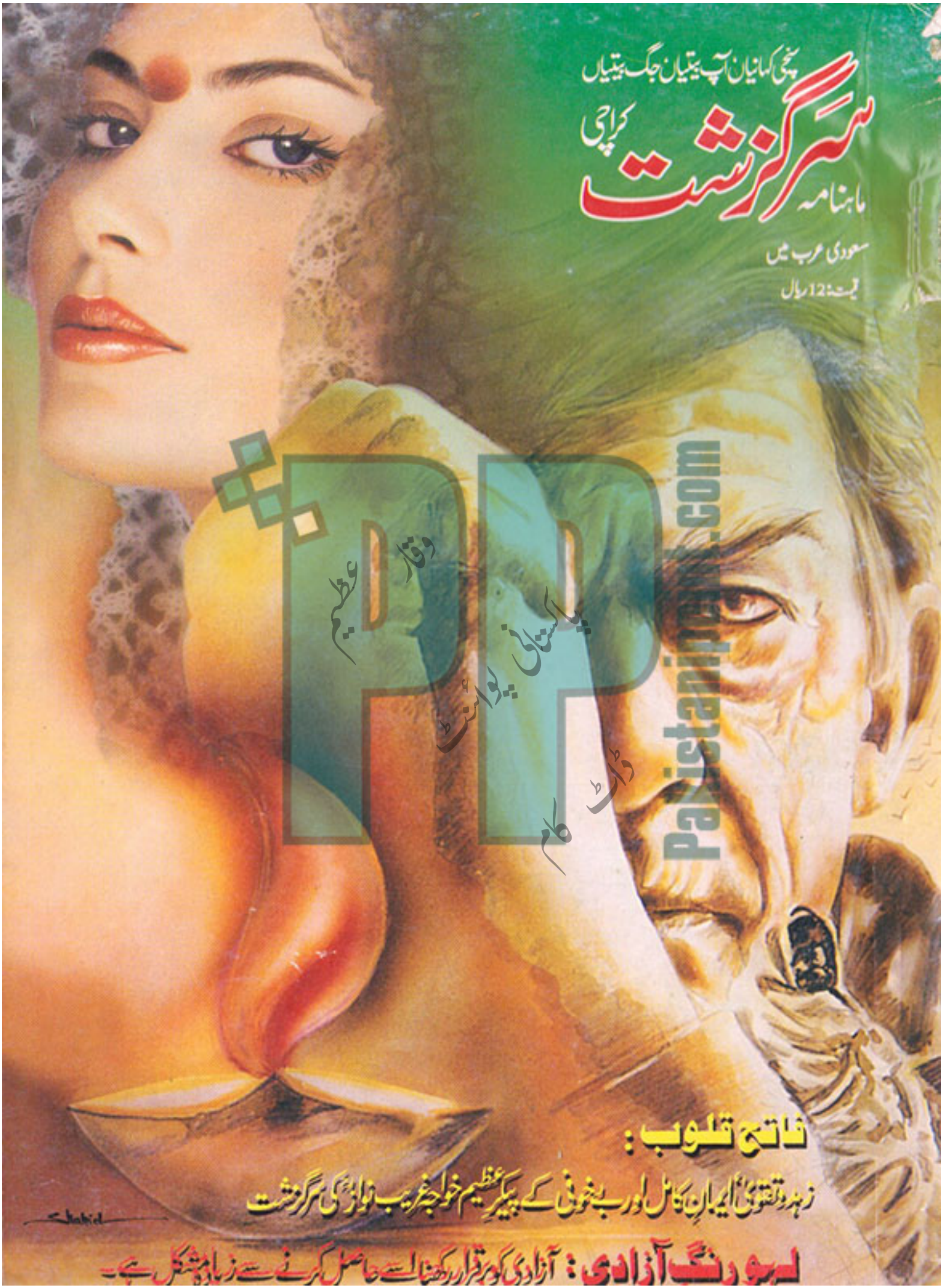
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ سرگزشت کراچی
سعودی عرب میں
قیمت 12 ریال
فاتح قلوب :
زہد و تقویٰ ایمانِ کامل اور بے خودی کے پیکرِ عظیم خواجہ غریب نوازؒ کی سرگزشت
لبرو رنگ آزادی : آزادی کو برقرار رکھنا اسے حاصل کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔
PP
Pakistanipoint.com
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

15
سرگزشت
ادارہ

شخصیات

ایک صفحے میں مکمل، مختصر مختصر،
ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

16
شہرِ خیال
معراج رسول

گفت و شنید

آپ کی باتیں آپ کے خیال
آپ کے شوئے آپ کے سوال

22
فاتحِ قلوب
ڈاکٹر ساجد امجد

رشد و ہدایت

"حسن اللہ اپنی رضا مرحمت فرمائے
وہ بہشت کو کیا سمجھے "خواجہ غریب نواز"

71
حیاتِ نو
کاشف زبیر

مہم جوئی

خود غرضی کے اس دور میں ایک باہمت
نوجوان کے جذبۂ ایثار کا سنسنی خیز ماجرا

83
انسانی رُندہ
محمد ظریف

شکاریات

ایک ایسے درندے کا قصہ جو
انسانیت کے لیے باعثِ تذلیل تھا

88
سفر ہے شرط
علی سفیان آفاقی

سفرنامہ

اس سرزمین کی تین جہاں انصار مدینہ کے کردار
حضرت ابوایوب انصاری تک محوِ خواب ہیں

113
عظیم ترین مقابلے
سائبہ علی

کھیل

ابتدائی اولمپک میں شامل کھیلوں اور خواتین
کی ایک سنہری انعام میں ملتی تھی

121
مماثل
منظر امام

استاد نامہ

ایک نوجوان حسینہ سے برس ہا برس
پوشیدہ تعلقات کی دلچسپ داستان

130
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی

فلم و صحافت

فلم صحافت اور ادب کان کہی کہانیاں
مارلن برانڈو کی زندگی کے اتار چڑھاؤ

159
دیوارِ چین
خرم چغتائی

تاریخ

بعض اوقات وقت کی ضرورت بھی
تاریخ کا حیرت انگیز حصہ بن جاتی ہے

169
سرِ راہ
غلام قادر

سماجیات

جذبات کے بپھرے ہوئے سمندر
میں ایک بے چین لہر کی کارفرمائیاں

186
مقدر
محی الدین نواب

معاشرت

انسان کے روز و شب پر مقدر
کی آہنی گرفت کا دلچسپ تماشا

224
لہو رنگ آزادی
احتشام

241
کسک
کامران احمد

سچ بیانیاں

آگ اور خون کے دریا میں ڈوب کر
نیا پار لگانے والوں کی لہولہو داستان

جذبۂ عشق جنون میں ڈھل جائے تو
اکثر چونکانے والے قصے جنم لیتے ہیں

249
نشیب و فراز
غزالہ منیر

263
جھوٹا ہمدرد
افشاں آفریدی

277
لمحۂ قاتل
زوہیب انصاری

289
اللہ والے
خالد احمد

موت کے قریب تر زندگی کی خواہش
میں مچلنے والی دلچسپ و انوکھی کہانی

غیض کی تکالیف دہ بے سکون ہو جانے
والا ایک جری نوجوان کا قصۂ عبرت

معاشرے کے خبیث رندوں کے جال میں پھنسے
والا ایک معصوم نوجوان کا عبرت انگیز واقعہ

مایوسی ناکامیوں کے اندھیروں میں اچانک
امید کی کرن پانے والے شخص کا قصۂ حیرت

293
زہرِ عشق
محمد وسیم خان

305
فیصلہ
اسلم

313
غلطی
عمار

327
تحریک
ظفر خان

غلط فہمیوں میں جنم لینے والی پاکیزہ
محبت کی عبرت انگیز داستان

محبت اور فریب میں بروقت احساس
کرنے والی ایک نادم و شیزہ کا ماجرا

جذبات کے بھنور میں محبت کی بھینٹ
چڑھ جانے والوں کی دلدوز کتھا

زندگی متعلق انتہائی دلچسپ خطرناک
خیالات رکھنے والے شخص کی روداد

PDF
پاکستانی ڈائجسٹ
وقار عظیم

سرمایۂ عالم

اس کا باپ انتقال ہوا تو اس کی بیوہ کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس کی تدفین کے انتظامات کر سکتی۔ ہمسایوں کے چندے سے یہ کام کیا گیا۔ مگر یہ وہی شخص ہے جس کا فلسفہ انقلابِ روس کا سبب بنا۔ اسی طرح اس کے فلسفے سے جنم لینے والے ممالک میں چین، کیوبا اور ویت نام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس وقت وہ دنیا کی انتہائی نامور اور اثر خیز شخصیت کی حیثیت سے مشہور ہے۔

یہ قول اسی کا ہے کہ ''سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ زبردست طبقے اور حکومت کے حقِ زندگی کو آہستہ آہستہ ختم کر دیتا ہے۔''

اس نے ایک کتاب لکھی تھی جو دنیا کی شہرۂ آفاق کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب دنیا کی مشکل ترین کتابوں میں سرفہرست ہے۔ یہ تمام تر محنت اور سرمائے کے موضوع پر ہے۔ یہ مشکل اس لیے ہے کہ اس میں اس نے انسان اور سماج کی صحیح معنوں میں تفہیم کے لیے قبل از سقراط کے مادیت پسند فلسفیوں (Materialistic Philosophers) سے لے کر آج تک کے کم از کم 500 فلسفیوں اور ادیبوں کے افکار کو غیر جذباتی طریقوں سے دستاویز بنایا ہے۔

اس نے معاشیات میں ادب کو بھی شامل کیا تھا۔ ہمارے ہاں جو اردو میں ترقی پسند تحریک چلی، اس کی پشت پر بھی اسی کے خیالات تھے جو اس نے ادب کے سلسلے میں پیش کیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ادب سماجی تطہیر کا ایک موثر ذریعہ ہے۔''

عجیب بات ہے کہ دنیا کا یہ عظیم ماہر معاشیات بنیادی طور پر شاعر تھا۔ اس کے دو سے زیادہ شائع شدہ شعری مجموعے موجود ہیں۔ اس کی آخری شعری کتاب 1939ء میں چھپی تھی جس کا نام تھا ''نظموں بھری کتاب''۔ 1837ء میں اس نے اپنے باپ کی ساٹھویں سالگرہ پر سالگرہ کے تحفے کے طور پر اسے چند نظمیں ارسال کیں۔ اس کا باپ چونکہ اسے شاعری سے دور رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اسے خوب ڈانٹ پلائی۔ اس نے جواب میں رات بھر جاگ کر چار ہزار الفاظ کا خط لکھا اور شاعری کا بھرپور دفاع کیا۔ یہ خط اس کی باقیات کا انوکھا حصہ ہے۔ اس نے Ph.D کے لیے ''اپی کیورین اور ڈیموقریطیسی فلسفۂ قدرت میں تضاد'' کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اور ہم عصری معاشی طاقتوں کی کشمکش کے لیے جس سائنسی طریقے کو روشناس کرایا وہ آج بھی عصری قوتوں کی تفہیم کے لیے بہت ضروری ہے۔

اس جگہ ہم اس کی شہرۂ آفاق کتاب کا نام بھی بتائے دیتے ہیں۔ یہ ہے ''داس کیپٹال''۔ ایک جگہ پڑھنے کو ملا تھا کہ کسی صحافی نے اس کی بیوہ سے پوچھا ''تم اپنے شوہر کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس نے کہا ''کاش اس نے ساری عمر کیپٹل پر کتاب لکھنے کے بجائے تھوڑا سا کیپٹل (سرمایہ) جمع کر لیا ہوتا۔''

نسلاً یہودی، یہ شخص اپنے وطن جرمنی سے ترکِ سکونت کر کے برطانیہ چلا گیا تھا اور وہیں بہت عُسرت کے عالم میں اس کا انتقال ہوا۔

علم الاقتصاد کے طلبا اور ماہرین اس سے بخوبی واقف ہیں اور دنیا اسے مارکس (کارل مارکس) کے نام سے جانتی ہے۔

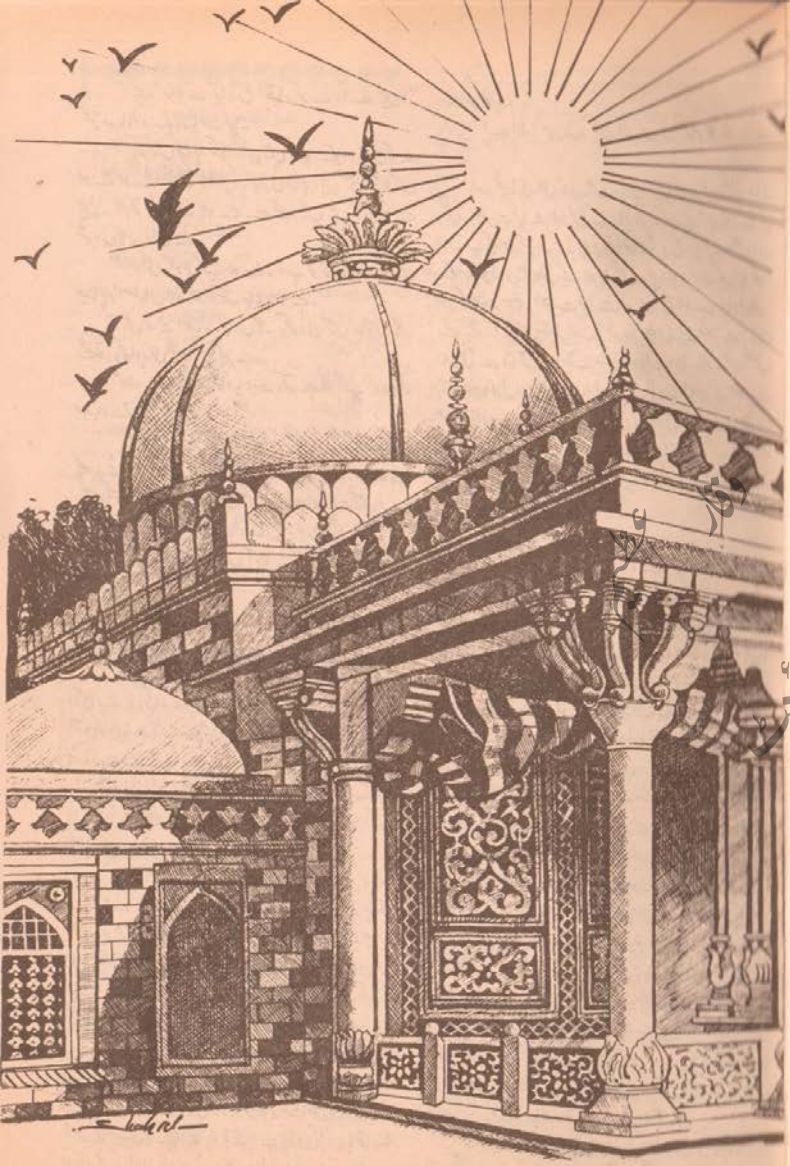

فاتح قلوب

تحریر : ڈاکٹر ساجد امجد

اللہ کے تمام برگزیدہ بندوں کی خوبی یہ رہی ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو نہ دکھ پہنچایا نہ تکلیف دی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس لحاظ سے ایک انتہائی بلند مقام پر فائز ہوئے اور آپ کو خود لوگوں نے، جن میں اکثریت کفار کی تھی، غریب نواز کا لقب دیا۔ آپ کو خواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہندوستان کی ولایت بخشی اور اجمیر کو اپنا مستقر بنانے کا حکم دیا۔ اُدھر ہندوستان کے مہاراجہ پرتھوی راج کے نجومی یہ پیش گوئی کرچکے تھے کہ دور دیس سے ایک دبلا پتلا، داڑھی والا، چوڑی پیشانی والا شخص آئے گا جس کے ہونٹوں پر مسکان ہوگی اور وہ پرتھوی راج کی سلطنت کو تباہ کردے گا اور پھر جب خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے چالیس ہمراہیوں کے ساتھ طویل فاصلے طے کرتے ہوئے اجمیر پہنچے تو نہ راستے میں اور نہ یہاں آپ کو کوئی روکنے والا تھا۔ صرف آپؒ کی زندگی ہی ہندوستان میں تبدیلیوں کا سبب نہ بنی، بلکہ آپ کی رحلت کے بعد بھی آپ کا مزار مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔

''جس کو اللہ اپنی رضا مرحمت فرمادے وہ بہشت کو کیا سمجھے'' خواجہ غریب نوازؒ

دیواروں سے دھوپ اتری تو بچے گلی میں نکل آئے۔ تنگ گلی مزید تنگ ہوگئی لیکن اس طرح جیسے پھولوں کی کیاریاں صحنِ چمن کو آباد کردیں۔ یہ بچے مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر مختلف کھیلوں میں مشغول ہوگئے۔ ایک بچہ جوان سب سے چھوٹا بھی تھا' دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ اشتیاق تھا نہ حسرت۔ ہاں حیرت ضرور تھی۔

''معین الدینؒ! تم کیوں دور کھڑے ہو۔ آؤ تم بھی کھیلو۔'' ایک بچے نے قریب آکر کہا۔

''ہم کھیل کود کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔'' معین الدینؒ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''اگر بچے کھیلیں گے نہیں تو پھر اور کیا کریں گے۔''

''کھیل کے بجائے اپنا وقت اللہ کی عبادت میں گزارنا چاہئے۔''

یہ بچہ معین الدینؒ کی بات کو کچھ سمجھا' کچھ نہیں سمجھا لیکن قریب سے گزرنے والے ایک بزرگ کے قدموں نے چلنے سے انکار کردیا۔ وہ کچھ دور آگے بڑھے اور پھر لوٹ آئے۔

''بیٹے! کس خوش قسمت باپ کے بیٹے ہو؟''

''میرے والد گرامی کا نام خواجہ غیاث الدینؒ حسن ہے۔''

''اسی لیے تو اس عمر میں ایسی بزرگی کی باتیں کررہے ہو۔'' ان بزرگ نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے کسی اور صاحب کی توجہ اس جواب کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا ''یہ معمولی بچہ نہیں ہے۔ اپنے وقت پر بہت بڑے مقام پر فائز ہوگا۔''

تمام بچے پھر سے اپنے کھیل میں مشغول ہوگئے تھے۔ معین الدینؒ کچھ دیر انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر گھر کی طرف لوٹ گیا۔

☆☆☆

ظلم کے اندھیرے شہروں کی سرحدوں پر پہرا دے رہے تھے۔ خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ اقتدار کے شکاری مصروفِ فساد تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا' حیوانیت نے سر ابھارا تھا۔ انسانیت کونوں کھدروں میں دبکی ہوئی سسک رہی تھی۔ ڈاکو اور لٹیرے دندناتے پھر رہے تھے' راستے محفوظ تھے نہ گھروں میں عافیت تھی۔

حضرت غیاث الدینؒ حسن ابھی ابھی اصفہان سے تشریف لائے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ماہ نور ان کے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں کہ سفر کے حالات جان سکیں۔ قصبہ سنجر تک جو خبریں پہنچ رہی تھیں' وہ بہت وحشت ناک تھیں۔

''کہیئے' حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں؟'' محترمہ ماہ نور نے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن میں امید کے دریچوں کو بند ہوتے ہوئے دیکھ کر آیا ہوں۔ تجارتی شاہراہیں قطعی محفوظ نہیں ہیں۔ ہم تو خیر ایک چھوٹے سے قصبے میں ہیں لیکن بڑے شہروں کا برا حال ہے۔''

''ہم بھی محفوظ کب ہوئے۔ آپ کو تجارت کے لیے نیشاپور' اصفہان اور بغداد تک جانا پڑتا ہے۔''

''میں تو خیر احتیاط کرلوں گا۔ کچھ دن نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو کچھ اور ہی فکر دامن گیر ہے۔''

''ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے پھر آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟''

''مجھے اپنی نہیں معین الدینؒ کی تعلیم کی فکر ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اس کی تعلیم کیسے مکمل ہوگی۔ سنجر سے باہر کیسی کیسی علمی درس گاہیں ہیں لیکن حالات اجازت نہیں دیتے کہ وہ سنجر سے باہر جائے۔ خراسان پر فوج کشی ہوچکی ہے سیستان کا گورنر حراست میں آچکا ہے۔'' یہ حالات ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔''

''معین الدینؒ کی عمر ایک جگہ رکی تو نہیں رہے گی۔ اگر یہ عمر نکل گئی تو کیا ہوگا۔''

''آپ نے تو مجھے بھی فکر مند کردیا۔ معین الدینؒ میں ابھی سے بزرگی کے آثار دیکھ رہی ہوں۔ اس میں عام بچوں جیسی کوئی بات نہیں۔ وہ پیدائشی ولی ہے۔ اسے تربیت کی سخت ضرورت ہے۔''

''اب یہ بیڑا مجھے خود اٹھانا پڑے گا یا پھر سنجر کے مکتب اس کی پناہ گاہ ہوں گے۔ اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔'' حضرت غیاث الدینؒ نے کہا۔

☆☆☆

رات گزرتے گزرتے اپنے آخری کنارے پر آگئی تھی۔ ہر طرف سکوت تھا ویرانی تھی۔ سنجر کی گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مخلوقِ خدا نرم گرم بستروں میں محوِ استراحت تھی لیکن ایک گھر میں چراغ کی روشنی گھر کے مکینوں کی بیداری کا سراغ فراہم کررہی تھی۔

دو مصلّے ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ ایک پر حضرت غیاث الدینؒ مصروفِ عبادت تھے دوسرے پر آپ کی اہلیہ محترمہ تہجد کے نوافل ادا فرمارہی تھیں۔ دونوں باہر کت نفوس برکتوں کے خزانے سمیٹ رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ پھر اذانِ فجر کی آواز بلند ہوئی۔ حضرت غیاث الدینؒ نے سجدے سے سر اٹھایا۔

''اے اللہ! میرے معین الدینؒ کی تعلیم کا بندوبست فرما۔''

اب تھوڑی ہی دیر میں سیاہی میں سپیدی گھلنے والی تھی۔ حضرت غیاث الدینؒ نے نمازِ فجر کے لیے مسجد کا رخ کیا اور آپ کی اہلیہ محترمہ نے بچوں کو اٹھانا شروع کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوجائیں۔ کیا باہر کت گھرانا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ حضرت غیاث الدینؒ صحیح النسب سادات سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت حسین ابن علیؓ سے ملتا تھا۔ صاحب حیثیت دولت مند تھے۔ علم و فضل میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ اہلیہ محترمہ کی یہ شان کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی نگی چچی زاد ہیں۔ دونوں نفوس کی پاکیزگی نے گھر کو باہر کت بنادیا تھا۔ عبادات میں اسی انہماک کا ثمر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی کو اس گھر کے آنگن میں اتار دیا تھا۔

''یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا''

☆☆☆

ملکی حالات کی ابتری کا دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ مزید پانچ برس گزر گئے۔ معین الدینؒ حسن سنجر کی عمر دس سال ہوگئی تھی۔ فقہ حدیث اور تفسیر میں کسی حد تک دسترس حاصل ہوگئی تھی کہ 544ھ میں ملکی حالات نے کچھ سنبھالا لیا۔ امن و امان کی حالت میں کچھ بہتری آگئی جس طرح شدید بارش مسلسل بعد بادل چھٹ جائیں اور دھوپ جھانکنے لگے۔

حضرت غیاث الدین حسنؒ بہ سلسلہ تجارت نیشاپور جاتے رہتے تھے وہاں کے علمی ماحول سے واقف تھے۔ تمام دینی درس گاہیں ان کی دیکھی بھالی تھیں۔ علما سے متعارف بھی تھے اور وہ ان کی عظمت کے معترف بھی تھے۔ خوابوں نے آنکھوں میں گھر بنالیا۔ وہ عالمِ تصور میں اپنے لختِ جگر کو علم و ذکر کی ایک عظیم درسگاہ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

شعلوں کی لپک میں کمی آگئی تھی اٹھتی ہوئی گرد بیٹھ گئی تھی۔ راستے محفوظ ہوگئے تھے خوارزمی اور غزنوی سلطنتیں وجود میں آچکی تھیں۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامعہ پہناتے۔ انہوں نے بیوی سے مشورہ کیا۔ جدائی کی خبر ناقابلِ برداشت تھی لیکن شوہر کی رضا اور بیٹے کا مستقبل سامنے تھا۔ انہوں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر اجازت دے دی۔ گھر کا چراغ گھر سے رخصت ہورہا تھا لیکن یہ یقین بھی تھا کہ جب لوٹ کر آئے گا تو چاند سے زیادہ روشن ہوگا۔

سواری کا گھوڑا دروازے پر بندھا تھا۔ بی بی ماہ نور نے لختِ جگر کو سینے سے لگایا۔ دعاؤں کے تحفے ساتھ کیے۔ حضرت

غیاث الدینؒ نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور سوار ہوگئے۔ دس سالہ معین الدینؒ نے ایک ہاتھ سے باپ کا ہاتھ تھاما' دوسری طرف سے ماں نے سہارا دیا۔ وہ گھوڑے پر باپ کے پیچھے بیٹھ گیا۔

حضرت غیاث الدینؒ متعدد بار نیشاپور کا سفر کرچکے تھے۔ قیام راستے دیکھے بھالے تھے لیکن اس وقت وہ بہت محتاط تھے۔ ان کی زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ معین الدینؒ کی صورت میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ بارِ بارداں صرف دیکھ لینے کہ کوئی لٹیرا کہیں میں نہ بیٹھا ہو۔ گھوڑا بھی سرپٹ دوڑنے لگتا کبھی وہ راس کھینچ لیتے کہ معین الدینؒ کو جھٹکے نہ لگیں۔

''ایسی تیسی نہ لگ جائے آبگینوں کو''

دروازۂ شہر نزدیک آرہا تھا۔ چہل پہل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اسباب سے لدے ہوئے خچر شہر میں داخل ہورہے تھے یا شہر سے باہر نکل رہے تھے۔ حضرت معین الدینؒ کے لیے یہ مناظر اجنبی سے کم نہیں تھے۔ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو یہاں کی فضا بھاگ نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے آئے تھے۔ سنجر کے مقابلے میں نیشاپور کی شان ہی دوسری تھی۔ سامان سے بھری ہوئی دکانیں' خریداروں کا ہجوم' ہاتھوں کی بھیڑ بھاڑ ان کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ گھوڑے سے نیچے اتر کر ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے لیکن اس وقت تو انہیں اپنی عظیم درس گاہ تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ شہر کی آبادی کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں کی درس گاہیں بھی لاجواب ہوں گی۔

حضرت غیاث الدینؒ کے لیے نہ یہ شہر نیا تھا نہ راستے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں کون کون سی درس گاہیں ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے۔ ایک درس گاہ کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے نیچے اتر گئے، دونوں ہاتھ پھیلائے تو ماہِ منجر معین الدینؒ ان کی آغوش میں تھا۔ معین الدینؒ نے اس مدرسے کے در و دیوار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ یہ وہ دیواریں تھیں جن کے عقب میں دنیا کے مایہ ناز اساتذہ علم دین پڑھانے اور بہترین افراد پڑھنے میں مشغول تھے۔

حضرت غیاث الدینؒ نے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور مدرسے میں داخل ہوگئے۔ غیاث الدینؒ کوئی عام بزرگ نہیں تھے۔ علم و فضل میں یکتا اور باطنی علوم سے آراستہ تھے۔ علمائے وقت ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں بھی کئی علما ان کے پرستار تھے۔ انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور معین الدین کا ہاتھ ان اساتذہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

سوانحی خاکہ

نام:	حضرت خواجہ معین الدینؒ
والد:	حضرت خواجہ غیاث الدینؒ
والدہ:	بی بی ام الورع الموسوم ماہ نور
بھائی، بہن:	دو بھائی' ایک بہن
مرشد:	حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ
سن پیدائش:	535ھ
اجمیر آمد:	587ھ
پہلی شادی:	598ھ
دوسری شادی:	616ھ
زوجۂ اول:	حضرت بی بی امتہ اللہ
زوجۂ دوم:	حضرت بی بی عصمت اللہ
بیٹے:	خواجہ فخر الدین ابوالخیرؒ حضرت حسام الدین ابوصالحؒ حضرت خواجہ ضیاء الدین ابوسعیدؒ
بیٹی:	بی بی حافظہ جمال
تاریخ وفات:	634ھ
مزار شریف:	اجمیر' ہندوستان

حضرت غیاث الدینؒ نے اپنے بیٹے کے لیے قیام کا بندوبست کیا۔ کچھ روز نیشاپور میں قیام کیا اور پھر خوشی خوشی سنجر کی طرف واپس پلٹ گئے۔ گھر پہنچے تو اہلیہ کو سراپا انتظار دیکھا۔ وہ یہ سننے کے لیے بے چین تھیں کہ ان کا بیٹا خیریت سے نیشاپور پہنچ گیا۔ خیریت کی خبر سنی تو دل سے خلش دور ہوئی۔ اسی وقت شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے مصلّے پر کھڑی ہوگئیں۔ ''اے اللہ! میرے معین کے قلب و ذہن کو کھول دے۔''

نیشاپور کون سا دور تھا۔ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ حضرت غیاث الدینؒ کو جب فرصت ملتی بیٹے کو دیکھنے نیشاپور پہنچ جاتے کچھ دن قیام کرتے اور پھر سنجر چلے آتے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہورہی تھی کہ ان کا ہونہار فرزند بڑے انہماک سے حصولِ علم میں مشغول ہے۔ درس گاہ میں اس کی ذہانت اور سعادت مندی کا چرچا ہے۔ اساتذہ تک اس قابل شاگرد کی تکریم کرتے ہیں۔

وقت کچھ دیر کے لیے ٹھہر سا گیا تھا۔ اطمینان و عافیت

نے ملنا ہیں چھوڑیں تو ساتھیں فراٹے بھرنے لگیں یہاں تک کہ چار سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ معین الدینؒ ابھی نیشا پور میں علوم دین کی بہاریں لوٹ رہے تھے کہ حضرت غیاث الدینؒ نے تجارت کی غرض سے کچھ دن بغداد میں قیام کا ارادہ کیا۔ وہ بغداد پہنچے ہی تھے کہ ہوا بد لنے لگی۔ غزنیوں نے جنگِ ترائن میں سلطان شہر کو گرفتار کرلیا اور پھر نیشا پور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے انوا ہوں کے لشکر شہر میں داخل ہوئے پھر ترک کے سپاہی آگئے۔ موت کے عفریت تلواریں ہاتھوں میں لیے نہتے شہریوں پر ٹوٹ پڑے۔ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ چلو مسجد نعبی میں پناہ لیتے ہیں۔ حملہ آور مسلمان ہیں مسجد کا رخ نہیں کریں گے۔

حضرت معین الدینؒ کئی دن اپنی قیام گاہ کو پناہ گاہ بنا کر چھپے رہے۔ آخر ایک روز چھپتے چھپاتے باہر نکلے۔ یہ وہ شہر ہی نہیں تھا جہاں وہ آئے تھے۔ ہر طرف سکون تھا جیسے یہ شہر نہ ہو قبرستان ہو۔ بچے، عورتیں، بوڑھے اپنے ہی خون میں نہائے سڑکوں پر پڑے تھے۔

پندرہ سال کا ایک لڑکا سڑک پر بے تحاشا دوڑنے لگا۔ اسے اپنی درس گاہ کی یاد آگئی تھی۔ مادرِ علمی پر کیا گزری؟ اس کے قدم ایک جگہ رک گئے۔ یہی تو وہ درس گاہ ہے جہاں وہ علم حاصل کرنے آیا تھا۔ یہاں اب رکھا ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے کئی ساتھیوں کی لاشیں بے گور وکفن پڑی ہوئی دیکھیں۔ اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔ اب وہ یہاں رک کر کیا کرتا۔ اسے چلنے کی جلدی تھی مگر بھاگنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا۔ حدِ نگاہ تک طویل راستہ تھا۔ کوئی بستی نہ آبادی نہ سواری۔ کئی میل چلنے کے بعد پیاس نے ستایا لیکن پانی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ اگر تلواروں نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا، بھوک اور پیاس مجھے نہیں چھوڑے گی۔ کبھی رکتے کبھی چلتے۔ آخر کئی دنوں کی تکلیف دہ سفر کے بعد بھوکے پیاسے نڈھال شہر پہنچ گئے اور ماں کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ تھکن تھی کہ منڈیر کی دھوپ کی طرح اتر گئی۔ اپنے چاند کو گہنائے ہوئے دیکھا تو والدہ پانی کے لیے دوڑیں۔

''میرے بچے! کیا حال ہو گیا تیرا۔''

''آپ کی دعاؤں سے زندہ رہ گیا ورنہ جہاں میں تھا وہاں شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو۔''

''انسانیت کی اس تذلیل کو بھولنا مت۔'' ماں نے کہا اور اپنے آنچل سے اس کے چہرے کی گرد صاف کرنے لگیں۔

ماں کو تو انہیں زندہ دیکھ کر ان کی سلامتی کا یقین ہو گیا تھا لیکن نیشا پور کے قتلِ عام کی خبر جب بغداد پہنچی تو حضرت غیاث الدینؒ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ صاحب فراش ہو گئے۔ پردیس میں بیٹے کی موت کا جب بھی خیال آتا آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے، خیال تھا کہ امن ہوتے ہی بیٹے کی تلاش میں نکلیں گے لیکن انتظار کی تاب ہی کب تھی۔ بیٹے کی محبت میں اپنی جان خالقِ حقیقی کو سونپ دی۔

اہلِ بغداد کے دل ان کی عظمت و بزرگی سے آباد تھے۔ ان کی موت کا علم ہوا تو عقیدت مند جمع ہو گئے اور پھر بغداد میں ہی دروازۂ شام کے قریب سپردِ خاک کر دیا گیا اور دیکھنے ہی دیکھتے ان کا مزار مرجعِ خلائق بن گیا۔

والد گرامی کی وفات کی خبر سفر پہنچی تو آپ کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ممکن تھا کہ اس صدمے سے وہ بکھر کر رہ جاتے لیکن صبر و رضا کی پیکر والدہ محترمہ نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، بکھرنے نہ دیا۔ ''جب ایسا وقت آئے تو اللہ کو یاد کرو۔''

بی بی ماہ نور کثرت سے عبادت فرماتی تھیں۔ اپنے عہد کی رابعہ بصری تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کی عبادت میں مزید خلوص آگیا۔ حضرت معین الدینؒ کو بھی اپنی والدہ کی خدمت اور عبادت و ریاضت کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

بی بی ماہ نور نے شوہر کی وفات کے بعد ساری توجہ اپنے بچوں پر مرکوز کر دی تھی۔ خصوصاً معین الدینؒ سے انہیں بڑی امیدیں تھیں البتہ انہیں اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے تیور بدلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ وہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھیں حضرت معین الدینؒ کے بڑے بھائیوں نے والد گرامی کے ترکہ کی تقسیم کا تقاضا کر دیا۔

''اماں جان! والد گرامی کے وصال کو اب کتنے دن ہو گئے ان کی جائیداد میں جو حصہ ہمارا بنتا ہے وہ اب ہمیں ملنا چاہیے۔''

''جو کچھ ہے وہ تم سب ہی کا تو ہے پھر اسے الگ الگ کرنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو'' بی بی ماہ نور نے کہا۔

''ایک چیز سب کی ہو تو جھگڑے کا امکان رہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا کیا ہے اور معین الدین کا کیا ہے۔''

''اس کی طرف سے تو کوئی مطالبہ نہیں آیا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس تقسیم کے حق میں ہوگا بھی نہیں۔''

''وہ نہ چاہے مگر اس کا حق بھی اسے ملنا چاہئے۔''

جب بیٹوں کی طرف سے اصرار بڑھنے لگا تو بی بی ماہ نور

نے بالآخر تمام جائیداد کی تقسیم کر دی۔ اس تقسیم کے نتیجے میں ایک دکان باغ اور پن چکی خواجہ معین الدینؒ کے حصے میں آئی۔

بھائیوں کی توقع کا امکان نہیں تھا لیکن اس تقسیم نے حضرت معین الدینؒ کو افسردہ کر دیا۔ ایک تو یہ صدمہ دامن گیر تھا کہ والد گرامی کی جائیداد کی حصوں میں تقسیم ہو گئی دوسرے یہ کہ والدہ بھی اب جائیداد کی دیکھ بھال میں وقت صرف کرنے لگیں گی۔ وہ تو طے کر چکے تھے کہ اب اپنا تمام وقت یادِ الٰہی میں گزاریں گے لیکن اب اپنی اور ماں کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے باغ کی نگرانی اور کاشتکاری کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ ہاتھ کام میں لگے رہتے اور دل یادِ الٰہی میں مشغول رہتا۔ انہوں نے اس دنیاداری کو بھی عبادت میں داخل کر لیا۔

یہ وقت نہایت آرام و سکون سے گزر رہا تھا کہ آزمائش نے آواز دی۔ ایک دن تھکے ہارے باغ سے واپس آئے تو والدہ کی طبیعت کو ناساز دیکھا۔ ایک یہی ہستی تو تھی جس کی دعا سے دوا بھی اثر کرتی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر آپ اٹھے۔ علاج معالجے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ دعاؤں کے عوض بھی دربارِ الٰہی میں روانہ کیے لیکن والدہ اپنی کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔ تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ والدہ محترمہ چند روز صاحبِ فراش رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ والدہ کی وفات کے بعد بھی کئی مصائب کے روبرو بھی صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ آپ نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور اللہ کی رضا کو اپنی رضا جانا کر سر جھکا لیا۔

ایک دن حسبِ معمول باغ کی خدمت میں مصروف تھے۔ ہاتھ کام میں، دل یادِ الٰہی میں مشغول تھا کہ سوکھے پتوں کی چرمراہٹ نے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ابراہیم قندوزی اور اس باغ میں اپنی وحدانیت کے رنگ میں روحانیت کے ایسے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ جن کو حضرت غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ نے آپ کے ساتھ ایک شب گزارنے کی آرزو کی تھی اور یہ صد آرزو پوری ہوئی تھی۔ اللہ اللہ میری قسمت کہ آرزو کے لائق ٹھہرے۔ نہایت ادب سے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور ایک کھجور کے پتے کی چادر بچھا دی۔

''خوش آمدید تشریف رکھیں۔'' آپ نے کہا اور دوڑ کر ایک کٹورے میں پانی لے آئے۔ پھر دوسری طرف بھاگے اور انگور کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے۔ نہایت ادب سے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابراہیم قندوزی کی نظریں ان کی پیشانی پر جمی ہوئی تھیں جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ پھر اس خوشے سے ایک دانہ انگور کا توڑ لیا۔

''لو اب ہم تمہیں کچھ کھلاتے ہیں۔'' حضرت ابراہیم قندوزی نے فرمایا۔

انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کھلی کا ایک ٹکڑا نکالا اور اپنے دانتوں سے چبانے لگے۔ خواجہ معین الدینؒ بڑی محویت سے دیکھ رہے تھے۔

جب ابراہیم قندوزی اس کھلی کا ٹکڑا اچھی طرح چبا چکے تو اس ٹکڑے کو دہن مبارک سے نکال کر حضرت معین الدینؒ کے دہن میں رکھ دیا۔

اس نکڑے کا حلق سے اترنا تھا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ حجابات اٹھ گئے۔ انوارِ الٰہی کی ایسی بارش ہوئی کہ آنکھیں کچھ اور دیکھنا بھول گئیں۔ پھر نہ باغ نہ خانہ اپنے ہونے کا احساس۔ کوئی اور ہی دنیا تھی جس کی سیر کو وہ نکلے ہوئے تھے۔ گرد و پیش کا ہوش نہ تھا۔

نہ جانے یہ کیفیت کب تک برقرار رہی۔ جب آپ اس کیفیت سے باہر آئے تو کٹورے میں تھوڑا سا پانی تھا۔ چادر پر انگور کا خوشہ رکھا ہوا تھا لیکن ابراہیم قندوزی موجود نہیں تھے۔ آپ بے تحاشا باغ کے دروازے کی طرف بھاگے۔ جانے والے کے قدموں کے نشان تک نہیں تھے۔ باغ میں آکر ڈھونڈا۔ ایک ایک درخت کے پیچھے جھانکا، کچھ نظر نہ آیا۔ تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

ایک شخص کیا گیا دنیا ہی خالی ہو گئی۔ جب وہ نہیں تو کیسا باغ کہاں کے انگور۔ میں کیوں تجر کیا۔ آپ عالمِ مستی میں اٹھے اور اپنے باغ اور پن چکی کا سودا کر دیا۔ اس سے جو رقم ملی فقرا اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر کے تجر سے نکل گئے۔ انہیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے اور کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ بس چلتے ہی رہنا ہے، یہ کون سا راستہ ہے کہ نہ

''خطابات''

1۔ قطب المشائخ بحر و بر۔ 2۔ خواجۂ اجمیر۔ 3۔ ہندالنبی 4۔ عطائے رسولؐ۔ 5۔ خواجۂ بزرگ۔ 6۔ ہندالولی۔ 7۔ غریب نواز۔ 8۔ سلطانِ الہند۔ 9۔ نائبِ رسول فی الہند۔

آبادی نہ بستی' ندیاں ہیں نالے اور ریت کے ٹیلے ہیں۔ جنگل ہے اور جنگل کے درندے۔

کافی دنوں کی مسافت کے بعد دور کسی شہر کی دیواریں نظر آئیں۔ قدموں میں تیزی آگئی۔ سامنے شہر کا دروازہ تھا۔ یہ شہر تو ہے مگر کون سا؟ کوئی باہر نکلے تو پوچھوں۔ آخر ایک شخص باہر آیا۔

''بھائی' یہ کون سا شہر ہے؟''

''بخارا'' اس آدمی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

آپ نے ذرا غور کیا تو حافظے کے دفتر میں اس نام کو کئی جگہ لکھا ہوا دیکھا۔ والد گرامی سے کئی مرتبہ اس شہر کے بارے میں سن چکے تھے کہ یہ شہر خانقاہوں اور مدرسوں کی جنت ہے۔ ہزاروں تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے یہاں آتے تھے۔ تو کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیت ہے اس نے مجھے اس راستے پر ڈال دیا جو بخارا تک آتا تھا؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ نیشاپور میں خون ریزی کی بدولت میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے میں اپنی تعلیم مکمل کروں۔ آپ نے سوچا اور دروازۂ شہر میں قدم رکھ دیا۔

اس شہر کے بارے میں جیسا سنا تھا اسے ویسا ہی پایا۔ شہریوں کے چہروں پر علم کی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کئی دیواروں پر مکتب ہونے کا گمان ہوا۔ کون سا در یا یاب ہے' کون سا تایاب' یہ کس سے پوچھا جائے' ہر طرف موتیوں کے خزانے ہیں۔ کس موتی کا انتخاب کیا جائے، یہ کون بتائے؟

''بھائی' یہاں سب سے مشہور و معروف شخص کون ہے؟'' انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

''تم تاجر ہو یا طالب علم؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''میں نے تو طالب علم کے لیے سفر اختیار کیا ہے۔''

''تو پھر شیخ حسام الدین کی خدمت میں وقت گزارو۔''

شیخ حسام الدین کے مکتب کا پتا معلوم کرنا کون سا دشوار تھا۔ ایک راہ گیر نے خود رہنمائی کی اور انہی شیخ حسام الدینؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ انہوں نے آپ کے حالات سنے' راہ کی تکلیفوں کا احوال سنا تو طلب صادق کا یقین آگیا۔ خواجہ معین الدینؒ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''سر اٹھاؤ' میں دیکھ رہا ہوں یہ سر کسی غیر اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں بنا۔ علم کی طلب میں نکلے ہو تو دامن پھیلاؤ جو کچھ حاصل کر سکتے ہو کر لو۔''

وہ تو گھر بار کو خیر باد کہہ کر نکلے ہی اسی مقصد سے تھے۔ ذوق و شوق سے علم کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ آپ کے خلوص دل نے یہاں بھی رنگ دکھایا۔ جلد ہی اساتذہ کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ منزلوں پر منزلیں سر کرتے رہے۔ راتیں عبادت میں اور دن مطالعے میں بسر ہونے لگے۔ طالب علم انہیں رشک سے اور اساتذہ فخر سے دیکھتے تھے۔

دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو یہاں کے علماء نے دستار فضیلت سے نوازا۔ شیخ حسام الدینؒ نے آپ کو الوداع کہا تو علم کی طلب ابھی تک سینے میں موجزن تھی۔ آپ نے بخارا کو خیر باد کہا اور سمرقند جانے کا ارادہ کیا۔ سمرقند بھی بخارا سے ہمسری کا دعوے دار تھا۔ یہاں بھی ایک سے ایک عالم موجود تھا۔ پڑھنے کے مواقع دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ سمرقند جانے کا فیصلہ نہایت بروقت تھا۔ آپ بخارا سے نکلے اور راستے کی مشکلات طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے بخارا سے روانہ ہونے سے قبل ہی معلوم کر لیا تھا کہ سمرقند میں انہیں کس عالم دین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا ہے۔ چنانچہ سمرقند پہنچتے ہی آپ نے مولانا شرف الدین کے مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ قرآن پاک حفظ کرنے سے ادھورا رہ گیا تھا۔ اسے پورا کیا اور پھر جملہ دینی علوم میں سند حاصل کی۔

اب انہیں گھر سے نکلے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے اور عمر مبارک 23 سال ہو گئی تھی۔ دینی و عقلی علوم حاصل کر لیے تھے لیکن تسکین قلب کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی' علوم ظاہری کی اہمیت اپنی جگہ لیکن دل کچھ اور ڈھونڈ رہا تھا۔ ابراہیم قندوزی کا دیا ہوا کھلی کا ٹکڑا سینۂ مبارک میں ہلچل ڈالے ہوئے تھا۔ اب انہیں کسی ولی کامل کی تلاش تھی جو انہیں علوم ظاہری سے حقیقت و معرفت کی آخری حدوں تک پہنچا دے۔

تصوف کے چار دریا صدیوں سے ساتھ ساتھ بہتے چلے آرہے تھے۔ انہیں ان دریاؤں میں سے کسی ایک کی تلاش مقصود تھی۔ کس دریا کا پانی کتنا گہرا تھا۔ اس کا فیصلہ کوئی ماہر تیراک ہی کر سکتا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ رب کریم پر چھوڑا کہ وہ انہیں کس دریا پر لے جا کر کھڑا کرتا ہے۔ اور کسی رہنما کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ بغداد ہی وہ سرزمین ہے جہاں پر سلسلۂ تصوف کے اولیائے کبار اپنی روحانیت سے مردہ دلوں کو بیدار کر رہے ہیں۔ بے شمار بزرگان دین کے مزارات ہیں جو انوار الٰہیہ تقسیم کر رہے ہیں۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ سمرقند کی گلیوں میں چلتے ہوئے پاؤں جلنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ لیکن ایک زنجیر ایسی تھی جو انہیں روکے ہوئی تھی۔ بغداد پہنچ کر وہ کس دروازے کا انتخاب کریں؟ انہوں نے

فقیروں کے گروں کے صدہا چکر لگائے۔ خاقانوں میں جا کر دیکھے۔ درویشوں اور زہد و ں سے معلومات کرتے رہے۔ کئی اولیائے کرام کے تذکرے سنے۔ پھر ایک روز حضرت عثمان ہرونی کا تذکرہ نکل آیا۔ کوئی درویش نہایت جوش و خروش سے آپ کی کرامات بیان کر رہا تھا۔ آپ کو ان کرامات سے کوئی غرض نہیں تھی، آپ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ اس نام پر ان کا دل بری زور سے دھڑکا تھا۔ دل کے کسی گوشے سے آواز آئی تھی یہ تجھے مراد ملے گی۔ آپ نے درویش کا تکیہ چھوڑا اور راستے کے لیے کچھ سامان خرید کر شہر کا دروازہ بھی چھوڑ دیا۔

آپ نے تیزی سے بغداد کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ شب باشی کے لیے جہاں پڑاؤ ڈالتے' حضرت عثمان ہرونی کا ذکر سننے کو ملتا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ ہستی ضرور میری رہنمائی کرے گی۔ اسی لیے قدرت بار بار اس نام کو میرے سامنے لا رہی ہے۔ اشتیاق دیدنے ایسا زور باندھا کہ کئی منزلیں کیے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ جیسے جیسے منزل قریب آرہی تھی۔ درویشوں کی سنائی ہوئی کرامات ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ایک نادیدہ رعب تھا جو دل کو اپنے حصار میں لیتا جا رہا تھا۔ کسی مقرب الٰہی کی بارگاہ میں حاضری کا یہ پہلا سفر تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ شوق تھا کہ ہمت بڑھا رہا تھا۔

بغداد کا دروازہ سامنے تھا۔ یہاں پہنچ کر ایک اور خیال نے دامن تھام لیا۔ والد گرامی حضرت خیاث الدینؒ کا مزار بھی یہیں تھا۔ اسی شہر میں آپ کے ماموں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ بھی تھے، کچھ دیر کو جی چاہا ملاقات کریں لیکن مرشد حضرت عثمان ہرونی کی خدمت میں پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ رکے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت عثمان کا آستانہ بغداد سے ایک ڈیڑھ منزل کے فاصلے پر تھا۔ طلب صادق تھی، یہ فاصلہ ہی کٹتا تھا۔ تھکن اتارنے کو بھی بغداد میں نہیں ٹھہرے اور ''ہرون'' پہنچ گئے۔

''دوست! حضرت خواجہ عثمان ہرونی کا آستانہ عالیہ کدھر ہے؟''

''یہاں سے سیدھے جا کر بائیں طرف مڑ جانا۔ ایک عمارت نظر آئے گی، وہی آپ کا آستانہ ہے۔''

آپ نے راہ گیر کے مشورے پر عمل کیا۔ ایک پرانی عمارت سامنے تھی۔ کتنی منزلوں کا سفر طے کرنے کے بعد اس عمارت کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ آنکھیں دیواروں کو چومنے میں مشغول ہو گئیں' اس خیال سے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی کہ ان دیواروں کے پیچھے وہ بزرگ ہستی تشریف فرما ہے جس کی کرامات کے تذکرے سمرقند و بخارا تک پہنچے ہوئے ہیں، کیا

چند فرمودات خواجہ بزرگ

☆ قرآن مجید کا دیکھنا ثواب' پڑھنا اور سمجھنا ثواب ہے' حرف پر نگاہ پڑے' دس گناہ دور ہوں اور دس نیکیاں درج ہوں۔ اس سے آنکھ کی روشنی بڑھتی اور امراضِ چشم سے نجات ملتی ہے۔

☆ درویشی اس کا نام ہے کہ جو آئے محروم نہ جائے۔ اگر بھوکا ہے تو کھانا کھلائے' اگر ننگا ہے تو نفیس کپڑا پہنائے۔

☆ گناہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل و خوار کرنا۔

خبر میری حاضری قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

عمارت کے باہر کھڑے ہوئے کتنی دیر گزر گئی خود انہیں بھی خبر نہ ہو سکی۔ خبر کیا ہوتی' ہوش ہی کب تھا۔ وہ تو اس وقت چونکے جب ایک شخص کو خانقاہ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

''حضرت خواجہ اندر تشریف رکھتے ہیں۔ آپ بے شک جا سکتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

حضرت معین الدینؒ کو یہ محسوس ہوا جیسے باریابی کی اجازت مل گئی ہو۔ جیسے منزل نے خود انہیں آواز دی ہو۔ انہوں نے اپنے جوتے باہر ہی چھوڑے اور خود ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

ایک کشادہ کمرے میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ چہرۂ مبارک پر نور برس رہا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ان میں خواجہ عثمان ہرونی کون ہیں۔

آپ جیسے ہی اس تنہائی میں مخل ہوئے' خواجہ عثمان نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ ''بیٹا! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' حضرت خواجہ نے کہا۔

ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ شراب معرفت نے اپنا اثر دکھایا۔ حضرت معین الدینؒ والہانہ آگے بڑھے اور مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔ مرشد نے نہایت شفقت سے آپ کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم آؤ گے اور اپنی امانت جو میرے پاس محفوظ ہے' آکر حاصل کر لو گے۔''

امانت لینے والا آگیا تھا لہٰذا مستقبل میں دیر کی گنجائش نہیں تھی' دوسرے ہی دن حضرت عثمان انہیں لے کر بغداد میں مسجد جنید پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں اولیائے کرام موجود تھے۔ گویا

رسم بیعت کی ادائیگی کا وقت آ گیا تھا۔

''معین الدینؒ تازہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرو۔''

حضرت خواجہ عثمان ہرونی نے حکم دیا۔

جب آپ حکم کی تعمیل کر چکے تو فرمایا ''قبلہ رو بیٹھ کر سورۂ بقرہ پڑھو۔''

آپ نے تلاوت شروع کر دی جب سورۂ بقرہ پڑھ چکے تو حکم ہوا ''اکیس مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔'' جب وہ اس مرحلے سے گزر گئے تو مرشد نے ان کا ہاتھ پکڑا ''آؤ میں تمہیں اللہ ذوالجلال تک پہنچا دوں۔'' اور پھر اپنے دست مبارک سے حضرت معین الدینؒ کے سر پر کلاہِ چہار ترک رکھی اور فرمایا ''بیٹھ جاؤ۔''

جب آپ بیٹھ گئے تو مرشد نے فرمایا ''ہمارے سلسلے (چشتیہ) میں ایک دن رات کا مجاہدہ ہے لہٰذا آج کا دن اور رات ذکر و عبادت میں گزارو۔''

یہاں کیا دیر تھی۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ آپ گوشہ تنہائی میں چلے گئے اور ذکر و اذکار میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے دن حسبِ ارشاد آپ مرشد کی خدمت میں پہنچے اور دوزانو بیٹھ گئے۔

''اوپر دیکھو اور بتاؤ کہاں تک نظر جاتی ہے۔''

''سرکار عرش اعظم تک۔''

''اب زین کی طرف دیکھو اور بتاؤ کہاں تک نظر جاتی ہے۔''

''سرکار تحت الثریٰ تک۔''

حضرت خواجہ عثمان کا تصوف اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ جو کچھ دکھانا چاہ رہے تھے دکھائی دے رہا تھا۔ حضرت معین الدینؒ کے لیے یہ نظارے عجائبات سے کم نہیں تھے لیکن ابھی تو اور بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔

''ایک ہزار مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھو۔'' مرشد کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

جب یہ عمل پورا ہوا تو مرشد نے فرمایا ''پھر آسمان کی طرف دیکھو۔''

آپ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کانوں سے آواز ٹکرائی ''کہاں تک دیکھ سکتے ہو؟''

''حجابِ عظمت تک'' حضرت معین الدینؒ نے بے خودی میں جواب دیا۔

''اب اپنی آنکھیں بند کرو۔''

آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد تعمیل حکم میں آنکھیں کھولیں تو مرشد نے اپنی دو انگلیاں آپ کے سامنے کیں۔

''کیا دیکھتے ہو؟''

''یا حضرت! اٹھارہ ہزار عالم دو انگلیوں کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔''

''بس معین الدینؒ، تمہارا کام پورا ہو گیا۔'' مرشد نے فرمایا ''اب کچھ عرصہ ہمارے پاس رہو۔''

ہرون میں عبادت کے لیے آپ کو علیحدہ کمرا دے دیا گیا اور کچھ وظائف دے دیئے گئے۔ حضرت معین الدینؒ سلوک کی پہلی منزل پر قدم رکھ چکے تھے۔ عرش اعظم، حجاب عظمت اور تحت الثریٰ کا مشاہدہ کر چکے تھے لیکن ہاتفِ غیبی مسلسل صدا دے رہا تھا۔

ابھی تو اور بہت آسمان دیکھنے ہیں
یہ آسمان یہ پہلی اڑان کچھ بھی نہیں

عزلت نشینی کا یہ عرصہ ڈھائی سال تک پھیل گیا۔ آپ کے کمرے سے اللہ اللہ کی روح پرور آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ان کی دنیا ایک کمرے میں سمٹ گئی تھی۔ خدا جانے کیسے کیسے اسرار کھلے۔ راز و نیاز کی کیسی کیسی باتیں ہوئیں۔

ایک دن مرشد کا حکم پہنچا اور آپ گوشہ نشینی سے باہر آ گئے۔ ''معین الدینؒ اب کچھ وقت میرے ساتھ گزارا کرو۔'' آپ نے ادب سے سر جھکا دیا۔

سماع کی محفلیں سجتی تھیں۔ علم و عرفان و ذکر کی مجالس بھی برپا ہوتی تھیں۔ غرض مند دیوانے، محبت کے پیاسے، صراط مستقیم کے متلاشی بھی درِ اقدس پر دستک دیتے تھے۔ حضرت معین الدینؒ ان محفلوں کا خاموشی سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ تھا۔

جب یہ تربیت بھی مکمل ہوئی تو ارشادِ مرشد ہوا ''بیٹا معین الدینؒ دنیا تجربہ گاہ ہے۔ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ سیاحت سے انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے ان کا کتب میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے لازم ہے کہ تم حجرے کی دنیا سے نکل کر دنیا کی وسعتوں میں گشت کرو اور جب مشاہدات سے دامن بھر جائے تو لوٹ آنا۔''

حضرت معین الدینؒ کے دل پر کسی نے چھریاں چلا دیں سمجھ گئے کہ فراق کی گھڑیاں نزدیک ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

''یا مرشد! میری تمنا ہے کہ تاحیات آپ کے قدموں میں پڑا رہوں۔''

''گھبراؤ نہیں۔ انشاء اللہ ہر مقام پر تم ہمیں اپنے ساتھ پاؤ گے۔''

''آپ بہتر سمجھتے ہیں۔'' کہنے کو تو آپ نے کہہ دیا اور اٹھ کر اپنے حجرے میں آ گئے لیکن فراق کے انگاروں پر آنسوؤں کی وہ بارش ہوئی کہ رخسار مبارک بھیگ گئے۔ نفی ذات کی یہی تو وہ تعلیم تھی۔ جس سے ان کا مرشد انہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اب اپنی نہیں مرشد کی رضا پر راضی ہونا تھا۔

خانقاہ سے باہر نکلے تو جدائی کے احساس سے ایک مرتبہ پھر آنکھیں نم ہو گئیں۔ بڑی دیر تک درودیوار کو تکتے رہے اور پھر ایک طرف کو چل دیئے۔ ایک مرتبہ پھر کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر درپیش تھا۔ مرشد کی دعاؤں کے سوا کچھ ساتھ نہ تھا۔ نہ زادِ راہ نہ ساتھی قدم خود بخود سفر کر رہے تھے شہر کب کا پیچھے رہ گیا تھا آگے ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد آپ ایک پہاڑی مقام پر پہنچے۔ دور کچھ فاصلے پر آبادی کے آثار نظر آئے۔ آپ کے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔ دھول اڑاتا ایک اونٹنی سوار چلا آ رہا تھا۔ آپ راستے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی وہ سوار قریب آیا آپ نے بلند آواز میں پوچھا۔

''سامنے کون سا قصبہ ہے؟''

''یہ سنجار ہے۔'' سوار نے جواب دیا اور دوسری سڑک پر ہولیا۔

آفتاب شفق کی سرخی سے وضو کر رہا تھا مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ آپ نے قدموں کی رفتار بڑھا دی تاکہ بستی میں پہنچ کر کسی مسجد کو تلاش کر سکیں۔

بستی میں داخل ہوتے ہی اذان کی آواز نے آپ کو اپنی طرف بلالیا۔ ''اللہ بہت بڑا ہے'' مسجد کے مینار آپ کے استقبال کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ جماعت تیار تھی۔ آپ بھی شامل ہو گئے۔

نماز سے فراغت کے بعد آپ مسجد ہی میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اب آپ کو یہ طے کرنا تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ اجنبی چہرہ مسافر ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ لوگ آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔

''کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' کئی آوازیں ایک ساتھ جواب طلب ہوئیں۔

''ہرون سے'' آپ نے فرمایا۔

''حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے قصبے سے؟'' خوشی اور حیرت کی کئی آوازیں فضا میں ابھریں۔

''آپ کی ان سے ملاقات تو رہی ہو گی۔''

''وہ میرے پیر و مرشد ہیں۔''

''آپ ان کے مرید ہیں؟ کیا نام ہے آپ کا۔''

''معین الدینؒ''۔

یہ سننا تھا کہ لوگ آپ کے گرد مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ عثمان ہرونی کا مرید اور ان کے قصبے میں۔ یہ تو برکتوں کے نزول کی گھڑی ہے۔ مرید کبھی اکیلا نہیں ہوتا اس کا مرشد ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا عثمان ہرونی بھی یہیں تشریف فرما ہیں۔

''سنجار میں کوئی آپ کا شناسا ہے؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

''نہیں''

''آج آپ میرے مہمان ہیں۔ تشریف رکھیں میں کھانا لے کر آتا ہوں۔''

''کیوں تکلیف کرتے ہو بھائی، مسافر ہوں کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔''

''کھانے کی ضرورت تو وہاں بھی پڑے گی۔ پھر اس خدمت کا موقع مجھے کیوں نہیں دیتے۔ آپ مسافر بھی ہیں اور اتنی بڑی ہستی کے مرید بھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خدمت کا یہ موقع ہاتھ سے نکال دوں۔''

آپ نے اس شخص کے اصرار کی لاج رکھی۔ وہ شخص بھاگا ہوا گیا اور کھانا لے آیا۔ جب آپ کھانا تناول فرما چکے اور چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ شخص ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''حضرت شیخ نجم الدین آج کل اسی قصبے میں مقیم ہیں۔ ولی کامل ہیں۔ میرا تو مشورہ یہ ہے کہ آپ جب یہاں آ ہی گئے ہیں تو ان کی زیارت کئے بغیر نہ جائیں۔''

''یہ تم نے خوب کہی' اولیا اللہ کی صحبت تو میرا اشغل کبریٰ ہے اب میں ان سے ملاقات کیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔''

''آج رات مجھے اپنی خدمت میں رہنے دیں۔ حقِ میزبانی ادا کرنے دیں۔ صبح تشریف لے جائیں۔''

''بھائی جیسی تمہاری مرضی۔''

عشا کی نماز کے بعد سنجار کے بہت سے مردانِ صالح آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ باتوں میں رات کٹنے لگی۔ موضوع گفتگو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کی ذات والا صفات تھی۔ ان کے بارے میں جو جتنا جانتا تھا بیان کر رہا تھا۔ آپ کی

خط بنام حضرت قطب الدین کاکیؒ

اللہ الصمد کے اسرار سے واقف' لم یلد ولم یولد کے انوار کے ماہر میرے بھائی قطب الدین

فقیر پر تقصیر معین الدین سنجریؒ کی طرف سے خوشی و خرمی آمیز اور انس و محبت بھرا سلام پہنچے۔

بھائی میرے شیخ حضرت خواجہ عثمانی ہرونیؒ فرماتے ہیں سوائے اہلِ معرفت کے کسی اور کو عشق کے رموزات سے واقف نہیں کرنا چاہیے..... مال و مرتبہ بڑے بھاری بت ہیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو سیدھی راہ سے گمراہ کیا اور کر رہے ہیں۔ پس جس نے جاہ و مال کی محبت کو دل سے نکال دیا اس نے گویا پوری نفی کر دی اور جسے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گئی اس نے پورا پورا اثبات کر لیا۔

فقیر معین الدین چشتی سنجریؒ

تربیت کے نئے دروازے کھل گئے، شب و روز عبادت میں گزرنے لگے' واعظ تلقین کی محفلیں سجتیں۔ حضرت نجم الدین لب کشائی فرماتے علم و حکمت کے موتی برستے، حضرت معین الدینؒ جلدی جلدی ان موتیوں سے اپنا دامن بھر رہے تھے کہ نہ جانے کب یہ بارش تھم جائے کب اذنِ سفر ہو اور یہاں سے جانا پڑ جائے۔

آخر یہ مرحلہ ایک دن آ ہی گیا۔ ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ شیخ نجم الدین نے آپ کو خلوت میں طلب فرمایا ''معین الدینؒ عنقریب ہم اس جگہ کو چھوڑنے والے ہیں۔ بہتر ہے اب تم جاؤ۔ ابھی کئی مراحل طے کرنے کے لیے تمہارے سامنے ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر وہی صورتِ حال سامنے تھی جو ہرون سے چلتے وقت ہوئی تھی' کہاں جانا ہے؟ یہ اس وقت بھی معلوم نہیں تھا اور اب بھی کچھ طے نہیں ہوا تھا انہوں نے منزل کا تعین عالم غیب کے سپرد کیا اور کسی انجانے راستے پر قدم رکھ دیا۔

دشت لے جائے کہ گھر لے جائے
تیری آواز جدھر لے جائے

کئی دنوں کے سفر کے بعد آپ نے اپنے آپ کو کوہ جودی کے دامن میں واقع قصبہ ''جیل'' ''یا'' ''جیال'' (یا جیلان) میں پایا۔ اسی قصبے کی نسبت سے حضرت عبدالقادرؒ کو جیلانی کہا جانے لگا۔ یہی وہ پہاڑ (جودی) تھا جس پر

حضرت نوحؑ کی کشتی آکر رکی تھی۔ اس پہاڑ کو دیکھتے ہی عبرت کے کئی مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

''یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں رات بسر کی جاسکے؟'' انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

''یہاں تو غوثِ وقت، محبوب سبحانی قیام رکھتے ہیں پھر آپ کو کیا فکر ہے۔ ان کی مہمانی کے مزے لوٹئے۔'' راہ گیر نے جواب دیا۔

''کیا اسمِ گرامی ہے ان بزرگ کا؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''حضرت عبدالقادر جیلانیؒ۔''

اس نام نے ایسا اثر کیا کہ لہو جوش مارنے لگا۔ چہرہ گلاب ہوگیا۔ پورے وجود میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ شخص تو میرے ماموں جان کا پتا تا رہا ہے۔ کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جب بتاؤں گا کہ میں ماہ نور کا بیٹا ہوں تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ ماں کا خیال آتے ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اماں جان کی زندگی میں کبھی ماموں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ملاقات کا وقت آیا تو اماں اس دنیا میں نہیں۔

انہوں نے راہ گیر سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آستانے کا پتا دریافت کیا اور وہاں پہنچ گئے۔ آستانے پر لوگوں کا ہجوم تھا، حضرت عبدالقادرؒ واعظ و نصیحت فرما رہے تھے۔ آپ بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گئے۔

جب بیان ختم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پیرانِ پیر کے پاس پہنچ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئے۔ پیرانِ پیر نے سمجھا ہوگا کوئی مظلوم دکھیارا جو اپنی کوئی غرض لے کر آیا ہے۔ آپ کی پشت پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

''حضرت مجھ ناتواں کو معین الدینؒ حسن سنجری کہتے ہیں، میرے والد غیاث الدینؒ حسن تھے، حضرت عثمان ہرونی کا مرید ہوں۔''

یہ سنتے ہی حضرت عبدالقادر کی بھی وہی حالت ہوئی جس خوشی سے حضرت معین الدینؒ کچھ دیر پہلے دوچار ہوئے تھے۔

''تم ہماری بہن کے لختِ جگر ہو؟''

''جی ماموں جان۔''

حضرت عبدالقادر نے انہیں سینے سے لگایا ''اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم تو میری مرحوم بہن کی نشانی ہو۔''

''حضرت مجھے تو سیر و سیاحت کا حکم ہوا ہے۔''

''ہم جانتے ہیں لیکن کچھ عرصہ تو ہمارے پاس رہو۔''

''ماموں جان اس میں مضائقہ نہیں۔''

اس در کی درباری کی شان ہی نرالی تھی۔ پہلے ہی دن محفل واعظ منعقد ہوئی تو پچاس کے قریب مشائخ وقت حاضر تھے۔ فیوض و برکات کی ایسی بارش ہوئی کہ معین الدینؒ سر سے پاؤں تک بارش نور میں بھیگ گئے۔

یہ محفلیں روز کا معمول تھیں۔ خواجہ معین الدینؒ ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ حقیقت و معرفت کی چابیاں ایک ایک کر کے آپ کے ہاتھ میں آتی رہیں۔ غوث الثقلین کی محفل میں آنے والے بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ وہ اس خزانے سے فیض یاب ہوتے رہے۔

ایک دن نورانی محفل برپا تھی۔ حضرت غوث اعظم نے خواجہ معین الدینؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ''یہ مرد مقتدائے مشائخ زمانہ ہوگا۔ بہت سے لوگ اس کے ذریعے منزلِ کمالات تک پہنچیں گے۔''

اس اشارے سے حضرت معین الدینؒ نے معلوم کرلیا کہ اس در پر ہونے والی تربیت مکمل ہوئی۔ اب انہیں آگے بڑھنا چاہیے۔ آپ کو یہاں رہتے ہوئے پانچ ماہ سات دن ہو چکے تھے کہ انہوں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ حضرت غوث اعظم نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

رخصت کا وقت قریب تھا کہ حضرت غوث اعظم نے آپ کو اپنے قریب بلایا اور سرگوشی میں ایک شغل کی تعلیم دی جسے طریقہ چشتیہ میں شغل سرگوشی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آپ نے اس ''شغل سرگوشی'' کو لوحِ قلب پر نقش کیا اور جیلان سے روانہ ہوگئے۔ جیلان سے بغداد سات دن کی مسافت پر تھا۔ اب ان کا رخ اس طرف تھا جہاں کئی انبیائے کرام اور اولیا اللہ کے مزاراتِ مقدسہ تھے۔ راستے میں کئی مقامات پر رکتے ہوئے عروس البلاد بغداد میں داخل ہوگئے۔

بغداد کی زمین پر قدم رکھتے ہی آپ کو مشفق باپ کی یاد آگئی۔ انہیں معلوم تھا کہ حضرت غیاث الدین کو بغداد ہی میں دفن کردیا گیا تھا لیکن کہاں دفن ہیں یہ معلوم نہیں تھا۔ یہ معلوم کرنا دشوار نہیں تھا۔ بغداد کے ہر شہری کو معلوم تھا کہ غیاث الدینؒ نوری کا مزار کہاں ہے۔

آپ مزار پر پہنچے تو کچھ لوگ کھڑے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ بچپن کے کئی واقعات تصویر بن کر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے وہ زمانہ یاد آیا جب وہ باپ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے نیشاپور آئے تھے۔ پھر نیشاپور میں ہونے والی خوں ریزی

لاشوں کے سامنے گھوم گئی۔ مہربان ماں کی یاد آگئی، بھائیوں اور بہنوں کی صورتیں سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زباں پر آیاتِ قرآنی جاری تھیں۔ اور پھر بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ بڑی دیر تک دعا کو ہاتھ اٹھے رہے۔ پھر قدم بوسی کی اور احاطۂ مزار سے باہر نکل آئے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوسکی کہ ابھی جو شخص باہر نکلا ہے صاحبِ مزار کا بیٹا ہے۔

بادلوں کی دھوپ چھاؤں ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ تھکن کا احساس اچانک بڑھ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد یادوں کے اس دائرے سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف کو چل دیئے۔ کچھ دور چل کر اچانک قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ وہ رک کر کھڑے ہوگئے اور حیران تھے کہ ہمت نے جواب کیوں دے دیا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک خانقاہ دکھائی دی۔ آپ دل ہی دل میں مسکرائے، ٹھیک ہے حضرت ..... بلانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ آپ اس خانقاہ کی جانب چل پڑے۔ یہ حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی کا مرکز تھا۔ بارہ واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا کر ملتا تھا۔ علومِ ظاہری و باطنی میں باکمال تھے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کسی انجانی ڈوری میں بندھے خانقاہ تک پہنچ گئے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، شیخ ابوالنجیب کی آنکھوں نے دروازے کا طواف کیا۔

''آؤ بیٹا! ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔''

''آپ کی کشش ہی تو مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''اب آ ہی گئے ہو تو کچھ عرصہ ہمارے پاس رہو گے۔''

''تابِ انکار کس کو ہے۔''

حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی نے خادم کو طلب کیا اور حضرت معین الدینؒ کی رہائش کے انتظام کا حکم دیا۔ بزرگ کی صحبت سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن شیخ کے اصرار پر کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے آپ کو حجرے میں جانا پڑا۔

حضرت شیخ ابوالنجیب تصوف کے سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ خواجہ معین الدینؒ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ لیکن شاید قدرت کا تقاضا تھا کہ وہ دریائے تصوف کی اس لہر سے بھی واقف ہو جائیں۔ اسی لیے قدرت آپ کو یہاں لے آئی تھی۔

صوفیوں کی ایک جماعت خانقاہ میں داخل ہوئی۔ خاطر مدارات کے بعد محفل منعقد ہوئی۔ خواجہ معین الدینؒ کو بھی طلب کیا گیا۔ شیخ ابوالنجیبؒ نے آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ اس وقت صوفیا کے اخلاق کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ ابوالنجیب فرما رہے تھے۔

''تصوف تمام تر اخلاق ہی کا نام ہے۔ جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہوگا اس کا تصوف زیادہ ہوگا۔'' اس کے بعد فرمایا ''صوفیوں کے اخلاق میں حلم، تواضع، نصیحت، شفقت، برداشت، موافقت، احسان، مدارات، ایثار، خدمت، الفت، بشاشت، فتوت، کرم، بذل جاہ، مروّت، تلطف، طلاقت، سکون، وقار اور جو اس کے ساتھ زیادتی کرے اس کے لیے دعا کرنا۔ جو ان کی تعریف کرے ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا۔ اپنے نفس کو چھوٹا سمجھنا۔ بھائیوں کی توقیر کرنا۔ مشائخ کی تعظیم کرنا۔ چھوٹوں بڑوں پر ترحم کرنا۔ جو کچھ کسی کو دے، اگرچہ بہت ہو، اس کو کم سمجھنا اور جو کچھ کسی سے لے، اگرچہ وہ کم ہو، اس کو زیادہ جاننا' یہ سب باتیں داخل ہیں۔''

شیخ ابوالنجیب کے دہنِ مبارک سے پھول جھڑ رہے تھے۔ محفل میں ہر شخص اپنی ذات کا احتساب کر رہا تھا کہ اس کے اندر ان میں سے کتنے اوصاف ہیں، خواجہ معین الدینؒ متبسم تھے کہ تربیت کے اس گوشے کی تکمیل کے لیے انہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔

ان پر یہ عقدہ جلد ہی کھل گیا کہ یہ خانقاہ تربیت کے کسی ایک پہلو تک ہی محدود نہیں ہے۔ حضرت شیخ ابوالنجیب کی محفل میں علما، ہدایت کے طالب، بزرگ اور علم دین کے متلاشی ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ کبھی فقر و غنا پر گفتگو ہوتی، کبھی سخاوت و عطا کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ کبھی تصوف کے طبقات کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ خواجہ معین الدینؒ ان نورانی محفلوں کی جان بنے ہوئے تھے۔ ایک ایک حرف کو اپنے سینے میں اتار رہے تھے۔

خواجہ معین الدینؒ خانقاہ سہروردیہ کی ان محفلوں تک محدود نہیں تھے۔ یہ کبھی جامع مسجد میں جا نکلتے، کبھی مزاروں کی زیارت کرتے، کبھی دریا کی سیر کو نکل جاتے۔ درویشوں کی کمی نہیں تھی۔ نصیحت کے پھول جہاں ملتے، چن لیتے۔

ایک روز خانقاہ سہروردیہ میں انسانی اعضا کے ادب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ ابوالنجیب آنکھوں، قلب، زبان اور دیگر اعضاء کے آداب کے بارے میں رطب اللسان تھے۔

''قلب کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمانوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھے۔''

''ہاتھ کا ادب یہ ہے کہ بذل و احسان اور بھائیوں کی خدمت کرے اور اپنے ہاتھوں سے معصیت کا کوئی کام نہ

کرے۔"

"آنکھ کا ادب یہ ہے کہ حرام چیزوں کو، لوگوں اور اپنے بھائیوں کے عیوب و منکرات و محرمات دیکھنے سے آنکھ بند کرے۔"

ماحول پُراسرار خاموشی کی گرفت میں تھا۔ حضرت معین الدینؒ بھی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، اچانک ان کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ اب یہاں سے رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔

اسی خیال نے حضرت شیخ ابوالنجیب کے دروازۂ دل پر بھی دستک دی تھی۔ آپ نے حاضرین کو جانے کا اشارہ کیا اور لوگ ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ خواجہ معین الدینؒ بھی اپنی جگہ سے اٹھے۔ حضرت شیخ نے چشم ابرو سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تمام لوگ اٹھ کر جا چکے تھے۔ خانقاہ میں پُراسرار خاموشی پیہم ادے رہی تھی۔ دو ہستیاں موجود تھیں اور دونوں خاموش تھیں۔ آخر شیخ ابوالنجیب نے اس خاموشی کو توڑا۔

"معین الدینؒ! ہم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ تمہیں ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔"

حضرت خواجہ سنجری کو اپنے کشف کی صداقت پر یقین آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ رخصت کا وقت قریب ہے۔ اسی لیے حضرت شیخ یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم نے اپنا حق ادا کر دیا۔"

"یا شیخ! آپ کی دعا کی برکت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

حضرت شیخ ابوالنجیب نے محبت سے آپ کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور دعائے خیر کی۔ عجیب سماں تھا۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

☆☆☆

سورج کی تمازت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خواجہ معین الدینؒ نے کندھے پر پڑے ہوئے بڑے رومال کو سر پر لپیٹ لیا تھا۔ لبوں پر ذکر جاری تھا اور قدم تیزی سے کسی نامعلوم منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انہیں جانا کہاں ہے۔ دور تک صحرا تھا، سناٹا تھا۔ نہ کوئی زادِ راہ تھا نہ کوئی ساتھی ساتھ تھا۔ آپ چلتے رہے، جہاں رات پڑ جاتی رک جاتے۔ جو مل جاتا شکر کر کے کھا لیتے۔ آخر کار آپ بصرہ پہنچ گئے۔

بصرہ میں چند روز قیام کے بعد پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ تجربات و مشاہدات سمیٹتے ہوئے آپ ملک شام کے قریب ایک شہر میں پہنچ گئے ابھی شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ شہر سے باہر ایک غار نے آپ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ آپ نے غار کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نورانی بزرگ تشریف فرما نظر آئے۔ اشتیاقِ ملاقات میں قدم مبارک غار کے اندر رکھا ہی تھا کہ دو شیر کھڑے دکھائی دیے آپ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

"اندر آ جاؤ، درویش۔" بزرگ کی آواز گونجی۔

حضرت خواجہ اندر تشریف لے گئے اور ادب سے سلام کر کے بیٹھ گئے۔ بزرگ کی آواز پھر گونجی۔ "جب تیرے دل میں خوفِ خدا ہوگا سب تجھ سے ڈریں گے۔ شیر کی کیا حقیقت ہے۔"

"میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں۔ آپ کے نام تک سے واقف نہیں۔"

"میرا نام شیخ اوحد محمد الواحد غزنوی ہے۔"

"آپ اس غار میں کب سے ہیں؟"

"سنو! مجھے اس غار میں رہتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ تمام خلقت سے گوشہ نشینی اختیار کی ہے لیکن تین سال سے ایک سبب سے رو رہا ہوں۔"

"حضرت وہ کیا؟"

"جب میں نماز ادا کرتا ہوں تو اپنے آپ کو دیکھ کر روتا ہوں کہ اگر ذرہ بھر بھی شرطِ نماز ادا نہ ہوئی تو سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ اسی وقت یہ طاعت میرے منہ پر دے ماریں گے۔"

حضرت شیخ اس وقت بھی رو رہے تھے۔ خواجہ معین الدینؒ نے آپ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر سکوت رہا پھر حضرت شیخ نے خود ہی سکوت توڑا۔

"میرے بدن پر جو ہڈیاں اور چمڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسی کے سبب سے ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھ سے نماز کا حق ادا بھی ہوا یا نہیں۔"

بات ختم کرنے کے بعد ایک سیب الٹھایا اور خواجہ معین الدینؒ کو عطا کر کے سر جھکا لیا۔ شاید نماز کی تلقین کے سوا ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ خواجہ معین سوچ رہے تھے "نماز اس طرح بھی پڑھتے ہیں جوان بزرگ کا طریقہ ہے۔ کیا غار اور پتھر بھی میری تربیت پر مامور کر دیئے گئے ہیں؟"

فضا میں باتیں کرتی ہوئی خاموشی طاری تھی۔ شیروں کے سانس لینے کی آوازوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ نے بھی اس کے بعد کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا اجازت طلب کی۔

وہ غار سے باہر نکلے تو ابھی کافی دن پڑا تھا دوپہر کو زور پڑ

رہی تھی۔ ابھی ایک منزل اور سفر کیا جا سکتا تھا۔ ڈھالنے لگے۔ بالآخر شہر خوباں میں پہنچے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کس راہ چلیں، آواز آئی "معین الدینؒ اس طرف۔"

آپ نے شوق کی سواری کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ہوش آیا تو ایک مزار مبارک سامنے تھا۔ یہ مزار شاہِ تصوف حضرت ابو الحسن خرقانیؒ کی آرام گاہ تھا۔

مزار پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ کوئی قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھا۔ کسی کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آنسوؤں کے نذرانے پیش کر رہا تھا۔ آپ نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ طویل دعا کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے۔ اللہ والوں کی شان ہی نرالی ہے زندگی بھر رشد و ہدایت فرماتے ہیں اور جب مزار میں آسودۂ خواب ہوتے ہیں تو فیض کا لنگر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے خیال دل میں آئے اور چلے گئے۔

مزار والے نے ایسے قدم پکڑے کہ آپ اٹھنا بھول گئے۔ کسی مزار کے بارے میں سنتے تو وہاں پہنچ جاتے۔ کسی بزرگ کے علم و فضل کا شہرہ سنتے تو اس کی مجلس میں جا بیٹھتے۔ اس شہر اور گرد و نواح کی برکتیں سمیٹتے سمیٹتے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ خزانے میں اتنے موتی تھے کہ انتخاب کرنا مشکل تھا، جوش و برکات کی ایسی بہتات ہوئی کہ خود خزینہ دار بن گئے۔

جب کوئی شخص دورانِ سفر خوب مال اکٹھا کر لیتا ہے تو اسے گھر والے یاد آتے ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ انہیں بھی اپنے روحانی وطن "چشت" کی یاد آئی۔ آپ سلسلۂ چشتیہ سے بیعت تھے اور چشت سلسلہ چشتیہ کا مرکز تھا۔

ایران و افغانستان کی سرحد پر ہرات کے مضافات میں واقع علاقہ چشت، سلسلہ چشتیہ کے عظیم روحانی پیشواؤں کے مزارات کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

چشت کا خیال آتے ہی خواجہ سنجری کو اپنے روحانی اکابرین کی خدمات یاد آ گئیں۔ ان بزرگوں نے کفر کی ظلمت میں دینِ حنیف کے چراغ روشن کیے تھے۔ ایک روحانی کشش تھی جو آپ کو جانبِ چشت کھینچ رہی تھی۔ حضرت مودود چشتیؒ کا مزار اپنی طرف بلا رہا تھا۔ خواجہ ابو یوسف چشتیؒ کی قبر مبارک اپنی جانب بلا رہی تھی۔ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ کی زیارت گاہ انہیں اپنی طرف آنے کا بلاوا دے رہی تھی۔ اتنی کششوں کے درمیان وہ تیزی سے چشت کی طرف جا رہے تھے۔ دل چاہتا تھا زمین کی چادر سمٹ جائے اور وہ سر کے بل چلتے ہوئے چشت پہنچ جائیں۔

شدتِ شوق نے پھر فاصلے طے کرنے شروع کر دیئے۔ راستے لگے سمرا باغ بن گئے۔ پہاڑ، میدانوں کا روپ

راستے بھر وہ اپنے اکابرین کی حیات ہائے مبارک کے زریں واقعات دل ہی دل میں دہراتے رہے۔ دشوار ترین راہ آسان ہوگئی پتھر پھول بن گئے' گھاٹیاں' وادیاں' پہاڑ جنگل' صحرا استقبال کے لیے آنکھیں بچھاتے رہے۔

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

خیالات نے فرصت دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چشت کے در و دیوار دکھائی دیے۔ دل نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ آنکھوں نے سلام پیش کیا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس راہ میں پاؤں رکھیں یا سر۔

احتیاط لازم تھی۔ ادب کا مقام تھا' پہلے کس بزرگ کے مزار پر حاضری دی جائے۔ ایک معروف شاہراہ پر کھڑے اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک خیال آیا۔ مرشد نا حضرت عثمان ہرونی کے مرشد حضرت خواجہ شریف زندنی تھے اور ان کے مرشد حضرت خواجہ مودود چشتی' لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے کہ پہلے خواجہ مودود چشتی کے مزار پر حاضری دی جائے۔ آپ نے ایک راہ گیر سے مزار کا پتا دریافت کیا اور مجسم ادب بنے اس راہ پر ہولیے۔

مزارِ پاک پر کھڑے بہت سے لوگ دعا مانگ رہے تھے۔ وہ بھی اپنے عالم کو دنیا سے چھپائے دعا مانگنے لگے۔

جس گلی سے سبھی بادیدہ تم گزرے ہیں
اپنے عالم کو چھپائے ہوئے ہم گزرے ہیں

دعا سے فارغ ہوئے تو سجادہ نشیں حضرت احمد بن مودود چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں اس طرح گلے لگے جیسے بچھڑے ہوئے بھائی برسوں بعد ملتے ہیں۔ روح نے روح کو پہچان لیا تھا۔ صاحب سجادہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنے والا حضرت عثمان ہرونی کا مرید خاص ہے تو روح میں بالیدگی آگئی۔ ''تم کوئی غیر تو ہو نہیں۔ اسی گھرانے کے فرد ہو۔ اب کہاں جاؤ گے یہیں رہو۔'' فوراً قیام کا بندوبست فرمایا۔

آپ نے اپنے حجرے میں جا کر آرام کی غرض سے کمر ٹیکی ہی تھی کہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی آغوش میں سر رکھ دیا ہو۔ اپنائیت کا ایسا احساس ہوا جیسے اپنوں میں آگئے ہوں۔ یہ ان کا گھر ہی تو تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سماع کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ ایسی دلسوز آواز تھی کہ آپ اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا چند درویش آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے سماع کا بندوبست کیا گیا ہے۔ وہ محفل میں پہنچے تو قوال عاشقانہ اشعار پڑھ رہے تھے اور درویش مجذوب رقص تھے۔

یہ چشت تھا' چشتیوں کا مرکز۔ سماع کی محفلیں جگہ جگہ سجی تھیں۔ قدم قدم پر بزرگوں کے مزارات تھے۔ آپ ان مزارات پر تشریف لے جاتے اور کئی کئی دن قیام فرماتے۔ راتوں کو عبادت میں مصروف رہتے یا سماع کی کسی محفل میں تشریف لے جاتے۔

ان مشاغل میں دو سال گزر گئے۔ بزرگانِ چشت نے جھولیاں بھر بھر کے فیوض و برکات آپ پر نچھاور کیے لیکن مرشد کا حکم تھا کہ سیر و سیاحت میں دن گزار دو۔ کسی ایک جگہ کا ہو جانا آپ کی تربیت میں شامل نہیں تھا لہٰذا ایک روز حضرت احمد بن مودود چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رخصتی کی اجازت طلب کی۔

''تم سے جدا ہونے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن ابھی سلوک کی بڑی منزلیں پڑی ہیں جو تمہیں طے کرنی ہیں۔ اس لیے روکوں گا نہیں۔'' حضرت احمد نے کہا اور سینے سے لگا کر رخصت کیا۔

سفر پھر شروع ہوگیا۔ مختلف آبادیوں سے گزرتے ہوئے بخارا میں قدم رکھا۔ یہ ان کے لیے اجنبی شہر نہیں تھا۔ طالب علمی کے کئی سال یہاں گزارے تھے۔ یہاں کے گلی کوچے' مکتبوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ کئی استاذہ یاد آئے۔

آپ سیدھے اپنے استادِ محترم حضرت شیخ حسام الدین کی خدمت میں پہنچے۔ ہونہار شاگرد نے عروج کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ دیکھا تو آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکنے لگے۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور مدرسے میں رہنے کا بندوبست کردیا۔

بخارا سے رختِ سفر باندھا تو سمرقند پہنچے۔ اس شہر میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ شہر بھی اتالیق کے ماضی کے یادوں کا حصہ تھا۔ آپ کے استاد مولانا شرف الدین اب بھی سمرقند میں مقیم تھے۔ گلیاں اور محلے آشنا تھے۔ راستے دیکھے بھالے تھے۔ بازاروں سے گزرتے ہوئے گلیوں کے چکر کاٹتے ہوئے آپ مولانا شرف الدین کے سامنے جا کھڑے ہوئے، مولانا نے ایک نظر آپ پر ڈالی اور جب پہچان لیا تو آگے بڑھ کے گلے سے لگالیا۔

خواجہ معین الدین کا ارادہ یہ تھا کہ سمرقند سے فوراً نکل جائیں گے لیکن استاد نے کسی قیمت پر جانے نہیں دیا۔ انہیں مجبوراً قیام کرنا پڑا، البتہ دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

سمرقند میں چند دن تو آرام سے گزر گئے پھر ایک انجانی سی بے چینی محسوس ہونے لگی، ایک رات کچھ دیر کے لیے کمر لگی تھی کہ خیال نے پرواز کی۔ مرشد نا حضرت عثمان ہرونی کی محفل سجی ہوگی، مشائخ و اولیا موجود ہیں۔ مرشد فرما رہے ہیں سب تو ہیں، ہمارا معین کہاں ہے۔ مرشد کے یاد جانے کے لیے دل تڑپنے لگا۔ گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلے آسمان کی طرف دیکھا' آسمان کا نیلا شامیانہ ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ستارے انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جدائی کا احساس فزوں تر ہوگیا۔ آتشِ فراق سے دل جلنے لگا، کبھی سوچتے تھے کسی کو بتائے بغیر مرشد کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ کبھی خیال آتا تھا بغیر اجازت کیسے پہنچ جاؤں۔ اس کشمکش کے بغیر پہنچ گیا تو مرشد خفا نہ ہو جائیں۔ ابھی وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ صبح کی اذان ہونے لگی۔

نماز کے بعد بھی خیالوں نے ساتھ نہ چھوڑا۔ فراغت ملی تو مرشد کی یاد نے پھر گھیر لیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یادوں کے [illegible] ایسا بے کل نہیں کیا تھا۔ وہ اس یاد آوری کو بھی کسی [illegible] حصہ سمجھ رہے تھے۔ مرشد سے ملنے کی آرزو میں [illegible] کی مرضی شامل نہ ہو کہیں وہ مجھے بلا تو نہیں رہے ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ساری زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ وہ رکے نہیں اور میں نہ جاؤں۔ وہ فوراً مولانا شرف الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو جانے کا کہہ رہے ہو۔'' استاد نے محبت سے مجبور ہو کر روکنا چاہا۔

''مرشد سے ملاقات کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔''

اس جواز کے بعد استاد کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ اجازت ملنی ہی پڑی، اسی وقت اٹھ کر چل دیے۔ مرشد حضرت عثمان ہرونی ان دنوں بغداد میں مقیم تھے لہٰذا آپ بھی سمرقند سے نکلے اور بغداد کے لیے عازمِ سفر ہوگئے۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد جب غبارِ سفر میں اٹے ہوئے مرشد کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا' وہ پیکرِ اشتیاق بنے بیٹھے ہیں اور یوں مسکرا رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ دیکھا کیسے بلالیا اور اسی لیے بلالیا کہ تمہیں اس سیاحت سے جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکے۔ اب تربیت کے کسی دوسرے راستے پر روانہ کیا جائے گا۔

آپ مرشد کے قدموں سے لپٹے ہوئے آنسو بہا رہے تھے اور مرشد تبسم فرما رہے تھے۔ ''معین الدین! روتے کیوں ہو تم نے تو تمام منزلیں سر کرلیں۔''

''حضور اب اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے گا۔''

''اب جس منزل کا ارادہ ہوگا تم ساتھ ہوگے، تمہاری جدائی تو خود ہمیں بھی گوارا نہیں۔''

یہ سننا تھا کہ پورا وجود خوشی کا خزانہ بن گیا۔ مرشد خود مرید کا طالب ہو۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی۔ مرشد کا پہلو مل گیا۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی۔

خدمتِ مرشد میں دن گزرنے لگے۔ عبادتوں کی لذت دو چند ہوگئی۔ ابھی اس لذت کو کشید کرتے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اعلانِ جدائی ہوا۔

''ہمارا ارادہ سفر کا ہے۔'' مرشد نے فرمایا اور تنکھیوں سے مرید خاص کی طرف دیکھا جن کے چہرے کا رنگ اس فرمان کے ساتھ ہی پیلا پڑ گیا تھا۔

''اگر تم ساتھ چلنا چاہتے ہو تو چل سکتے ہو۔'' مرشد نے دوسری سانس میں کہا حضرت خواجہ معین الدینؒ کے چہرے کا رنگ بحال ہوگیا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ مرشد کے ساتھ ہم رکابی کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔

مرشد کو سفر پر جانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ تو مرید کی تربیت کے لیے کیا جا رہا تھا تاکہ مرشد کی معیت میں راہِ عشق پر چلنا آجائے۔

مرید کا یہ حال تھا کہ مرشد نے جس دن سے ارادۂ سفر ظاہر کیا تھا' زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ اس دن کا انتظار ہو رہا تھا جس دن سفر پر نکلا جائے گا۔ آخر وہ دن آگیا۔ حضرت خواجہ عثمان کمرے سے باہر تشریف لائے تو حضرت خواجہ معین الدین کو اس عالم میں کھڑے دیکھا کہ کندھے پر مرشد کا بستر رکھا ہے اور سر پر ایلچی کے اوپر توشہ دان رکھا ہے تاکہ جب مرشد کھانا طلب کریں' وہ گرم کھانا پیش کریں۔

سفر کا آغاز ہوا۔ مرشد آگے ہیں اور مرید پیچھے پیچھے ان کے نقشِ پر چل رہا ہے۔ ہمہ تن متوجہ ہے کہ مرشد اگر کچھ ارشاد فرمائیں تو سننے اور یاد رکھنے میں کوتاہی نہ ہو۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ ایک ایک قدم پر آپ کے دل میں روحانی انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کسی سفر میں ایسا حال نہیں ہوا تھا۔ مرشد اقوال سے نواز رہے ہیں حکایات سنا رہے ہیں علم و معرفت کا سمندر موجزن ہے۔ سفر کیا ہے چلتا پھرتا مکتب ہے۔

اس دور کی قافلے کا رخ مضافاتِ بغداد کی طرف تھا جہاں انہیں اوش نامی شہر میں پہنچنا تھا۔ حضرت عثمان ہرونی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اوش میں بہاء الدین بختیار اوشی کی خانقاہ میں قیام کریں گے۔ چنانچہ اوش پہنچتے ہی اس خانقاہ کا رخ کیا۔ حضرت بہاء الدین نہایت تپاک سے ملے اور دونوں بزرگ گفتگو میں مشغول ہوگئے۔ خواجہ معین الدینؒ کسی شاگرد کی طرح خاموش بیٹھے تھے لیکن گفتگو کا ایک ایک لفظ

کتابِ دل میں محفوظ کرتے جا رہے تھے۔ آپ سمجھ گئے تھے کہ یہ سب باتیں مجھے تعلیم دینے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ انہی اقوال صادق کو انہیں آئندہ عملی زندگی میں بروئے کار لانا ہے۔

اس خانقاہ میں جب تک قیام رہا' باتوں کی بھیڑ لگتی رہی۔ دونوں بزرگ اپنے اپنے تجربات ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ مقصود یہی تھا کہ ساتھ آنے والا شاگرد ان تجربات کو حفظ کر لے۔

اوش کے بعد اگلی منزل بدخشاں تھی۔ یہاں پہنچ کر ایک مسجد میں قیام کیا۔

''تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔ ایک وقت وہ تھا جب میں سلوک کے مراحل طے کرتا ہوا اپنے مرشد کے ساتھ بدخشاں آیا تھا۔ آج میں مرشد ہوں اور تم میرے ساتھ آئے ہو۔ جن مقامات سے میں گزرا تھا۔ آج تمہیں وہاں سے گزار رہا ہوں۔ چراغ سے چراغ اسی طرح روشن ہوتے ہیں۔''

حضرت عثمان ہرونی نے فرمایا۔

کئی دنوں بعد یہ دونوں بزرگ دمشق پہنچے۔ دمشق اور اس کے مضافات میں ہزاروں کی تعداد میں انبیاء کرام کے مقدس مزارات تھے۔ لاتعداد اولیا اللہ یہاں آسودۂ خواب تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان ہرونی کے مرشد حضرت خواجہ شریف زندنیؒ بھی اس خاک میں سو رہے تھے۔ ان پاکیزہ ہستیوں کی زیارت کیے بغیر کیسے آگے بڑھ سکتے تھے۔

سب سے پہلے حضرت شریف زندنیؒ کے مزار پر حاضری دی اور کئی دن وہاں بسر کیے۔ پھر مزاروں کی زیارت کا سلسلہ طول پکڑتا رہا۔ مدت قیام خاصی طویل ہو گئی۔ اس قیام نے آپ کو جن حقائق' مقامات' احوال اور درجات سے گزارا وہ کم نہیں تھا۔ لیکن سچ ہے معرفتِ الٰہیہ کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر پرواز کے بعد ایک اور پرواز کی تیاری ہوتی ہے۔ مرشد نے اپنے مرید کے پروں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''معین الدینؒ! کل انشاء اللہ روانہ ہوں گے۔''

''جیسا آپ کا حکم۔''

عشا کی اذان ہوئی۔ دونوں بزرگ اٹھ کر جانبِ مسجد چل پڑے۔ نماز پڑھ کر قیام گاہ پر واپس آئے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ کے دل میں خیال آیا کہ مرشد نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اگلی منزل کون سی ہوگی۔ پوچھنے کی ہمت تو تھی نہیں راضی بہ رضا ہو کر چپ ہو گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اگلی منزل سب منزلوں کی منزل ہے۔ مرشد نے ان کے لیے کیسی حسین منزل کا انتخاب کیا ہے اور وہاں سے کیسے کیسے انعامات ملنے والے ہیں۔ یہ بھید تو اس وقت ظاہر ہوا جب وہ مرشد کی ہمراہی میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ پورے وجود میں لرزہ طاری تھا۔ یہ مرشد مجھے کس امتحان گاہ میں لے آئے۔ بات اب سمجھ میں آئی۔ ان مراحل سے گزارنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں تک لانا مقصود تھا۔

جب خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے تو ہیبت و جلال سے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ مرشد نے سہارا دینے کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑا اور خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اپنے رب کی مناجات کی اور عرض کیا۔

''اے بارالٰہا! معین الدینؒ میرا مرید ہے۔ اس کو تیرے پیارے حبیب ﷺ کا فیض پہنچایا ہے تو اسے قبول فرما۔''

ابھی یہ دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ندا آئی ''ہم نے معین الدینؒ کو قبول کیا۔''

''معین الدین! اللہ تبارک و تعالیٰ کی اس قبولیت پر مبارک ہو۔'' مرشد نے فرمایا۔

''حضور' یہ آپ کی نظر و دعا کا فیض ہے وگرنہ میری کیا حیثیت ہے۔''

قبولیت کا حکم اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ خوشی سے دل جھوم رہا تھا۔ اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد دنیا میں دل کس کا لگ سکتا ہے۔ دنیا اتنی حقیر نظر آنے لگی کہ مرشد کی خدمت اور اللہ کی عبادت کے سوا کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ دن کو روزہ رکھتے شب کو عبادت کرتے۔ یہی اس شہر کا استقبال تھا۔ ریاضت و مجاہدہ عجیب تھا۔ سات روز کے بعد روٹی کے کناروں سے، جن کی مقدار پانچ مثقال سے زیادہ نہ ہوتی' پانی میں بھگو کر افطار کرتے۔ لباس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے۔ نظریں زمین پر دل عرش معلیٰ پر۔

اسی عالم میں دن پر دن گزرتے گئے۔ کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کے شہر مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ مقام ادب تھا۔ اولیائے کرام یہاں ادب سے اونچا سانس نہیں لیتے۔ امام مالک یہاں کے گلی کوچوں کے کنارے کنارے ننگے پاؤں چلتے تھے کہ کہیں ان کا پاؤں حضورؐ کے قدم مبارک پر نہ آ جائے۔ جہاں ہر روز ستر ہزار ملائکہ سلامی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ ایسے شہر کا سفر تھا کہ رعب محبت سے بدن کانپ رہا تھا۔ ہر ہر قدم پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہ وہ بارگاہ تھی کہ جہاں مرشد و مرید دونوں برابر تھے۔ دونوں کا ایک عالم تھا۔ دور سے سبز گنبد نظر آیا تو آنکھوں سے آنسو رواں

ہو گئے۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔ پاؤں رکتے تھے کہیں' پاؤں کہیں پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ مسجد بنوی ؐ کے اندر داخل ہوئے تو سیدھے روضۂ اقدس کی طرف گئے' سر خود بخود جھک گیا۔ ہاتھ ادب سے بندھ گئے۔ ایسی بارگاہ میں تھے کہ لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔

''معین الدینؒ! بارگاہِ رسالت مآبؐ میں نذرانہ عقیدت اور صلوٰۃ وسلام کا ہدیہ پیش کرو۔''

حضرت خواجہ معین الدینؒ کو جیسے ہوش آ گیا ''الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدی یارسول اللہ ﷺ''

اس عاجزانہ سلام کے الفاظ مکمل ہوئے تھے کہ روضۂ پاک کے اندر سے آواز آئی ''وعلیکم السلام یا قطب المشائخ بردِ بحر۔''

''بس تمہارا کام بن گیا۔'' مرشد نا حضرت عثمان ہرونی نے مبارک باد دی۔

خواجہ معین الدینؒ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ عنایات وکرم کی بارش ہو رہی تھی۔ عطائی عطا تھی۔ رحمت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اتنا تھا کہ ایک دن میں سمٹ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کیا عمر خضر بھی کم تھی۔ جی چاہتا تھا کہ یہ عمر مختصر یہیں بیت جائے۔ لیکن دینے والے نے بھی کمال کیا۔ ایک مٹھی میں سب کچھ بخش دیا، مشائخ بردِ بحر کی سند عطا فرما دی۔

سبز گنبد' سنہری جالیوں سے الگ ہونے کا خیال آتا تھا تو روح بغاوت پر مل جاتی تھی۔ چند یوم اسی حالت میں گزر گئے۔ پھر کسی ذات شفقت آمیز نے دلِ مضطرب پر تسلی کا ہاتھ رکھ دیا۔ صبر آ گیا مرشد کے قدم اٹھ چکے تھے۔ ابھی کوئی امتحان اور باقی تھا۔ چشم نم کے ساتھ رخصت کی اجازت طلب کی۔ سنہری جالی کو بوسہ دیا اور مرشد کی معیت میں مسجد نبوی ؐ سے باہر نکل آئے۔

اب ان کے مرشد انہیں جس امتحان سے گزارنا چاہتے تھے' اس سے بڑا امتحان اور کوئی نہیں۔ وہ مرشد کے بستر کو کندھے پر اٹھائے اور سر پر انگیٹھی رکھے' منزل سے ناآشنا، نظریں جھکائے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے مغرب کا وقت ہو گیا' دور تک ویرانہ تھا کوئی بستی نہ کوئی مسجد۔ مرشد کی امامت میں انہوں نے اسی ویرانے میں نماز عشا ادا کی۔ چودھویں کا چاند ان پاکیزہ ہستیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے اسی ویرانے میں ٹھہر گیا تھا۔ ہر طرف نور کی چادر بچھ گئی تھی۔

صبح نمودار ہوئی۔ چاند نے اپنی سلطنت سورج کے حوالے کی تو یہ مسافر بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے، کئی دنوں کی مسافت کے بعد مرشد نے اس راستے پر قدم رکھے جو سیستان کو جاتا تھا۔ اسی صوبے کے ایک چھوٹے سے قصبے میں حضرت خواجہ معین الدینؒ کی ولادت ہوئی تھی۔ بہن بھائی اسی سرزمین پر آباد تھے۔ بچپن یہیں گزرا تھا۔ بچپن کے ساتھی ابھی تک یہاں آباد ہوں گے۔

وہ گھر یہیں تھا جس کے آنگن میں ان کا بچپن کھیلا تھا۔ ماں جیسی ہستی بھی یہیں دفن تھی۔ ایک ایک ذرے میں یادوں کا رین بسیرا تھا۔

مرشد نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ عارضی وطن کے لیے دل تڑپتا ہے یا اصلی وطن پر نگاہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت نے سب محبتوں کو دل سے نوچ کر پھینک دیا ہے یا نہیں۔ دنیا کی محبت دل میں گھر کیے ہوئے ہے یا ہر طرف سے بے نیاز ہو کر ''ایک'' محبت نے دل میں گھر بنا لیا ہے۔ اپنی ہر خواہش کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے یا نہیں؟ تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا سونا تپ کر کندن بن چکا؟

ایک جگہ ڈیرے ڈالے گئے' مرشد بار بار مرید کی طرف دیکھ لیتے تھے کہ چہرے کا رنگ وہی ہے یا بدل گیا؟ کسی محبت نے کوئی جلوہ گری نہیں کی۔ کسی یاد نے دل کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ ماضی کا کوئی نقش ابھر کر نمایاں نہ ہوا۔ خواجہ معین الدینؒ اس طرح مطمئن بیٹھے تھے جیسے کسی اجنبی جگہ میں قیام پزیر ہوں۔ مرشد نے جب یہ حال تماشا کیا تو تربیت کی تکمیل کا یقین آ گیا۔

''معین الدینؒ!''

''یا مرشد!''

''چلو اب چلتے ہیں۔''

خواجہ معین الدینؒ نے مرشد کا بستر کندھے پر رکھا۔ انگیٹھی سر پر دھری اور نقش قدم کی پیروی میں قدم بڑھا دیے۔ یہ پوچھنا خلاف ادب تھا کہ اب ارادہ کدھر کا ہے۔

جب مرشد نے بغداد کے راستے پر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ واپسی قریب ہے، یہ واپسی آٹھ سال مسلسل سفر میں رہنے کے بعد ہو رہی تھی' بغداد میں مریدین اور عقیدت مندوں کی آنکھیں راہ تک رہی تھیں۔ جیسے ہی واپسی کا غلغلہ بلند ہوا زیارت و ملاقات کرنے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ سب خاموش مؤدب بیٹھے تھے' چاہتے سب یہی تھے کہ سفر کے حالات سے آگاہی ہو لیکن بولنا خلاف ادب تھا جب تک کہ حضرت عثمان ہرونی از خود ان رازوں کو آشکار نہ فرمائیں۔

حضرت عثمان ہرونی نے دلوں کے سوالوں کو پڑھ کر جواب کے لیے لب کشائی کی ''معین الدینؒ اللہ تعالیٰ کا مقبول

[illegible] کا حامل ہے اور ہم اس کی مریدی پر فخر کرتے [illegible]''

اس مرشد کا کیا کہنا جس پر خود مرشد فخر کرے۔ حاضرین [illegible] آمیز نظروں سے خواجہ معین الدینؒ کی طرف دیکھا۔ [illegible] ایک ساتھ آپ کی بزرگی کا جائزہ لینے کے لیے [illegible] سر جھکائے ادب سے دوزانو بیٹھے تھے۔

ابھی کلمات تحسین اور مبارک باد کا شور کم نہیں ہوا تھا کہ حضرت خواجہ عثمان ہرونی کی آواز ابھری ''ہم کچھ عرصے کے لیے مختلف ہونا چاہتے ہیں۔''

آپ نے ایک نظر اپنے چہیتے مرید کی طرف دیکھا اور فرمایا ''چاشت کی وقت آ جایا کرو تاکہ مزید علم و معرفت عطا کروں۔'' پھر حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

''اگر تم میں سے بھی کوئی آنا چاہے تو دروازے کھلے ہیں [illegible] مختلف ہونے کے بعد میری نیابت کے فرائض [illegible] انجام دیں گے۔''

[illegible] منزل تھی جس سے آپ کے مرشد آپ کو گزار رہے تھے۔ [illegible] حاضرین سے کیا سلوک روا رکھتے ہیں، عام لوگوں کی دلجوئی کس طرح کرتے ہیں، مشکل میں [illegible] افراد کی دست گیری کس طرح کرتے ہیں، جو [illegible] تقسیم ہوئے ہیں انہیں کس طرح تقسیم کرتے ہیں۔ [illegible] بڑھ کر یہ کہ اس مصروفیت کے باوجود ریاضت و [illegible] کا حق کس حد تک ادا کرتے ہیں۔

حضرت عثمان ہرونی اعتکاف میں چلے گئے اور نیابت کے فرائض حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اٹھانا پڑا۔ آپ خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے لیکن مرشد کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ حضرت خواجہ نے خانقاہ کے تمام معاملات خوش اسلوبی سے انجام دینا شروع کر دیے۔ حضرت عثمان ہرونیؒ کی مجلس کے شرکاء حضرت خواجہ معین الدینؒ کے اخلاق کریمانہ کے معترف ہو گئے۔

مرشد کا حکم تھا کہ تم (حضرت خواجہ معین الدینؒ) چاشت کے وقت آ جایا کرو۔ دوسرے حاضرین کو بھی یہی حکم تھا۔ جب چاشت کا وقت ہوتا آپ اپنے مرشد کے پاس تشریف لے جاتے۔ اور لوگ بھی آ جاتے تھے۔ جب سب جمع ہو جاتے تو حضرت عثمان ہرونی لب کشائی فرماتے اور علم و معرفت کے موتی لٹانے لگتے۔ ان محافل کا انتظام دراصل حضرت خواجہ معین الدینؒ کی تربیت کے لیے ہی کیا گیا تھا۔ مرشد مختلف ہو کر بھی مرید سے غافل نہیں تھے۔

اٹھائیس مجالس منعقد ہو چکی تھیں کہ ایک محفل کے اختتام پر حضرت عثمان ہرونی نے خواجہ معین الدینؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے معین الدینؒ! میں نے تیری کمالیت کے لیے ان باتوں کی ترغیب دی ہے۔ بس چاہئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے تو دل و جان سے انہیں بجالائے تاکہ قیامت کو شرمندہ نہ ہو۔ لائق فرزند وہ ہے کہ جو کچھ اپنے پیر کی زبان سے سنے تو ہوش کے کانوں سے سنے۔ اور اس میں مشغول ہو جائے اور اسے بجالائے۔''

یہاں تک پہنچ کر آپ خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آنکھیں کھولیں اور عصا جو پاس پڑا تھا۔ اٹھا کر حضرت خواجہ معین الدینؒ کو عطا فرمایا۔ اس کے بعد خرقہ اور لکڑی کی پاپوش (کھڑاویں) اور ایک مصلیٰ مرحمت فرمایا۔

''یہ تمام چیزیں ہمارے پیروں کی یادگاریں جو رسول اللہ ﷺ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ہم نے تجھے دیں مناسب ہے کہ جیسا ہم نے ان چیزوں کو رکھا ویسا ہی تو بھی رکھے اور جس شخص کو تو مدخلا معلوم کرے اسے دے دے۔''

جب یہ فرما چکے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ سے بغل گیر ہو کر فرمایا ''تجھے خدا کو سونپا۔'' ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ آپ سمجھ گئے کہ مرشد سے جدائی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ تمام پیر بھائی جو اس وقت موجود تھے اٹھ اٹھ کر آپ سے مصافحہ کر رہے تھے' مبارکباد دے رہے تھے۔ آپ کا یہ حال کہ دل پر قابو پانا مشکل تھا۔ مرشد کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آ رہا تھا۔ نورانی تمثلوں کی یاد آ رہی تھی۔ کیا خبر مرشد سے زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

آرزو کچھ بھی ہو مرشد کی بات ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مرشد سے معانقہ کیا' قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور بغداد سے روانہ ہو گئے۔ حضرت شیخ اوحد الدین کرمانی اور چند دوسرے افراد بھی آپ کے ہمراہ ہو گئے۔

معرفت کی جو دولت نصیب ہوئی تھی اس کا خانۂ کعبہ میں حاضر ہو کر شکر بھی بجالانا تھا۔ اور ثابت قدمی کے لیے دعا بھی فرمانی تھی۔ آپ نے کچھ دن کرمان میں گزارے۔ یہیں حضرت قطب الدین اوشی آپ کے مرید ہوئے۔ چند اور افراد بھی آپ کے جمال ولایت اور رنگ فقر کو دیکھ کر آپ کے ہمراہ ہو گئے۔ تیس چالیس افراد کا یہ قافلہ حرم کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

''اے اللہ! تیرا شکر بجالاتا ہوں کہ تو نے مجھے اپنے مقبول بندوں میں شمار کیا' مجھے توفیق دے کہ میں تیری مخلوق کی

خدمت و رہنمائی میں سرگرم عمل رہوں۔ مجھ سے دین اسلام کی سربلندی کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ ہو۔''

مکہ مکرمہ پہنچتے ہی یہ کلمات آپ کے ہونٹوں پر جاری ہوگئے۔ طوافِ کعبہ کرتے اور عبادت میں مشغول ہوتے تو اس کے سوا کوئی دعا ہونٹوں پر نہ آئی۔ آخر ایک روز سننے والے نے یہ صدا سن لی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔

''اے معین الدینؒ! ہم تجھ سے خوش ہیں، تجھے بخش دیا مانگ کیا مانگتا ہے تاکہ عطا کروں۔''

یہ سنتے ہی سر نیاز زمین پر رکھ دیا اور بصد عجز و انکسار عرض کیا ''بارالٰہا! معین الدینؒ کے مریدان سلسلہ کو بخش دے۔''

آواز آئی ''اے معین الدینؒ! تو ہماری ملک ہے، جو تیرے مرید اور تیرے سلسلے میں تا قیامت مرید ہوں گے انہیں بخش دوں گا۔''

انہی دنوں حج کا موسم آگیا۔ بہار آگئی۔ ہر طرف سفید احراموں کے پھول کھل گئے، آپ نے بھی یہ فریضہ انجام دیا اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

مکہ مکرمہ میں اگر رعب و جلال تھا تو یہاں محبتیں تھیں۔ نرمی ہی نرمی شفقت ہی شفقت تھی، ہر سو رحمتیں برستی تھیں۔ روضۂ پاک پر حاضری دی گلدستہ سلام نذر کیا اور پھر مسجد قبا میں معتکف ہو کر ریاضت و عبادت میں مشغول ہوگئے۔

وصال کے شب و روز طویل ہوتے چلے گئے۔ چھ ماہ گزر گئے ایک رات کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹے تھے کہ نیند آگئی لیکن مقدر بیدار ہوگیا۔ خواب میں دیکھا کہ رحمۃ للعالمینؐ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔

''اے معین الدینؒ! تم معین دین ہو، تمہیں ہندوستان کی ولایت دی جاتی ہے۔ اجمیر کو اپنا مستقر بناؤ۔''

آنکھ کھلی تو حضور اکرمؐ کی تشریف آوری کی خوشی میں آنسو رخساروں کا وضو کرنے لگے۔ پھر خواب کا خیال آیا تو الجھن میں پڑ گئے۔ اجمیر کا تو نام ہی میں نے پہلی بار سنا ہے۔ یہ کہاں ہے کس طرف ہے۔ میں وہاں تک پہنچوں گا کیسے۔ سوچتے سوچتے پھر غنودگی آگئی۔ دربار پھر سج گیا۔ عالم خواب میں اجمیر اور اس کا راستہ دکھا دیا گیا۔

خواب سے بیدار ہوئے تو روضۂ اقدس پر حاضری دی اور پھر اپنے احباب کے ہمراہ بغداد کی طرف چل پڑے تاکہ اس کامیابی سے مرشد کو باخبر کر سکیں اور ان سے اجازت لے کر ہندوستان کا قصد کریں۔

☆☆☆

اجمیر کے کفرستان میں راجا پرتھوی راج کے محل میں بہت سے نجومی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ انکے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ کئی ایک کے ماتھے پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ وہ بڑی دیر سے ستاروں کا حساب لگانے میں مصروف تھے۔ ایک زائچہ بناتے، اسے غور سے دیکھتے، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہوتیں اور ازسرِ نو زائچہ بنانے لگتے کہ شاید ستاروں کی چال سمجھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ ہر مرتبہ ایک ہی جواب آرہا تھا، اور وہ جواب ایسا نہیں تھا کہ راجا کی ماں کو بتایا جاسکتا جو ان پنڈتوں کے چہروں کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے تم لوگ کس بات پر پریشان ہو رہے ہو، کیا کہتے ہیں ستارے؟'' راج ماتا نے تنگ آکر پوچھا۔

''رانی ماں! خبر اچھی نہیں ہے۔ ابھی روشنی ہے مگر جلد ہی اندھیرا پھیل جائے گا۔'' ایک نجومی نے ہمت کر کے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا، کس اندھیرے کی بات کر رہے ہو، میرے بیٹے کی حکومت دہلی سے پنجاب تک پھیلی ہوئی ہے اس کی قسمت میں اندھیرا کیسا؟''

''رانی ماں! ستارے تو یہی کہتے ہیں۔''

''صاف صاف بتاؤ کہ کیا کہتے ہیں ستارے۔''

''ایک شخص غیر دیس سے آئے گا اور آپ کے بیٹے پرتھوی راج کی سلطنت برباد کر دے گا۔''

''میں تم سب کو ہاتھی کے پاؤں تلے ڈلوا دوں گی۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ کس میں ہمت ہے جو پرتھوی راج کو نیچا دکھائے۔'' رانی ماں غصے سے تن کر کھڑی ہوگئی۔

تمام نجومی تھر تھر کانپ رہے تھے، آخر ایک نے ہمت کر کے کہا ''ستارے تو یہی کہتے ہیں۔ لگتا ہے مرتبہ حساب لگا کر دیکھ لیا۔''

''آنے والا کوئی بادشاہ ہے؟'' رانی ماں کی آواز میں تشکیک نمایاں تھی۔

''نہیں، وہ کوئی درویش ہوگا جس کے ساتھ چند لوگ اور بھی ہوں گے۔''

''حساب کتاب لگا کر اس کے بارے میں مجھے کچھ اور بتاؤ۔''

''ہم پہلے ہی سب حساب کتاب لگا چکے ہیں۔ اس کے حلیے کے بارے میں جانکاری ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی ہوگی۔ چوڑی پیشانی ہوگی شانے چوڑے ہوں گے۔ آنکھوں میں چمک ہوگی۔ ہونٹوں پر مسکان، قد لمبا ہوگا۔ بہت دبلا پتلا ہوگا۔''

''کیا اس بلا کو ٹالا جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی اُپائے ہے

وقار عظیم

باوجود وہ بے چین رہنے لگا۔ جب زیادہ پریشان ہو جاتا تو نجومیوں کو بلا لیتا۔ نجومی ہر مرتبہ وہی جواب دیتے۔ راجا کے سپاہی نگر نگر مسجدوں اور خانقاہوں میں اس مسلمان مسافر کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

☆☆☆

حضرت خواجہ معین الدینؒ تیزی سے بغداد کی طرف جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھی اس جلد بازی پر حیران ہو رہے تھے۔ ایسی عجلت ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھی لیکن اب کچھ بات ہی ایسی تھی۔ وہ جلد از جلد مرشد کی خدمت میں پہنچ کر یہ خوشخبری سنانے کے لیے بے چین ہوگئے تھے۔

قدموں نے بغداد کی زمین چومی۔ انہوں نے ساتھیوں کو خیر باد کہا اور خود حضرت عثمان ہرونی کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئے۔ قدم بوسی کے بعد مرشد کو اس خواب سے آگاہ کیا جو انہوں نے مدینہ منورہ میں ملاحظہ کیا تھا۔ مرشد نے سماعت فرمایا تو خوش ہوئے۔

''ان الطاف و عنایات کا تقاضا ہے کہ زکوٰۃ دو'' مرشد نے قدرے سکوت کے بعد فرمایا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی جو اس وقت موجود تھے، حضرت خواجہ معین الدینؒ نے انہیں سینے سے لگایا، بے شمار انعامات سے نوازا اور بیعت و خلافت سے مشرف کیا۔ یہی ان کی زکوٰۃ تھی۔

حضرت خواجہ عثمان ہرونی اکثر گوشہ تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ اب خواجہ معین الدینؒ تشریف لے آئے تو انہوں نے اپنے بہت سے کام آپ کے سپرد کر دیے۔ اگر کوئی حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی درخواست کرتا تو خنداں بہ لب ارشاد فرماتے ''معین الدینؒ کے پاس جاؤ۔'' مقصد یہ تھا کہ مریدین میں اضافہ ہو جائے اور ہندوستان جانے سے پہلے ان کا اعتماد بحال ہو جائے۔

اس اجازت کا ملنا تھا کہ لوگ دور و نزدیک سے حاضرِ خدمت ہونے لگے اور دستِ حق پرست پر بیعت کرنے لگے۔ عام لوگ بھی دستگیری و رہنمائی کے لیے ان کے پاس آنے لگے۔ بغداد میں ہر طرف ان کی جلالت و عظمت کے چرچے ہونے لگے۔

ایک روز حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے بعض مریدوں اور پیر بھائیوں کے ساتھ کسی جگہ تشریف فرما تھے اور ذکر انبیا علیہ السلام کا ہو رہا تھا کہ بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا ہاتھ میں پیالہ لے کر ادھر سے گزرا۔ سب بزرگوں کی نظر اس پر پڑی۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ ''یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا' اللہ اسے دنیا سے نہیں اٹھائے گا۔''

یہ لڑکا شمس الدین التمش تھا جو واقعی دہلی کا بادشاہ بنا۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تھے جن کی اللہ نے لاج رکھی یا اس کی قسمت تھی جسے خواجہ معین الدینؒ نے پڑھ لیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مریدوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فرمان رسولؐ کے مطابق اجمیر جاکر آپ کو اسلام کا پرچم بلند کرنا تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہاں کے مریدین و معتقدین کی تربیت ہوجائے۔ اس کے لیے انہوں نے مجالس کا انعقاد کیا۔ وقتاً فوقتاً تربیتی مجالس منعقد ہونے لگیں جن میں مختلف موضوعات پر آپ گفتگو فرماتے۔

اس قسم کی گیارہ مجالس منعقد ہوئی تھیں کہ آپ نے اجمیر کی طرف روانہ ہونے کا اعلان کردیا۔ حضرت قطب الدین بختیار اوشی تو خیر آپ کے قدموں سے جدا ہوتے ہی نہیں تھے۔ انہیں تو شرف ہمرکابی سے مشرف ہونا ہی تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مریدوں نے اذن ہمرکابی طلب کیا۔ آخر ان پاکیزہ نفوس کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔

جب یہ چھوٹا سا کارواں چلنے لگا تو حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے عطا کردہ تبرکات خواجہ بختیار اوشی کے سر مبارک پر تھے۔ میر کارواں حضرت خواجہ معین الدینؒ نے قرآن پاک کو اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ مختلف لوگوں نے مختلف سامان سروں اور کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اسی وقت حضرت عثمان ہرونی تشریف لے آئے۔

''معین الدینؒ! ہم تمہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔''

ان الفاظ میں ایسی تاثیر تھی کہ پورا ماحول سوگوار ہوگیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جس میں آنسو نہ ہوں۔ برسوں کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ یقین تھا کہ اب ملاقات نہ ہوگی۔ اب واپسی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح
واپسی کا کوئی سوال نہیں

حضرت عثمان ہرونی الوداع کہنے کے لیے قافلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے سب خاموش سر جھکائے چل رہے تھے۔ جب قافلہ اس راستے پر پہنچا جو سبزوار کی طرف جاتا تھا تو آپ رک گئے۔ سب کے لیے بارگاہ رب العزت میں دعا فرمائی اور واپس لوٹ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ مڑ مڑ کر مرشد کو دیکھتے رہے اور پھر سبزوار کی طرف چل پڑے۔

قافلہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ رہبر کارواں نے ویرانوں اور جنگلوں کے بجائے ایسے راستے کا انتخاب کیا جو بستیوں قصبوں اور باغوں سے ہوکر گزرتا تھا۔ کیونکہ یہ سفر ریاضت اور مجاہدے کے لیے نہیں تھا تلقین و وعظ کے لیے تھا۔ وہ باغوں اور شہروں میں ڈیرے ڈالتے تاکہ مخلوق خدا میں انعامات تقسیم کریں۔ جس طرف سے گزریں' مسلمانوں کو سیدھی راہ دکھائیں۔ رشد و ہدایت کے چراغ روشن کریں' علم و حکمت کے موتی نچھاور کریں۔

یہ قافلہ جب کسی بستی سے گزرتا دیکھنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ ان لوگوں کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے جو گھر بار' عزیز و اقارب کو چھوڑ کر دیار کفر و شرک میں اللہ کے دین کا پرچم بلند کرنے جارہے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ ان جمع ہونے والے لوگوں سے خطاب کرتے' اپنے استقبال کرنے والوں پر نصیحتوں کے پھول نچھاور کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سیکڑوں دلوں میں حق کے چراغ جلا دیئے' بنجر ذہنوں کو شاداب کردیا' مایوس دلوں کو پرامید کردیا۔

یہ قافلہ سبزوار' ہرات' بلخ اور غزنی سے ہوتا ہوا ملتان پہنچ گیا۔ راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے اعلان فرمایا کہ وہ یہاں قیام فرمائیں گے۔ ملتان سے آگے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوجاتی تھی۔ گویا آپ اس دروازے پر آکر رک گئے جہاں سے آگے آپ کے مشن کا آغاز ہونا تھا۔

یہاں قیام کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ اجمیر کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندی زبان بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ یہاں کے لوگوں سے ابلاغ ممکن ہوسکے۔ ملتان اولیا کی سرزمین ہے۔ لاتعداد مزارات قدم قدم پر جلوہ افروز ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ان مزارات پر حاضری و فیوض و برکات کا حصول بھی ضروری تھا۔

آپ کو ملتان میں قیام کیے ہوئے دو ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے اپنے ماموں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا وہ فقرہ یاد آگیا جو انہوں نے ایک دن آپ سے فرمایا تھا۔

''اے معین الدینؒ! ہند کی سرحد پر ایک شیر بیٹھا ہے' اس سے ڈرنا۔''

بعد میں اس فقرے کی وضاحت بھی فرمادی تھی۔ ان کی مراد حضرت علی بن عثمان داتا گنج بخش ہجویریؒ سے تھی جن کا مزار لاہور میں تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ غزنی میں پیدا ہوئے۔ علم کی تشنگی بجھانے کے لیے دور دراز کے علاقوں میں تشریف لے گئے۔ یہاں صدہا مشائخ و اولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علم و معرفت کے موتیوں سے دامن بھرا۔ والدین کی تربیت' نامور اساتذہ کی تعلیمات اور مرشد کی قربت و تربیت نے انعامات سے نوازا۔ بعد ازاں مرشد کے فرمان کے مطابق ہندوستان کا رخ کیا۔ دوران سفر جہاں قیام فرماتے تبلیغ حق کرتے۔ رشد و ہدایت کے چراغ روشن کرتے ہوئے 431 ہجری میں وارد لاہور ہوئے۔ یہاں تک کہ 465 ہجری کو اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کے وصال کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہوا تھا کہ اللہ کا ایک اور ولی ملتان میں بیٹھ کر انہیں یاد کررہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے مریدوں پر اجمیر روانگی کا ارادہ ظاہر کرچکے تھے کہ اچانک یہ فقرہ یاد آگیا ''ہند کی سرحد پر شیر بیٹھا ہے' اس سے ڈرنا۔''

آپ نے اجمیر جانے کے بجائے اپنے مریدوں کے ہمراہ لاہور کا رخ کیا۔ داتا کے مزار اقدس پر پہنچ گئے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ کافی دیر تک کیا خبر کیا کچھ مانگتے رہے۔

اب اس شیر کو منائے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ حضرت داتا گنج بخش کے پاؤں کی جانب ایک حجرہ مبارک سا بنالیا اور عبادت میں مشغول ہوگئے۔ نماز فجر کے بعد قرآن پاک کی تلاوت اس لحن سے فرماتے کہ در و دیوار جھوم اٹھتے۔ اسی حال میں آٹھ نو ماہ گزر گئے۔ قبر مبارک سے کوئی آواز نہ آئی۔ کوئی نشانی ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حاضری قبول ہوگئی ہے۔ آپ چالیس روز کے لیے چلے میں بیٹھ گئے۔ جب چلہ پورا ہوگیا تو مزار پاک کی طرف متوجہ ہوئے۔

''اے داتا! نظر کرم فرمائیں۔''

آپ بار بار یہی کہتے تھے لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ اس خیال نے پریشان کردیا کہ شاید حاضری قبول نہیں ہوئی۔ اس خیال کے آتے ہی دیر تھی کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اچانک آپ پر کیفیت طاری ہوئی۔ آواز آئی۔

''معین الدینؒ!''

''جی حضور۔''

''کیوں روتے ہو؟''

''مجھے خیال آیا تھا کہ شاید حاضری قبول نہیں ہوئی۔''

''حاضری قبول کی۔ میں تو اس لیے جواب نہیں دیتا تھا کہ تمہارا قرآن پڑھنا مجھے بے حد پسند ہے۔ آج سے تم ہندالولی ہو۔''

آپ نے ہند کی سرحد پر بیٹھے ہوئے شیر کو منالیا تھا۔

ایسے آموختے رم خوردہ کی وحشت کھوئی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے اس کو رام کیا

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ایک ماہ مزید لاہور میں گزارا۔ اس دوران وہ اجمیر کے متعلق خبریں جمع کرتے رہے۔ اسی دوران آپ کو معلوم ہوا کہ پرتھوی راج کے ملازم سپاہی مسلمان مسافروں کی تلاش میں ہیں۔ نجومیوں کی پیش گوئی کی روشنی میں وہ ایسے درویش کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں جو پرتھوی راج کی سلطنت کے خاتمے کا سبب بنے گا۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ درویش وہ خود ہیں۔ قدم قدم پر ان کی جان کو خطرہ ہے لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ تاجدار مدینہ حضرت محمد ﷺ کی ہدایت پر اجمیر کا سفر کررہے ہیں۔ معمولی سپاہی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انہیں اجمیر تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ضروری انتظامات کے بعد آپ اپنے رفقا کے ہمراہ اجمیر جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔ پٹیالہ کے قریب پہنچ کر آپ نے پہلا پڑاؤ کیا۔ ویرانے میں آگ روشن ہوگئی۔ خیمے لگادیئے گئے۔ عبادت و ریاضت میں رات بسر ہوگئی۔

راجا کے جاسوس جنگلوں' ویرانوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا تو مسلمانوں کا بھیس بدلا اور چہروں پر عقیدت کی پرچھائیاں سجائے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ کسی بادشاہ کا دربار تو تھا نہیں کہ چھان بین ہوتی۔ آپ کے مریدوں نے یہی سمجھا کہ علاقے کے عقیدت مند مسلمان ہیں' حضرت کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ خواجہ معین الدینؒ کی خدمت میں پہنچادیا۔ جب ان جاسوسوں نے آپ کو دیکھا اور فراہم کردہ تصویر سے ملایا تو پہچان لیا کہ یہی وہ درویش ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی ہے۔

''حضرت ہماری نصیحت کے لیے کچھ ارشاد فرمائیے۔'' ان لوگوں نے کہا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے پہلے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا۔ پھر بہ حیثیت مسلمان انہیں ان کی ذمے داریاں یاد دلائیں۔ کتاب و سنت پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

یہ لوگ بڑے غور سے سنتے رہے بلکہ بعض تو آپ کے ارشادات کو لکھتے بھی رہے تاکہ عقیدت کا ڈھونگ پوری طرح رچایا جاسکے' ان ارشادات کو سن کر انہیں کامل یقین ہوگیا تھا کہ

یہی وہ درویش ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ اب وہ آپ کے قتل کی تدابیر سوچ رہے تھے۔ آخر ان میں سے ایک نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کی۔

''یا حضرت! کرم فرمائیں۔ ہمارے پاس ٹھہریں تاکہ ہم بھی آپ کی برکتوں سے مستفید ہوں۔ ہمارے ہوتے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ اس ویرانے میں قیام فرما ہوں۔''

آپ نے مراقبہ کیا۔ دربارِ رسالت سے بشارت ہوئی ''ان لوگوں کی نیت بد ہے' دغا فریب کرنا چاہتے ہیں ٹھہرنا مناسب نہیں۔''

''آپ لوگوں کا شکریہ' ہم عجلت میں ہیں رک نہیں سکتے۔'' آپ نے ارشاد فرمایا۔

''حضور! آپ ہمیں کیوں اپنے فیض سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہم تمہیں ہر جگہ سے فیض پہنچاتے رہیں گے۔'' آپ نے فرمایا اور رفقا کو سفر جاری رکھنے کا حکم دیا۔

حکم ملنے کی دیر تھی کہ ساتھیوں نے اپنا اپنا سامان سروں پر اٹھایا اور تیزی سے چل دیے۔ آپ کے روحانی رعب و جلال کا اثر تھا کہ وہ لوگ مزید دیکھتے رہ گئے۔ کسی کو روکنے کی ہمت تک نہ ہوسکی۔ سوچ سکے تو اتنا کہ کوئی بات نہیں، اگر یہاں سے بچ گئے ہیں تو آگے قابو آجائیں گے۔ قافلہ یوں اٹھ گیا جیسے یہاں کبھی کوئی آکر ٹھہرا ہی نہیں تھا۔

شہاب الدین محمد غوری نے غزنین سے آکر نہ صرف ملتان پر قبضہ کرلیا تھا بلکہ راجا پرتھوی راج کے مضبوط قلعے بھٹنڈہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اب وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ شہاب الدین غوری غزنین واپس چلا گیا تھا۔

راجا پرتھوی راج مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا۔ دن رات جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ عوام کو ایک ایک پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ جنگ کے خوف سے ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ اور آپ کے رفقا ان حالات سے بے پروا جنگلوں' بیابانوں میں اذانیں دیتے' رکوع وسجود کرتے اجمیر جانے کے لیے دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دہلی' راجا پرتھوی راج کا پایۂ تخت تھا لیکن اس کا مستقل قیام اجمیر میں رہتا تھا۔ دہلی کفرستان بنا ہوا تھا۔ یہاں کے ہندو' مسلمانوں کا منہ دیکھنا گناہ سمجھتے تھے۔ نماز تو بڑی بات اذان کی آواز تک انہوں نے نہیں سنی تھی۔ ہر طرف کفر و شرک اور بت پرستی تھی۔ ایسے شہر میں اہلِ صفا کا پورا قافلہ لے کر پہنچنا موت کو دعوت دینا تھا لیکن آپ بے خوف وخطر دہلی کی دہلیز تک پہنچ گئے۔ اسی وقت یہ خبر دہلی تک پہنچ گئی کہ شہاب الدین محمد غوری اپنے لشکر کے ساتھ غزنین سے نکل چکا تھا اور کسی بھی وقت ہندوستان پہنچ جائے گا۔ اہلِ دہلی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس آپا دھاپی نے سب کی بینائی چھین لی اور آپ کسی قاتل ذکر مخالفت کا سامنا کیے بغیر دہلی میں داخل ہوگئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور آپ نے اپنے اصحاب سمیت حضرت شیخ رشید گنجی کے مقبرے کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ چاروں طرف کفر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس اندھیرے میں کوئی مسلمان دینِ حق کی شمع روشن کرنے آپہنچا ہے۔ اہلِ دہلی کے دل تو اس وقت دہلے جب فضا میں اللہ اکبر کی آوازیں گونجیں کفار نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کچھ لوگ اس آواز کا کھوج لگانے کے لیے دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ کبھی جھکتے ہیں کبھی سجدے میں جاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی بت نہیں ہے پھر یہ سجدہ کس کو کررہے ہیں؟ انہوں نے سوچا موقع اچھا ہے ان سب کا یہیں کام تمام کردیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ان پر لرزہ طاری ہوگیا۔ قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ ہاتھ اٹھانے کی طاقت نہ رہی۔ عاجز ہوکر سب کے سب واپس پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد اذان کی آواز پھر بلند ہوئی۔ کچھ لوگ گمان پہنچانے کی غرض سے پھر وہاں پہنچے۔ اس مرتبہ بھی یہی واقعہ پیش آیا، اور جب بار بار یہی ہوا تو اپنی آگ میں خود جلنے لگے۔ ان خطرناک لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک دن ایک سخت دل کافر نے ہمت کرکے تیز دھار خنجر اپنی بغل میں چھپایا اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کی خدمتِ عالیہ میں پہنچ گیا۔ نیت یہ تھی کہ کسی طرح باتوں میں لگا کر آپ پر حملہ کردے گا۔ جب اسے خواجہ کی بارگاہ تک رسائی کا موقع مل گیا تو اسے یقین ہوگیا کہ وہ اپنا ارادہ پورا کرسکے گا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے مومنانہ فراست سے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جس ارادے سے آئے ہو وہ پورا کرو۔ میری گردن حاضر ہے۔''

جب اس نے یہ سنا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ بغل سے خنجر نکال کر پھینک دیا اور خود آپ کے قدموں پر گر پڑا۔

''مجھے معاف کردیں۔ اپنے اللہ کے واسطے مجھے معاف کردیں۔''

''اللہ۔'' آپ نے نہایت شفقت سے فرمایا ''جاؤ

انہوں نے تمہیں معاف کیا۔''

''حضرت اب میں کہاں جاؤں گا۔ مجھے تو اپنے ساتھ ملا لیں۔''

حضرت خواجہ نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ اسے مشرف بہ اسلام کیا، وہ شخص اس وعدے کے ساتھ لوٹ گیا کہ وہ اپنے لوگوں میں خاموشی سے اسلام کی تبلیغ کرتا رہے گا اور جب تک حضرت یہاں مقیم ہیں' وہ ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتا رہے گا۔

آپ کے حسن سلوک' اخلاق کریمانہ اور انداز عبادت نے اہل دہلی کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔ اجنبیت دور ہونے لگی تھی۔ اب اتنا ہوگیا تھا کہ آپ آزادانہ شہر میں گھومنے لگے تھے۔ میل ملاپ کے مواقع ملنے لگے تھے۔ آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ یہاں بہت جلد اسلام پھیل جائے گا۔ لیکن آپ کو ابھی رہنے کا حکم ہوا تھا۔ یوں بھی دہلی میں زیادہ قیام خلافِ مصلحت تھا۔ حالات ایسے تھے کہ شہاب الدین محمد غوری اور راجا پرتھوی راج کی افواج کا کسی وقت بھی ہوسکتا تھا۔ آپ یہ نوبت آنے سے پہلے دہلی سے نکل جانا چاہتے تھے۔

اس روز فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر مراقبے کی صورت میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اچانک اپنے مرید اور خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین اوشی کو مخاطب کیا۔

''بیٹا قطب الدین!''

''یا مرشد!''

''ہم آج اجمیر کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔''

''بہت بہتر۔''

''میں تمہیں دہلی میں چھوڑے جارہا ہوں۔ آج سے یہ علاقہ تمہارا ہے۔''

''حضرت! آپ سے جدائی؟''

''میل ملاقات اور خط وکتابت ہوتی رہے گی۔'' آپ نے خواجہ قطب الدین کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے تسلی دی ''اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہاں بہت جلد اسلام پھیلنے والا ہے۔ اس لیے یہاں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔''

''آپ بہتر جانتے ہیں۔''

قافلے میں چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حضرت بختیار اوشی راضی بہ مرشد تھے لیکن پھر بھی آپ کی حالت اس بچے کی طرح تھی جسے کسی نے اس کی ماں سے جدا کردیا ہو۔ قافلے کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک چلے اور پھر مرشد سے بغل گیر ہوکر واپس لوٹ گئے۔

دہلی سے اجمیر تک یہی نظر آیا کہ جنگ کا خوف لوگوں پر مسلط ہے۔ ہر طرف نفسانفسی پھیلی ہوئی ہے لوگ اتنے خوف زدہ تھے اور اپنے بچاؤ کی فکر میں لگے ہوئے تھے کہ کسی کی توجہ اس طرف نہ ہوسکی کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس طرف جاتے ہیں۔ اس میں آپ کی باطنی قوت کا بھی دخل تھا کہ لوگ انہیں دیکھتے تھے پھر بھی کوئی توجہ نہ دیتے تھے' ورنہ کسی دنیاوی ہتھیار کے بغیر اتنے بڑے قافلے کا نقصان اٹھائے بغیر گزر جانا ممکن نہیں تھا۔

یہ قافلہ اجمیر میں داخل ہوا تو ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ راجا پرتھوی راج اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ قلعہ بھٹنڈہ کی تسخیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ دوسری طرف شہاب الدین غوری ہوا کے دوش پر سوار چلا آرہا تھا۔ اجمیر میں لوگ سہمے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی اجمیر کی سڑکوں سے گزر رہے تھے لیکن کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

آپ کو شہر میں داخل ہوتے ہی بڑے بڑے مندر نظر آئے۔ ان مندروں کے بتوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ بت شکن شہر میں داخل ہوچکے ہیں۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد یہ سوال درپیش تھا کہ کہاں قیام کیا جائے۔ آپ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک مندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا مندر تھا۔ اور مہاراجوں' مہارانیوں اور رانیوں کے لیے مخصوص تھا۔ غریب غربا یہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس مندر کے ساتھ ہی ایک تالاب تھا جس کا نام انا ساگر تھا۔ انا ساگر کے قریب ذرا فاصلے پر گھنے سایہ دار درخت تھے۔ آپ کو یہ مقام پسند آیا لہٰذا آپ نے یہاں پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ اپنے ساتھیوں پر ظاہر کردیا۔

''ہم یہاں قیام کریں گے۔''

''یہاں سے تو مندر بہت قریب ہے ہم سب کی نظروں میں آجائیں گے۔''

''سورج اگر نظر نہ آئے تو اسے سورج کون کہے۔''

''یہ ہندوؤں کا کوئی مقدس تالاب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہندو نہانے کے لیے آتے ہوں گے۔ ہماری موجودگی ان پر شاق گزرے گی۔''

''اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا۔'' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔

ساتھیوں نے جب آپ کا اصرار دیکھا تو درختوں کے سائے میں سامان اتار دیا۔ انا ساگر کا تالاب سامنے تھا، نماز کا وقت قریب تھا' مسلمانوں نے انا ساگر کے پانی سے وضو کیا

اور پھر اللہ اکبر کی صدائے دل نواز بلند ہوئی۔ مندروں کی گھنٹیوں کے سوا کوئی آواز اب تک یہاں سنائی نہیں دی تھی۔ یہ آواز اجنبی بھی تھی اور حیران کن بھی۔ لوگ گھروں سے نکل آئے، دکانوں سے اتر آئے۔ ''کہیں سے مسلمان گھس آئے ہیں۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' لوگوں نے کہا اور انا ساگر کی طرف چل دیئے جہاں سے ابھی اذان کی آواز آئی تھی۔ قریب پہنچے تو دیکھا درختوں کے سائے تلے کچھ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ ایک نورانی چہرے والا شخص سب سے آگے کھڑا ہے۔

''یہ تو وہی شخص لگتا ہے جس کی پیش گوئی نجومیوں نے کی تھی۔'' ہجوم میں سے کسی نے کہا اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا کہ راجا پرتھوی راج کے ملازم چرواہے اونٹ لے کر آ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ پہلے ہی سے درختوں کے نیچے بسیرا کیے ہوئے تھے۔ وہ چرواہے.... حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس آئے۔

''یہ جگہ فوراً خالی کر دو۔''

''کیوں؟ یہاں ٹھہرنے میں کیا برائی ہے؟''

''یہاں پرتھوی راج کے اونٹ بیٹھیں گے۔''

''یہاں سے وہاں تک زمین پڑی ہے، کہیں بھی بٹھا دو۔''

''نہیں۔ وہ یہیں بیٹھیں گے۔'' ملازموں نے ڈانٹ کر کہا۔

اب ملازموں کے تیور بگڑنے لگے تھے لہٰذا آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''سامان اٹھالو، ہم ذرا ہٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں راجا کے اونٹ بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھے رہنے دو۔''

آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر انا ساگر کے کنارے پر چلے گئے۔ درختوں کے تلے اونٹ بیٹھ گئے۔ رات آ گئی۔ اونٹوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ قافلے والے رات بھر اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ ذرا دیر کو سب نے آرام کیا اور پھر نماز فجر کے لیے اٹھ بیٹھے۔

ذرا دن چڑھا تھا کہ چرواہے آ گئے۔ مقامی زبان میں کچھ گاتے جا رہے تھے اور درختوں سے بندھی اونٹوں کی رسیوں کو کھولتے جا رہے تھے۔ رسیاں تو کھل گئیں لیکن جب وہ اونٹوں کو اٹھانے لگے تو وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

''آج انہیں کیا ہو گیا۔ اونٹ تو ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھتے تھے۔''

انہوں نے پھر کوشش کی مگر بے سود۔ پریشانی ان کے چہروں سے عیاں تھیں۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اونٹوں کو ڈانٹ رہے تھے، ٹھوکریں مار رہے تھے مگر وہ پتھر کے بنے بیٹھے تھے، حالانکہ زندہ بھی تھے اور گوشت پوست کے بھی تھے۔

''یہ سب اس جادوگر کی کارستانی ہے۔'' ایک چرواہے نے قافلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کل ہم اس کے ساتھ بولے بھی تو بڑی بدتمیزی سے تھے۔''

''یہ تو پھر بہت بڑا جادوگر ہوا۔''

''دیکھتے نہیں، اونٹ اٹھنا ہی بھول گئے ہیں۔''

''اب کیا کریں۔''

''کرنا کیا ہے اس جادوگر کے پاس چلتے ہیں۔ وہی اس جادو کو ختم کرے گا ورنہ یہ اونٹ یہیں بیٹھے بیٹھے بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔''

وہ چرواہے انا ساگر کے کنارے آئے حضرت خواجہ معین الدینؒ سے معافی مانگی۔ جب آپ نے معاف کر دیا تو ان کی ہمت ہوئی۔

''آپ اپنا جادو واپس لے لیں اور ہمارے اونٹوں کو اٹھنے دیں۔''

''ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا جادو سے کوئی واسطہ نہیں۔'' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ ''یہ اونٹ اللہ کے حکم سے بیٹھے ہیں اور اسی کے حکم سے اٹھ بیٹھیں گے۔''

''تو پھر اپنے اللہ سے کہو، ورنہ ہماری تو نوکریاں چلی جائیں گی۔''

''تم واپس تو جاؤ۔ اللہ کے حکم سے اٹھ جائیں گے۔''

وہ چرواہے کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے بہرحال واپس آ گئے۔ اونٹ انہیں دیکھتے ہی اٹھ گئے جیسے پہلے اٹھ جایا کرتے تھے۔ ان چرواہوں پر آپ کی اس کرامت کا بڑا اثر ہوا۔ اونٹ لے کر جدھر سے گزرتے تھے یہ واقعہ بیان کرتے جاتے تھے۔

یہی چرواہے جب شام کو اپنے اونٹ باندھنے آئے تو لامحالہ ان کے دل میں خیال آیا کہ کچھ دیر ان فقیروں کے پاس بھی بیٹھا جائے۔ وہ بڑے ادب سے آئے اور سر جھکا کر خواجہ معین الدینؒ کے پاس بیٹھ گئے۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ اس لیے کہ نیک لوگوں کی صحبت نیکی کرنے سے بہتر اور برے لوگوں کی صحبت بدی کرنے سے بدتر ہے۔ بدبختی کی علامت یہ ہے کہ انسان گناہ کرتا رہے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونے کا امیدوار رہے۔'' حضرت

خواجہ معین الدینؒ ان چرواہوں سے باتیں کررہے تھے۔

''آپ مسلمان ہیں۔ ہماری ذات کے نہیں ہے پھر بھی آپ نے ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دی۔''

''ہمارے مذہب میں ذات پات کی تفریق نہیں۔ سب اللہ کے بندے ہیں۔ آپس میں سب برابر ہیں۔''

''آپ اللہ کے بندے ہیں۔ ہم تو دنیا دار چرواہے ہیں۔''

''یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ کیا خبر تم مجھ سے بہتر ہو۔ بتوں کی پوجا چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کرو۔ تم ہم سے بہتر ہو جاؤ گے۔''

وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ ان باتوں میں نہ کوئی پیچیدگی تھی نہ کوئی ہیر پھیر۔ انہی کی زبان میں باتیں ہورہی تھیں۔ خواجہ صاحب کا لہجہ بھی شگفتہ اور دل موہ لینے والا تھا۔ غرور تھا نہ تکبر۔ انہیں ایسا لگا جیسے اپنے ہی جیسے کسی آدمی سے بات کررہے ہیں۔ جب جانے کے لیے اٹھے تو خواجہ صاحب نے کھڑے ہوکر ان سے مصافحہ کیا۔

''آپ مسلمان ہوکر ہم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔''

''ہم انسان بھی تو ہیں۔'' خواجہ صاحب نے کہا۔

وہ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو راستے بھر خواجہ صاحب ہی کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے اپنے مذہب کے ہندو پنڈت انہیں اپنے پاس بیٹھنے تک نہیں دیتے تھے۔ اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق وہ عام دیکھ رہے تھے۔ ان درویشوں کے اخلاق نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ ان کے دل میں جو ایک خوف سا بیٹھا ہوا تھا نکل گیا۔ اب وہ جس سے بھی ملے ان درویشوں کے حسنِ اخلاق کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کیے۔

ان چرواہوں کی ہر شام خواجہ صاحب کے ساتھ گزرنے لگی۔ ہر ملاقات میں وہ ایک نیا تاثر لے کر اٹھتے۔ وہ جس سے بھی ان فقیروں کی تعریف کرتے' اس کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہونے لگتا۔ کوئی اس بات پر حیران تھا کہ ایک فقیر نے راجا کے اونٹ بٹھا دیے۔ کوئی اس بات پر حیران تھا کہ وہ مسلمان ہوکر ہندوؤں کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں چھوت چھات کا نظام تھا' ذات پات کی تفریق تھی' نیچی ذات کے ہندوؤں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ عبادت تک کی اجازت نہیں تھی۔ غریب اور امیر کی تفریق تھی۔ خواجہ صاحب کے حسنِ اخلاق پر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ کوئی یہ دیکھنے پہنچا کہ وہ کیسا فقیر ہے جس کے ایک اشارے پر اونٹ بیٹھ جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو پریشانیوں اور مصیبتوں نے ابھارا کہ وہ دعا کے لیے اس فقیر کے پاس جائیں۔ کسی نہ کسی طرح عوام کا رخ آپ کی طرف ہوگیا۔ ان میں زیادہ تعداد غریبوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی تھی۔ معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی لیکن جب وہ غریب نواز کے ڈیرے پر پہنچتے تو انہیں عزت و احترام سے بٹھایا جاتا۔ ان کے دکھوں کا مداوا کیا جاتا۔ ان کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جاتے۔ دعاؤں میں تاثیر تھی۔

جب لوگوں کے کام ہونے لگے تو ان کا اعتقاد بھی بڑھنے لگا۔ اب تک وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے لیکن جب قریب آئے ان پر حقیقت روشن ہوئی تو نفرت میں بھی کمی آئی۔ بعض تو اتنے متاثر ہوئے کہ مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ پھر یہ تعداد بڑھنے لگی، جو کام بادشاہوں کی تلواروں سے ممکن نہیں تھا' دربارِ تصوف کے ایک فقیر نے کر ڈالا۔

پنڈت اور پروہت تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی مسلمان فقیر آیا ہے۔ کچھ دن ٹھہرے گا چلا جائے گا۔ لیکن جب اس نے قدم ہی جما لیے اور نوبت یہ آگئی کہ بہت سے ہندو اپنا مذہب ترک کرکے بنیادین قبول کرنے لگے تو ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جوگیوں کی کٹیاؤں میں زلزلہ آگیا۔

''یہ شودر لوگ اس مسلمان کی باتوں میں آگئے تو ہمارا کون سنے گا؟''

''ہمیں پوجا پاٹ کے لیے کون بلائے گا۔ چڑھاوے کون چڑھائے گا؟''

''دیوتا ہمیں شراپ دیں گے۔''

''دیوتاؤں کو تو چھوڑو' راجا جب جنگ سے واپس آئے گا تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

مختلف مشورے ہوتے رہے۔ تمام پنڈت بڑے مندر میں موجود تھے اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترکیبیں سوچ رہے تھے۔ آخر طے پایا کہ ان فقیروں کو اجمیر سے نکال دیا جائے۔ انہوں نے اپنے چند آدمیوں کو حضرت معین الدینؒ کے پاس بھیجا۔

''آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اجمیر میں آپ نہیں رہ سکتے اور انا ساگر سے پانی بھی نہیں لے سکتے۔''

''سب ہی لوگ اس تالاب سے پانی لے جاتے ہیں اگر تھوڑا پانی ہم استعمال کرلیتے ہیں تو کسی کا کیا نقصان ہے؟''

''وہ لوگ ہمارے دھرم کے ہیں۔ یہ پوتر جل ہے' تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔''

بہت بحث طول پکڑنے لگی تو خواجہ معین الدینؒ تشریف لائے۔ ''صرف ایک مشکیزہ پانی لینے کی اجازت دے دو۔ اس کے بعد ہم قسم سے پانی نہیں مانگیں گے۔''

''ٹھیک ہے ایک مشکیزہ لے لو۔ اس کے بعد اجازت نہیں ہوگی۔'' ایک پروہت نے آگے بڑھ کر کہا۔

آپ نے ایک خادم کو اشارہ کیا کہ مشکیزہ لاکر ایک مشکیزہ پانی لے لو۔ خادم مشکیزہ لینے چلا گیا اور تمام پروہت خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ راستے میں باتیں کرتے جارہے تھے کہ ایک مشکیزہ کتنے دن چلے گا۔ پیاس تنگ کرے گی تو خود بھاگ جائیں گے۔ رات بھر میں تھی دوسرے دن ہندو خوشی سے ناچتے' گاتے' بجاتے اپنے گناہ دھونے انا ساگر کی طرف روانہ ہوئے۔ دل میں سوچتے جاتے تھے کہ اب تک تو مسلمان فقیر بھاگ چکے ہوں گے۔

یہ ہندو' انا ساگر کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تالاب بالکل سوکھا پڑا ہے۔ پانی کہاں چلا گیا۔ یہ کوئی سوچنے والی بات بھی ہی نہیں۔ شور مچاتے' واویلا کرتے وہ خیمے کی طرف بھاگے۔

''انا ساگر خشک ہوگیا۔''

''ایک قطرہ پانی بھی وہاں نہیں۔''

''فقیروں نے سارا پانی چرا لیا۔''

یہ خبر ایسی تھی کہ جس نے سنی تصدیق کے لیے تالاب کی طرف بھاگا۔ اجمیر اور اس کے مضافات کے ہندو انا ساگر تالاب پر جمع ہوگئے۔ لوگ اداس اور افسردہ تھے۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر درویشوں کی طرف دیکھ لیتے تھے جو اطمینان سے بیٹھے ذکر و عبادت میں مشغول تھے۔ تھوڑی دیر میں راجا کے افسران بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سوکھے ہوئے تالاب کو دیکھا اور پھر دور بیٹھے فقیروں کو دیکھا۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے بپھرے ہوئے مجمع کو سپاہیوں کے ذریعے وہیں روکا اور خود حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں نہایت احترام سے بٹھایا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

''بابا جی! انا ساگر کا پانی خشک ہوگیا ہے تمام لوگ سخت پریشان ہیں' ہمیں معلوم ہے یہ کیوں ہوا ہے۔ اب آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جتنا پانی چاہیں استعمال کریں۔''

''ہم نے تو آپ لوگوں کی اجازت سے ایک مشکیزہ پانی لیا تھا۔ وہ پانی ہم آپ کو لوٹا دیتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا اور خادم کو حکم دیا۔

خادم نے پانی سے بھرا مشکیزہ اٹھایا اور لے جاکر انا ساگر میں انڈیل دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پورا تالاب اس ایک مشکیزہ میں بند ہوگیا تھا۔ مشکیزے کا پانی انڈیلتے ہی انا ساگر میں پانی بھرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے تالاب کا پانی کناروں کا منہ چومنے لگا۔ لوگ تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ کئی ایک نے ''دھن ہو مہاراج خواجہ کی'' کے نعرے بلند کیے۔

یہ ایسی کرامت تھی جو تقریباً پورے اجمیر کے سامنے ظہور میں آئی تھی۔ سب نے اپنی آنکھوں سے تالاب کو بھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے دل اپنے مذہب کی طرف سے ہٹنے لگے۔ بعض شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئے بعض نے ہمت کی اور حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا وہ بھی متاثر ضرور ہوئے۔ اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ بھی حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگے اور ان کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔

☆☆☆

ترائن کے مقام پر شہاب الدین غوری اور راجا پرتھوی راج کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ دونوں فریقین مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ خلجی' غوری اور خراسانی امرا آئے تھے۔ پرتھوی راج نے ہندوستان بھر کے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملایا تھا۔ ہندو دھرم کی بقا کا سوال تھا۔ ان میں سے ہر ایک مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔ دوسری طرف شہاب الدین غوری کا لشکر بھی ہندوستان میں دین اسلام کے جذبہ دل میں لے کر آیا تھا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔ پورا دن گزر گیا۔ ایک سپاہی کے قدم بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ دوسرے دن بھی جنگ کا نقشہ یہی رہا۔ دونوں طرف کی فوجیں نہایت پامردی سے لڑ رہی تھیں۔ دن بھر جنگ جاری رہتی اور شام کو کسی نتیجے کے بغیر تلواریں نیام میں چلی جاتیں۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری رہتا کبھی دوسرے کا۔

جب اسی کیفیت میں کئی دن گزر گئے تو سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ آئے ہوئے امرا میں بددلی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ وہ تو یہ سوچ کر شہاب الدین کے ساتھ چلے آئے تھے کہ ہندوستر نوالہ ہیں۔ جنگ کا فیصلہ ہوتے ہی خوب مال و دولت ہاتھ لگے گا لیکن راجا کی فوجیں جی کھول کر داد شجاعت دے رہی تھیں' لہٰذا جنگ کا فیصلہ جلدی ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

مسلمانوں کی اس بددلی کو راجا پرتھوی راج نے محسوس کرلیا اور اس کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس کے سپاہیوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کردیے۔ اب مسلمانوں کے قدم بالکل ہی

اکھڑ گئے۔ شکست کے بادل منڈلانے لگے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ شہاب الدین غوری زخمی ہوگیا۔ اسے اپنے سرداروں پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کی فی الحال قلعے کا دفاع چھوڑ کر غزنیں واپس لوٹ جائے۔ اس نے اپنی فوجوں کو نکال لیا۔ آسمان نے یہ منظر بڑے غور سے دیکھا کہ پرتھوی راج بھاگتی ہوئی مسلمان فوجوں کا تعاقب کررہا ہے۔ پرتھوی راج نے بڑی دور تک مسلمان سپاہیوں کا تعاقب کیا اور پھر واپس آکر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

اسلامی لشکر غزنیں واپس لوٹ گیا تھا لیکن قلعہ بھٹنڈہ اب بھی تسخیر نہیں ہوسکا تھا۔ مسلمان شہادت کے جذبے سے سرشار تھے اور کسی طرح ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھے۔ جب یہ محاصرہ طول کھینچنے لگا تو راجا نے اپنے لڑکے ''کولا'' کو قلعے کی تسخیر پر مامور کیا اور خود اجمیر واپس لوٹ گیا۔

راستے بھر اس کے نام کی جے جے کار ہوتی رہی۔ جس طرف سے گزر ہندوؤں نے کسی اوتار کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اجمیر کو دلہن کی طرح سجادیا گیا تھا۔ جب وہ اجمیر میں داخل ہوا' مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بج رہے تھے۔ گیندے اور گلاب کے پھول سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ کوٹھے ناریوں سے اور گلیاں جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ راجا جونہی اجمیر میں داخل ہوا' محل میں جانے کے بجائے اناساگر کے قریب بنے ہوئے بڑے مندر میں پہنچ گیا تاکہ دیوتا اس سے خوش ہوں۔ ابھی اس نے مندر میں قدم ہی رکھا تھا کہ اذان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ کیسی آواز ہے۔ اجمیر میں اذان کی آواز؟'' اس نے قریب کھڑے ہوئے اپنے عمّال سے پوچھا۔

''مہاراج' کچھ دنوں سے ایک فقیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر ٹھہرا ہے۔''

''میں کچھ دیر اجمیر سے باہر کیا رہا' یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اس مسلمان فقیر کی اتنی ہمت!''

وہ اتنا برہم تھا کہ پوجا پاٹ بھی بھول گیا۔ الٹے قدموں مندر سے نکل گیا۔ ہاتھی پر بیٹھ سیدھا اپنے محل پہنچ گیا۔ عمّال اور امرا ہاتھ باندھ کر حاضر ہوگئے۔

''اس مسلمان فقیر کو فوراً اجمیر سے نکال دو۔ میں ایک پل کے لیے اس کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔''

''مہاراج' اب یہ اتنا آسان نہیں رہا۔''

''کیا مطلب؟ میں نے شہاب الدین غوری کو فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ یہ فقیر کس گنتی میں ہے۔''

''مہاراج' شہاب الدین کی بات اور ہے۔ یہ فقیر لوگ ہیں۔ دلوں پر حکومت کرتے ہیں' ان فقیروں نے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو عوام اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

''میری تلوار ہر بغاوت کو کچل دے گی۔''

''مہاراج' بدھی سے کام لیجیے۔'' ایک پنڈت نے کھڑے ہوکر کہا ''کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''میرا کام تلوار چلانا ہے۔ بدھی تم استعمال کرو۔''

''پھر یہ کام ہم پر چھوڑ دیجیے۔ ہم اسے یہاں سے نکال کردم لیں گے' لیکن دھیرج سے۔''

''ٹھیک ہے' تم جو کرسکتے ہو کرو۔''

ان پنڈتوں نے اکیلے میں راجا سے ملاقات کی اور دیر تک اسے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ طے یہ پایا کہ پہلے عوام کی عقیدت کو کم کیا جائے۔ ایک طرف یہ بات پھیلا دی کہ یہ اجنبی درویش دراصل شہاب الدین محمد غوری کا جاسوس ہے، دوسری طرف اپنے کچھ ملازموں کو اس کام پر متعین کیا کہ وہ اس درویش اور اس کے پیروکاروں کی خامیاں تلاش کریں اور راجا کو بتائیں تاکہ ان خامیوں کو عوام میں پھیلایا جائے یا ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس درویش کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔

اس حکم کو سنتے ہی یہ ملازم ادھر ادھر پھیل گئے۔ کچھ نے یہ وتیرہ اختیار کرلیا کہ عقیدت مند کا روپ دھار کر آپ کے پاس وقت بسر کرنے لگے۔ کبھی کبھی رات کو بھی وہیں رک جاتے تھے۔

ان لوگوں نے شب و روز میں کوئی بات بھی ایسی نہیں دیکھی جو آداب واخلاق کے منافی ہو۔ اللہ کے ان نیک بندوں کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح تھیں۔ بے ہودہ کوئی تو کجا کھل کر قہقہے بھی نہیں لگتے تھے۔ زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ کہیں سے تلاوت کی آواز آرہی ہے کوئی نوافل ادا کررہا ہے' کبھی مریدین حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور حضرت خواجہ بزرگ حکمت ودانائی کے موتی نچھاور کررہے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں جو زہر بھرا گیا تھا' اس محبتِ نیک سے رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا۔ دلوں کے پتھر سے چشمے پھوٹنے کے دن آگئے۔ جذبوں کے سوکھے درخت برگ وبار لانے لگے۔ نفرت کی جگہ خاموش محبت نے لے لی۔

ایک دن محفل سجی ہوئی تھی۔ باہر چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی' خیمے کے اندر باتوں کی روشنی۔ سب مؤدب بیٹھے تھے

حضرت خواجہ معین الدینؒ واعظ وتلقین میں مشغول تھے۔ راجا کے آدمی بھی اس دن موجود تھے۔

آپ نے فرمایا ''درویش وہ ہے کہ جس کے پاس جو بھی عنایت لے کر آئے تو اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرے۔'' اور پھر آپ نے حکومتی اشخاص کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا۔ ''آپ کی اگر کوئی حاجت ہو تو بتائیں۔''

یہ حضرات اس نرم سلوک کو دیکھ کر اپنا راز پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ ''حضور! ہمیں آپ کی خامیاں تلاش کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔'' ان لوگوں نے بہ یک زبان کہا۔

''اگر کوئی خامی نظر آئی ہو تو بتائیں تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔'' آپ نے اس عاجزانہ انداز میں کہا کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ لوگ کس مٹی کے بنے ہیں۔ راز کھل جانے کے بعد بھی برہمی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، انہوں نے سوچا اور سب کے سب آپ کے پاؤں میں گر پڑے۔

''حضور' ہم اسلام لے آئے۔ ہمیں قبول کیجیے۔ بے شک اسی کا مذہب سچا ہے ہم اب تک اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ آپ نے ہمیں روشنی دکھائی ہے۔ ایسا ظرف تو ہم نے بادشاہوں میں بھی نہیں دیکھا جس کا مظاہرہ آپ نے کیا۔''

آپ نے انہیں اٹھایا۔ شفقت سے ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ابھی تم اپنے اسلام کو ظاہر مت کرنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ یہ دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ آتے جاتے رہنا۔''

شرمندگی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ وہ سب اٹھے اور خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب انہیں راجا کو یہاں کے حالات سے مطلع کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اپنا راز ظاہر کیے بغیر جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے' بے کم وکاست بیان کردیں گے۔

انہوں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا' راجا کے گوش گزار کردیا۔ راجا کا یہ حربہ بھی ناکام ہوگیا۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا طریقہ اختیار کرے۔ اس کے مشیروں نے اسے پھر ایک ترکیب سجھادی۔ راجا کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک اشارہ کیا اور حسین ترین ہندو عورتیں اس کے سامنے حاضر ہوگئیں۔ ان عورتوں کا سندر روپ دیکھ کر ایک مرتبہ راجا کا دل بھی بے ایمان ہوگیا۔ ان کا لباس' ان کی ادائیں' قاتل مسکراہٹ ایسی تھی کہ بڑے سے بڑے زاہد کے قدم بھی لڑکھڑا جائیں۔ راجا کو یقین ہوگیا کہ اس کا یہ ہتھیار ضرور کامیاب ہوگا۔

''ناریو! تمہیں اپنی سندرتا پر بڑا ناز ہے؟''

''کیوں نہ ہو۔ ہم تو وہ ہیں کہ دیوتا بھی ہمیں للچا کر دیکھتے ہیں۔''

''کیا تم پتھر کو جونک لگا سکتی ہو؟''

''مہاراج' حکم تو کریں۔''

''تمہیں معلوم ہے' کچھ دنوں سے ایک فقیر اناساگر کے قریب آکر ٹھہرا ہے۔''

''ٹھہرا تو ہے۔''

''تم اس کے پاس جاؤ اور اسے بہکانے کی کوشش کرو۔''

''کوشش کیسی مہاراج' کسی کوشش میں اتارنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس فقیر کی کیا حیثیت ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی پگھل جائے گا۔''

''اگر تم کامیاب ہوگئیں تو منہ مانگا انعام ملے گا۔''

''آپ کا اشیرواد ہی ہمارا انعام ہے۔'' ان عورتوں نے کہا۔

ان عورتوں کے لیے بظاہر یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اتنی آسانی سے تیار ہوگئی تھیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا سابقہ ایسی شخصیت سے پڑنے والا ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو حقیر ذرے کی حیثیت بھی نہیں دیتا۔ جو اپنی خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی جس کے دل میں جاگزیں ہے۔ جس نے جمالِ الٰہی سے آنکھیں دوچار کی ہیں۔ دنیاوی حسن کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ان عورتوں نے سولہ سنگھار کیا۔ آفت بن کر' غضب میں ڈھل کر بارگاہ سنجری میں پہنچ گئیں حضرت خواجہ بزرگ کے ساتھیوں نے ان نئی مصیبتوں کو ایک نظر دیکھا اور پلکوں کی جھالر سے آنکھوں کی کھڑکیاں بند کرلیں۔ یہ ایمان شکار عورتیں جونہی حضرت خواجہ معین الدینؒ کے سامنے پہنچیں اور حضرت نے آنکھ اٹھا کر خفیف مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا' کسی انجانی قوت نے ان عورتوں کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے چہروں کو ڈھانپ لیں۔ ان کے ہاتھ اپنی اوڑھنیوں تک گئے اور گھونگٹ نکال کر بیٹھ گئیں۔

''کہو میری بیٹیو! کون سی ضرورت تمہیں یہاں لے آئی؟''

''حضور' ہمیں ایک مسئلہ پوچھنا تھا۔''

''تم اپنا مسئلہ کسی کے ہاتھ کہلوا بھیجتیں تو اچھا تھا۔ بہرحال پوچھو' کیا پوچھنا ہے۔''

''پوچھنا یہ تھا کہ آپ کے مذہب میں عورتوں کا کیا مقام

ہے ہ'ان عورتوں نے اپنا حال چھپانے کے لیے یہ مسئلہ پوچھ لیا تاکہ یہی سمجھا جائے کہ وہ صرف مسئلہ پوچھنے آئی تھیں۔ ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت نے اختصار کے ساتھ ان کے مسئلے پر تقریر کی۔ جب اچھی طرح ان کی تشفی ہوگئی تو انہوں نے اجازت طلب کی۔ خاموشی سے اٹھیں اور گھونگھٹ نکالے نکالے وہاں سے چلی آئیں۔ وہ جس مقصد سے آئی تھیں دھرا کا دھرا رہ گیا۔

یہ عورتیں حیران تھیں کہ انہیں کس قوت نے گھونگھٹ نکالنے پر مجبور کیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگیں کہ انہوں نے اپنے راجا کی لاج نہیں رکھی۔ انعام کا لالچ الگ اکسا رہا تھا۔ انہوں نے پھر طے کیا کہ وہ وہاں جائیں گی اور اس فقیر کو پکانے کی کوشش کریں گی۔ دوسرے دن وہ پھر بن سنور کر پہنچ گئیں۔ کسی قوت نے پھر انہیں بے بس کر دیا۔ انہوں نے پھر گھونگھٹ نکالا لے' بدن کو اچھی طرح ڈھانپا اور اپنا مسئلہ بیان کرنے بیٹھ گئیں۔

غرور و تکبر کو پاؤں کی پازیب بنا کر وہ ہندو عورتیں راجا پرتھوی راج کے دربار میں حاضر ہوگئیں۔ ان کے چہروں پر شرمندگی کی گھٹا ئیں کچھ کہنے سے قاصر تھیں' راجا کے طعنے سن رہی تھیں اور خاموش تھیں۔ انہیں اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آخر ایک نے ہمت کر کے کہا ''مہاراج! وہ فقیر بہت بڑا جادوگر ہے' اس کے سامنے پہنچتے ہی ہماری حالت غیر ہو جاتی تھی ہم اپنے چہرے ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کے پاس بہت شکتی ہے۔''

''بس اب آگے کچھ مت کہنا' دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

وہ عورتیں اس طرح وہاں سے اٹھ کر بھاگیں جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں وہ رک گئیں تو راجا اپنا فیصلہ نہ تبدیل کر دے اور انہیں اپنی جان گنوانا پڑ جائے۔ وہ تو اسے بھی فقیر کی کرامت سمجھ رہی تھیں کہ راجا نے ان کو قتل کا حکم جاری نہیں کر دیا۔

پرتھوی راج غصے میں سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر نجومیوں کی پیش گوئی یاد آرہی تھی۔ کہیں یہ فقیر وہی تو نہیں جو اس کی سلطنت کو خاک میں ملانے آیا ہے۔ مجھے جلد سے جلد اس کا کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ پہلے خیال آیا کہ وہ خود جا کر اس فقیر سے معافی طلب کرے لیکن پھر شاہی وقار آڑے آگیا۔ میں راجا ہو کر اس فقیر کے پاس خود چل کر جاؤں۔ یہ کام تو میرا کوئی پنڈت بھی کر سکتا ہے۔ اجمیر میں بڑے بڑے گیانی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی مدد لینی چاہئے۔

اس نے بڑے مندر کے سب سے بڑے پجاری کو بلایا۔

''رام دیو! دیکھ رہے ہو مسلمان درویشوں نے کیا دھم مچا رکھا ہے؟ لوگ اپنا دھرم چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟''

''رام رام مہاراج۔ کون ایسا چاہے گا۔'' رام دیو نے کہا۔

''پھر تم اس کا کوئی اپائے کرو۔''

''جو آپ کا حکم مہاراج۔''

''تو من تیل چراغوں میں جلا سکتے ہو۔ ایک فقیر کو شکست نہیں دے سکتے۔ جاؤ اور اس کی باتوں کا توڑ کرو۔ اسے اجمیر چھوڑنے پر مجبور کر دو۔''

''ابھی لو مہاراج۔ میں ابھی اپنے چیلوں کو لے کر وہاں پہنچتا ہوں۔''

رام دیو سیدھا مندر پہنچا۔ اپنے شاگردوں کو ساتھ لیا۔ موٹی موٹی کتابیں اٹھائیں اور حضرت خواجہ معین الدین ؒ کے پاس پہنچ گیا۔ مریدین ارد گرد مؤدب بیٹھے تھے۔ علمی مجلس برپا تھی کہ آپ کی نظر رام دیو اور اس کے ساتھیوں پر پڑی۔

''اللہ کی رحمت ہے۔ مہمان تشریف لائے ہیں۔ انہیں بیٹھنے کو جگہ دو۔'' آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا۔

''ہم بیٹھنے نہیں آئے۔ آپ سے صاف صاف باتیں کرنے آئے ہیں۔''

''میرے مہربان۔ باتیں تو بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں۔ کہئے کیا کہنا ہے؟''

''آپ نے اجمیر میں بڑا فساد برپا کیا ہے۔'' رام دیو نے کہنا شروع کیا ''لوگوں کو ان کے مذہب سے بدظن کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی زمین نہیں ہے' راجا کا اجمیر ہے۔ بس جتنے دن رہ لیے بہت ہے' اب آپ اجمیر چھوڑ دیں۔''

وہ بولتا رہا اور آپ سر جھکائے سنتے رہے۔ آخر کار تھک ہار کے خود ہی چپ ہو گیا۔ آپ اس کی طرف کچھ دیر دیکھتے رہے کہ شاید کچھ اور کہے۔

''اور کچھ کہنا ہے؟'' آپ نے فرمایا۔

''جو کچھ کہہ لیا یہی بہت ہے۔ پہلے آپ ان باتوں کا جواب دیں۔''

''رام دیو! میں تیری پیشانی پر اسلام کا نور دیکھ رہا ہوں اور تو ہے کہ میرے ساتھ مناظرہ کر رہا ہے۔ میں تجھے جنت میں دیکھ رہا ہوں اور تو ہے کہ جہنمیوں کی وکالت کر رہا ہے۔''

ان لفظوں میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ ہونٹوں پر تالے پڑ

گیا' بھول گیا کہ کس مقصد سے آیا تھا۔ بس خواجہ صاحب کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

''سوئی کہاں ہے' ہولکھ پڑھو۔''

وہ جیسے خواب سے جاگ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ کلمہ پڑھا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ''میرا اسلام قبول کرو باباجی' میرا اسلام قبول کرو۔''

''اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اٹھو' آج سے تمہارا اسلامی نام محمد عبداللہ ہے۔''

رام دیو کے چیلے یہ سب کارروائی بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ پنڈت رام دیو واقعی مسلمان ہو گیا ہے تو ان پر ہیبت طاری ہو گئی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگے اور سیدھے پرتھوی راج کے پاس جا کر دم لیا۔

دھرم کا رکھوالا۔ بڑے مندر کا سب سے بڑا پجاری۔ شکار کرنے گیا تھا خود شکار ہو گیا۔ آنکھیں کھولنے کے لیے یہ کافی تھا۔ پرتھوی راج کو یقین آگیا کہ اس فتنے کو آسانی سے نہیں دبایا جا سکتا۔ اس وقت اس کے غضب کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انعام کی لالچ اس کے ارد گرد جلنے لگی لیکن اب وقت نکل چکا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس فقیر نے اجمیر کے ہندوؤں کو اپنے اس میں لپیٹ لیا ہے۔ اگر اس کے خلاف طاقت استعمال کی گئی تو ممکن ہے پرجا اس کے حق میں اٹھ کھڑی ہو۔ اسے یہاں سے ہٹا بھی دیا گیا تو وہ کہیں اور بسیرا کر لے گا۔ جب تک لوگ اس کے ساتھ ہیں اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ سوچ رہا تھا' اسے ابتدا میں ہی اس سیلاب پر بند باندھ دینا چاہئے تھا۔ اب بہت سارا وقت گزر گیا۔

اخلاق کریمانہ اور شفقت کا برتاؤ وہ ہتھیار ہے جس سے چٹانوں کو ریزہ ریزہ کیا جا سکتا ہے۔ سمندروں کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ نفرتوں کو محبت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے یہی کیا تھا۔ وہ جب اجمیر میں وارد ہوئے تھے لوگ مسلمانوں کا نام سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن جیسے جیسے خواجہ صاحب کے قریب ہونے لگے' ان کے گن گانے لگے۔ انہوں نے کسی کو جبراً اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ انہوں نے حق کا راستہ دکھایا۔ ضرورت مندوں کی مدد کی۔ دکھی دلوں کی دل جوئی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے بڑا پجاری ان کا خادم بن کر رہنے پر مجبور ہو گیا۔ خدا کی خلقت ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر آنے لگی۔ پرتھوی راج کے روکنے کے باوجود خلق خدا ان ساگر کے قریب آپ کی زیارت کو آنے لگی۔

''مرشد!'' رام دیو نے جواب محمد عبداللہ ہو چکا تھا ایک دن آپ سے درخواست کی ''میرے پاس جھالرہ میں ایک زمین کا ٹکڑا ہے' وہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیں اور آبادی میں چل کر قیام کریں تاکہ مخلوق خدا یہاں تک آنے کی زحمت سے بچ جائے۔ وہیں مسجد بھی تعمیر کر لیں گے اور آپ کے لیے حجرہ بھی بن جائے گا۔''

آپ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور نئی زمین پر (جہاں اب آپ کا مزار ہے) منتقل ہو گئے۔ سب سے پہلے آپ نے ''مسجد اولیا'' کی بنیاد رکھی۔ مطبخ خانہ اور مریدین کے لیے جماعت خانہ کی تعمیر بھی شروع کرا دی۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ راجا کے کچھ سپاہی گشت پر تھے کہ انہیں دور سے چراغ جلتے نظر آئے جیسے کوئی چراغاں کر رہا ہو۔ ''دیوالی تو ہے نہیں پھر یہ چراغاں کیسا۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔''

''ارے یہ تو رام دیو کی زمین ہے۔ وہ کیا یہاں محل بنوا رہا ہے؟''

سپاہی قریب پہنچے تو کچھ مزدوروں کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔

''یہ مزدور تو معلوم نہیں ہوتے۔ ہندو بھی نہیں ہیں۔ آؤ معلوم کرتے ہیں۔'' یہ سپاہی اور نزدیک آگئے ''اے! کیا کر رہے ہو؟''

''یہاں مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔''

''مسجد! اجمیر میں مسجد! کس نے کہا ہے تم سے کہ مسجد بناؤ؟''

''ہمارے مرشد حضرت معین الدین ؒ نے اب یہاں قیام کر لیا ہے۔ وہ جہاں قیام کرتے ہیں مسجد تعمیر ہوتی ہے۔ اب تو تم سمجھ گئے ہو گے۔''

''اب ہم بالکل سمجھ گئے اور جا کر راجا کو بھی سمجھاتے ہیں۔''

وہ سپاہی بھاگم بھاگ داروغہ کے پاس گئے' داروغہ نے یہ خبر اپنے سے بڑے افسر کو پہنچائی۔ صبح تک اس خبر نے دربار میں ہلچل مچا دی۔

''مسلمان رات کو چراغوں کی روشنی میں مسجد تعمیر کر رہے ہیں۔''

رانی ماں نے بھی سنا۔ بیٹے کو ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ نجومیوں کا کہنا ٹھیک ہی نکلا۔ وہ مسلمان درویش آ بھی گیا اور تم اسے روک نہیں سکے۔ اب اس نے قدم جما لیے ہیں۔ تمہاری رعایا اس کے گن گانے لگی ہے۔ اس سے مصالحت کر لو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ لیکن پرتھوی راج کا تکبر کسی نصیحت پر عمل کرنے نہیں دیتا تھا۔ ہر وار اوچھا پڑ رہا تھا لیکن وہ ہر بار اپنا

داؤ چلتا تھا۔ اس بار اس نے شہر بھر میں اعلان کرادیا کہ کوئی دکاندار معین الدینؒ اور اس کے درویشوں کو تیل نہ دے۔ کوئی ہندو بھی اگر تیل لینے آئے تو اچھی طرح چھان بین کرلی جائے کہ وہ یہ تیل کس کے لیے خرید رہا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کا ایک خادم تیل خریدنے بازار آیا تو اسے یہ حکم سننے کو ملا۔ ہر دکاندار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ''ہم مسلمانوں کے ہاتھوں تیل فروخت کر کے کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے۔''

راجا کے خوف سے آپ کے ہندو عقیدت مندوں نے آپ کے لیے تیل فراہم کرنے سے معذرت کرلی اگر راجا کو معلوم ہوگیا تو ان کی خیر نہیں۔ راجا کے جاسوس ہر اس شخص کا پیچھا کر رہے تھے جو کسی دکان سے تیل خریدتا ہوا نظر آتا تھا۔

جب آپ کے مریدوں نے اپنی تشویش سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ یہ کہہ کر چپ ہوگئے ''انشاء اللہ اس کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔'' مغرب کا وقت ہوا اور آپ وضو کرنے کے لیے بیٹھے تو ایک برتن رکھ لیا جس میں وضو کا پانی جمع ہوتا رہا۔ جب وضو فرما چکے تو سب مریدوں کو بلایا۔

''اسے چراغوں میں ڈال دو۔ انشاء اللہ تیل کی طرح جلے گا۔''

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مرید پریشان تھے کہ اگر روشنی کا انتظام نہ ہوا تو مسجد کی تعمیر کا کام رک جائے گا۔ جب آپ کا حکم سنا تو وضو کے اس پانی کو چراغوں میں ڈال دیا۔ چراغ جلائے تو اندھیرے میں چراغاں ہوگیا۔

راجا تک خبر پہنچی کہ فقیر کے چراغ تیل کے بغیر ہی جل رہے ہیں تو سخت حیران ہوا لیکن بدبختی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ قائل ہونے کے بجائے مزید دشمنی پر آمادہ ہوگیا۔ حضرت معین الدینؒ کی روحانیت کا کمال تھا جس نے راجا کی طاقت کو کمزوری میں بدل دیا تھا۔ وہ چاہتا تو آپ کے خلاف تلوار اٹھا سکتا تھا لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے درباریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔

''مسلمانوں کے فقیر معین الدینؒ نے اجمیر میں جو صورتِ حال پیدا کردی ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ اگر آج اس کا تدارک نہ کیا گیا تو آنے والے دنوں میں بہت بڑا فتنہ پیدا کرے گا۔ آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ کیا اس کے خلاف فوج کشی کروں؟''

''مہاراج! اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ جادوگر ہے' ہمارے لشکر کو جادو کے زور سے پتھر کا بنادے گا۔ جادو کا توڑ تو جادو ہی سے کیا جاسکتا ہے۔''

''کون ایسا ہے جو اس کے جادو کو توڑ سکتا ہے۔''

''ان دنوں جے پال نامی جادوگر کا سکہ چلتا ہے۔ ہندوستان میں اس سے بڑا جادوگر نہیں ہے۔'' راجا کے وزیر نے کہا۔

''دیر کس بات کی ہے۔ جے پال کو جلدی بلاؤ تاکہ ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا ملے۔''

چند دنوں کے بعد جے پال کو راجا کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ راجا کے لیے جے پال آخری سہارا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس مسلمان فقیر کو شکستِ فاش دے گا لہٰذا جے پال کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔

''وہ میرے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا۔ آپ تاریخ مقرر کریں اسے مقابلے کی دعوت دیں' پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔'' جے پال نے بڑے تکبر سے کہا۔

راجا نے تاریخ کا اعلان کیا۔ اس کی اطلاع خواجہ معین الدینؒ کو بھی پہنچادی گئی۔ آپ نے بھکانہ حرکت اور تاریخ کے بارے میں سنا اور مسکرا کر خاموش ہوگئے۔

راجا نے اس مقابلے کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ اس کے آدمی گرد و نواح کے دیہات میں جا کر خوب ڈھول بجا بجا کے پیٹتے اور اعلان کرتے ''مسلمان جادوگر اور ہندو جادوگر کا مقابلہ ہوگا۔''

لوگوں نے کشتی کے مقابلے دیکھے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جنگیں دیکھی تھیں۔ لیکن جادوگروں کا مقابلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے مسلمان ہی نہیں دیکھے تھے۔ ان کے لیے یہ اعلان بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ جیسے جیسے مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی' لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بے شمار لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ مقررہ تاریخ سے پہلے ''جھالرہ'' کے مقابل وسیع و عریض میدان میں لوگوں نے پڑاؤ ڈال لیا جہاں یہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ گلی بازاروں میں اس مقابلے کے چرچے ہو رہے تھے۔ جے پال کی طاقت سے سب واقف تھے اور پھر اس کے ساتھ دیگر جادوگر بھی آنے والے تھے' لہٰذا بیشتر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اس مقابلے میں جے پال کی فتح ہوگی اور مسلمان فقیر کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔

مقابلے سے ایک دن پہلے ہاتھی' بلیاں اور تختے لگا کر ایک اونچا اسٹیج بنادیا گیا جہاں راجا کو بیٹھنا تھا۔ رات ہی سے راجا کے سپاہیوں نے پورے علاقے کو گھیر لیا تاکہ مسلمان فرار

ہونے کی کوشش نہ کریں۔ راجا انہیں جے پال کے ذریعے میدان میں شکست دینا چاہتا تھا۔ سب کو دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھ لو' مسلمان کتنے بڑے جادوگر ہیں۔ اسے یقین تھا کہ جے پال یہ کام کر دکھائے گا۔

ڈھول اور نفیریوں کی آواز سے پورا میدان گونج رہا تھا۔ لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ ایک طرف میدان تھا جس میں انسانوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ دوسری جانب ایک مسجد کی چند دیواریں اور کچھ کچے پکے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اچانک اعلان ہوا' پرتھوی راج کی سواری یہ مقابلے دیکھنے کے لیے میدان کی طرف آرہی تھی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے اور پھر خاموشی چھاگئی۔ پرتھوی راج' اراکین سلطنت کے ساتھ اس اونچے ''اسٹیج'' کی طرف بڑھ گیا۔ اس اونچی جگہ پہنچ کر اس نے نعیر ہوتی ہوئی مسجد کی طرف نفرت سے دیکھا اور نفرت سے گردن بلند کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں جے پال اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگیا۔ پورا میدان ایک مرتبہ ''جے پال کی جے'' کے نعروں سے گونج گیا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اور آپ کے ساتھی دور سے ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے اور ہندوؤں کی جہالت پر مسکرا رہے تھے۔

''مسلمان تو ابھی تک میدان میں اترے نہیں' کہاں ہے وہ مسلمان فقیر' ہم کس سے مقابلہ کریں گے؟'' جے پال نے راجا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مقابلے پر آنے کی ہمت ہی کہاں ہوگی' کہیں دبکے ہوئے ہوں گے۔'' اراکین سلطنت میں سے کسی نے کہا اور کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔

''انہیں خبر تو کردی گئی تھی' پھر وہ آئے کیوں نہیں' کہیں بھاگ تو نہیں گئے؟''

''اب تو انہیں بلانے کے لیے بھی جادو کرنا پڑے گا۔''

میدان میں موجود لوگوں کی بے چینی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جے پال کے غرور و تکبر میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے خوف کی وجہ سے مسلمان فقیر میدان میں آنے سے گریز کر رہا ہے۔

''حضور! ہمیں بھی میدان میں چل کر بیٹھنا چاہئے ورنہ یہ لوگ کہیں گے کہ اسلام کو مقابل آنے کی ہمت نہیں پڑی۔'' رام دیو نے کہا جو عبداللہ ہو چکے تھے۔

''اچھا! یہ بات ہے تو اسلام کی سربلندی کے لیے ہم بھی وہاں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ویسے ہمیں جادو وغیرہ تو آتا نہیں ہے۔'' آپ نے مسکرا کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

آپ کا اشارہ پاتے ہی مریدین نے کھلے میدان میں صفیں بچھادیں۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما ہوگئے۔ ہجوم میں زندگی کہ لہری دوڑ گئی۔ جے پال اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس پہنچ گیا۔ مجمع سانسیں روکے کھڑا تھا کہ نہ جانے کیا ظہور میں آئے۔

''بابا جی! پہلے میں اپنا جادو دکھاؤں یا آپ پہل کریں گے؟'' جے پال نے آپ سے پوچھا۔

''تمہیں جو کرنا ہے کرو۔'' آپ نے فرمایا اور ذکر میں مشغول ہوگئے۔

جے پال نے یہ جواب سنا اور اپنی مالا پر کوئی منتر پڑھنے لگا۔ اچانک بے شمار سانپ نمودار ہوئے اور پھنکارتے ہوئے حضرت خواجہ بزرگ کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگ خوف زدہ ہوگئے کہ اب یہ سانپ فقیر بابا اور ان کے ساتھیوں کو یقیناً ڈس لیں گے۔ یہ مقابلہ تو پہلے جادو ہی میں ختم ہوجائے گا۔ ہر آنکھ اس لمحے کی منتظر تھی جب سانپ حضرت خواجہ اور آپ کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن یہ کیا؟ یہ سانپ جیسے ہی ان حلقوں کے قریب پہنچے جہاں حضرت اور ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے' ایک ایک کر کے مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' ایک سانپ بھی اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

''یہ کیا! تمہارے تو تمام سانپ مٹی کا ڈھیر بن گئے؟'' پرتھوی راج نے جے پال سے کہا۔

''مہاراج! یہ تو میں نے ہلکا سا جادو دکھایا تھا۔ میرے ترکش میں ابھی کئی تیر باقی ہیں' آپ دیکھتے جایئے ہوتا کیا ہے۔''

جے پال دوسرے کرتب کے لیے جنتر منتر پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ اس جادو کا اثر یہ ہوا کہ آسمان سے آگ کے شعلے برسنا شروع ہوگئے لیکن ہر شعلہ حضرت خواجہ بزرگ کے اردگرد گر رہا تھا۔ اس آگ سے آپ اور آپ کے ساتھیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ پھر یہ شعلے برسنا بند ہوگئے۔

لوگوں کی خوشی مایوسی میں بدلنے لگی تھی۔ راجا بھی جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ جے پال کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جارہا تھا۔

''مہاراج! آپ گھبرائیں نہیں بس دیکھتے جائیں۔''

جے پال نے کہا اور پھر اپنے تھیلے سے ہرن کی کھال نکالی اور اسے زمین پر بچھا کر اس پر بیٹھ گیا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اچانک وہ کھال جے پال کو لے کر فضا میں بلند ہوگئی اور وہ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ کوئی شیطانی طاقت اسے ہوا میں اِدھر اُدھر لیے پھر رہی تھی، لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجانی شروع کردیں۔

لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ''مسلمان فقیر سے کہو وہ بھی اسی طرح ہوا میں اڑ کر دکھائے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مقابلہ ہار گیا۔'' پرتھوی راج اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ معین الدینؒ کے پاس اس جادو کا توڑ نہیں ہوگا۔

مریدوں کی آنکھیں' حضرت کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں کیا ظہور میں آتا ہے۔ آپ کی کھڑاویں قریب پڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے ان کھڑاوؤں (جوتے یا چپل جو لکڑی سے بنائے جاتے تھے) کو حکم دیا ''جاؤ اور جے پال کو نیچے لاؤ۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی لاج رکھی۔ کھڑاویں فضا میں بلند ہوئیں اور جے پال کے سر پر زور زور سے برسنے لگیں۔ وہ بلبلانے لگا ہاتھ سے مالا گر پڑی۔ وہ چیختا چلاتا زمین پر اترا اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ بے بسی سے اپنے چیلوں کی طرف دیکھا جو اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔

''ہندوستان میں مجھ سے بڑا جادوگر اور کوئی نہیں۔ کوئی میرے جادو کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ حضرت معین الدینؒ جادوگر نہیں روحانی قوت کے مالک ہیں۔ انجام بخیر چاہتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ۔''

حق اور ناحق کو لوگوں نے بہ چشم خود ملاحظہ کرلیا تھا۔ جے پال اور اس کے ساتھی کیا اسلام لائے کہ اور بہت سے لوگ بھی اسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

پرتھوی راج نے یہ سوچ کر مقابلہ منعقد کرایا تھا کہ اس مقابلے میں آپ کو شکست ہوگی تو لوگ آپ کی طرف سے بدظن ہو جائیں گے لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ آپ پر لوگوں کا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

تعمیر کا کام ہزار دقتوں کے باوجود جاری تھا۔ اب آپ کے اتنے معتقد ہو گئے تھے کہ مالی امداد کی کمی نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مطبخ خانہ' جماعت خانہ' حجرہ اور مسجد اولیا تیار ہوگئی۔ آستانہ مبارک مرجع خلائق بن گیا۔ ہر وقت رونق رہنے لگی۔ لوگ اپنی مرادیں لے کر حاضر ہوتے اور جھولیاں بھر کر لے جاتے۔ آپ ہندو' مسلمان کی تفریق کے بغیر ہر ایک سے کشادہ دلی سے ملتے، لوگوں کے حق میں دعا کرتے' ذکر و فکر کی محفلیں سجاتے۔ اپنے پرائے سب فیض پاتے۔

مسجد اولیا میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نے اجمیر میں وارد ہونے کے بعد جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی روز بہ روز نزدیک تر ہوتی جارہی تھی۔ اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔

کرامات کا ظہور اور خوارق عادات کا اظہار ولایت کی دلیل نہیں اور نہ ہی اولیا اللہ بے جا اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاں جب اسلام کی سربلندی کا سوال ہو تو اللہ تعالیٰ ان میں ایسی قوت پیدا کردیتا ہے کہ جو وہ کہتے ہیں وہی ہو جاتا ہے۔ انا ساگر کے پانی کے خشک ہونے میں یہی حقیقت کارفرما تھی۔ جے پال کے جادو کا توڑ اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ ان کرامات ہی نے دشمنوں کی قلب ماہیت کی اور کفرستان میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ کچھ لوگ اسے محض قصے کہانیاں سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ بزرگ جیسی پاکیزہ زندگیاں گزارتے ہیں اس کے سامنے یہ کرامات کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

☆☆☆

راجا پرتھوی راج سے شکست کھانے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری' غزنین میں مایوسی اور بے دلی کے دن گزار رہا تھا۔ رات دن اسی خیال میں غلطاں رہتا تھا کہ کسی طرح اس شکست کا بدلہ لے۔ اسے اپنی ہمت پر بھروسا تھا لیکن امرا کی بے وفائیاں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھیں۔ اسے سرفروشوں کی جماعت چاہیے تھی۔ دور دور تک نگاہ دوڑاتا تھا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

سردیوں کی ایک رات اس کی امیدوں کے شجر پر ثمر لے آئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن نیند اب تھا کہ آنکھ لگنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں کئی مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی اور پھر لوٹ آیا۔ بے یار و مددگار۔ زخمیوں سے چور' ہراساں اور پریشان۔ کیا میں اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب ہو سکوں گا؟ اس کے دل سے ایک درد بھرا سوال ابھرا۔ اور وہ ایک سرد آہ کھینچ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی۔

''اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی سلطنت تمہیں بخشی۔ جلد اس طرف توجہ کرو اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے مزا دو۔''

ایک نورانی چہرہ بزرگ عالم خواب میں اسے بشارت دے رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اس خواب کو اپنے ذہن میں دہرایا۔ یہ میری محرومیوں کی آواز ہے یا واقعی

کوئی مجھے بشارت دے رہا تھا؟ ان بزرگ کا چہرہ اس کی آنکھوں میں آگیا۔ روشن آنکھیں، متبسم ہونٹ کشادہ پیشانی، وہ چہرہ اس کے حافظے میں ابھی تک محفوظ تھا۔

اس نے اس خواب کو ذہن سے جھٹک کر سونا چاہا لیکن نیند نے بغاوت کر دی تھی۔

صبح ہوتے ہی اس نے غزنیں کے علما فضلا کو طلب کر لیا اور سب کے سامنے اپنا خواب بیان کر کے ان سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔

''مبارک ہو۔ خواب بہت مبارک ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی جا رہی ہے۔ آپ بے خوف و خطر ہندوستان پر حملہ کر دیں۔''

''میں کن ساتھیوں پر بھروسا کر کے اتنا بڑا قدم اٹھاؤں؟''

''بشارت آپ کو مل گئی ہے۔ آپ آغاز کریں کوئی نہ کوئی صورت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔''

''وہ نورانی بزرگ کون ہو سکتے ہیں۔''

''اللہ تعالیٰ خود خواب میں نہیں آتا۔ اپنے کسی نہ کسی بندے سے کام لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان بزرگ سے کبھی آپ کی ملاقات ہو بھی جائے۔'' علما نے جواب دیا۔

علما نے امید دلائی تو اس کی ہمت بندھی۔ اس نے تن دہی سے اسلامی لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ اور غیب سے کوئی صورت پیدا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جہاد کی سرگرمیوں کا چرچا ہوا تو مختلف سردار بھی سرگرم ہو گئے۔ ایک دن سردار معین الدین تو لکی جو علاقہ تو لک کی پہاڑیوں کے سرداروں کا سرغنہ تھا شہاب الدین غوری کے پاس اس خوش خبری کے ساتھ حاضر ہوا۔

''ایک لاکھ بیس ہزار مسلح سوار جذبۂ جہاد سے سرشار آپ کے حکم کے منتظر تیار بیٹھے ہیں۔'' غیب سے امداد ملنے کی پہلی نشانی ظاہر ہو چکی تھی۔ ایک لاکھ بیس ہزار سرفروشوں کا ظاہری سہارا مل چکا تھا۔ ابھی سردار معین الدین تو لکی اس لشکر کے جانبازوں کی داستانیں سنا رہا تھا کہ چوبدار حاضر ہوا۔

''قنوج کے راجا جے چندر نے ہندوستان سے اپنا ایلچی بھیجا ہے۔ آپ سے ملنے کا خواستگار ہے۔ کہتا ہے کہ راجا کی جانب سے ایک ضروری پیغام آپ کے نام لے کر حاضر ہوا ہے۔''

''بھیج دو۔'' سلطان شہاب الدین نے کہا۔

ایلچی حاضر ہوا۔ آداب شاہی بجالانے کے بعد راجا جے چندر کا رقعہ جو شہاب الدین غوری کے نام لکھا گیا تھا، پیشِ خدمت کیا۔ لکھا تھا۔

''شہاب الدین غوری! تم دہلی پر حملہ کرو۔ میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور پوری پوری مدد کروں گا۔ مزید برآں وہ تمام راجے جو راجا پرتھوری راج کے مخالف ہیں، وہ بھی تمہارے راستے میں نہیں آئیں گے۔''

''جے چندر کو ہم سے ایسے کیا محبت ہو گئی کہ وہ ہمیں ہندوستان پر حملے کرنے کی دعوت دے رہا ہے اور سدّ راہ نہ ہونے کی عہد کر رہا ہے۔'' سلطان شہاب الدین نے ایلچی سے پوچھا۔

''آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔'' ایلچی نے عرض کیا ''راجا جے چندر اور پرتھوی راج کی آپس میں سخت مخالفت بلکہ عداوت ہے۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے چارہ جوئی کرتے رہتے ہیں۔ جے چندر نے آپ کی محبت میں نہیں بلکہ پرتھوی راج کو سبق پڑھانے کے لیے آپ کو دعوت دی ہے۔''

ایلچی کے لہجے سے صداقت کی بو آ رہی تھی۔ حقیقت نمایاں ہوتی تھی۔ شہاب الدین کی تشنگی بھی ہوائی اور خدا کے انعام پر تشکر کے آنسو بھی آنکھوں میں آ گئے۔ ایک دن میں دو دو خوش خبریاں سننے کو ملی تھیں۔ اس نے اسی وقت کاتب کو بلوایا اور پرچا لکھوایا۔

راجا جے چندر! انشاء اللہ ہم عنقریب حملہ آور ہوں گے اور راجا پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دیں گے۔''

ادھر راجا جے چندر کا ایلچی ہندوستان روانہ ہوا ادھر سلطان شہاب الدین اسلامی لشکر کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے غزنیں سے روانہ ہوا۔

منزلوں منزلوں گرد اڑاتا یہ لشکر اسلامی لاہور پہنچ گیا۔ کچھ دن آرام کرنے اور مکمل منصوبہ بندی کرنے کے بعد سلطان شہاب الدین نے اپنے ایلچی کو پرتھوی راج کے پاس روانہ کیا تاکہ اسے ہتھیار ڈالنے پر رضامند کیا جائے۔

راجا پرتھوی راج غیظ و غضب میں بھرا، دربار میں بیٹھا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین کا اجمیر میں ہی وجود اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔

''بس بہت ہو چکا۔ میری پرچا چاہے مجھ سے پھر جائے میں کل معین الدین اور اس کے ساتھیوں کو اجمیر سے نکال دوں گا پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے ایلچی کے آنے کی خبر دربار میں پہنچی۔

اس کے لیے یہ خبر چونکا دینے والی تھی کہ شہاب الدین لاہور تک آ پہنچا ہے۔

خواجہ معین الدین کا قصہ ایک طرف رہ گیا۔ وہ اب ایلچی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اراکین مہموت بیٹھے تھے، دربار میں سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ایلچی اندر آیا اور خط پیش کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

''چندا بھانٹ! اس خط کو بلند آواز سے پڑھو۔'' پرتھوی راج نے کہا اور چندا بھانٹ نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''پرتھوی راج! خون خرابے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ قلعہ سے دستبردار ہو کر اطاعت کر لو ورنہ تمہیں ہزیمت، پشیمان کا رن پڑے گا، پھر جو بھی نتیجہ ہو۔''

پرتھوی راج نے حقارت سے مسلمانوں کے ایلچی کی طرف دیکھا۔ گردن غرور سے اکڑ گئی۔ کاتب کو بلوایا اور خط لکھوانا شروع کیا۔

''شہاب الدین محمد غوری! کیا تم نے ماضی کی شکست سے کچھ نہیں سیکھا؟ ہماری بے شمار فوج کی تیاری کا تمہیں اندازہ نہیں تمام راجے میرے ساتھ ہیں۔ اگر تمہیں خود پر رحم نہیں آتا تو اپنی فوج پر رحم کرو اور پشیمان ہو کر واپس لوٹ جاؤ اور تیار رہو میرے ہاتھی تمہاری فوج کو کچلنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔''

جنگ کی تیاری اوّلیت رکھتی تھی۔ وہ خواجہ معین الدین کو نکال کر اس وقت کسی اندرونی بغاوت کو پنپنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس معاملہ میں اس کے عزائم ایک مرتبہ پھر سرد خانے میں رہ گئے۔

مسلمانوں کے ایلچی کے واپس ہوتے ہی اس نے تمام راجاؤں کی طرف قاصد دوڑا دیے۔ انہیں مذہب اور ہندوستان کے نام پر غیرت دلا کر امداد کا طالب ہوا۔

مذہب اور ہندوستان کا سوال درمیان میں تھا۔ راجاؤں کے غلبوط آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ اس میں راجا جے چندر اور اس کے چند ہم خیال راجے شامل نہیں تھے۔ تین لاکھ کا عظیم لشکر تین ہزار مست ہاتھیوں کے ساتھ راجا پرتھوی راج کے ساتھ تھا جبکہ مسلمان صرف ایک لاکھ بیس ہزار تھے۔ دونوں فوجوں نے دریائے سرسوتی کے پار مورچے لگائے۔ ایک کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا دوسرے کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا۔

جنگ کے آغاز سے قبل سلطان شہاب الدین نے اپنے فوجیوں سے مخاطب ہو کر نہایت پُرجوش تقریر کی۔ اس تقریر نے دلوں میں آگ لگا دی۔ مسلمان فوجی تقریر کے الفاظ ختم ہونے سے پہلے ہی لڑنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ان کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے سلطان نے فوج کا پہلا حصہ آگے کیا۔ پرتھوی راج کے راجپوت سپاہیوں نے بھی تلوار پر ہاتھ رکھ کر مرمٹنے کی قسم کھائی تھی۔ دونوں فوجیں ٹکرائیں تو جیسے دو پہاڑ ٹکرا گئے۔ کچھ دیر بعد شہاب الدین نے دوسرے تازہ دم جتھے کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ یہ دستہ ابھی تھکا نہیں تھا کہ فوج کا تیسرا حصہ آگے بڑھا۔ اور پھر چوتھا حصہ آ گیا۔

پرتھوی راج اپنی تمام فوج سامنے لے آیا تھا جبکہ سلطان نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ وقفے وقفے سے تازہ دم فوج سامنے لا رہا تھا۔ پرتھوی راج کی فوج کے قدم جلد ہی اکھڑ گئے۔ راجا کے مست ہاتھیوں نے اپنے ہی لشکر کو کچل کر رکھ دیا۔ جان بچانے کے لیے جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ راجا پرتھوی راج دریا کے کنارے گرفتار کر لیا گیا۔

اب سلطان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ راجا جے چندر سے اس کی پہلے ہی ساز باز ہو چکی تھی، وہ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ تیزی سے دہلی کا انتظام سنبھالا۔ اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود راجا جے چندر کی فوج اور دوسرے راجاؤں کی معیت میں اجمیر کی طرف چل دیا۔

سلطان نے اجمیر میں قدم رکھا تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اچانک اس نے اذان کی آواز سنی تو حیران رہ گیا۔ اس کفرستان میں اذان کی آواز کیسی؟

''یہ اذان کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟'' اس نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے دریافت کیا۔

''کچھ عرصے سے یہاں کچھ درویش قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کی ہے۔''

''کس طرف ہے وہ مسجد؟''

''جہاں آپ کھڑے ہیں اس سے کچھ ہی فاصلے پر۔''

''چلو، پھر نمازِ مسجد ہی میں پڑھیں گے۔''

اجمیر کے مندروں کی اداس دیواریں اس قافلے کو لبِ جھاڑہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ دور سے مسجد کے مینار ہاتھ بلند کیے نظر آئے پھر کچھ اور عمارتوں پر اس کی نظر پڑی۔ یہ مطبخ خانے اور جماعت خانے وغیرہ کی عمارتیں تھیں۔

جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ شہاب الدین بھی شامل ہو گیا۔ قرأت کی دل کش آواز نے اس کے دل میں لذت کے بھنور ڈال دیے۔ لہجہ بتا رہا تھا کہ قرأت کرنے والا مقامی نہیں ہے۔ ایسی دل سوز آواز اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔

نماز ختم ہوئی تو وہ امام صاحب سے ملنے اور انہیں دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ کیسا شخص ہوگا جس نے کفرستان میں مسجد تعمیر کرنے کی جرأت کی ہے۔ وہ ملاقات کی غرض سے آگے بڑھا۔ حیرت انگیز خوشی نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ جس ہستی سے ملاقات کررہا تھا۔ وہی بزرگ تھے جنہوں نے خواب میں آکر ہندوستان کی فتح کی بشارت دی تھی۔ یہ شخصیت غریب نواز حضرت معین الدینؒ سنجری اجمیری کی تھی۔

شہاب الدین مصافحے کے لیے آگے بڑھا تھا لیکن چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ آپ کے قدموں پر گر پڑا۔ آنسو بہہ رہے تھے' پورا بدن فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔

''یا خواجہ! اپنی مریدی کا اس ناچیز کو شرف بخشیں۔''

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے شفقت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے حجرے میں لے کر آئے۔ شربت وغیرہ سے تواضع کے بعد آپ نے اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کیا۔ یہاں سے اس نے پرتھوی راج کے محل کا رخ کیا۔ پرتھوی راج گرفتار کرنے کے بعد پہلے ہی قتل کیا جاچکا تھا۔ اس کا بیٹا ''کولا'' گرفتار تھا۔ سلطان شہاب الدین نے حکمت کے تحت اجمیر میں اپنا نائب مقرر کرنے کے بجائے پرتھوی راج کے بیٹے ''کولا'' کو اجمیر کا حاکم مقرر کردیا۔ حکمت یہ تھی کہ اگرچہ اجمیر میں اسلام کی روتق حضرت خواجہ کی وجہ سے روز افزوں ہورہی تھی لیکن اردگرد کفر کا غلبہ تھا۔ ان علاقوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انہی کا ہم قوم یہاں کا حاکم ہو۔

سلطان شہاب الدین کو انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کچھ عرصہ اجمیر میں قیام کرنا پڑا۔ اس تمام عرصے میں وہ حضرت معین الدینؒ کی خدمتِ عالیہ میں برابر حاضر ہوتا اور فیوض و برکات سمیٹتا رہا۔ دہلی کی طرف سے وہ پہلے ہی مطمئن ہوچکا تھا۔ اس کا غلام قطب الدین ایبک نہایت ذمے داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور ادھر ادھر اٹھنے والی بغاوتوں کو بڑی کامیابی سے کچل رہا تھا۔ جب وہ اجمیر کی طرف سے بھی مطمئن ہوگیا تو اس نے خواجہ کی دعائیں لیں اور خراسان کی طرف لوٹ گیا۔

وقت کچھ دیر کے لیے تھم سا گیا تھا۔ امن و امان نے زنجیر ہلائی تو موسم ہی دوسرا تھا۔ دہلی میں قطب الدین ایبک کی حکمرانی تھی اور حضرت بختیار اوشی دینِ اسلام کی شمع روشن کررہے تھے، اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدینؒ مقیم تھے۔ مقیم تو وہ کئی سال سے تھے لیکن مخالفتوں کی آندھیوں کے درمیان جھلملا رہے تھے۔ آپ کی دعاؤں سے شہاب الدین کو فتح حاصل ہوئی۔ راجا جو آپ کا سب سے بڑا مخالف تھا واصل جہنم ہوا۔ اب کوئی دنیاوی طاقت ایسی نہیں تھی جو آپ کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ پرتھوی راج کا بیٹا ''کولا'' اجمیر کا حاکم تھا' جوارادے کے باوجود آپ کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا۔ اب حجرۂ مبارک میں ذکر و فکر کی محفلیں آزادانہ آراستہ ہونے لگیں۔ علم و فیاضی کے دریا بہنے لگے۔ اجمیر اور اس کے مضافات اور قریبی شہروں میں بسنے والے لوگ دعا و برکت کے لیے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہونے لگے۔ اپنی مشکلات کے حل کی امیدیں لیے آنے لگے۔ سائل' حاجت مند محتاج' یتیم' بیوائیں درِ خواجہ پر حاضر ہوتے۔ آپ سب کی دستگیری فرماتے۔ بھوکوں کو کھانا مل جاتا۔ ظالم کو ظلم سے نجات ملتی ہر ایک سے اس طرح گفتگو کرتے کہ وہ یہی سمجھتا جیسے وہ سب سے زیادہ اسی کو چاہتے ہیں۔ اس در سے جسے نوازا جاتا وہ آپ کو غریب نواز کہہ کر پکارنے لگتا۔

اپنے بعض مریدین و خلفا کو آپ نے تبلیغ حق پر متعین کر رکھا تھا جو اجمیر کے قرب و جوار میں جاکر اسلام کی حقانیت واضح کرتے رہتے تھے۔ اس انداز و طریق تبلیغ نے کفار و مشرکین کے اذہان و قلوب میں انقلاب عظیم برپا کردیا اور نورِ اسلام اپنی تابانیوں اور رحمتوں کے ساتھ پھیلنے لگا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے مقصد کے حصول کے لیے شبانہ روز مصروف تھے۔ راتیں عبادتِ الٰہی میں بسر ہوتیں' دن تبلیغ اور آستانے پر آنے والوں کی دل جوئی میں گزر جاتے۔ فراغت کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں تھا۔ کئی کئی دن بعد نیند غالب آجاتی تو کچھ دیر کے لیے فرش پر دراز ہوجاتے۔

ایک رات سونے کے لیے زمین کو فرش بنایا تو زمین عرش معلیٰ بن گئی۔ حضور اکرم ﷺ خواب میں تشریف لے آئے اور بڑی شفقت سے فرمایا۔

''معین الدینؒ! تم ہمارے دین کے معین ہو اور میری سنتوں میں سے ایک کے تارک ہو۔''

''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کون سی سنت؟''

''تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔'' ارشاد ہوا۔

آنکھ کھلی اور خواب یاد آیا تو خوف سے بدن لرزنے لگا۔ دن رات کی مصروفیت میں شادی کا خیال ہی نہیں آیا۔ کہیں اس کوتاہی سے میرے آقا و مولا ناراض نہ ہوگئے ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ چہرہ ہلدی بن گیا۔ نیند آنکھوں سے اڑ گئی۔

آقا کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اب آپ اس فکر میں گھلنے لگے کہ یہ بات کس سے کہیں' حکم کی بجا آوری کیسے ہو۔ شادی کہاں کریں؟

آپ اس فکر میں غلطاں تھے کہ ایک روز آپ کا ایک ایک مرید ملک خطاب جو قطب الدین کے ایک قلعے کا حاکم تھا' آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک کنیز آپ کی خدمت میں پیش کی۔

''حضور! قطب الدین ایبک نے مجھے ایک راجا کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہمیں فتح حاصل ہوئی۔ مال غنیمت میں راجا کی بیٹی ہمارے ہاتھ لگی جسے میں آپ کی خدمت کے لیے لے کر آیا ہوں۔''

آپ نے مبہوت و سکون سے ملک خطاب کا پورا بیان سنا اور پھر اس لڑکی سے مخاطب ہوکر اسلام کی حقانیت سے اسے آشنا کیا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

''خواجہ! میں تو کب سے اس دن کے لیے ترس رہی تھی۔ جب آپ کا اور سچے پال جادوگر کا مقابلہ ہوا تھا' میں بھی اپنے پتاجی کے ساتھ یہ مقابلہ دیکھنے آئی تھی۔ اسی دن مجھے یقین آگیا تھا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے لیکن اس وقت میں مجبور تھی۔ چپکے چپکے آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ تقدیر نے آج مجھے آپ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا ہے۔ آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔''

آپ نے اسے کلمہ پڑھایا۔ ''آج سے تمہارا نام امتہ اللہ ہے' میری طرف سے تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو جاسکتی ہو۔''

''آپ کو اچانک اپنا خواب یاد آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس خواب کی عملی صورت پیدا فرمادی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اب یہ سنت بھی پوری ہوجائے گی' آپ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ آپ نے اسے نکاح کی دعوت دی جو اس لڑکی نے بہ خوشی قبول کرلی اور آپ نے حضرت امتہ اللہ کو اپنے عقد میں قبول فرمالیا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک تقریباً چونسٹھ سال ہوچکی تھی۔

موسم بدلتے رہے۔ شہاب الدین غوری اپنے نامزد حاکم قطب الدین ایبک سے بے حد مطمئن تھا، اتنا مطمئن کہ دوبارہ ہندوستان آنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اب سلطان قطب الدین ایبک خود مختار تھا اور سلطنت کی توسیع میں مشغول تھا۔

اجمیر میں پرتھوی راج کا بیٹا ''کولا'' حکمران تھا۔ وہ مسلمانوں کی طاقت کے رعب میں خاموش تھا لیکن اندرونِ خانہ مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل رہتا تھا۔ اس کی یہ حرکتیں جب زیادہ بڑھ گئیں تو قطب الدین ایبک نے اسے حاکمیت سے دستبردار کردیا۔ اور اس کی جگہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے ایک مرید میر سید حسین مشہدیؒ کو حاکم اجمیر مقرر کردیا۔

اس تبدیلی کو اردگرد کے کفار نے دل سے قبول نہیں کیا لیکن قطب الدین ایبک کی طاقت کے سامنے ہر سازش دم توڑ دیتی تھی۔

سلطان قطب الدین ایبک ایک روز چوگان کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گرا اور سفرِ آخرت پر روانہ ہوگیا۔ اس اچانک حادثے نے کفار کے حوصلے بڑھا دیے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں افراتفری پھیل گئی۔ جگہ جگہ فتنے سر اٹھانے لگے سید مشہدیؒ اسی ایک فتنے کی نذر ہوکر شہید ہوگئے۔

سلطان قطب الدین ایبک کے بعد ارا کین سلطنت نے سلطان مرحوم کے غلام شمس الدین التمش کو اس کا جانشین بنایا۔ 585ھ میں حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ایک لڑکے کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اسے دنیا سے نہیں اٹھائے گا۔ پانچ سال بعد آپ کا فرمان سچ ثابت ہوا کیونکہ شمس الدین التمش وہی لڑکا تھا۔

التمش تخت پر بیٹھا تو ہر طرف کفر و شرک نے سر اٹھایا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا زیادہ تر وقت بغاوتوں کو کچلنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بزرگوں سے اس کی عقیدت کم نہیں ہوئی تھی خصوصاً حضرت خواجہ قطب الدینؒ بختیار اوشی کا بہت ارادت مند تھا اور ان کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدینؒ کا نیاز مند تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ رشد و ہدایت کے چراغ روشن ہوتے گئے۔ ان چراغوں کی روشنی دور دور تک پھیل رہی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ہندوستان بھر سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیوض و برکات سے اپنا دامن بھر کر لے جاتے۔

سید حسین مشہدیؒ کی شہادت کے بعد ان کے چچا حضرت سید وجیہہ الدین مشہدی اجمیر کے داروغہ مقرر ہوئے تھے۔ عابد و زاہد، شب زندہ دار تھے۔ ان کی دختر بی بی عصمت اللہ بھی نہایت عبادت گزار تھیں۔ والد گرامی کو ان کی شادی کی فکر ہونے لگی تھی لیکن کوئی نیک شخص نظر نہیں آتا تھا جس سے ان کا عقد کیا جاتا۔ ایک شب وہ استراحت فرما رہے تھے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کو خواب میں دیکھا۔

''کیوں پریشان ہو؟''

''بی بی عصمت کے لیے کوئی رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ بس یہی پریشانی ہے۔''

''تمہارے لیے ایک مبارک حکم ہے۔''

''حضور کیسا حکم؟''

''حضور اکرم کا حکم ہے کہ وجیہہ الدین سے کہو اپنی بیٹی کی شادی خواجہ معین الدین سنجری سے کردو۔''

حضرت سید وجیہہ الدین کی آنکھ کھلی تو فکر و پریشانی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پہلی فرصت میں حضرت معین الدینؒ کے آستانہ عالیہ پہنچ گئے۔ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا' عرض کیا اور جواب کے انتظار میں خاموش بیٹھ گئے۔

حضرت معین الدینؒ کی عمر اس وقت 81 سال کی ہو چکی تھی۔ یہ عمر شادی کی نہیں ہوتی لیکن حضور اکرمؐ کا حکم تھا۔ اگر انکار کرتے تو آنحضرتؐ کے حکم سے سرتابی ہوتی۔ اس سرتابی کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے کچھ دیر سوچا اور پھر اثبات میں جواب دیا۔

''وجیہہ الدین! اگرچہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں' اب یہ عمر شادی کی نہیں لیکن نبی کریمؐ کے فرمان کے مطابق مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔'' دوسرے ہی دن بی بی عصمت اللہ آپ کے عقد میں آ گئیں۔ یہ آپ کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی اور دو بیٹے تولد ہوئے تھے جو آپ کی نگرانی اور والدہ کی تربیت کی چھاؤں میں پاکیزگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کی زیست کا ایک ایک لمحہ دین اسلام کی روشنی پھیلانے میں گزر رہا تھا۔ عمر طبعی کے تمام قیمتی سال گزر چکے تھے۔ اب آپ چراغ سحری تھے۔ آپ نے مختلف خلفا کی صورت میں ایسے چراغ روشن کر دیے تھے جو مختلف مقامات پر اپنے کردار و اخلاق کے ذریعے قلوب و اذہان کو اسلام کی روشنی سے منور کر رہے تھے۔ وہ مطمئن ضرور تھے لیکن عمر گزرنے کا احساس بھی تھا۔ طائر وقت تیزی سے پرواز کر رہا تھا اور آپ کو اس سے پہلے کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی جانشین آپ کے مشن کو پورا کر سکے۔ 633ھ کا سن تھا کہ آپ کو حضرت بختیار اوشی کی یاد آئی۔ خط و کتابت ہوتی ہی رہتی تھی۔ اس مرتبہ جو خط لکھا تو لکھ بھیجا کہ جیسے بیٹھے ہو اجمیر چلے آؤ۔ حضرت بختیار اوشی کئی مرتبہ اجمیر آنے کی ضد کر چکے تھے لیکن حضرت خواجہ معین الدینؒ ہمیشہ یہی کہتے رہے تھے کہ جب ان کی ضرورت ہو گی انہیں اجمیر بلا لیا جائے گا۔ شاید وہ وقت آ گیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ بار بار نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھ لیتے تھے جیسے کسی کا انتظار ہو۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ پھر خوشی سے چہرہ گلنار ہو گیا۔ حضرت قطب الدین بختیار اوشی مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ باقی حاضرین نے بھی آپ کی اتباع کی۔ خواجہ قطب الدین تیزی سے لپکے اور قدم بوسی کے لیے جھکنے لگے۔ آپ نے انہیں سینے سے لگایا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنی نشست تک آئے۔

''یا خواجہ! آپ کی کرم نوازی کی انتہا ہے کہ آپ نے شرف زیارت کا موقع فراہم کیا۔''

''قطب الدین! بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ننانوے سال کی عمر ہو گئی ہے کیا بھروسا سانس کب ساتھ چھوڑ دے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے' آپ کا سایہ مجھ جیسے حقیر کے لیے نعمت ہے۔''

''ربِ کریم تمہارے درجات بلند کرے۔'' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر آپ اٹھ کر اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔

شب جمعہ اپنا دامن پھیلائے خیر و برکت کی طالب تھی۔ اجمیر کی جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ درویش، اہل صفا، مریدین' خلفا سب کو مدعو کیا گیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ حضرت قطب الدین بختیار اوشی کو بازو سے پکڑے مسجد میں داخل ہوئے تو ہر طرف نور کی بارش ہونے لگی۔ ایسی محفلیں اکثر منعقد ہوتی تھیں لیکن آج تو جیسے فرشتے بھی ساتھ چلے آئے تھے۔

آپ نے زبان حقیقت کو جنبش دی تو کلمات نے بھی موقع محل کا ساتھ دیا۔ گفتگو کیا اہل دل کے لیے اشارے تھے۔

''ملک الموت کے بغیر دنیا کی قسمت کچھ نہیں کیونکہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست ملاتا ہے۔'' سب لوگ خاموش تھے۔ سب اہل دل تھے سب ان اشاروں کو سمجھ رہے تھے۔ آپ گفتگو کرتے ہوئے بڑی دور تک نکل گئے۔ جب بیان ختم ہوا تو آپ فرما رہے تھے۔

''ہمیں اس جگہ (اجمیر) اس لیے لایا گیا ہے کہ ہمارا مدفن یہاں ہو گا۔ ہم چند ہی روز میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائیں گے۔''

بات اشاروں سے وضاحت تک پہنچ گئی تھی۔ حاضرینِ مجلس تڑپ اٹھے۔ داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ابھی پیاس بجھی نہیں تھی کہ چشمہ اپنا رخ بدل رہا تھا۔ یہ آنسو اس وقت سسکیوں میں بدل گئے جب آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا' سندِ خلافت لکھو۔

''دہلی کی خدمت ہم نے قطب الدین کو دی ہوئی ہے۔ اس کو تحریر میں بھی لانا چاہتے ہیں۔''

سندِ خلافت تحریر کرائی اور پھر اس پر اپنے دستخط ثبت فرما دیے۔

''قطب الدین! سندِ خلافت لے لو۔ بیعت خلافت تم سے بغداد ہی میں لے لی تھی۔'' آپ نے ارشاد فرمایا اور پھر حضرت قطب الدین بختیار اوشی کو اپنے قریب بلایا۔ اپنی دستار اور کلاہ آپ کے سر پر رکھی۔ قرآن شریف' مصلیٰ اور خرقہ کی پاپوش جو بغداد سے چلتے وقت حضرت عثمان ہرونیؒ نے آپ کو مطافرمائی تھی آپ کے حوالے کی۔

''قطب الدین! یہ چیزیں حضور اکرمؐ سے ہمارے خواجگان چشت کو بطور امانت ملی ہیں۔ جس طرح یہ امانت ہم تک پہنچی اور میں نے تمہیں دی تم آگے پہنچا دینا۔ نیز اس کا حق ادا کرنا تاکہ قیامت کے دن ہم خواجگان چشت کے روبرو شرمندہ نہ ہوں۔''

آپ کا ارشاد انتظام کو پہنچا تو حضرت قطب الدین بختیار اوشی آداب بجالائے اور شکرانے کا دوگانہ ادا کیا۔ اسی اثنا میں حضرت خواجہ معین الدینؒ بھی نفل شکرانہ سے فارغ ہو چکے تھے۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ مسجد سے باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مسجد میں نور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نور میں دعا کے اس نور کا مزید اضافہ ہو گیا۔

''قطب الدین! جا تجھے اللہ کو سونپا اور تجھے منزل گاہ تک سے پہنچایا۔''

حضرت بختیار اوشی کے قلبِ اطہر میں یہ خیال گزرا کہ حضرت کی قدم بوسی کے بعد اب رخصت کی اجازت لینی چاہیے۔ روشن ضمیر مرشد پر فوراً منکشف ہو گیا کہ ان کے دل میں کیا خیال آیا ہے۔ فوراً نزدیک بلایا اور آخری نصیحت سے فیض یاب کیا۔

''غم نہ کرو اور مردہ نہ بنو۔''

حضرت قطب الدین نے دست بوسی کی۔ اجازت طلب کی اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اہل اجمیر اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ گزرنے والی شب کیسے کیسے انعام الاکرام رخصت ہو گئی۔ آنے والی صبح کیا تبدیلی لے کر آئی ہے۔ راز و نیاز کے کیسے کیسے فیصلے کھلے اور بند ہو گئے۔ آئندہ کیا ظہور میں آنے والا ہے۔

حضرت قطب الدین کے رخصت ہوتے ہی آپ نے

☆ قبرستان میں کھانا پینا اور ہنسنا نہیں چاہئے کیونکہ یہ مقام عبرت کا ہے اور جو ایسا کرتے ہیں وہ سنگ دل اور منافق ہوتے ہیں۔

☆ اے غافل! سفرِ آخرت کا توشہ تیار کر جو تجھے درپیش ہے۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اس پر بلا نازل ہوتی ہے۔

☆ جو بزرگی کا دعویٰ کرتا ہے قید میں ہوتا ہے۔

☆ بندۂ مومن تین چیزوں کو دوست رکھتا ہے۔ اول فقر و فاقہ' دوم بیماری اور سوم موت۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رضا مرحمت فرما دے وہ بہشت کو کیا سمجھے۔

☆ محبت کے چار معنی ہیں۔

1۔ ذکرِ خدا میں دل و جان سے خوش رہنا۔

2۔ ذکرِ خدا کو بزرگ تر جاننا۔

3۔ اس کے ساتھ مشغول رہے' دوسروں کے ساتھ قطع تعلق کر لے۔

4۔ اپنے آپ پر روئے اور اس پر جس کو اس سے محبت ہے۔

☆ صاحبو! سورۃ فاتحہ تمام دردوں اور بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ جو بیماری کسی علاج سے درست نہ ہو وہ صبح کی نماز کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان اکتالیس مرتبہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے دور ہو جاتی ہے۔

☆ نماز ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سپرد کی ہے۔ پس بندوں پر واجب ہے کہ امانت میں کسی قسم کی خیانت نہ کریں۔ جب انسان نماز ادا کرے تو رکوع و سجود کما حقہ، بجا لائے اور ارکانِ نماز اچھی طرح ملحوظ رکھے۔

☆☆☆

خود کو حجرے میں بند کر لیا تھا۔ صرف نماز کی ادائیگی کے لیے باہر تشریف لاتے تھے۔ زیادہ تر خاموش رہتے تھے جیسے کسی خیال میں مست ہوں۔ اس تبدیلی کو سب محسوس کر رہے تھے لیکن پوچھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے آپ کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چہرے پر پھیلے ہوئے نور میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا نور کہ آپ کے مریدین اس نور کی ضیا پاشیوں میں کھوئے رہتے۔ یہ خیال

ستا تار رہتا کہ نہ جانے اس کے بعد آپ کی زیارت نصیب ہو یا نہ ہو۔۔

پانچویں رجب 633ھ بمطابق 1237ء کو جب آپ عشا کی نماز سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ خلافِ معمول حاضرین میں ہر ایک سے مصافحہ کیا اور حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔ دروازے پر رک کر ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا اور خدام کو قریب بلایا۔

''کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔'' آپ نے فرمایا اور حجرے کے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

خدام تو آپ کے دولتِ بخشش سے ایک پل کی جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی حجرے کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندر سے ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے عالم وجد میں کوئی رقص کر رہا ہوں۔ پیروں کی دھمک ایسی محسور کن تھی کہ خدام بھی وجد میں آگئے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ سحور کن آوازیں لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جارہی تھیں پھر ان میں کمی آنے لگی اور جب رات نے آخری انگڑائی لی تو آوازیں بند ہوگئیں۔

''شاید حضرت نے تہجد کی نماز کے لیے نیت باندھ لی ہے۔ اسی لیے خاموشی طاری ہوگئی۔''

''آؤ ہم بھی اقتدا کرتے ہیں۔''

خدام بھی تہجد کے نوافل میں مشغول ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کان دروازے سے لگادیے۔ اندر مسلسل خاموشی تھی خدام نے خیال کیا کہ تہجد کے بعد حضرت آرام کی غرض سے لیٹ گئے ہیں۔

مؤذن نے صبح کی اذان بلند کی۔ آج مؤذن کی آواز میں وہ کیف تھا کہ اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ حضرت کے دیدار کے اشتیاق میں لوگ کھنچے چلے آرہے تھے۔ نماز کا وقت تنگ ہوتا جارہا تھا سب منتظر تھے کہ حضرت تشریف لائیں تاکہ امامت کریں۔ حکم تھا کہ کوئی حجرے کے اندر نہ آئے اس لیے سب حجرہ کھلنے کے منتظر تھے' آخر چند محرمان نے دروازے پر دستک دی پھر بھی دروازہ نہ کھلا تو بلند آواز سے آواز دی۔

''یا خواجہ باہر تشریف لائیں نماز کا وقت ہوگیا۔''

آواز کے جواب میں کوئی آواز نہ آئی تو چہروں پر تشویش کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ باہم فیصلہ کیا گیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔ دروازہ ٹوٹا اور لوگ اندر گئے تو حضرت خواجہ چٹائی پر قبلہ رو دراز تھے۔ موت کا پل عبور کر کے دوست سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاچکے تھے۔

آپ کے وصال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق لب جھالرہ کی طرف چل پڑے۔ نمازِ جنازہ تیار ہوئی تو حد نظر تک سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے جو اللہ کے دوست کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ آپ کے صاحب زادے حضرت فخر الدینؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کے جسم اطہر کو حجرۂ خاص میں سپردِ خاک کردیا۔

☆☆☆

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے ایک شخص ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ آنے والا اجمیر سے آیا ہے تو مرشد کی یاد نے بے چین کردیا۔ مرشد کے شہر سے آنے والا عزت و احترام کا مستحق تھا۔ آپ اس کے احترام کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ نہایت تو قیر سے اپنے قریب بٹھایا۔

مرشد کے شہر سے کوئی آیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا آپ اس سے مرشد کی خیریت دریافت نہ کرتے۔

''آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں یہ' ٹوداروں نے کہا۔

''کیا ہوگیا وہاں۔ کچھ بتاؤ تو۔''

''یا خواجہ! حضرت خواجہ بزرگ دو پہر کے وقت بیرونِ ہوئے اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے۔''

''یہ خبر مجھ سے چھپی رہی تو اس میں بھی میرے مرشد کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوگی۔'' آپ نے فرمایا اور پھر اس شخص سے آپ کے جنازے اور اہلِ اجمیر کی دلی کیفیات دریافت کرنے لگے۔ وہ شخص رخصت ہوا تو آپ پر غم واندوہ کی کیفیات کا غلبہ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ یتیم ہوگئے ہوں' آنکھوں سے خود بخود آنسو گرے اور کپڑوں کا دامن بھیگ گیا۔

''واہ خواجہ' خبر بھی نہ دی اور رخصت ہوگئے۔'' آپ نے فرمایا اور عشا کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔

مسجد سے واپس آئے تو دل پر بوجھ سا تھا۔ مصلّٰی بچھایا اور وظائف میں مشغول ہوگئے۔ آج خلافِ معمول نیند سے آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔ آپ بہت دیر نیند سے لڑتے رہے۔ نیند کا غلبہ تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔ آخر ایسا جھونکا آیا کہ مصلے پر ہی لیٹ گئے ایسی نیند آئی جیسے کوئی تھک تھک کر سلارہا ہو۔ آنکھ لگتے ہی آپ عالمِ خواب میں پہنچ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ زمین عرش پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے قدم بوس ہو کر کیفیتِ حال دریافت فرمائی۔

''اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے نوازا اور فرشتوں اور ساکنانِ عرش کے نزدیک جگہ عطا فرمائی اب میں

یہاں رہتا ہوں۔''

اس جواب کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ دل ہلکا ہو چکا تھا صدمے کا نام تک نہیں تھا۔ اطمینان کی لہر جگی جو بدن میں دوڑ رہی تھی۔ نیند رخصت ہو چکی تھی۔ کسی نے صرف اتنی دیر تک سلایا تھا کہ آپ کی ملاقات حضرت خواجہ سے کرادی جائے۔ آپ مصلّٰے سے اٹھے، وضو کیا اور پھر وظائف میں مشغول ہوگئے۔

☆☆☆

اللہ بہت بڑا ہے اور اسے دوست بنانے والوں کی بڑائی میں بھی لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اولیا اللہ کا شمار اسی صفِ دوستاں میں ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ نظر رکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا مزار سادہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور ایک عرصے تک یہ عام قبور کی طرح رہا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کے احاطے میں عمارت بننے لگی۔ مختلف عمارات زمین کے سینے پر جنم لینے لگیں اور مزار پاک ایک آرائش دیدنی ہوگئی۔ کئی عقیدت مند ہاتھ بلند ہوئے۔ کسی ہاتھ نے مزار اقدس پر عمارات تعمیر کرائیں۔ کسی نے سنگِ مرمر کی گنبد بنوادیا۔ کسی نے سونے کا کلس چڑھادیا۔ اندرونی حصے میں سنہری لاجوردی کا کام ہوگیا۔ مزار شریف کے تعویذ میں یاقوت رمانی جڑ گیا۔ عظیم فاتح سلطان محمود غلجی زیارت کے لیے آیا تو پچاسی فٹ بلند دروازہ بنوادیا اور اور روضے کے شمال میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔

اکبر اعظم کا دور آیا تو وہ بادشاہوں کے بادشاہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مزار اقدس پر ننگے پاؤں چل کر آیا۔ دیکھا کہ خواجہ کا لنگر تقسیم ہورہا ہے خواجہ کی زندگی میں ان کے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اب بھی خواجہ کسی کو بھوکے پیٹ بھیجنے کو تیار نہیں۔ لنگر لوٹنے والے بھی ایسے کہ ایک پر ایک گرے جاتے ہیں مگر اس برکت سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔ خلقت اتنی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے لوگوں کے کھانے کا انتظام کون کرتا ہوگا۔ خواجہ کی باتیں خواجہ جانیں۔ ان کے مہمان ہیں وہ خود انتظام کرتے ہوں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ اتنے لوگوں کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے بڑی دیگ چاتی ہوگی۔ سیکڑوں دیگیں چڑھتی ہوں گی۔ کیوں نا ایک ہی دیگ ہو۔ اکبر اعظم نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑی دیگ تیار کی جائے جس میں ایک وقت میں سوا سو من چاول پک سکیں۔ پھر اس نے روضۂ مبارک اور یعنی دالان کے مابین ایک صندل کا دروازہ بنوا کر نصب کرایا جو شرقی دروازہ گلشن کہلاتا ہے۔

بے شک! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ پر چلنے والوں کو بلندی نصیب ہوتی ہے۔ بادشاہوں کے سر جھکتے ہیں' اللہ ان کے دل میں ڈالتا ہے کہ میرے ولی کی شان و شوکت میں اضافہ کرو۔ میرے ولی کے پاس آنے والوں کی سہولت کے لیے سامان مہیا کرو۔

جب جہانگیر پیدا ہوا تو اکبر اعظم آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا اور اکبری مسجد تعمیر کرائی۔ لنگر خانے کے دالان میں لوہے کا کڑھایا بنوایا اور پھر چشم فلک نے یہ حیرت ناک نظارہ بھی دیکھا کہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے والا' پیالہ ہاتھ میں لیے لنگر لوٹنے والوں کی بھیڑ میں گم ہے۔ لوگوں کا ریلا آتا ہے اور اکبر کے ہاتھ سے پیالہ گر کر کرچیوں میں بدل جاتا ہے۔ خواجہ کی روح مسکراتی ہے اور کہتی ہے' اکبرا یہ درویشوں کا ڈیرا ہے یہاں بادشاہ اور فقیر میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تمہیں احساس ہوگیا ہوگا کہ تمہاری دنیاوی بادشاہت تمہارے معمولی پیالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کسی وقت بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوسکتی ہے۔

قلم کا نشتر آزمانے والے، درد سے آشنا کرنے والے اور سماجی شعور کو بھڑکانے والے محی الدین نواب کی دل شاہکار کہانیوں کا مجموعہ

ایمان کا سفر

نیا ایڈیشن شائع ہوچکا ہے

مضبوط جلد — کمپیوٹرائزڈ کتابت

قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر بھیجیں ورنہ وی پی کے ذریعے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895313

اکبر کے کانوں تک شاید یہ آواز نہیں پہنچی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ان سعادتوں سے دور ہوتا چلا گیا اور گمراہی کے غار میں اتر گیا جہاں اس کا بنایا ہوا دینِ الٰہی تھا اور وہ تھا۔ چند روزہ بہار کی پھر خزاں ہی خزاں۔

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشیں ہوا تو آپ کے در پر حاضر ہوا۔ بڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا کچھ مانگتا رہا۔ یہی مانگا ہوگا کہ میری شہنشاہیت باقی رہے۔

شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو اس نے اجمیر میں شاہ جہانی مسجد تعمیر کرائی۔ اس کی بیٹی نے بیگمی دالان تعمیر کرایا۔ ملکہ انگلستان نے دسمال خانے کے لیے چھتری بنوائی۔

حضرت خواجہ اپنے مزار میں آرام فرما ہیں اور فیضِ عام کا لنگر جاری کیے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شکم سیری کی نیت سے جاتا ہے تو اسے پیٹ بھر کے کھانا ملتا ہے، صبح شام لنگر جاری ہے شہر کے سارے مساکین، غربا دفترا کھاتے ہیں اور کھانا پھر بھی بچا رہتا ہے، یہ ہے دستِ غیب۔ یہ ہے اللہ کے دوستوں کا تصرف۔

کسی کو اطمینان و سکون کی تلاش ہوتی ہے تو حاضر ہوتے ہی کوئی دستِ شفقت بڑھاتا ہے، اولیا اللہ کے مزارات پر ہر وقت رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ جو وہاں جاتا ہے اطمینانِ دلی سے فیض یاب ہوتا ہے۔

جب رجب المرجب کا چاند چڑھتا ہے اور خواجہ کے عرس کا دن آتا ہے تو بہاریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ سوئے اجمیر چل پڑتے ہیں۔ ان میں عام لوگ بھی ہوتے ہیں، عقیدت مند بھی، اولیا اللہ بھی، امیر بھی غریب بھی ہندو بھی مسلمان بھی کیونکہ خواجہ سب کے خواجہ ہیں۔ اپنی حیات میں انہوں نے سب کو گلے سے لگایا تھا۔ وصال کے بعد بھی ان کا فیض سب کے لیے ہیں۔ ان کے احسانات سب پر ہیں، انہوں نے بادشاہیں تقسیم کی ہیں۔ سلطان شہاب الدین غوری کو آپ ہی نے بشارت دی کہ ہندوستان پر حملہ کرو، اور پھر اسے فتح سے ہمکنار کیا۔ التمش کی بادشاہت کے لیے پیش گوئی کی اور بالآخر وہ بادشاہ بن کر رہا۔

عرس کے شب و روز دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہوتا۔ کہیں خواجہ کی سیرت و اخلاق بیان کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ کہیں ان عبادات و ریاضات کا ذکر ہوتا ہے جو آپ نے قربِ الٰہی کے لیے کیں۔ کہیں آپ کے سیر و سفر پر گفتگو ہوتی ہے۔ کہیں تبلیغ اسلام کا تذکرہ ہے۔

کہیں آپ کے دورِ حیات کے ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں موضوعِ بحث ہیں، کہیں بے چال سے مقابلے کی داستانیں سنائی جا رہی ہیں، کہیں "یا خواجہ!" کی دلدوز صدائیں ہیں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں نم ہیں، ہر طرف خواجہ ہی خواجہ ہے۔ اللہ نے ان کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔ جو پکار کر سکتا ہے پکار کر رہا ہے۔ جو لوٹ سکتا ہے لوٹ رہا ہے۔

ایک جانب چشتیوں کا خاص مشغلہ سماع اپنی بہاریں دکھا رہا ہے، زمین و آسمان وجد میں ہیں۔ روح کی گتھیاں دھل رہی ہیں۔ پرواز کی قوتیں بڑھ رہی ہیں۔ در و دیوار جھوم رہے ہیں۔

وصال کے بعد اولیا اللہ کی فیض رسانی میں ستر گنا اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا فیض جاری و ساری ہے۔ مانگنے والا چاہیے سب کچھ ملتا ہے۔

حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے مرید خاص اور خلیفہ تھے نیز حضرت خواجہ معین الدینؒ کے بھی فیض یافتہ تھے۔ حضرت خواجہ کے وصال کے بعد آپ مزار پر معتکف تھے اور چلہ کاٹ رہے تھے۔ [illegible] رہنے کے قریب نماز ادا کی اور وہیں بیٹھ کر تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہو گئے۔ تلاوت کے دوران ایک لفظ ترک ہو گیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے ایک آواز سنی۔

"بابا فرید! ایک لفظ چھوڑ گئے ہو اسے پڑھو۔"

بابا فرید الدینؒ نے آیت پلٹائی اور جو لفظ چھوڑ گئے تھے اسے ادا کیا۔ پھر آواز آئی "قرآن پاک عمدہ پڑھتے ہو۔"

جب وہ تلاوتِ قرآن پاک فرما چکے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ کی پائینتی پر کھڑے ہوئے فرمایا۔

"مجھے نہیں معلوم میں کس گروہ میں سے ہوں۔"

"جو شخص یہ نماز ادا کرتا ہے وہ بخشے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔" مزار کے اندر سے آواز آئی۔

لوگ آج بھی خواجۂ بزرگ کے مزار پر چلے کاٹتے ہیں اور روحانی انعامات سے نوازے جاتے ہیں۔ آٹھ سو سال کے قریب ہو گئے یہ فیض جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ انشاء اللہ!

ماخذات

تاریخ مشائخ چشت۔ سیرت خواجہ معین الدینؒ چشتی۔ شاہ اجمیر مصنفہ نواز رومانی۔

خود غرضی کے اس دور میں ایک باہمت نوجوان کے جذبۂ ایثار کا سنسنی خیز ماجرا

حیاتِ نو

تحریر: کاشف زبیر

کہتے ہیں کہ دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے اور اُس نے بھی دوستی کا پورا حق ادا کیا۔ انسانی ہمت اور جذبوں نے نہ صرف بلند ترین پہاڑوں کو مسخر کیا، بلکہ گہرے سمندروں کو بھی اپنا تابع بنالیا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جذبِ صادق اور عزمِ صمیم کی ضرورت ہے پھر دیکھیے موت کا فرشتہ بھی راستہ چھوڑ دیتا ہے۔

یہ 19 فروری 1937ء کا دن تھا۔ ابھی جنگِ عظیم شروع ہونے میں دو سال کا عرصہ باقی تھا۔ ایک سٹن سن طیارہ جس پر پانچ مسافروں سمیت کُل سات افراد سوار تھے، برسبین سے سڈنی کی طرف جاتے ہوئے لاپتا ہو گیا۔ اس [illegible] میں شہری ہوابازی نہایت محدود تھی۔ گنتی کی چند ائر لائنز ہی جو مقامی طور پر مسافروں اور سامان کی نقل و حرکت کا کام کرتی تھیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر اب بھی سڑک یا بحری جہازوں کے ذریعے ہی کیا جاتا تھا۔

آسٹریلیا ایک وسیع و عریض زمین اور قلیل آبادی رکھنے والا ملک ہے۔ اس کی طویل مسافتوں کو طے کرنے کے لیے طیارہ ہی سب سے مؤثر ذریعۂ سفر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق موجودہ وقت میں آسٹریلیا کے نوے فیصد باشندے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے ہوائی سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلینڈ اور جاپان جیسے مختصر سے ممالک کے محض پچاس فیصد لوگ ہوائی سفر کرتے ہیں، اگر انہیں اپنے ملک میں سفر کرنا ہو۔ آسٹریلیا میں زمین یا سمندر کے راستے سفر بے حد طویل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ طیارہ سازی کے ابتدائی عرصے میں آسٹریلیا میں ہوائی سفر مقبول ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود معدودے چند افراد ہی ہوائی جہاز سے سفر کرنے کے قابل تھے کیونکہ اس وقت یہ بے حد مہنگا ہوا کرتا تھا۔ کم سفر کی وجہ سے حادثات بھی کم ہوتے تھے اور کسی

طیارے کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں یہ واقعہ ہفتوں لوگوں کی زبان پر رہتا تھا۔

سٹن سن طیارہ راستے میں آنے والے ایک طوفان کے بعد غائب ہوا تھا اور اس کی اطلاع ملتے ہی آسٹریلیا کی مشرقی ریاستوں میں موجود تمام فوجی اور سویلین طیاروں نے غائب ہوجانے والے طیارے کی تلاش شروع کردی۔ مختلف جگہوں سے طیارے کو دیکھے جانے کے بارے میں کل چونسٹھ شہادتیں موصول ہوئیں کہ اس طیارے کو کس نے کس وقت اور کہاں دیکھا تھا۔ ان اطلاعات کو سامنے رکھ کر طیارے کی تلاش کی مہم شروع کی گئی مگر طیارے کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

عینی شاہدین کی گواہیوں کے مقابلے میں ماہرین کا اندازہ تھا کہ طیارہ سڈنی کے آس پاس کے سمندر میں کہیں ڈوب گیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ طوفان سے بچنے کے لیے طیارے کے پائلٹ نے اس کا رخ سمندر کی طرف موڑ دیا ہو کیونکہ اس طرف طوفان اتنا شدید نہیں تھا۔ راستہ بھٹکنے سے بچنے کے لیے طیارہ ساحل کے ساتھ اڑ رہا ہوگا کہ سمندر میں جا گرا۔ ماہرین کے اس خیال کی تائید ایک واقعاتی نشانی نے کی تھی۔ سڈنی کی بندرگاہ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر پانی پر سومربع گز کے رقبے پر پھیلا ہوا تیل نظر آیا تھا مگر سمندر اس جگہ اتنا گہرا تھا کہ کسی قسم کی امدادی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دوسری طرف خشکی پر تلاش کی مہم پورے زور وشور سے جاری تھی۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ طیارے کے مسافروں کی زندگی کے امکانات کم ہوتے جارہے تھے۔ اگر طیارہ خشکی پر گرا تھا اور اس کے کچھ مسافر زندہ بچ بھی گئے تھے تو اب تک انہوں نے لاچار بھوک پیاس سے دم توڑ دیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ حادثے کے آٹھ دن بعد طیارے کی تلاش کی مہم ترک کردی گئی مگر اسے مکمل طور پر منسوخ نہیں کیا گیا۔ اب بھی حکومت کی طرف سے فوجی طیارے ملنے والی ہر اطلاع پر مذکورہ علاقے میں جاکر طیارہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مسافروں کے لواحقین بھی ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ ایک مسافر کی ماں نے طیارہ تلاش کرنے والوں کے لیے انعام میں ایک بڑی رقم رکھی تھی، اگر چہ اسے سمجھایا گیا تھا کہ یہ تلاش بے سود ہے اور اب کسی مسافر کے زندہ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک طرف ہوا بازی کے ماہرین اور اخبار والے طیارے کے جائے حادثہ کے بارے میں اندازوں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے، تو دوسری طرف آسٹریلیا کی دو ریاستوں، نیو ساؤتھ ویلز اور کوئنز لینڈ کی سرحد پر رہنے والے ایک کاشت کار کا ذہن بھی طیارے کی گمشدگی کے معمے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا نام برنارڈ اوریلی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک طیارے کے جائے حادثہ کے بارے میں جو بھی اندازے لگائے گئے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اس کے خیال میں طیارہ اپنی منزلِ مقصود یعنی سڈنی تک پہنچا ہی نہیں تھا کیونکہ اس صورت میں اسے مزمور نامی جگہ پر اتر کر ایندھن حاصل کرنا تھا۔ یہ جگہ سڈنی سے چار سو میل کے فاصلے پر تھی۔ غائب ہونے والا طیارہ مزمور پہنچا ہی نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ماہرین نے اتنی اہم بات کیسے نظر انداز کردی۔ طیارہ درمیان میں ایندھن لیے بغیر سڈنی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا اور برسبن کے بعد مزمور اس کا پہلا اسٹاپ ہوتا۔ اوریلی نے اندازہ لگایا کہ طیارہ سڈنی کے آس پاس نہیں بلکہ اس کے علاقے کے قریب ہی ملگرفن کے گھنے جنگلا میں گر کر تباہ ہوگیا تھا۔

یہ حادثے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ ایک روز اوریلی کے سر پر طیارے کی تلاش کی دھن سوار ہوئی اور وہ میلگرفن کے جنگلات کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ علاقہ بریگ ریز جنگلات نہایت دشوار گزار علاقے میں تھے۔ یہاں کی زمین مشکل سے ہی دستیاب ہوتی تھی جہاں اونچی نیچی پہاڑیوں، بے پناہ گھنے جنگل تھے جن میں سورج کی روشنی بھی بمشکل چھن پاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس علاقے کے اوپر تلاش کے لیے کئی پروازیں بے سود ثابت ہوئی تھیں۔ اوریلی مختلف پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ کر اردگرد کے علاقے کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے حادثے کے کسی نشان کی تلاش تو نہیں تھی مگر اسے کیا پتا تھا کہ اس سے کچھ ہی دور دو انسان زندگی اور موت کی سرحد پر سسک رہے تھے۔

☆☆☆

سٹن سن امریکی ساخت کا طیارہ تھا۔ اس کے تین انجن ہوتے تھے اور یہ طویل اڑان کے لیے موزوں اور قابلِ اعتماد طیارہ تصور کیا جاتا تھا۔ جب طیارہ برسبن سے روانہ ہوا تو اسے آسٹریلیا کے دو انتہائی تجربہ کار پائلٹس اڑا رہے تھے۔ یہ ریکس ہائیڈن اور اس کا ساتھی بیورلے شیفرڈ تھے۔ دن کے ایک بجے برسبن میں گرم موسم سے قطع نظر ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ راستے میں ایک خوف ناک طوفان ان کا منتظر ہے۔ ان دنوں نہ تو ریڈار ہوتے تھے اور نہ ہی طیاروں کو موسم کا حال بتانے والے دوسرے آلات۔ حتیٰ کہ طیارے میں ریڈیو بھی نہیں تھا۔ گو اس وقت تک ریڈیو طیاروں اور بحری جہازوں میں استعمال ہونے لگا تھا لیکن اس کا استعمال محدود تھا۔

سٹن سن طیارے میں کل آٹھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ اور یہ روزانہ ہی برسبن سے سڈنی جاتا تھا۔ اس روز طیارے میں کل پانچ مسافر تھے۔ پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہی طیارہ اپنی سے اچانک سامنے آنے والے طوفان میں گھر گیا۔ اسے بچنے کے لیے مزمور کی ائرفیلڈ پر اترنا تھا لیکن جب طیارہ وہاں نہیں پہنچا تو اس کے بارے میں خدشات پیدا ہونے لگے اور یہ خیال پیدا ہوا کہ طیارہ طوفان میں گھر جانے کے باعث مزمور کی طرف آنے کے بجائے ساحل کی طرف چلا گیا اور پھر ساحل کے ساتھ ساتھ اڑتا سڈنی کے قریب جا پہنچا اور نا کافی ایندھن کی بنا پر سمندر میں گر کر تباہ ہوگیا۔ یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ ہائیڈن جیسا زیرک پائلٹ جسے برسبن اور سڈنی کے درمیان پرواز کا بہت طویل تجربہ تھا، ایسی فاش غلطی کیسے کرسکتا ہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ اتنے ایندھن کے ساتھ طیارہ سڈنی تک جا ہی نہیں سکتا پھر اگر وہ ساحل کی طرف چلا بھی گیا تھا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ سڈنی تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ درمیان میں متعدد مقامات ایسے آتے تھے جہاں وہ اپنا طیارہ اتار سکتا تھا اور اس طرح اپنی اور اپنے مسافروں کی جان بچا سکتا تھا۔

شام تک کسی کو طیارے کا خیال نہیں آیا اس کے بعد دلوں کے خدشات ستانے لگے۔ ہر جگہ تار کھڑکائے جانے لگے۔ ساحلی اسٹیشنوں سے رابطہ کیا گیا۔ معلوم ہوا ہر جگہ کا ہی موسم خراب تھا جب صبح تک طیارہ اور اس کے مسافر کہیں نہیں پہنچے تو باقاعدہ اعلان کرایا گیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے مگر ہے کہاں؟ راستے میں آنے والے تمام شہروں اور قصبوں سے رابطہ کیا گیا، مگر ہر جگہ سے طیارے کے متعلق جواب نفی میں آیا تھا۔

☆☆☆

اوریلی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ طیارے کو طوفان نے عین میلگرفن کے اوپر آلیا تھا۔ ایک سو پینسٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتے طیارے کو طوفانی تھپیڑوں نے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ طیارہ فضا میں اس طرح اڑ رہا تھا جیسے تیز ہوا ایک پتے کو اڑا لے جاتی ہے۔ طوفانی ہواؤں نے طیارے کو بے قابو کردیا اور وہ تیزی سے پہاڑیوں میں گرنے لگا۔ خوف زدہ پائلٹس طیارے کو قابو کرنے کی انتہائی کوشش کررہے تھے۔ ان کے برعکس مسافر سکون سے اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ غالباً انہیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اچانک طیارے نے چند قلابازیاں کھائیں اور عین جنگل کے اوپر پہنچ گیا۔

کپتان ہائیڈن نے طیارے کو سنبھالنے کی اپنی سی آخری کوشش کی اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ زمین سے ٹکرانے سے پہلے طیارہ سیدھا ہوگیا۔ اس کے پہیے اور بازو درختوں سے ٹکرائے۔ اگلے ہی لمحے طیارہ کریش ہوگیا۔ زمین سے لگتے ہی یہ دائیں جانب گھوما اور دو چھوٹے درختوں کو گراتے ہوئے ایک بڑے درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کا دایاں حصہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ دونوں ہوا باز ریکس ہائیڈن اور اس کا ساتھی بیورلے شیفرڈ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے، کیونکہ طیارے کا کاک پٹ مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ اسی طرف بیٹھے دو مسافر بھی حادثے کے فوراً بعد مر چکے تھے، البتہ بائیں طرف بیٹھے تین مسافر مرنے سے بچ گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا انجام زیادہ دور ناک ہوگا۔ کیونکہ دنیا کو ان کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

بچ جانے والے تین مسافر بھی صدمے سے اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ درحقیقت طیارے کو اتنا شدید حادثہ پیش آیا تھا کہ ان کا بچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ سٹن سن کی

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسہابرس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو ازلی ناکامی کی مار پیہم، امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربے، تحقیقات، انتھک محنت، گہن اور کاوشوں سے ایسا فارمولا تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے لاکھوں ناکام مردوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور یہی نہیں گئے گزرے کمزور نوجوان ایک بلٹ آور کا ریکارڈ قائم کرکے ہر دلعزیزی کا سرچشمہ بنے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کررہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا لہو، نیا خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی، آنکھوں میں چمک، نوجوانی ظاہر کرکے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور پھر تمام خوبیاں سمیٹ کر ہوجانگی کے لیے آپ ایک مرد سے محرم بن جاتے ہیں آج ہی ایک خط لکھ کر اپنی مکمل کیفیت لکھ کر ہمارے ادارے کے معرفت ہمیں روانہ کریں تاکہ یہ نسخہ فوراً روانہ کردیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

ہاڈی کے ٹکڑے ہوتے گئے تھے۔ ایندھن رسنے سے طیارے کے عقبی حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ اسی وقت تک طیارے کے چار مسافر اپنی زندگیوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اور باقی تین بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ آگ تیزی سے انہیں بھی چاٹ لینے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے جان پر اینیو نامی ایک نوجوان کو ہوش آیا۔ پہلے تو اسے یہ سب ایک بھیانک خواب لگا تھا لیکن جلد اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ طیارے میں آگ لگ گئی تھی اور اندر دھواں بھر رہا تھا۔ اگر وہ جلد طیارے سے نہ نکلتے تو ان شعلوں کی نذر ہو جاتے۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو جھنجوڑنا اور چلانا شروع کر دیا ''اٹھو..... طیارے میں آگ لگ گئی ہے۔ جلدی سے باہر نکلو..... ورنہ مر جاؤ گے۔''

اندر دھواں بھر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں شعلے چمک رہے تھے۔ جوزف بن سٹینڈ کو جلد ہوش آ گیا۔ لیکن ان کا تیسرا ساتھی جو پہلے قسمتی سے طیارے کے جلتے ہوئے حصے کے پاس تھا بری طرح جھلس گیا تھا۔ اس کا گوشت نکل آیا تھا اور وہ از خود حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔ جوزف اور جان نے مل کر کسی طرح اسے طیارے کی ٹوٹی کھڑکی سے نیچے دھکیل دیا۔ جیمز ویسٹرے چھ فٹ کی بلندی سے نیچی زمین پر جا گرا۔ اسے چوٹ لگی لیکن جلنے کی اذیت میں اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس کے بعد جوزف نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور جیمز کے پاس زمین پر آ گرا۔ سب سے آخر میں جان نے باہر چھلانگ لگائی۔ بظاہر اس کی حالت سب سے بہتر تھی لیکن جب وہ زمین پر گرا اور اس نے جلتے طیارے سے دور بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ چلنے سے قاصر تھا۔ دوسری طرف طیارے کی آگ بے قابو ہو رہی تھی۔

''دوستو۔'' جان نے چلا کر کہا ''میں چل نہیں سکتا۔ مجھے یہاں سے نکالو۔''

اس پر جیمز اور جوزف جو کسی نہ کسی طرح رینگتے گھسٹتے طیارے سے دور چلے گئے تھے واپس پلٹے اور جان کو بھی کھینچ کر طیارے سے دور لے جانے لگے۔ محفوظ فاصلے پر جا کر وہ بے حال زمین پر گر کر جلتے طیارے کو دیکھنے لگے۔ طیارے کی آگ ایک طرف تو ان کے لیے خطرہ تھی کہ کہیں اس سے جنگل میں آگ نہ لگ جائے۔ فروری آسٹریلیا میں گرم اور خشک مہینوں میں شمار ہوتا ہے اور اسی دوران میں آئے دن جنگلات میں آگ لگتی رہتی ہے۔ ذرا سی تیلی بعض اوقات میلوں پر پھیلے جنگلات خاکستر کرنے کا سبب بن جاتی ہے یہ تو ایندھن سے بھرا طیارہ تھا۔ جو پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا مگر خوش قسمتی سے طیارہ اس وقت جہاں گرا تھا وہاں زیادہ تر بڑے درخت تھے جو ذرا مشکل سے ہی آگ پکڑتے ہیں۔ اگر یہاں جھاڑیاں اور گھاس زیادہ ہوتی تو اب تک جنگل میں آگ لگ چکی ہوتی۔ دوسری طرف یہی آگ ان کے لیے واحد امید تھی کہ ان شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ کر کوئی اس طرف آنکلے یا فضا میں اڑتا کوئی طیارہ اس آگ کو دیکھ لے مگر کئی گھنٹے تک جلنے کے بعد آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ان کی مدد آنے کی امیدیں بھی سرد پڑتی چلی گئیں۔

اس وقت جوزف ان میں کسی قدر بہتر حالت میں تھا۔ اسے زخم آئے تھے لیکن اتنے نہیں کہ وہ بے حال ہو جاتا۔ اس نے پہلے جان کو ایک درخت کے ساتھ سہارا دے کر بٹھایا اور اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ ہڈی مکمل طور پر ٹوٹ گئی تھی اور ایک جگہ کھال سے باہر آ گئی تھی۔ جوزف نے اس کا پاؤں سیدھا کر کے اس پر دو لکڑیاں رکھ کر انہیں جان کی قمیص کی دھجیوں سے کس کر باندھ دیا تا کہ ٹوٹی ہڈی حرکت کر کے اسے تکلیف نہ دے۔ اس کے بعد وہ جیمز کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بری طرح جھلس گیا تھا اور اس کے حواس بھی بجا نہیں تھے۔ اس نے اٹھ کر جنگل میں جانے کی کوشش کی مگر جوزف نے اسے پکڑ کر زمین پر لٹا دیا۔

''اگر تم نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو میں تمہارے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤں گا اور تمہیں ہلنے بھی نہیں دوں گا۔'' اس نے جیمز سے درشت لہجے میں کہا۔

''میں جاؤں گا۔'' جیمز جوزف کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ''میں کسی بستی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

مگر جوزف اسے زمین پر لٹانے میں کامیاب رہا۔

''ہمارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ ہم اپنے اس جگہ بیٹھیں رہیں اور مدد آنے کا انتظار کریں۔ مجھے یقین ہے جلد یا بدیر مدد ضرور آئے گی۔ جب طیارہ مرمور نہیں اترے گا تو اس کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔''

''بشرطیکہ موسم بہتر ہو جائے۔'' جان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر بادل چھائے ہوئے تھے اور طوفان کے آثار پائی جاتے تھے۔

جیمز کی حالت بدستور خراب تھی اور اس نے ہذیانی انداز میں بڑبڑانا شروع کر دیا تھا ''کل میں بحری جہاز سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ آج میرے دوست سڈنی میں میرے اعزاز میں الوداعی پارٹی دے رہے ہیں۔''

تینوں کو شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس پانی بالکل نہیں تھا۔ جہاز کے جلے ہوئے ڈھانچے میں ایسی کسی شے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آس پاس کوئی ندی، چشمہ یا پانی کا تالاب بھی نظر نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ چھوٹے موٹے گڑھوں میں جمع ہو جانے والا پانی بھی نہیں تھا۔ لگتا تھا اس علاقے میں کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ طوفان بھی بس آنے اور مٹی اڑا رہا تھا مگر سہ پہر چار بجے بادل سرمئی ہو گئے اور پھر تیز بارش ہونے لگی۔ تینوں منہ کھولے بارش کا پانی حلق کے اندر اتارتے رہے اور یوں کم سے کم ان کی پیاس بجھ گئی تھی۔ جیمز کے زخموں کی تکلیف بھی ذرا کم ہو گئی تھی مگر بارش کے بعد موسم یک لخت سرد ہو گیا تھا۔ تینوں سوچ رہے تھے کہ اس طرح کب تک پڑے رہیں گے۔ بارش کے بعد سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ رات سر پر تھی۔ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ سخت زمین پر پڑے تھے اور اگر اس طرف کوئی خطرناک جانور آ نکلتا تو وہ اپنا تحفظ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان جنگلات میں بڑی نسل کی بلیاں اور چیتے تھے جو آدم بیوں پر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ جان نے پہلو بدلنے کی کوشش کی تو اس کی ٹوٹی ٹانگ سے درد کی لہر اٹھی جو اسے بے چین کر گئی۔

رات ہوئی تو سونے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی نیند غالب ہو جاتی اور کبھی کسی جانور کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ رات خاصی سرد تھی لیکن وہ اتنی سردی برداشت کر سکتے تھے۔ البتہ بھوک رفتہ رفتہ ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اتفاق سے تینوں نے آخری کھانا صبح ناشتے کی صورت میں کھایا تھا۔ جوزف نے صرف دو سلائس لیے تھے اور اسے بھوک بھی جلد لگنے لگی تھی۔ رات مارے بھوک کے اسے نیند بھی نہیں آئی تھی۔ اگلی صبح روشنی ہوتے ہی جوزف نے اعلان کیا کہ وہ کچھ کھانے کی تلاش میں جا رہا ہے کیونکہ اگر اس طرح پڑے رہے تو بھوک سے مر جائیں گے۔

جوزف کھانے کی تلاش میں نزدیکی نظر آنے والی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیمز جو اب خاصی بہتر حالت میں تھا یعنی دماغی طور پر ہوش میں ہی تھا۔ اگر چہ اس کے جلے ہوئے ہاتھ اس وقت قطعی طور پر ناکارہ تھے وہ ان سے کوئی چیز نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جان سے بولا ''اب میں مزید اور انتظار نہیں کر سکتا۔ تم لوگ یہاں بیٹھ کر بے شک مدد آنے کا انتظار کرو۔ میں خود اپنا راستہ تلاش کروں گا۔''

اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ جان قطعی اس قابل نہیں تھا کہ جیمز ویسٹر کو روک سکتا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''ٹھیک ہے دوست میں تمہیں روکنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے تم جاؤ۔ میں دعا کروں گا کہ تم کامیابی سے کسی جگہ پہنچ جاؤ اور دوست اگر ایسا ہو جائے تو ہمیں بھول نہ جانا۔ ہمارے لیے بھی مدد لانا۔''

جیمز نے بے دھیانی میں سر ہلایا۔ اس نے شاید جان کی بات پوری طرح سنی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف لڑکھڑاتے قدموں سے چل دیا۔ اس کے پیروں کو بھی آگ نے متاثر کیا تھا لیکن ان کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ چل بھی نہ پاتا۔ اس نے سوکھے پتوں بھرا ایک راستہ منتخب کیا تھا اور اس پر چلتا ہوا جان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی جیمز ویسٹر کو نہیں دیکھا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جوزف واپس آیا تو جان نے اسے جیمز کے بارے میں بتایا۔

''بے وقوف آدمی۔'' جوزف فکرمندی سے بولا ''اسے ان جنگلات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی رہتی ہے۔''

''کاش کہ وہ کسی انسانی آبادی تک پہنچ سکے۔'' جان نے حسرت سے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ اس جگہ سے کبھی کوئی انسان گزر ہی نہیں ہے۔''

جان درست کہہ رہا تھا۔ میکفرسن کے جنگل کا یہ حصہ انسانی قدموں سے کم ہی آشنا تھا۔ جوزف اس کے پاس آ بیٹھا۔ دونوں ہی جیمز کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ انگلینڈ کا رہنے والا تھا اور اس اندوہناک حادثے کا شکار ہونے والے طیارے کا واحد غیر آسٹریلین فرد تھا۔ پھر جوزف نے اپنی جیبوں سے جان کو بیر نما کچھ پھل نکال کر دکھائے۔ ''کھانے کے قابل یہی کچھ ملا ہے۔ خدا جانے یہ بھی کھانے کے لائق ہے یا نہیں۔''

وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ جنگل میں پائے جانے والے اکثر پھل زہریلے یا انسانی صحت کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ وہ ان بیر نما پھلوں کو کھاتے ہوئے خوف محسوس کر رہے تھے۔ متفقہ طور پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت تک یہ پھل نہیں کھائیں گے جب تک بھوک سے بالکل ہی نڈھال نہ ہو جائیں۔ جیسے جیسے دن چڑھ رہا تھا گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی تناسب سے ان کی پیاس بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جوزف نے سب سے پہلے کسی ایسی چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو پانی لانے کے کام آ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جہاز کے ملبے کو کھنگالا۔ جہاز میں تو نہیں البتہ کریش لینڈنگ کے دوران جہاز کے ٹوٹ جانے والے ایک حصے سے جوزف کو ایک ربر کی بوتل مل گئی۔ اس میں معمولی سا

سوراخ تھا جسے اس نے کسی نہ کسی طرح بند کر دیا۔ اگلے روز دوپہر تک ایک دن پہلے ہونے والی بارش کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ انہوں نے اسے پی کر اپنی پیاس بجھائی لیکن شام تک آگ برساتا سورج پانی کے ان قلیل ذرائع کو چاٹ گیا تھا۔ ان دونوں کے دل اس خیال سے لرز رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ پھلوں کی تلاش میں جوزف جہاں تک جنگل میں گیا تھا۔ اسے پانی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ملا تھا۔

''ہم جلد ہی پیاس سے مر جائیں گے۔'' جان نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''فکر مت کرو کل صبح میں سب سے پہلے پانی تلاش کروں گا۔''

جان ذرا دیر کے لیے خاموش رہا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''دوست تم چلے کیوں نہیں جاتے ہو؟ تم ابھی چل سکتے ہو تمہارے اندر ہمت ہے تم ضرور کسی آبادی تک پہنچ جاؤ گے۔''

جوزف نے چاروں طرف دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں دوست میں تمہیں اس خوف ناک جنگل میں اکیلے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مدد آئے گی تو ہم دونوں کے لیے آئے گی اور موت بھی آئی تو ہم دونوں کو آئے گی۔''

جان کا خیال تھا کہ اس کا ساتھی اس کی طرح نوجوان اور جذباتی ہے۔ اس وجہ سے حقائق کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اسے اس جگہ کسی قسم کی مدد آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے رفتہ رفتہ قائل کر لے گا کہ وہ اس کی فکر نہ کرے اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ بھوک سے اتنے بے تاب ہو گئے تھے کہ انہوں نے پھلوں میں ممکنہ زہر کی پروا کیے بغیر انہیں کھا لیا۔ خوش قسمتی سے ان کے کوئی مضر اثرات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ جوزف نے اٹھتے ہوئے کہا ''اچھا دوست میں پانی کی تلاش میں جاتا ہوں۔''

بیر نما پھل کی نمی سے ان کی تشنگی کچھ کم ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ جوزف نے پہلے جنگل کے اوپری حصے کا رخ کیا جہاں جھاڑیوں سے اسے بیر نما پھل ملے تھے۔ اس نے پہلے اپنی جیبوں میں یہ پھل بھرے اور کچھ کھائے۔ اس کے بعد وہاں پانی تلاش کرنے کی سعی کی۔ اس کا خیال تھا کہ جھاڑیوں کے درمیان کسی گڑھے میں اسے پینے کے لائق پانی مل جائے گا جس سے وہ آج کے روز اپنی اور جان کی پیاس بجھا سکے گا مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگل کے اس حصے میں اسے پانی تو ایک طرف زمین پر کہیں نمی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چالیس گھنٹے پہلے ہونے والی بارش کا ایک قطرہ بھی جنگل کے نچلے حصے کا رخ کرنا چاہے۔ جوزف نے سوچا اور پھر نیچے جانے کے خیال سے اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ نشیب خاصا ڈھلوان تھا اور اس پر چڑھنا اترنا دونوں ہی آسان کام نہیں تھے۔ مگر پانی تو تلاش کرنا ہی تھا اس کے بغیر وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ بادل نخواستہ اس نے نشیب کا رخ کیا۔ جانے سے پہلے اس نے حاصل کیے ہوئے پھل جان کے حوالے کر دیے۔ ''انہیں احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان جھاڑیوں میں مجھے اب یہ بھی زیادہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

جان نے ایک بار پھر اسے چلے جانے کے لیے کہنا چاہا لیکن پھر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ جوزف احتیاط سے ڈھلان سے اترنے لگا۔ ابھی طیارے کے کریش میں آنے والے زخم پوری طرح نہیں بھرے تھے۔ اگر وہ پھسل جاتا تو مزید زخمی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پیر تڑوا لیتا یا کوئی جان لیوا زخم کھا کر اس جہان فانی سے کوچ کر جاتا۔ اس صورت میں معذور پڑا جان بالکل ہی بے یار و مددگار رہ جاتا۔ اسے خود سے زیادہ جان کا خیال تھا اور وہ اسی لیے احتیاط کر رہا تھا۔

تقریباً ڈھائی سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے مسلسل ترنم ریز پانی کی آواز سنائی دی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سچ مچ پانی بہنے کی آواز سن رہا تھا یا اس کے کان اسے دھوکا کھا رہے تھے۔ پاس ہی جنگل میں کوئی چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی۔ جوزف نے پچاس گز کا فاصلہ مزید طے کیا تو اسے جھاڑیوں کے عقب میں پتھروں پر بہتا یہ شفاف پانی کا چشمہ نظر آ گیا۔ مارے خوشی کے اس نے بے تابی سے پانی میں ہاتھ ڈالا منہ پر ملا پھر جانوروں کی طرح لپک کر چشمے کا پانی پینے لگا۔ چشمہ چھوٹا سا تھا اس میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی مسلسل بہنے والا چشمہ نہیں تھا بلکہ ایک پہاڑی نالہ تھا جو بارش کے دنوں میں بہتا تھا۔ اس وقت نالے میں بہنے والا پانی یقیناً دو دن پہلے ہونے والی بارش کا تھا اور اوپر جھاڑیوں سے بہتا آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ آنے والے پانی کی مقدار مسلسل گھٹتی جاتی اور اگر اوپر پہاڑوں پر بارش نہ ہوتی تو یہ چشمہ مکمل طور پر خشک ہو سکتا تھا۔ اس امکان نے جوزف کو لرزا دیا تھا اس علاقے میں اسے پانی کے لیے یہی ذریعہ ملا تھا۔ یہ بھی خشک ہو جاتا تو وہ پیاس سے مر جاتے.... مگر فی الوقت تو جان کو پانی پلانا زیادہ ضروری تھا۔ چشمے کے خشک ہونے کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جا سکتا تھا۔ واپسی کا

سفر اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اکثر اسے چاروں ہاتھ پیروں سے چلنا پڑتا تھا اور اوپر جاتے جاتے اس کے ہاتھ پیر زخمی ہو گئے تھے۔ جان پانی دیکھ کر کھل گیا تھا اور جوزف کی ساری تھکن اور تکلیف اسے خوش ہوتا دیکھ کر دور ہو گئی تھی۔ مگر اس روز ایک اور چکر لگا کر پانی لاتے لاتے اس کی حالت تباہ ہو گئی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور گھٹنے بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

دراصل حادثے کے بعد حالات کی سختی اور خوراک کی کمی نے جوزف کو بھی متاثر کیا تھا۔ اگلے روز وہ بہ مشکل ایک چکر لگا سکا تھا اور اس دوران میں اتنی پیاس لگی کہ اوپر آتے آتے نصف پانی وہ خود پی گیا تھا۔ حادثے کو آج تیسرا دن تھا اور انہیں جنگل میں اپنے علاوہ کوئی تیسری انسانی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ آسمان پر انہیں تلاش کرنے والا کوئی طیارہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ جان نے جوزف سے کہا۔

''لگتا ہے کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ہمارا طیارہ اس جنگل میں گرا ہے۔ شاید امدادی کارروائی کسی اور علاقے میں کی جا رہی ہے۔'' جوزف نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

تیسرے دن انہیں کھانے کے لیے چند ہی بیر نما پھل ملے تھے اور ان کی تعداد بھی ناکافی تھی۔ ان کے پیٹ بھوک کی وجہ سے سکڑ گئے تھے اور کمزوری کی وجہ سے دن رات میں ان کا بیشتر وقت سوتے یا اونگھتے گزرتا تھا۔ چوتھے دن گرمی بے پناہ تھی جب جوزف صبح نیچے پانی لینے گیا تو اس نے دیکھا کہ چشمہ اب ایک پتلی سی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا اور لگ رہا تھا جب وہ اگلی بار یہاں آئے گا تو اسے چشمہ خشک ملے گا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس ہولناک جنگل میں یہ پانی ان کی زندگی کی واحد امید تھا۔ اگر یہ بھی خشک ہو جاتا تو ایک دو روز سے زیادہ زندہ نہ رہ پاتے لیکن اسے خشک ہونے سے روکنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے بغور چشمے کا جائزہ لیا۔ اور ایک ذرا نیچی جگہ منتخب کر کے اس نے وہاں سے پتھر نکال کر ذرا آگے ایک دیوار سی بنانی شروع کر دی۔ جس جگہ سے پتھر نکال رہا تھا۔ وہاں چشمے کا پانی جمع ہونے لگا۔ مزید پتھر نکالنے اور ان سے دیوار بنانے سے وہاں ایک اچھا خاصا تالاب بن گیا تھا جس میں پانی جمع ہو رہا تھا۔ اب اگر اوپر سے پانی آنا بند بھی ہو جاتا تب بھی اس تالاب میں اتنا پانی ہوتا کہ اس سے وہ ایک دو روز پانی حاصل کر سکتے تھے۔ وہ پانی لے کر اوپر آیا۔ اس روز ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ باتوں اور لطیفوں سے جان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔

پانچویں دن جوزف نے ایک بار پھر ہمت کی۔ نیچے سے جان کے لیے پانی لانے کے بعد وہ اٹھا اور کھانے کے لیے کچھ تلاش کرنے اوپر والے جنگل کی طرف نکل گیا۔ پانی کے لیے نیچے آتے جاتے اس نے اتنا تو دیکھ لیا تھا کہ وہاں کھانے کے لائق کوئی شے نہیں تھی۔ کھانے کے لیے پھل اوپری جنگل میں ہی دستیاب ہو سکتے تھے۔ جن جھاڑیوں سے اس نے بیر نما پھل حاصل کیے تھے۔ وہ اب ان پھلوں سے مکمل طور پر خالی ہو چکی تھیں اور اسے وہاں پر ایسی اور جھاڑیاں نظر نہیں آئی تھیں۔ غالباً ان پھلوں کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ اس نے جھاڑیوں سے مایوس ہو کر ان کے نیچے تلاش کیا تو اسے مشکل سے درجن بھر اور بعض پرندوں کے ادھ کھائے سوکھے پھل مل گئے۔ اس کے کپڑے بالکل پھٹ گئے تھے۔ ان میں جیب نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ اسے واپسی کے دوران بعض چکنوں پر چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلنا پڑتا تھا۔ اس لیے پھل ہاتھ میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے پھل اپنے منہ میں بھر لیے اور واپس چل پڑا۔ دو گھنٹے تک خاک چھاننے کے بعد اسے اتنے پھل ملے تھے جو ایک بچے کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتے تھے مگر کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں یہ چند پھل بھی نعمت تھے۔

جان اسے دیکھ کر مسکرایا ''تم نے اتنی دیر لگا دی۔''

جوزف رینگتا ہوا آ کر اس کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ ''یہ جنگل بدستور دشوار ہے۔'' اس نے پھل جوزف کے سامنے ڈال دیے۔

''اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ کسی مدد کا انتظار کرنا فضول ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ تم چلے جاؤ۔ جنہوں عقل مند تھا۔ شاید وہ اب تک کسی انسانی آبادی تک پہنچ گیا ہو۔''

جوزف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں ہماری مدد کے لیے بھی کوئی نہ کوئی پارٹی ضرور اس طرف آتی اس کے بارے میں مجھے خوف ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ وہ ویسے بھی خاصا زخمی تھا۔''

''ہم دونوں کے مرنے سے بہتر ہے کوئی ایک اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔ تم جتنی محنت میرے لیے پانی اور پھل لانے میں کرتے ہو۔ اتنی تگ و دو اگر جنگل سے نکلنے میں کرتے تو اب تک کہیں نہ کہیں پہنچ چکے ہوتے۔''

جان درست کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر ہمت تھی۔ اسے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی تھی۔ وہ چلتا تو اسے راستے میں پانی اور کھانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا اور وہ کسی نہ کسی

آبادی تک بھی پہنچ جاتا لیکن اس صورت میں یہ خوب صورت نوجوان جس نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ موت کی آغوش میں سو جاتا۔ یہ اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ وہ اس کا محسن تھا۔ اگر وہ اپنی ٹوٹی ٹانگ کے باوجود ہمت کر کے انہیں طیارے سے نہ نکالتا تو وہ وہیں جل کر راکھ ہو جاتے۔ جان بچانے کا صلہ وہ اس صورت میں دے کر اسے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ جائے۔ یہ اس کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس نے جان سے کہا ''دوست بار بار مجھ سے ایک ناممکن بات مت کہا کرو۔ میں کسی بھی صورت میں تمہیں یہاں بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''اس صورت میں ہم دونوں ہی مر جائیں گے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے ساتھ جان دینا پسند کروں گا۔ بہ نسبت یہاں سے جانے کے۔''

جان کی ٹانگ کا زخم خراب ہو رہا تھا جہاں سے ہڈی ٹوٹی وہاں سے ٹانگ سوج کر دوگنا سائز کی ہو گئی تھی اور اس کی رنگت بھی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ زخم سے نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی اور اس سے ہلکی سی بو بھی اٹھ رہی تھی۔ زخم میں انفیکشن تو لازمی ہو گیا تھا اور جوزف کو ڈر تھا کہ مدد آنے کے باوجود جان کی ٹانگ نہیں بچائی جا سکے گی اور یہ نوجوان ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے گا۔

''تم جذباتی ہو رہے ہو دوست۔'' جان نے آہستہ سے کہا۔

''تم بھی فضول باتیں کرنے کے بجائے اپنے دانے پر توجہ دو۔'' جوزف نے ایک پھل اس کے منہ میں ڈالا۔

چھٹے دن خاصی جدوجہد کے بعد بھی جوزف کو کھانے کے لائق کوئی شے نہیں ملی۔ سوائے ایک جگہ اوپر سے گرے کسی پرندے کے انڈے کے۔ انڈہ ٹوٹ گیا تھا اور اس کی سفیدی بہہ گئی تھی البتہ زردی چھلکے میں تھی۔ جوزف نے اسے ہی چاٹ لیا۔ اس روز بھی پانی لانے میں وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کسی پتھر سے لگا تھا اور وہ کلائی کے پاس سے سوج گیا تھا۔ یہی حال دونوں گھٹنوں کا تھا۔ چلنے کے دوران جب بھی اس کے گھٹنے کسی پتھر سے ٹکراتے۔ اس کی کراہ نکل جاتی تھی۔ ایک بار پانی لاتے ہوئے وہ دس بارہ گز کی ڈھلان سے لڑھکتا ہوا ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ایک گھنٹے تک تو وہ اٹھنے کی ہمت ہی نہ کر سکا تھا۔ اس کے بعد وہ بہ مشکل چاروں ہاتھ پیروں سے اوپر تک پہنچا تھا۔ اس دوران میں نصف سے زیادہ پانی ضائع ہو گیا تھا۔

جان اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' جوزف زبردستی مسکرایا۔ ''ایک جگہ سے لڑھک گیا تھا۔ کمر میں چوٹ آئی ہے۔''

اپنی سوجی ٹانگ کے باوجود جان اٹھ بیٹھا اور اس نے جوزف کی کمر کی مالش کی جو نیلگوں ہو رہی تھی۔ پھر اس نے اصرار کر کے جوزف کو چوں کے بستر پر لٹا دیا جو جوزف نے تہہ جمع کر کے اس کے لیے بنایا تھا۔ یہاں زمین سخت تھی اور اس پر لیٹنا بے حد تکلیف دہ ہوتا تھا۔ شام تک جوزف اپنی حالت بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ جتنا پانی لایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ دونوں بے حد پیاسے تھے۔ گزشتہ چھتیس گھنٹے سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا مگر پیاس کا احساس بھوک پر حاوی تھا۔ شام کو جوزف نے پانی لانے کے لیے جانا چاہا لیکن جان نے اسے روک دیا۔

''نہیں دوست تمہاری حالت ابھی اچھی نہیں ہے اور کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ تاریکی میں یہ راستے خطرناک ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہم یہ رات پانی کے بغیر گزار سکتے ہیں۔''

جوزف نے بہت اصرار کیا لیکن جان نے اسے جانے نہیں دیا۔ رات کسی پہر ہلکی سی بارش ہوئی اس نے ان کی پیاس کیا بجھنی ہاں سردی میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ جوزف کے پیر کے زخم میں اتنی تکلیف تھی کہ اسے اب نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ رات بھر وہ کراہتا رہا تھا۔ اگر نیند بھی آتی تو تکلیف کی لہر اسے فوراً جگا دیا کرتی تھی۔ صبح روشنی کی پہلی کرن پھوٹتے ہی جوزف پانی لینے کے لیے نیچے روانہ ہو گیا۔ اس بار وہ کولھوں کے بل بچوں اور ہتھیلیوں کی مدد سے نیچے اترا تھا اس طرح اس کے سوجے ہوئے گھٹنے محفوظ رہے تھے۔ چشمے پر پہنچ کر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب اس میں پانی روانی سے بہہ رہا تھا۔ شاید گزشتہ رات پہاڑوں پر جو بارش ہوئی تھی اس کا پانی نالے میں آ گیا تھا۔

اس نے جی بھر کر پانی پیا پھر اپنے گرد آلود ہاتھ پیر دھوئے۔ سر سے مٹی صاف کی۔ اسے بے حد سکون ملا۔ اس کے بعد اس نے بوتل میں پانی بھرا۔ ابھی وہ واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پانی کے ساتھ بہہ کر آنے والے ہلکے سبز رنگ کے امرود نما پھل دیکھے۔ اس نے پانی سے ایک پھل نکال کر چکھا اس کا ذائقہ ہلکا سا ترش تھا لیکن کھانے کے لائق تھا۔ اس نے جلدی سے مزید پھل اٹھانا شروع کر دیے۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ پھل حاصل نہیں کر سکا تھا۔ شاید زیادہ تر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پھل پانی میں بہہ کر جا چکے تھے۔ اس کے ہاتھ بہ مشکل چھ پھل لگے تھے۔

پھل اور پانی لے کر اس نے واپسی کا سفر شروع کیا لیکن اس بار اسے اپنے پیروں کا استعمال کرنا ہی پڑا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ پانی کی بوتل اور پھل سنبھالنا اس کے لیے بے شمار تھا لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا بے شک کتنی دیر لگ جائے وہ ایک پھل اور پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں جانے دے گا۔ جین سوگز کا فاصلہ اس نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ اس طرح وہ جان کے لیے پھل اور پانی لے جانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے پانی پیا پھر انہوں نے ایک ایک پھل کھایا۔ کئی دن بعد ان کے کمزور معدوں میں کچھ گیا تھا۔ وہ زیادہ کھا کر پیٹ کی خرابی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اور وہ ان پھلوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ زہریلے ہوتے تو وہ اس کمزوری کی حالت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے مگر جب چند گھنٹے تک کچھ نہیں ہوا تو وہ باقی پھل کھا گئے۔ رات شام کو جوزف اندھیرا ہونے سے پہلے ایک بار پھر پانی لے آیا۔ اس دوران میں اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اسی پر اس نے جان سے کہا ''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں نیچے چشمے تک لے جاؤں۔ اس طرح میں بار بار آنے جانے سے بچ جاؤں گا اور ہم کم سے کم پیاسے نہیں رہیں گے۔''

جان پھیکے سے انداز میں مسکرایا ''یہ ممکن نہیں ہے دوست۔ اس سوجی اور ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ نیچے جانا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے نیچے ہم بالکل ہی چھپ جائیں گے اس بلندی کو تلاش کرنے والا آیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ نیچے ایسا ممکن نہیں ہوگا۔''

جوزف نے سوچا۔ جان درست کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی جوزف کے بھاری جسم کو نیچے نہیں لے جا سکتا تھا اس ڈھلان پر بعض مقامات ایسے آتے تھے کہ صحیح سلامت انسان بھی اترتے ہوئے گھبراتا تھا۔ جوزف کے لیے تو قطعی ناممکن تھا۔ اس کی ٹانگ میں معمولی سی حرکت بھی ہوتی تھی تو وہ درد سے بے حال ہو جاتا تھا۔ تو کیا وہ اسی طرح بے بسی کی موت مر جائے۔ جوزف نے سوچا آج ساتواں دن ہو گیا تھا۔ مسلسل فاقوں سے ان کے جسموں کی توانائی چٹخ گئی تھی۔ اب بات بھی کرتے تو ہانپنے لگتے تھے۔ انہوں نے موت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا جو اب سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دن وہ اسی طرح رہتے تو مر ہی جاتے۔

آٹھویں دن جوزف کو نیچے چشمے سے جا کر پانی لانے میں پورے سات گھنٹے لگے۔ یہ تین سو گز کا فاصلہ اس نے نہ جانے کس طرح رینگ رینگ کر طے کیا تھا۔ اس روز تو وہ بھی زندگی سے مایوس ہو گیا اس نے جان سے کہا ''میں تازہ پھل جمع کرتا ہوں تاکہ ہم ان کا بستر بنا کر لیٹ جائیں اور موت کا انتظار کریں۔''

یہ سن کر جان رو دیا تھا اس لیے نہیں کہ اسے موت کا خوف تھا بلکہ اس لیے کہ اس کا یہ ساتھی کل تک اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ہنستا تھا اور اس سے مذاق کرتا تھا۔ وہ اسے پھل کھلاتے ہوئے کہتا تھا ''لو بیٹے، تمہاری ماں تمہارے لیے چونگا (جیسے پرندے اپنے بچوں کے لیے خوراک منہ میں جمع کر کے لاتے ہیں) لائی ہے۔'' پھر دونوں دل کھول کر ہنسا کرتے تھے اور آج وہ کتنے دل شکستہ انداز میں موت کے استقبال کی بات کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جوزف کو پتے جمع کرتا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ واقعی انجام قریب ہے۔

☆☆☆

عین اسی لمحے تیس میل کے فاصلے پر برنارڈ اور ولی اپنی مہم پر روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے سارے امکانات کا جائزہ لیا تھا۔ اس نے بعض لوگوں سے سنا تھا کہ انہوں نے حادثے کے وقت ایک طیارے کو میکنرسن کے پہاڑی سلسلے سے گزر کر مزمورو کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان افواہوں کی بنیاد پر اس نے علاقے کے نقشے کو کھنگالا اور اندازہ لگایا کہ طوفان نے طیارے کو میکنرسن سے آگے جانے کا موقع نہیں دیا ہوگا اور وہ اس پہاڑی سلسلے میں کہیں گر کر تباہ ہو گیا ہوگا۔ برسبن سے مزمورنک ایک سیدھی لکیر نقشے پر کھینچنے کے بعد اسے طیارے کے ممکنہ جائے حادثہ کے بارے میں بھی کسی حد تک آگاہی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''اس لکیر پر چار چوٹیاں آس پاس واقع ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ طوفان سب سے زیادہ شدید اس علاقے میں تھا۔ طیارہ ان چار میں سے کسی ایک پہاڑی پر گرا ہوگا۔ میں وہاں تک طیارے کے ملبے کو تلاش کرنے جاؤں گا۔''

''میرے خیال میں یہ کام آسان نہیں ہے۔'' اور یلی کی بیوی نے کہا ''تمہیں پوری تیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔''

اور یلی نے سر ہلایا ''ہاں اس علاقے میں کوئی چیز تلاش کرنا دشوار کام ہے۔ ممکن ہے مجھے کئی دن لگ جائیں تم اور بچے گھبرانا مت۔''

اور یلی نے اردگرد کے رہنے والوں کو اپنی اس مہم کے بارے میں بتایا تھا لیکن ان میں سے کوئی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوا تھا اس لیے 27 فروری کو اور یلی خود ہی اپنی اس

ایک نفری مہم پر روانہ ہوگیا۔ روانگی سے پہلے اس نے ضرورت کا سارا سامان رکھ لیا تھا۔ اس میں دو بڑی ڈبل روٹیاں، جام اور پنیر، کچھ خشک دودھ، کافی، پانی کا ایک مشکیزہ، رسہ، کیلیں، ہتھوڑی، ایک کلہاڑی، سانپ کے کاٹے کی دوا اور رائفل اس کے پاس تھی۔ راستے میں بڑے جانور بھی مل سکتے تھے۔ رات سکون سے گزارنے کے لیے اس کے پاس کمبل تھا اور بیروں میں کیلوں والے لانگ شوز تھے جو پہاڑی مقامات پر سفر کرنے کے لیے ضروری تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر سب سے پہلے ماؤنٹ بیتھون گمبل کی طرف روانہ ہوا۔ ان چار چوٹیوں میں یہی پہاڑی سب سے پہلے آتی تھی۔ پہاڑی چار ہزار فٹ سے زیادہ بلند تھی اور یہ بے حد گھنے اور دشوار گزار جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

گھوڑے کی وجہ سے اور ٹلی نے یہ سفر تیزی سے کیا تھا۔ راستہ بے حد خراب تھا۔ کیونکہ میکفرسن کے اس حصے کی طرف جرواہے بھی نہیں جاتے تھے۔ کیونکہ یہ علاقے حد سے زیادہ دشوار گزار تھے اور ان کے مویشی اکثر چٹانوں سے گر جاتے تھے یا کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنس جاتے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کی آمدورفت نہ ہونے کے سبب اس علاقے میں راستے بھی نہیں تھے۔ اور ٹلی بہ مشکل راستہ تلاش کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ سامنے سے آنے والے طوفان نے طیارے کو کسی چوٹی کی ڈھلان پر دے مارا تھا اور اس صورت میں طیارے کا ملبہ شمال مشرقی ڈھلانوں پر ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس کا رخ ڈھلانوں کی طرف ہی تھا۔

آٹھ گھنٹے کے لگاتار سفر کے بعد وہ سہ پہر کے قریب پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہاں سے آگے ڈھلانوں پر بے حد گھنا جنگل تھا۔ جس میں گھوڑے سمیت سفر بے حد مشکل تھا اس لیے اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور سامان شانے پر لاد کر پیدل ہی آگے چل پڑا۔ اس حصے میں بے حد بلند اور گھنے درخت تھے جو آسمان سے باتیں کرتے محسوس ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر اوپر چھائی سبز بیلوں نے پوری کردی تھی۔ نیچے تاریکی مسلط تھی اور کہیں کہیں سورج کی روشنی اس تاریکی سے لڑ رہی تھی۔ ٹیلوں سے لگاتار پانی کے قطرے گر رہے تھے اور زمین سیلی ہو رہی تھی۔ زمین پر جا بہ جا زہریلے کانٹوں والی جھاڑیاں بکھری تھیں جن کے کانٹے اگر انسانی جسم میں چبھ جاتے تو تڑپانے والا درد پیدا کرتے تھے۔ ان سے بچ کر چلنا بے حد ضروری تھا۔

رات تک وہ پہلی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اس نے رات یہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور بارش شروع ہوگئی۔ کوئی جائے پناہ بھی نہیں تھی۔ وہ ایک درخت تلے پانی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ خدا خدا کرکے بارش تھمی تو سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ اس کا کمبل بھیگ گیا تھا اس نے آگ جلانے کی کوشش کی لیکن لکڑیاں گیلی ہونے کی وجہ سے آگ جل ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے سردی سے ٹھٹھرتے اور اونگھتے ہوئے یہ اذیت ناک رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ڈبل روٹی اور مکھن سے ناشتا کیا پھر مشرقی ڈھلان پر اترنے لگا۔ ابھی تک اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب وہ دوسری چوٹی پر جا پہنچا۔ تیسری چوٹی یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اس جگہ جنگل اتنا گھنا نہیں تھا لیکن زمین ناہموار تھی۔ اسے دور ڈھلان پر ایک سیاہ دھبا نظر آیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس علاقے میں سیاہ رنگ کی کوئی چیز نہیں تھی۔ زمین سرخی مائل تھی اور چٹانوں کا رنگ خاکی تھا۔ تو کیا یہ سیاہ دھبہ کسی شے کے جلنے سے پیدا ہوا تھا۔ کیا اس نے جہاز کا ملبہ تلاش کرلیا تھا لیکن ابھی یہ بہت دور تھا۔ اس نے چوٹی سے اترنے کی سمت میں بڑھنا شروع کردیا۔ جیسے ہی وہ نیچے پہنچا دھبا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن وہ اس کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس لیے جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے اس طرف بڑھتا رہا۔ اس جگہ جھاڑیاں بے پناہ گھنی اور سخت تھیں۔ ان میں راستہ بنانا آسان نہیں تھا۔ وہ تین میل تک ان جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اسے لگا وہ اپنی منزل کے پاس آگیا ہے۔ اس نے اب تک چھ میل کا فاصلہ طے کرلیا تھا اور یہاں جہاز کا ملبہ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اس امید پر کہ طیارے کا کوئی مسافر بچ گیا ہو۔ وہ آوازیں دینے لگا۔

''کوئی ہے..... کسی کو مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی ہے۔''

☆☆☆

جوزف غنودگی محسوس کررہا تھا۔ دو روز قبل انہوں نے آخری بار پانی پیا تھا اور پھل کھائے ہوئے انہیں تین روز ہوچکے تھے۔ وہ اتنی کمزوری محسوس کررہے تھے کہ ان سے بات بھی نہیں کی جارہی تھی۔ جان کل سے تیز بخار کی کیفیت میں تھا اور اس کا پاؤں بالکل سیاہ ہو رہا تھا۔ جوزف کی نظر جب بھی اس کے پاؤں پر پڑتی اس کے اندر خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا اگر کسی معجزے کے تحت ان کی جان بچ بھی گئی تو جان کی یہ ٹانگ شاید کاٹنی ہی پڑے۔ غنودگی میں اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی آواز دے رہا ہو۔ وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اس کا خیال تھا کہ جان نے کچھ کہا ہے۔ مگر وہ تو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی اور آنکھیں جیسے کچھ سوجی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید اس کے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرنا چاہیں تو اسے آواز دوبارہ آئی۔ آواز دور سے ہوا کے دوش پر لہراتی آئی تھی لیکن آواز کسی انسان کی تھی۔ وہ مارے جوش کے اٹھ بیٹھا اس نے نیم بے ہوش جان کو جھنجھوڑ دیا۔

''اٹھو میں نے ابھی ایک آواز سنی ہے۔ اس جنگل میں کوئی اور بھی ہے۔''

جان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا ''وہم ہوگا تمہارا.....''

''نہیں یقین کرو میں نے دو بار سنی ہے اور ایک بار تو بالکل واضح سنی ہے۔ اگر تم بھی کان لگا کر سنو تو سنائی دے گی۔''

جوزف کے کہنے پر جان نے خاموشی سے آواز سننے کی کوشش شروع کردی اور انہیں زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہوا کے دوش پر لہراتی وہ آواز واضح طور پر ان کے کانوں تک آئی تھی۔ جان بھی مارے جوش کے اچھل پڑا تھا۔

''یہ تو کوئی آدمی ہے اور شاید ہمیں ہی تلاش کرنے آیا ہے۔''

''ہمیں چلا کر اسے جواب دینا چاہیے۔'' جوزف بولا اور پھر دونوں اپنی کمزور آواز میں جواباً چلا چلا کر پکارنے لگے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگے پھر آواز انہیں قریب آتے لگیں۔ نیچے ڈھلان کی طرف ایک شخص جھاڑی ہٹاتا نمودار ہوا اور ان کے پاس آکر انہیں گھورنے لگا۔ تینوں کے لیے یہ ایک حیرت ناک موقع تھا۔ جیسے ان دونوں کو اس بھیانک اور ویران جنگل میں کسی کی آمد کی توقع نہیں تھی تو آنے والے کو بھی اتنی امید نہیں تھی کہ اسے تباہ شدہ جہاز کے دو مسافر زندہ مل جائیں گے۔

برنارڈ اور ٹلی نے حیرت سے ان دونوں افراد کو دیکھا سب سے پہلے اس کی نظر جان پر پڑی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا اور اس کی کھال جیسے ہڈیوں پر منڈھی تھی۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ سب سے خوف ناک شے اس کی دائیں ٹانگ تھیں جو سوج کر معمول کی جسامت سے دوگنی سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اس کی رنگت سیاہ ہو رہی تھی اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دوسرا شخص اس سے ذرا فاصلے پر تھا لیکن اس کی حالت بھی پہلے والے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ جھاڑیوں میں گھستا رہا ہو جسمانی حالت اس کی بھی ناگفتہ بہ تھی۔ تینوں ایک دوسرے کو حیرت ناک نظروں سے گھورے جارہے تھے۔ سب سے پہلے جوزف کو ہوش آیا۔ اس نے کہا

''دوست کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں مگر میرے پاس ابھی کافی ہے۔'' اور ٹلی ان کے پاس بیٹھ کر اپنا سامان کھول رہا تھا۔

''دوست کرکٹ میچ کا کیا ہوا؟'' اس بار جان نے پوچھا۔ ان دنوں اسٹریلیا کی ٹیم ڈان بریڈ مین کی قیادت میں انگلینڈ سے نبرد آزما تھی اور ٹلی نے کھانے پینے کا سامان نکالتے ہوئے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے انگلینڈ کو شکستِ فاش دے دی۔''

ان سے باتیں کرتے ہوئے ٹلی انہیں یہاں سے لے جانے کے طریقے پر غور کررہا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام وہ اکیلے نہیں کرسکتا تھا۔ اسے واپس جانا تھا اور اپنے ساتھ پوری امدادی پارٹی لے کر آنی تھی۔ اس نے سب سے پہلے انہیں پانی دیا پھر ڈبل روٹی اور پنیر دینے لگا۔ اس نے خیال رکھا کہ وہ اتنا نہ کھائیں کہ ان کا معدہ جو خوراک سے خالی ہو رہا تھا

خراب ہوجائے۔ کھانے کے بعد اس نے ان کے لیے کافی بنائی۔ وہ اپنا مشکیزہ لے کر نیچے چشمے تک گیا اور اسے بھر کر لا کے ان کے پاس رکھ دیا۔ کھانا ابھی اتنا اور تھا کہ جوزف اور جان ایک وقت اور کھا سکتے تھے۔

''دوستو مجھے مدد لینے کے لیے واپس جانا ہوگا۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ کچھ دیر بعد ہم انسانوں کے درمیان ہوں گے۔''

اور یلی نے اپنا کمبل جان کو اوڑھا دیا اور خود مدد لینے نزدیک ترین بستی کی طرف روانہ ہوگیا جو یہاں سے کوئی دس میل کے فاصلے پر مشرق میں تھی۔ اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو جیمز نے اختیار کیا تھا۔ اسے ایک میل بعد جا کر ہی اس کی لاش ایک درخت کے تنے سے لگی ہوئی مل گئی تھی۔ اور یلی نے افسوس سے اس کے لیے دعا کی اور آگے روانہ ہوگیا۔ جوزف نے اسے کریش اور کریش کے بعد کی ساری کہانی سے آگاہ کیا تھا۔

اور یلی نے حیران کن رفتار سے بے حد دشوار گزار یہ راستہ محض تین گھنٹے میں طے کیا اور اپنے ایک دوست کے فارم پر جا پہنچا۔ اس نے وہاں پر حالات بتا کر ایک امدادی پارٹی تیار کرنے کو کہا۔ گمشدہ طیارے اور اس کے مسافروں کے بارے میں سنتے ہی مقامی آبادی میں ہیجان پھیل گیا تھا اور یلی ایک معتبر اور معزز شخص تھا اور نہ لوگ سمجھتے وہ مذاق کر رہا ہے۔ بے حد تیزی سے پچاس سے زیادہ افراد نے ایک امدادی پارٹی تشکیل دی۔ یہ قصبہ ہوکمٹن کہلاتا تھا اور یہاں پر تار کی سہولت تھی۔ اس لیے فوراً ہی یہ خبر سارے ملک میں پھیل گئی تھی۔

دو پارٹیاں بنائی گئیں۔ اولین پارٹی خوراک اور ادویات لے کر پہلے روانہ ہوئی اس میں ایک ڈاکٹر سرجن بھی تھا کیونکہ اور یلی نے جان کے بارے میں بتایا کہ اس کی ٹانگ کا زخم خطرناک حد تک خراب ہوگیا تھا اور اسے کسی ڈاکٹر کی اشد ضرورت تھی۔ یہ پارٹی آٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ اسے جان اور جوزف تک پہنچنے میں آٹھ گھنٹے لگے تھے اس سے اور یلی کی حیرت انگیز رفتار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس نے اکیلے ہونے کے باوجود یہ فاصلہ محض تین گھنٹے میں طے کرلیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں ابھی تک زندہ سلامت تھے۔

پہلی پارٹی نے جاتے ہی جان اور جوزف کی جسمانی حالت بہتر بنانے کے لیے انہیں شکر، دودھ اور انڈے کا محلول وقفے وقفے سے دینا شروع کردیا۔ درمیان میں ان کے جسموں کی حرارت بحال کرنے کے لیے انہیں برانڈی بھی دی گئی تھی۔ ٹیم کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے جان کے پاؤں کا معائنہ کیا اور اس کی حالت کے پیش نظر فوری آپریشن کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے دوسروں سے کہا ''اگر اس کی ٹانگ کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو اسے کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا اس لیے میں اسی جگہ آپریشن کروں گا۔''

پارٹی میں ایک شخص طبی امداد دینے کی تربیت حاصل کرچکا تھا اس نے ڈاکٹر کی مدد کی۔ اس نے آپریشن کر کے جان کی ٹوٹی ہڈی بٹھائی اور اس کے پاؤں کی سوجن کم کرنے کے لیے چیرے لگائے۔ خطرہ تھا کہ یہ سوجن شریانوں کو دبا کر نچلی ٹانگ میں خون کی فراہمی روک دے گی اور وہ مردہ ہوجائے گی۔ اس آپریشن نے جان کی ٹانگ بچالی تھی۔

پہلی پارٹی کے عقب میں روانہ ہونے والی دوسری پارٹی زیادہ بڑی تھی اس کا کام راستے کو اسٹریچر گزارنے کے قابل بنانا تھا۔ انہوں نے جھاڑیاں گرائیں اور راستے میں آنے والے گڑھوں کو پاٹ دیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک عدد اسٹریچر بھی لائے تھے۔ انہوں نے جان کو اس پر منتقل کیا اور جیسے ہی سورج کی روشنی نمودار ہوئی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کردیا۔ کیونکہ اسٹریچر اٹھانے والوں کی کمی نہیں تھی اس لیے وہ تیز رفتاری سے سفر طے کر کے جلد اپنی منزل پر جا پہنچے اور جان اور جوزف کو اسپتال میں داخل کردیا۔ یہ عافیت کا پہلا دن تھا اور اس عرصے میں ان کا وزن گھٹ کر نصف رہ گیا تھا۔ متواتر ایک ہفتے کے علاج سے وہ صحت یاب ہوگئے۔ جان کے پاؤں کا دوبارہ آپریشن ہوا اور اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ بٹھا کر اس کے پاؤں پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا۔

مقامی لوگوں نے جیمز ویسٹر کی لاش اور طیارے میں ہلاک ہونے والے باقی افراد کی باقیات اسی مقام پر دفنا دی تھیں۔ ان کی قبروں پر بعد میں ایک طیارے سے پھول برسائے گئے تھے۔ اور یلی کو اس کارنامے پر اپنے ملک میں ہیرو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اسے ملک کے کونے کونے سے مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ لوگوں نے ایک فنڈ کے تحت دو ہزار پاؤنڈ اکٹھا کر کے اسے بطور انعام دیے۔

آسٹریلیا کی ہوابازی کی تاریخ میں یہ پہلا بڑا حادثہ تھا اور اس نے شہری ہوابازی کے بارے میں حکومت کا رویہ بدل دیا تھا۔ حکومت نے فوری طور پر تمام ہوائی اڈوں اور طیاروں میں ریڈیو لگانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی موسمیات سے متعلق آلات کی تنصیب بھی کی گئی تاکہ آئندہ اس قسم کے حادثوں میں فوری امدادی کارروائی ممکن ہوسکے۔

ایک ایسے درندے کا قصہ جو انسانیت کے لئے باعث تذلیل تھا

انسانی درندہ

تحریر : محمد ظریف

جنگلی درندوں اور حیوانات سے بچنے اور نبرد آزما ہونے کے لئے تو انسان نے تمام ممکنہ صورتیں تلاش کرلی ہیں، مگر انسانی درندوں سے بچنا آج بھی اتنا آسان نہیں کیونکہ ایک تو وہ خود انسانی سرشت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کی غرض اور ضرورت حیوانوں سے مختلف ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ ان کی شناخت ہمیشہ ان کا نشانہ بن جانے کے بعد ہوتی ہے اب بھلا ان سے بچاؤ کس طرح ممکن ہو؟

''جلد پہنچو۔ تمہارے بھائی کو چیتے نے ہلاک کر دیا ہے۔'' چند الفاظ پر مشتمل تار کا یہ مضمون میرے لیے دردِ غم کی ہزار داستانوں کے برابر تھا۔ تار کے کاغذ کو تھامے میں حزن وملال کی تصویر بنا خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ بیٹے جیسے پیارے چھوٹے بھائی کی موت کی اطلاع نے میرے قوائے ذہن کو مختل کر دیا تھا اور دیر تک طور پر میں سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہوچکا تھا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نہ بول سکتا نہ دیکھ سکتا اور نہ کسی بات پر غور کر سکتا تھا۔ صرف سننے کی قوت باقی تھی۔ اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کی آوازیں مجھے مکھیوں کی بھنبھناہٹ محسوس ہو رہی تھیں اور میں تار کا کاغذ ہاتھ میں تھامے ساکت بیٹھا خلاؤں میں گھورے چلا جا رہا تھا۔

''صاحب کو سکتہ ہوگیا ہے۔ خدا کے لیے انہیں رلاؤ۔ ورنہ یہ پاگل ہوجائیں گے۔''

یہ حسن میاں کی گمبھیر آواز تھی جو رقت کے سبب کانپ رہی تھی۔ ان کی اس دلدوز صدا میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ میں سکتے کی کیفیت سے نکل کر عالم ہوش وحواس میں آگیا۔ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں بچوں کے مانند بلک بلک کر

رونے لگا۔

یہ 1945ء کی بات ہے جب میں نے آسام کے جنگل سیتل باڑی میں صندل کی لکڑی کی کٹائی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ سیتل باڑی وہ علاقہ ہے جہاں کے جنگلات میں صندل کے بے شمار درخت پائے جاتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کے بعد صندل کی لکڑی کا زیادہ تر ذخیرہ سیتل باڑی ہی میں موجود ہے۔ نباتات میں صندل کی لکڑی کی وہی اہمیت ہے جو دھاتوں میں پورویم کو حاصل ہے۔ یہ نہایت قیمتی اور خوشبودار ہے..... جو ادویات تیار کرنے، شربت بنانے اور خوشبو پیدا کرنے کے علاوہ قیمتی نادر فرنیچر تیار کرنے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک اس لکڑی کو ایک خاص مذہبی تقدس بھی حاصل ہے۔ اعلیٰ نسل کے دولت مند ہندوؤں کی چتا صندل کی لکڑی ہی سے تیار کر کے جلائی جاتی ہے۔

سیتل باڑی کا ٹھیکہ میں نے محکمۂ جنگلات کے افسروں کو ایک خطیر رقم بطور تحفہ دے کر ایک لاکھ روپیہ میں حاصل کیا تھا۔ اس ایک لاکھ کی رقم کو اب ایک کروڑ روپیہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے اس ٹھیکے میں کم از کم دو لاکھ روپیہ آمدنی کی توقع تھی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ سیتل باڑی کا ٹھیکہ ملنے کے بعد مجھے نینی تال میں جنگل کی کٹائی کا ایک ٹھیکہ اور مل گیا۔ چونکہ سیتل باڑی میں صندل کی کٹائی کا کام شروع ہو چکا تھا اور نینی تال میں کام شروع کرنا تھا۔ اس لیے سیتل باڑی کا انتظام میں اپنے چھوٹے بھائی رفیع احمد خان کے سپرد کر کے خود نینی تال روانہ ہو گیا۔

رفیع احمد خان مجھ سے کوئی اٹھارہ برس چھوٹا تھا۔ 25 برس کا یہ کڑیل اور حسین نوجوان مجھے بیٹوں سے زیادہ اس لیے عزیز تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے میرے والدین کو گیارہ اولادیں (5 لڑکے اور 6 لڑکیاں) عطا کیں لیکن صرف ہم دو بھائی ہی زندہ رہ سکے۔ دیگر 9 بہن بھائی شیر خوارگی کے زمانے میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ اور رفیع احمد کا تو میں اس لیے زیادہ خیال رکھتا تھا کہ وہ صرف ایک برس کا تھا کہ میری والدہ رحلت کر گئیں۔ چونکہ میری شادی اٹھارہ برس کی عمر ہی میں ہو گئی تھی اور میں اپنی والدہ کی وفات کے وقت ایک بچے کا باپ بھی تھا' اسی لیے ماں کی رحلت کے بعد میری بیوی نے رفیع احمد کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ اس طرح رفیع احمد نہ صرف میرا بھائی بلکہ رضاعی بیٹا بھی تھا۔ میرا بڑا بیٹا رفیع احمد سے عمر میں صرف ایک سال چھوٹا تھا۔ اور یہ دونوں سگے بھائی ہی معلوم ہوتے تھے۔ کہتے ہیں "پالے کی محبت پیٹ کی محبت سے زائد ہوتی ہے۔" اس لیے میری بیوی بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی' کیونکہ اس نے اپنا خون پلا کر رفیع کو پروان چڑھایا تھا۔

رفیع احمد کی موت کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ ہم ایک شریف گھرانے کی لڑکی سے اس کا نکاح کر چکے تھے اور ایک ماہ بعد دھوم دھام سے اس کی رخصتی ہونے والی تھی۔ اس بچی کی حالتِ زار سوچ سوچ کر بھی میرا دل تڑپ رہا تھا جو سرخ عروسی جوڑا زیبِ تن کیے بغیر ہی بیوہ ہو گئی۔ لیکن اللہ کی مشیت میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ماسوائے صبر کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

نینی تال میں مجھے رفیع کی ہلاکت کی خبر اس تار سے ملی تھی جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ یہ تار سیتل باڑی سے شفن خان نے روانہ کیا تھا جو میرے دور کے رشتہ دار ہونے کے علاوہ سیتل باڑی میں میرے منشی بھی تھے۔ ان کا تار ملتے ہی میں نے تمام کام حسن میاں کے حوالے کر دیا جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ یہ حسن میاں ہی تھے جن کی رقت آمیز آواز مجھے عالمِ بے خبری سے ہوش و حواس کی دنیا میں لے آئی تھی۔ حسن میاں نینی تال کے مقامی باشندے تھے جو بڑے قابل بھروسا اور دیانتدار آدمی تھے۔ کاروبار کے انتظامات حسن میاں کے سپرد کر کے میں بڑی عجلت میں سیتل باڑی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ان دنوں سخت گرمی کا موسم تھا اور اس عالم میں پہلی بار ضلع نینی تال سے آسام کے ضلع گوہاٹی تک پندرہ سو میل طویل راستہ سست رفتار ٹرینوں سے طے کرنا ایک بڑا دشوار مرحلہ تھا۔ تاہم بھائی کی نعش کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے اور مٹی دینے کا جذبہ مجھے کشاں کشاں وہاں لیے جا رہا تھا۔ پندرہ سو میل کا یہ سفر دو دن میں طے ہو کر گوہاٹی سے بس کے ذریعے جب میں سیتل باڑی میں واقع اپنے کیمپ تک پہنچا تو وہاں کی فضا نہایت ہی غم ناک تھی۔ کام بالکل بند تھا۔ کچھ مسلمان مزدور کیمپ کے ایک خیمے میں بیٹھے تلاوتِ کلامِ پاک یا دعاؤں میں مصروف تھے اور ہندو مزدور بھی خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جیسے ہی بس سے اترا شفن خان دوڑتے ہوئے آئے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے مجھ سے چمٹ گئے۔ میں بھی آنسو بہانے لگا۔ اس سے قبل کہ میں رفیع کی تجہیز و تکفین کے بارے میں ان سے دریافت کرتا کہ انہوں نے یہ بات بتا کر مجھے مزید غم زدہ کر دیا کہ آج صبح سویرے رفیع کی تدفین ہو گئی ہے۔ کیونکہ سخت گرمی کے سبب اس کی نعش خراب ہونے لگی تھی۔ ظاہر ہے جنگل میں کوئی سرد خانہ تو تھا نہیں جس میں نعش محفوظ کر دی جاتی۔ اس لیے شفن خان اور دیگر مسلمانوں نے رفیع احمد کو منوں مٹی کے نیچے اتار دیا تھا۔ میں اپنے پیارے بھائی کی قبر پر فاتحہ خوانی اور آنسوؤں کا نذرانہ دینے کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکا۔ میں نے رفیع کی قبر پر پھول چڑھائے اور خاصے دکھی..... جذبے کے ساتھ قبر کی مٹی ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ اب میں سیتل باڑی سے اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گا جب تک اپنے بھائی کے قاتل چیتے کو ہلاک نہ کر دوں۔

☆☆☆

میں ایک ماہر شکاری تھا جبکہ میرے منشی شفن خان بھی متعدد درندوں کا شکار کر چکے تھے۔ یوں بھی جنگلات کی کٹائی کے دوران جنگلی جانوروں اور درندوں سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے اس لیے وہاں کام کرنے والوں کے لیے لازم ہے کہ کسی ناخوشگوار صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جب میں رفیع کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر قبرستان سے نکلا تو شفن خان میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے راستہ ہی میں مجھے رفیع کی ہلاکت کی تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

شفن خان نے بتایا کہ اس رات 9 بجے کے قریب رفیع خان رفعِ حاجت کے لیے اپنے خیمے سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر واقع بیت الخلا گئے تھے۔ گرمیوں کی رات تھی اور کیمپ کے بیشتر لوگ کھانا کھا کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ رفیع میاں کو کیمپ سے نکلے ہوئے کوئی نصف گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ دور سے چیتے کی دھاڑ سنائی دی۔ رفعِ حاجت کے لیے نصف گھنٹا کا وقت غیر معمولی تھا مگر انہی مذاق میں ہم نے ان کی غیر حاضری کو محسوس نہ کیا۔ اب جو چیتے کی دھاڑ سنی تو ہمارا ماتھا ٹھنکا اور خطرہ سر پر منڈلاتے دیکھ کر ہر کسی حادثہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ چونکہ جنگل کی زندگی میں جنگلی درندوں سے سامنا ہونے کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے لہٰذا ہمارے پاس اچھا خاصا اسلحہ موجود تھا۔ ہم لوگوں نے ہتھیار سنبھال لیے اور آواز کی سمت دوڑے۔ ابھی ہم اس طرف جا ہی رہے تھے کہ کیمپ کا نیپالی چوکیدار سندر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پھولی ہوئی سانس کے درمیان بتایا کہ اس نے بیت الخلا کے قریب ایک نعش پڑی ہوئی دیکھی ہے۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے تو رفیع خان کو اوندھے منہ پڑا ہوا پایا۔ وہ دم توڑ چکے تھے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' گردن ٹوٹ گئی تھی اور جسم کا بیشتر حصہ چیتے کے پنجوں سے نچا ہوا تھا۔ تاہم نعش کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ چیتا نعش کو کھائے بغیر کسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے بھاگ نکلا تھا۔ شفن خان نے یہ انکشاف بھی کیا کہ سیتل باڑی کے تمام شیر اور چیتے شکار

ہین فنٹیرنر (ڈچ)

ڈچ صنعت کاروں میں کسی زمانے میں وہ سب سے بڑا شمار ہوتا تھا۔ 1962ء میں ایک زمین کے سلسلے میں لوکل میونسپلٹی سے اس کی مقدمے بازی شروع ہوئی۔ یہ مقدمہ 27 سال تک چلا۔ اس قانونی جنگ میں اس نے اپنی ساری دولت جھونک دی۔ سب نے اسے روکا تھا مگر وہ ڈٹا رہا اور بالآخر اسے عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ مل گیا۔ اس کا تبصرہ تھا۔

"زمین جیت گئی مگر میں ہار گیا ہوں"۔ اب اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس پر مکان تعمیر کرا سکتا۔

جارج ہڈسن (برطانیہ)

ہڈسن ساری دنیا میں ریلوے کنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے یورک شائر بیلون بھی کہا جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے مالیاتی افق پر کسی غبارے کی طرح بلند ہوا تھا اور پھر کسی غبارے ہی کی طرح وہ پھٹ گیا تھا۔ برطانیہ اس کی اور اسٹیم انجن کے موجد جارج اسٹیفنسن کی ملاقات تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی بار وہاں 400 مسافروں کو لے کر ٹرین چلی جس کی رفتار 65 میل فی گھنٹا تھی۔ 1848ء میں برطانیہ کی ریلوے میں اس کا حصہ 20 فیصد تھا۔ لندن میں اس کی حویلی دنیا بھر کی حویلیوں میں سب سے بڑی حویلی تھی۔ افسوس اس کی یہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکا۔ زبردست قرضے لے لیے تھے اس نے جن کی ادائی نہ کر سکا۔ اس کی ایک ایک چیز فروخت ہو گئی۔ آخر میں وہ خیرات پر جیا جس کا انتظام اس کے دوست کرتے تھے۔

ہو چکے ہیں۔ اور گزشتہ ایک برس سے کسی شیر یا چیتے کے ہاتھوں کسی انسان کے ہلاک ہونے کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ یہ درندہ نہ معلوم کہاں سے آنکلا جس نے میرے بھائی کو اجل کی گود میں پہنچا دیا۔

☆☆☆

اس وقت کٹائی کا کام اپنے پورے عروج پر تھا۔ تاہم میں نے انسانی جانوں کے تحفظ اور اپنے مرحوم بھائی کا انتقام لینے کے لیے کام بند کرا دیا۔ مزدوروں سے بھی کہہ دیا گیا کہ وہ ہر وقت چوکس اور حفاظتی انتظامات کے لیے تیار رہیں اور جب تک چیتا ہلاک نہیں ہو جاتا وہ بلاضرورت بالخصوص رات کے وقت کیمپ سے باہر نہ نکلیں۔ انہیں مزدوری برابر ملتی رہے گی۔ تاہم سخت حفاظتی تدابیر کے باوجود ہمارا ایک اور کارکن اس چیتے کا شکار ہو گیا۔ اس کا نام جمشید تھا۔ الہ آباد کا رہنے والا یہ خوبصورت نوجوان میرا اکیئرٹر تھا جسے سیتل باڑی کا ٹھیکہ ملنے کے بعد میں نے ملازم رکھا تھا۔ جمشید کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ مزدوروں کو اجرت دی جانے والی رقم کو بھی ہمیشہ اپنے ساتھ محفوظ رکھتا۔ وہ قمیص کے نیچے آٹھ دس جیبوں والا واسکٹ نما ایک سلو کا پہنتا جس میں رقم رکھی ہوتی۔ اس بات پر ہم لوگ ہنستے اور اسے چلتا پھرتا بینک کہا کرتے تھے۔ تاہم وہ ہماری بات کو ہنس کر ٹال دیتا۔ میرے سیتل باڑی پہنچنے کے تیسرے دن جمشید بھی اس پراسرار چیتے کا شکار ہو گیا۔ ظالم چیتے نے نہ صرف بے دردی کے ساتھ اس کی جان لی تھی بلکہ وہ اس کے جسم سے قمیص اور سلو کا بھی نوچ کر لے گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جمشید کا گوشت کھانے کی نوبت نہ آسکی تھی۔ البتہ چیتے کے دانتوں اور پنجوں کے نشانات اس کی لاش پر نمایاں تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت جمشید کے سلو کے میں کم از کم پانچ ہزار روپیہ محفوظ تھے جو سلو کے سمیت غائب پائے گئے۔ ”تو گویا چیتا درندہ ہونے کے علاوہ ڈکیت بھی ہے۔“ میں نے سوچا اور چیتے کو ہلاک کرنے کی مہم مزید تیز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جمشید کی تدفین کے اگلے روز کیمپ میں عام ”لام بندی“ کر دی گئی۔ تمام لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ آج بہر قیمت چیتے کا خاتمہ کرنا ہے۔ چوکیدار سندر کے مطابق اس نے چیتے کی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب وہ رفیع کو ہلاک کر کے بھاگ رہا تھا۔ سندر کا بیان تھا کہ وہ اپنی لوہے کی گولے والی مضبوط لاٹھی گھٹ کھٹا ہوا جب رفیع احمد کی نعش کے قریب پہنچا تو اس نے چیتے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اس کہ لاٹھی کی آواز سن کر ہی چیتا بھاگ نکلا تھا۔ سندر کے بیان کی روشنی میں چیتے کے شکار کے لیے یہ حکمتِ عملی طے کی گئی کہ مرکزی محاذ اس جگہ قائم کیا جائے جہاں رفیع احمد کی نعش پائی گئی تھی۔ جبکہ کیمپ کے لوگوں کو لاٹھی ڈنڈے اور آتشیں ہتھیار لے کر پورے جنگل میں پھیل جانے کا حکم دے دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ ہانکا کریں تاکہ چیتا گھبرا کر اپنی کمین گاہ سے نکل آئے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ چیتے کو گھیر گھار کر کیمپ کے اس حصے میں لایا جائے جہاں میں اور شفن خان تھری ناٹ تھری کی رائفلیں لیے مورچہ بند تھے۔

اس رات شور اور ہنگامے سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ شفن خان نے مجھ سے کہا تھا کہ شفیع خان میں تم سے کوئی ایک سو گز دور بیٹھوں گا تاکہ چیتے پر دو طرف حملہ کیا جا سکے۔ شفن خان چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب تھے اس لیے چند منٹ کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر ہانکا کرنے والوں کی طرف چل دیے تاکہ انہیں مزید کچھ ہدایات دے سکیں۔

میں اپنے مورچے میں تنہا بیٹھا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص دبے پاؤں میرے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے میں نے پلٹ کر دیکھا تو سندر کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ میں نے سندر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔ لاٹھی اس کے ہاتھ میں تھی اور بدن آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور اس کے آنے کا سبب دریافت کیا۔ سندر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کچھ کہا۔ چونکہ ہانکا قریب ہی ہو رہا تھا اس لیے شور شرابے کے سبب اس کے الفاظ مجھے سنائی نہ دے سکے۔ تاہم ایک خوش قسمتی میری منتظر تھی۔ ابھی میں سندر سے دوبارہ یہ سوال کر رہا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے کہ برق رفتاری سے بھورے رنگ کا ایک چیتا ساتھ کی جھاڑیوں سے نکلا اور سیدھا میری طرف چلا آیا۔ چیتے اور میرے درمیان فاصلہ سو گز سے زائد نہ تھا۔ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور گولی چلا دی۔ خوش قسمت گولی سیدھی چیتے کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو گئی اور چیتا گر کر تڑپنے لگا۔ ایک ہی فائر میں چیتے کا کام تمام ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی مجھے اپنی شاندار کامیابی پر خوش ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سندر نے اپنی لاٹھی سے میرے سر پر وار کیا تھا۔ عالم بے ہوشی کا سفر کرتے ہوئے میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ ایک اور گولی چلی اور سندر اپنا پیٹ پکڑے ہوئے گرتا نظر آیا۔

☆☆☆

پورے چوبیس گھنٹے بعد میری آنکھ گوہاٹی کے جنرل ہسپتال میں کھلی۔ شفن خان میرے بستر سے لگے بیٹھے تھے۔ میرے ہوش میں آکر ان سے سوال کیا کہ یہ سب کیا اور کیسے ہوا اور مجھے سندر نے اس حالت میں کیوں پہنچایا تو انہوں نے جواب میں ایسا انکشاف کیا جو میری شکاری زندگی کا غالباً سب سے زیادہ بھیانک تجربہ تھا۔

شفن خان نے بتایا کہ رفیع احمد اور جمشید کو کسی چیتے نے ہلاک نہیں کیا تھا بلکہ انہیں سندر نے روپے کے لالچ میں قتل کیا تھا۔ قتل کے وقت رفیع احمد خان کی جیب میں ایک بڑی رقم موجود تھی۔ سندر کی ہلاکت کے بعد جب اس کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس میں سے تقریباً پندرہ ہزار روپیہ نقد اور رفیع احمد خان کا بٹوہ برآمد ہوا۔ بٹوے میں رفیع کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ یہی وہ رقم تھی جس کی خاطر رفیع احمد اور جمشید کو قتل کیا گیا تھا۔ شفن خان نے مزید کہا کہ جس وقت سندر نے مجھ پر لاٹھی کا وار کیا تھا تو اسی وقت موقع پر شفن خان پہنچ گئے اور انہوں نے سندر کو ڈھیر کر دیا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ آخر مقتولین کی نعش پر چیتے کے پنجوں اور دانتوں کے نشانات کس طرح پائے جاتے رہے؟ شفن خان نے بتایا کہ اس کا راز اس طرح کھلا کہ سندر کی ہلاکت کے بعد جب انہوں نے حقارت اور غصے کے ساتھ سندر کی نعش پر ایک ٹھوکر ماری تو اس کے سینے سے کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز نکلی۔ شفن خان نے محسوس کیا کہ سندر نے اپنے لباس کے اندر مزید کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہے۔ اس لیے جب انہوں نے سندر کا کرتا اٹھا کر دیکھا تو اس کی بنیان کے نیچے ایک کپڑے کے ساتھ بندھے ہوئے شیر یا چیتے کے دو پنجے اور شیر کا دانتوں سمیت ایک جبڑا برآمد ہوا۔ یہ پنجے نہ معلوم کس ترکیب سے خشک کیے گئے تھے کہ وہ لکڑی کی طرح سخت تھے۔ سندر نے رفیع احمد کو بھی اپنی لاٹھی ہی کے ذریعے ہلاک کیا تھا اور پھر سر کے زخم کو اس طرح نوچ ڈالا جیسے اسے چیتے نے چیرا ہو۔ سندر ایک ماہر اور دھوکے باز قاتل تھا جو بڑی برق رفتاری کے ساتھ اپنے مقتول کی نعش کو چیتے کے کھاتے میں ڈالنے کے لیے نوچ کھسوٹ ڈالتا تھا۔

رہا وہ چیتا جو اچانک میرے ہاتھوں سے مارا گیا تو وہ غریب شائد کسی اور جنگل سے ادھر آنکلا تھا۔ چیتے کی ہلاکت تو ”قبل موذی قبل از ایذا“ کی رعایت سے ہوئی۔ تاہم شفن خان نے سندر جیسا انسانی درندہ مار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔

بیرون ملک مقیم قارئین
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
کے
سالانہ خریدار
بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ڈائریمیل
اپنا پسندیدہ پرچا گھر بیٹھے حاصل کریں
ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے زرِ سالانہ
2000 روپے
امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے زرِ سالانہ
2500 روپے
اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر/ ملک ادائی کے لئے بنک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

سفر ہے شرط

علی سفیان آفاقی

کچھ لوگوں کی بے چین روح انہیں سیر و سیاحت پر اکساتی ہے اور ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک لئے پھرتی ہے۔ زیر نظر سفرنامہ بھی ایک ایسے ہی جہاں گرد کے شب و روز کی روداد ہے۔ علی سفیان آفاقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے سفر نامے بھی خاصے مقبول ہوئے اور ان کی جہاں گردیاں آپ سرگزشت میں بھی پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے ہمسفر خان صاحب اور بت صاحب بھی محتاج تعارف نہیں۔ زیر نظر سفرنامہ دوست اور برادر ملک ترکی کے اہم اور تاریخی شہر استنبول کا ہے جسے پہلے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں مشرق اور مغرب کے اس سنگم میں اور کیا کیا دلچسپیاں ہیں۔

اس سرزمین کی باتیں جہاں انصار مدینہ کے سردار حضرت ابوایوب انصاریؓ محوِ خواب ہیں

استنبول ایک ایسا نام ہے جسے سنتے ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ شہر مسلمانوں کے خون میں رچا ہوا ہے۔ صلیبی جنگوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور پھر سلطان صلاح الدین ایوبی کا تصوراتی چہرہ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں نے ایک زمانے میں فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اسلامی لشکر جس ملک اور جس براعظم کا رخ کرتا تھا' ساری دنیا جان جاتی تھی کہ یہ فتح سے ہم کنار ہوئے بغیر واپس نہیں لوٹے گا۔ ایک کے بعد ایک شہر' ایک کے بعد ایک ملک، ایک کے بعد ایک براعظم مسلمان لشکریوں کے گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے فتح اور مسلمان لازم وملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

استنبول اس شہر کا نیا نام ہے لیکن مسلمانوں کے دلوں میں یہ قسطنطنیہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے ایک عظیم کارنامے کا محلِ وقوع قسطنطنیہ ہی تھا۔ یہی وہ شہر تھا جس کے حصول کے لیے یورپی اقوام متحد ہو کر اس کو فتح کرنے کے لیے صف آرا ہو جاتی تھیں اور یہی وہ نام تھا جسے مسیحی طاقتوں سے واپس لینے کے لیے مسلمانوں کے لشکر عرصۂ دراز تک پڑاؤ ڈالے رہتے تھے۔ یہ اپنے محلِ وقوع اور دفاعی انتظامات کی وجہ سے ایک ناقابل تسخیر شہر تھا۔ سمندر اور پہاڑوں نے اس تک رسائی کو قریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ قسطنطنیہ ایک زمانے میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے وقار کا سوال بن گیا تھا۔ جب عیسائیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کے لیے زندگی عذاب بنا دی گئی مگر جب سلطان صلاح الدین کی فاتح افواج کامیابی کے جھنڈے لہراتی ہوئی شہر میں داخل ہوئیں تو کسی غیر مسلم کی نکسیر تک نہ پھوٹی' نہ خون بہایا گیا، نہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ نہ ہی لوٹ مار کی گئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی انسانی روایات کا بڑے بڑے انگریز مؤرخ بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی ایک عزم کا پیکر اور آہنی ارادے کا مالک سلطان ہی نہ تھا' وہ انتہائی ہمدرد' منصفانہ مزاج کا حامل اور انسانی خوبیوں سے بھرپور انسان تھا۔ جنگجو فاتحین میں ظلم و ستم گری کی جو خو ہوتی ہے سلطان اس سے قطعی مبرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا نام آج بھی غیر مسلم تک بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ اس نے صرف ملک ہی فتح نہیں کیے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم فاتح تھا جو ملکوں کے ساتھ ساتھ ان ملک کے باسیوں کے دلوں کو بھی مسخر کر لیتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو تاریخ میں ایک افسانوی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ سپہ گری کے علاوہ اس کی زندگی کا انسانی پہلو اس قدر روشن اور نمایاں تھا کہ وہ دشمنوں کو بھی تکلیف میں دیکھنا برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کی داستانیں خود متعصب انگریزوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ ایسے کردار اسلامی تاریخ میں نظر تو آتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ فاتح بہت سے تھے لیکن سلطان صلاح الدین جیسی خوبیوں کے حامل دلوں کے فاتح بہت کم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ استنبول کے ائرپورٹ پر پہنچتے ہی سب سے پہلے سلطان صلاح الدین کا خیال آ جاتا ہے۔

استنبول ایک عظیم الشان شہر ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ گنگ وجمن کی آمیزش ہے۔ انگریزی کا وہ مقولہ کہ ''مشرق' مشرق ہے اور مغرب' مغرب۔ یہ نہ کبھی ملے ہیں اور نہ کبھی ملیں گے۔'' استنبول کو دیکھ کر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کا حسین ملاپ اگر دیکھنا ہو تو استنبول ضرور جایئے۔ یہاں دونوں تہذیبیں' طرز زندگی' طرز تعمیر اور طرز فکر کے نمونے جا بجا نظر آتے ہیں' جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ایک زمانے میں ہم لوگ کسی ملک اور شہر کا اندازہ اس کے ائرپورٹ کو دیکھ کر لگاتے تھے۔ استنبول کا ائرپورٹ انتہائی جدید اور مصروف ترین ائرپورٹ ہے۔ عمارت میں قدیم رکھتے ہی مشرق و مغرب دونوں کا مزہ آ جاتا ہے۔ رونق گہما گہمی اور افراتفری۔ ہر شخص اپنے سامان، بکنگ اور ہوٹل کی فکر میں بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ استنبول ائرپورٹ پر ہر وقت طیاروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے' اسی لیے یہاں ہر وقت ایک جشن یا میلے کا سا سماں نظر آتا ہے۔ لیکن ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک کے ائرپورٹس کی طرح یہاں بدنظمی' انتشار اور نفسانفسی کا عالم دیکھنے میں نہیں آتا۔

ائرپورٹ کو دیکھ کر ہی آپ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ ایک مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں آ گئے ہیں۔ اول تو غیر ملکیوں کی بہت بڑی تعداد کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے دوسرے یہ کہ خود ترک قوم بھی ایک مہذب قوم بن چکی ہے۔ ہمارے مشرق سے جو غلط روایات منسوب ہیں اور جن کا مظاہرہ بیرِ سفیر کے ہوائی اڈوں پر نظر آتا ہے، ترک اس سے بالاتر اور مختلف ہیں۔ معقول لباس' شائستہ انداز گفتگو۔ کیا مجال جو کوئی اونچی آواز میں بات کرے۔ گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیہات کے ترک بھی کوٹ پتلون اور

پتلون قمیص پہنتے ہیں۔ دیہاتی خواتین البتہ اپنے روایتی ملبوسات پہنتی ہیں۔ شہروں میں خواتین کا لباس بھی مغربی ہے لیکن اکثر خواتین سروں پر حجاب پہنتی ہیں اور ایسا لباس استعمال کرتی ہیں جس سے جسم کی نمائش نہ ہو۔ جدید فیشن کے مغربی ملبوسات اور حلیے میں بھی لڑکیاں نظر آتی ہیں، لیکن بے حجابی کے بغیر۔

ائرپورٹ کو دیکھ کر خان اور بٹ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ خان صاحب نے عمارت اور گہما گہمی کا جائزہ لیا پھر مستعد کارکنوں اور مہذب مسافروں کو دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے مغربی خواتین وحضرات پر نظر ڈالی اور خوشی کے آثار ان کے چہرے پر نمودار ہوگئے۔

''بھئی کمال ہے یہ استنبول تو۔'' انہوں نے تعریفی انداز میں کہا ''لگتا ہے کہ کسی ترقی یافتہ قوم کا ائرپورٹ ہے۔''

بٹ صاحب بولے ''کیوں نہ ہو' آخر سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہر کا ائرپورٹ ہے۔''

خان صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا ''بٹ جی! ایک تو تم وقت بے وقت جہالت کی باتیں کر کے خون جلا دیتے ہو۔ یار' یہ ائرپورٹ سلطان صلاح الدین ایوبی نے تو نہیں بنوایا تھا۔ ان کے زمانے میں تو ائرپورٹ اور ہوائی جہاز ہی نہیں تھے۔''

بٹ صاحب کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔ پھر خفت مٹانے کے لیے بولے ''میرا مطلب یہ تھا کہ ایک بڑے حکمران کے شہر کا ائرپورٹ ایسا ہی شاندار ہونا چاہیے۔''

استنبول کے ائرپورٹ پر قدم رکھتے ہی بٹ صاحب اور خان صاحب کے مابین یہ پہلا اختلافِ رائے تھا۔

جس وقت ہم اپنا سامان سمیٹ رہے تھے اور ٹرالیوں کی تلاش میں تھے تو خان صاحب سامان سے زیادہ مسافروں کی کھوج میں تھے۔

''یہ تو بالکل یورپ لگتا ہے۔'' انہوں نے خوش ہو کر مطلع کیا۔ ''خوب چہل پہل ہے۔ ٹورسٹ بھی بہت زیادہ ہیں۔ مقامی لوگ بھی انگریزی ہی بولتے ہیں۔ آخر استنبول میں برائی کیا ہے؟''

''کس نے کہا ہے کہ استنبول میں کوئی برائی ہے؟''

بولے ''تو پھر ہم یورپ کی خاک چھاننے سے پہلے ترکی کیوں نہیں آئے؟ یار! یہ تو یورپ سے بھی بڑھ کر ہے۔''

''آپ کو تو صرف ننگے بدن اور بے حیائی سے مطلب ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہی جگہ آپ کو پسند آجاتی ہے۔''

''ارے' ارے۔ کیا کہہ رہے ہو؟ تو یہ کرو' کان پکڑو۔ ترکی کو تم نے بے حیا کہہ دیا۔ جانتے ہو یہ کیسے بہادر لوگوں کا ملک ہے۔ یہ وہ ملک ہے جسے مسلمانوں نے دوبار فتح کیا تھا۔''

''دوبار فتح کیا تھا؟'' ہم بھی حیران رہ گئے۔

''بھئی ایک بار سلطان صلاح الدین ایوبی نے قسطنطنیہ فتح کیا تھا اور دوسری بار کمال اتاترک نے اسے دشمنوں سے لڑ کر چھین لیا تھا۔ بٹ صاحب! خدا کا خوف کرو' تمہیں تو شرم آنی چاہیے۔''

''شرم؟ کس لیے؟''

''ارے..... استنبول آتے ہی ننگی عورتوں کو دیکھنے لگے۔ تمہیں یہاں ننگے پن کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان کو تھوڑا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ یار' کم از کم اسلامی تاریخ اور جغرافیہ تو پڑھ لیا ہوتا۔ جانتے ہو اس ملک میں کیسی کیسی نادر روزگار عمارتیں اور یادگاریں ہیں۔ اس ملک کی حیثیت کیا ہے؟ یہ مشرق اور مغرب دونوں کا نمونہ ہے۔ انگریز بھی یہاں آکر پریشان اور شرمندہ ہو جاتے ہیں۔''

''انگریز شرمندہ کیوں ہو جاتے ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی مشرقی قوم اتنی ماڈرن اور ترقی یافتہ ہوگی۔ یہاں ہر قدیم عمارت ان کے لیے ایک نمونہ اور حیرت کدہ ہیں۔ سمندر ہی کو دیکھ لو' یہاں کا تو سمندر بھی نرالا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ارے بھئی اور ملکوں میں تو سمندر بس سمندر ہوتا ہے۔ ساحلوں اور بندرگاہوں تک اس کی پہنچ ہوتی ہے مگر یہاں سمندر نے پنواری والا کام کیا ہے۔ یعنی اس ملک کو یورپ اور ایشیا دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ آپ نے ایسا سمندر کہیں دیکھا ہے؟ اور کسی جگہ سمندر ایسا کام کرتے ہیں؟ یہ اعزاز صرف ترکی کے سمندر کو حاصل ہے۔''

بٹ صاحب کچھ لاجواب سے ہوگئے تھے مگر پھر چاروں طرف دیکھ کر بولے ''بس تعریفیں ہی نہ کیے جاؤ۔ یہ کیسا ماڈرن ائرپورٹ ہے۔ مجھے دیکھو وہ ٹرالی تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ ٹرالیوں تک کا بندوبست تو ہو نہیں سکتا ان سے؟''

ان کی یہ بات درست تھی۔ ہم نے چاروں طرف دیکھ لیا تھا مگر کوئی خالی ٹرالی نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے دیکھیے وہ اپنی ٹرالی پر سامان لیے چلا جا رہا ہے۔

''اس طرح تو لاہور کے ائرپورٹ پر ہوتا تھا۔ وہ بھی بیس پچیس سال پہلے۔ اب تو وہاں بھی ٹرالیوں کی کوئی کمی نہیں ہے، بلکہ کوڈر بھی مل جاتے ہیں۔''

ابھی ان کا فقرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بڑے سے ہال میں

ایک جانب سے ٹرالیوں کی ایک لمبی سی ٹرین اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری ٹرین اور پھر تیسری ٹرین۔ ٹرین سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ٹرالیاں ایک لمبی زنجیر میں پیچھے سے دھکیلی جائیں تو وہ ٹرین ہی کے مانند نظر آتی ہیں۔

''لیجیے..... وہ آگئیں ٹرالیاں'' خان صاحب نے بٹ صاحب سے کہا ''اب چاہے جتنی ٹرالیوں پر اپنا سامان رکھ لو، بار بار لوڈ ان کر پھر رقم بھی وصول کر لو۔''

دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف ٹرالیوں کی بہتات ہوگئی۔

ایک لمبا چوڑا صحت مند ترک ایک ٹرین کو پہنچا کر واپس جا رہا تھا۔ ہم نے فوراً اسے روکا اور پوچھا ''یو اسپیک انگلش؟''

''اوہ یس' وہاٹ از یور ایبلم سر؟''

ہم نے پوچھا کہ ٹرالیاں کہاں چلی گئی تھیں اور اتنی بہت سی ٹرالیاں ایک دم کیسے اور کہاں سے آگئی ہیں؟

اس نے بہت شستہ انگریزی میں کہا ''سر۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کتنا مصروف ائرپورٹ ہے۔ بے شمار مسافر آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ہر مسافر غرالی باہر ٹیکسی یا بس کے پاس چھوڑ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر میں نئی فلائٹس سے ہزاروں نئے مسافر آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ باہر ہر جگہ سے ٹرالیاں اکٹھی کرنے اور یہاں تک لانے میں کچھ وقت تو لگ جاتا ہے مگر آپ دیکھ لیجیے۔ کسی مسافر کو ایک دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔''

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور معذرت بھی پیش کر دی۔ وہ جاتے جاتے رک گیا۔ پلٹ کر آیا اور پوچھا ''پوچھ سکتا ہوں آپ کس ملک سے آئے ہیں؟''

ہم نے کہا ''ہم پاکستانی ہیں۔''

ترک نے ایک دم جوش میں آکر ہم سے پُرزور مصافحہ کیا اور پھر گلے بھی لگا لیا۔

''پاکستان' پاکستان' گڈ کنٹری' برادر کنٹری۔''

ہم نے خان صاحب اور بٹ صاحب کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ یہ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔ اس نے ان دونوں سے بھی مصافحہ اور معانقہ کیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں ترکی کی سرزمین کو دیکھ کر جتنی مسرت ہوئی تھی۔ ترکوں کو بھی ہم پاکستانیوں سے مل کر اتنی ہی مسرت ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں اگر کہیں پاکستانیوں کی آؤ بھگت اور ان سے محبت کی جاتی ہے تو وہ ترکی ہی ہے۔

وہ رخصت ہوگیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ ہم سب اس کے اچانک اظہارِ مسرت اور اظہارِ محبت کی وجہ سے ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''کتنا اچھا آدمی ہے۔'' بٹ صاحب نے چند لمحے بعد کہا۔

''وہ آدمی نہیں' ترک ہے۔'' خان صاحب نے تصحیح فرمائی۔

بٹ صاحب نے ان کی بات ان سنی کر دی' بولے ''آفاقی صاحب' آپ نے اس کا نام پوچھا ہوتا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' ہم نے کہا ''اب دوبارہ تو اس سے ملاقات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔ دنیا بہت مختصر ہے۔'' بٹ صاحب نے فلسفہ بگھارا۔

خان صاحب جل گئے ''کون کہتا ہے کہ دنیا بہت مختصر ہے' زندگی کا اتنا بڑا حصہ گزار کر تم یہاں آئے ہو۔ ابھی دنیا کے بے شمار ملک ایسے ہیں جو تم نے دیکھے ہی نہیں اور نہ دیکھو گے۔ پھر مختصر کیسے ہوگئی دنیا؟ دیکھو بٹ جی! تم سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتیں میرے سامنے نہ کیا کرو۔''

دوسرے مسافر ٹرالیوں پر سامان لاد کر جا رہے تھے۔ چند خاندانوں کے ساتھ بچے تھے۔ وہ بھی سامان پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے اور سواری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمیں نادیہ اور پاروکا بچپن یاد آگیا۔ وہ دونوں بھی ہمیشہ سامان کے ساتھ ٹرالیوں پر سوار ہو کر ہی لطف اندوز ہوتی تھیں۔ پتا چلا کہ بچے دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

گہما گہمی اور چہل پہل ہر بڑے ائرپورٹ پر ہوتی ہے لیکن استنبول کے ائرپورٹ کی رونق اور بھاگ دوڑ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ مسافروں کا ایک ہجوم تھا۔ شاید کئی فلائٹس ایک ساتھ آگئی تھیں اس لیے اتنا ہجوم تھا۔

یہاں ہر چیز یورپ کے معیار کی ہے۔ لوگوں کا برتاؤ اور رکھ رکھاؤ بھی ویسا ہی ہے۔ ویسی ہی صفائی اور سجاوٹ' ویسا ہی نظم وضبط۔ ویسا ہی ماحول' سیاحوں کی بھرمار تھی جنہیں دیکھ کر خان صاحب کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر دیکھتے رہے پھر بولے ''شکر ہے ایران کی طرح یہاں حجاب کی پابندی نہیں ہے۔''

بٹ صاحب نے انہیں گھورا مگر یہ بات درست تھی۔ ایرانِ جدید میں تو مغربی اور بیرونی خواتین کو بھی ننگی ٹانگوں کے ساتھ پھرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جسم کو ''بخوبی ڈھانپ'' کر رکھنا پڑتا ہے۔

ہمارے پاس ترکی کرنسی نام کو بھی نہیں تھی اس لیے ہم نے قافلے کو رکنے کے لیے کہا اور کرنسی تبدیل کرانے کے لیے ایک کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی یورپ ہی کی طرح رش نظر آیا۔ کرنسی تبدیل کرانے کے لیے بہت سی کھڑکیاں تھیں تاکہ مسافروں کو بلاوجہ دیر نہ لگے۔ اسمارٹ' خوش لباس اور خوش شکل خواتین کھڑکیوں کے پیچھے بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

ہم نے بہت سوچ سوچ کر کچھ ڈالر نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ یہ صرف تین نوٹ تھے۔ انہوں نے نوٹ اٹھائے' ایک مشین پر کچھ حساب کیا۔ ایک کاغذ پر اندراج کیا' رسید بنائی اور اس کے ساتھ ہی نوٹوں کی ایک گڈی ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم تو گھبرا گئے کہ شاید انہوں نے حساب کتاب میں کوئی غلطی کردی ہے مگر دراصل یہ ترکی لیرا اور امریکی ڈالر کا فرق تھا۔ اس زمانے میں ایک ڈالر غالباً پانچ ہزار سے زائد ترکی لیرا کے برابر تھا۔ تھوڑے سے ڈالر ادا کر کے ہم فوراً لکھ پتی بن گئے تھے۔ بہت خوش ہوئے مگر جب خرچ کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ادائیگی کے وقت بھی ہزاروں لیرا ہی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ایک دن ہم ٹیکسی لے کر سارے دن مختلف مقامات پر پھرتے رہے۔ رات کو ٹیکسی ڈرائیور سے بل پوچھا تو لاکھوں میں تھا۔

بٹ صاحب ہر بار لاکھوں کا سن کر پریشان ہوجاتے تھے اور کہتے تھے کہ اتنی بڑی رقم دیتے ہوئے میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ لیرا کے بجائے ڈالر زہی میں لین دین کریں' سوائے چھوٹی موٹی چیزوں کے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو اس زمانے میں ایک ایک روپے کے نوٹ بھی چلتے تھے مگر ترکی میں ایک لیرا کے نوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکی کے نوٹ پچاس ہزار سے شروع ہوتے ہیں۔ یعنی سب سے چھوٹا نوٹ پچاس ہزار کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک لاکھ' ڈھائی لاکھ' پانچ لاکھ' دس لاکھ اور پچاس لاکھ کا نوٹ ہوتا ہے۔ ذرا غور فرمایئے اگر ہم اپنے یہاں پچاس لاکھ کا نوٹ جیب میں لے کر گھومیں تو کیسا لگے گا؟

ترکی لیرا کا کم سے کم سکہ پانچ ہزار کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دس ہزار' پچیس ہزار' پچاس ہزار اور ایک لاکھ لیرا کا سکہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مسافر ترکی پہنچ کر انفیاتی طور پر بہت مالدار ہوجاتا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر اور یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ ڈالر اور لیرا کے نرخ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی لیرا اچھل بڑھ جاتا ہے کبھی گھٹ جاتا ہے۔ اس لیے سیاحوں کو چاہیے کہ صرف ضرورت کے مطابق رقم تبدیل کرائیں۔ جن ترکوں کو ڈالروں میں تنخواہ ملتی ہے وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ایک ساتھ ساری رقم تبدیل نہیں کراتے۔ ضرورت کے مطابق تبدیل کراتے رہتے ہیں۔

کوئی شخص اچانک بلا کسی جدوجہد کے اگر کروڑ پتی اور ارب پتی ہوجائے تو اس کی خوشی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ہم نے جب خان صاحب اور بٹ صاحب کے پاس جاکر (ان ڈالروں کا سوچ کر جو ہماری جیب میں تھے) انہیں یہ خوش خبری سنائی کہ ہم لوگ کروڑ پتی ہوگئے ہیں تو وہ بے یقینی سے ہمیں دیکھنے لگے۔

پھر بٹ صاحب نے خان صاحب سے سرگوشی میں پوچھا "آفاقی صاحب کہیں سے نشہ کر کے تو نہیں آگئے؟"

خان صاحب نے انہیں ڈانٹ دیا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ یہ معاملہ سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔"

ہم نے انہیں سنجیدگی سے بتایا کہ ہم واقعی کروڑ پتی ہوگئے ہیں اور پھر اس کا سبب بھی بتادیا۔

"ویری گڈ" خان صاحب نے کہا۔

بٹ صاحب بولے "ہمیں ایک بات کا خیال رکھنا پڑے گا کیونکہ یہ ہماری آزمائش ہے۔"

"مثلاً کس بات کا؟"

"دیکھو بھائی' دولت مند بن جانے والے لوگ مغرور ہوجاتے ہیں۔ عہد کرلو کہ ہم بالکل غرور نہیں کریں گے۔" بٹ صاحب نے بڑی سنجیدگی سے نصیحت کی۔

ہم نے کہا "بٹ صاحب آپ نے انگریزی کا وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ آسانی سے حاصل ہونے والی دولت اتنی ہی آسانی سے چلی بھی جاتی ہے (یعنی ایزی کم' ایزی گو)"

"آپ کا مطلب ہے "مال حرام بود بجائے حرام رفت" (اس کا ترجمہ یہ ہے کہ حرام سے کمایا ہوا مال ایسے ہی ناجائز اور غیر ضروری کاموں میں ضائع ہوجاتا ہے)"

"کیا بے معنی ہانک رہے ہو" خان صاحب نے ڈانٹا "ہم نے کون سا حرام میں کمایا ہے۔ ہماری حلال کی کمائی کا مال ہے۔ حرام میں کیسے ضائع ہوسکتا ہے۔"

ٹرالیوں پر سامان لاد کر ہم لوگ باہر کی طرف چلے۔ امیگریشن والوں نے توقع سے بھی جلدی ہمیں فارغ کردیا۔ پاکستانی پاسپورٹ کی قدر کا اندازہ ہمیں ترکی جاکر ہوا۔ پاکستانی پاسپورٹ دیکھتے ہی سرخ وسفید رنگت' سیاہ بالوں اور سیاہ موٹی مونچھوں والے خوبصورت اور باوقار ترک نے پہلے تو ہمیں "السلام علیکم" کہا اور پھر مسکرا کر سر ہلایا۔ "پاکستان..... پاکستان' برادر پاکستان۔"

اس کے بعد اس نے پاسپورٹ کھولا۔ مندرجات دیکھے اور ٹھپا لگا دیا۔ ہمیں تین ماہ ترکی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

"یہ تو بڑی مشکل ہوگئی" بٹ صاحب نے پریشان ہوکر کہا۔

"کیا ہوا؟" ہم بھی گھبرا گئے۔

"اب ہمیں تین مہینے ترکی میں ہی رہنا پڑے گا؟"

"بٹ صاحب! زیادہ بھولے بننے کی کوشش مت کیجئے۔ اس کا مطلب آپ بخوبی جانتے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک اس ملک میں رہ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے جب بھی چاہیں واپس جاسکتے ہیں۔ چاہیں تو ابھی الٹے پیروں چلے جائیں۔"

"یار' میں تو مذاق کررہا تھا۔ تم لوگوں میں تو سینس آف ہیومر ہی نہیں ہے۔ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔"

(مسافروں کی بہتات تھی اس لیے رکنا یا آہستہ چلنا مشکل تھا۔ ہم تیز تیز قدم موٹر سے باہر کی طرف چلے۔

باہر نکلتے ہی ایئرپورٹ کے عملے کے چند اسمارٹ حضرات اور چند پولیس والے نظر آئے۔ عملے کے ایک رکن نے ہمیں "ویلکم" کہا پھر انگریزی میں پوچھا۔

"آپ کا قیام استنبول ہی میں ہوگا یا کسی اور شہر جائیں گے؟"

ہم نے کہا "فی الحال تو اسی شہر میں رہیں گے۔"

"موسٹ ویلکم" وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اس سوال کا مقصد ہم جانتے تھے۔ دراصل استنبول میں بین الاقوامی فلائٹس مسافروں کو لے کر آتی ہیں لیکن اگر آپ ترکی کے کسی اور شہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے لیے نزدیک ہی علیحدہ ایئرپورٹ بنائے گئے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے مگر بہت خوبصورت اور صاف ستھرے ایئرپورٹس ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے کسی بہت بڑے ایئرپورٹ کو سکیڑ دیا گیا ہے۔ یہاں تمام سہولتیں اور رکھ رکھاؤ انٹرنیشنل ایئرپورٹ جیسا ہی ہوتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے یہ بہت بڑی سہولت ہے۔ خود ترک بھی ہوائی جہازوں کے ذریعے کافی سفر کرتے ہیں۔

ہمیں یہ سسٹم بہت اچھا لگا کہ بیرونِ ملک جانے کے لیے استنبول کا بڑا ایئرپورٹ حاضر ہے اور اندرونِ ملک جانے کے لیے آپ اس شہر کے لیے مخصوص ایئرپورٹ پر چلے جائیں تو بلاوجہ کے ہجوم اور بھاگ دوڑ سے بچ جاتے ہیں۔ یہ ایئرپورٹ استنبول کے بین الاقوامی ایئرپورٹ کے گردونواح میں ہی واقع ہیں اور وہاں تک پہنچانے کے لیے ایئرکنڈیشنڈ چھوٹی بسیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ اس کے لیے مسافروں کو اضافی کرایہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اس وقت ہمیں استنبول آنے والے سیاحوں کی تعداد کا اندازہ ہوا۔ یہ ساری رونق اور گہما گہمی صرف باہر سے آنے والے مسافروں کے دم سے تھی۔ اگر اندرونِ ملک پروازوں کے مسافر بھی یہیں اسی ایئرپورٹ سے سفر کرنے لگیں تو ہجوم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چند قدم آگے بڑھے تو فٹ پاتھ کے نزدیک خوبصورت وردیوں میں ملبوس پولیس والے کھڑے تھے۔

ایئرپورٹ کے سامنے ٹیکسی ڈرائیوروں کا ہجوم نہ تھا۔ ایک جانب سے ٹیکسی آتی تھی اور مسافر کو بٹھا کر لے جاتی تھی۔ ٹیکسیاں باری باری آرہی تھیں جس کی وجہ سے ذرا سی بھی بدنظمی نہیں تھی۔ ہر ٹیکسی میں میٹر نصب ہوتا تھا اور کیا مجال کہ میٹر میں کوئی خرابی ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور میٹر کے مطابق کرایہ لینے کا پابند ہے۔ البتہ اگر کوئی ٹپ دینا چاہے تو شکریئے کے ساتھ قبول کرلی جاتی ہے مگر نہ دینے والوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

ہماری باری آنے پر ٹیکسی آکر سامنے رک گئی۔ جھٹ پٹ ایک نوجوان خوش پوش ڈرائیور باہر نکلا۔ ڈگی کھول کر اس میں ہمارا سامان رکھا۔ تمام سامان رکھنے کے بعد مسکرا کر پوچھا۔ "فنش؟" یعنی کیا اتنا ہی سامان تھا۔ سارا کا سارا رکھ دیا گیا ہے؟

ہم نے کہا "یس۔ فنش۔"

وہ مسکرایا اور ہم لوگوں کو ٹیکسی میں بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"بسم اللہ" کہہ کر اس نے گاڑی چلادی۔ اس کا "بسم اللہ" کہنا ہمیں بہت اچھا لگا۔ دراصل باہر جاکر یہی باتیں ہم پاکستانیوں کا بہت دل دکھاتی ہیں۔ وہاں کا مہذب ماحول' لوگوں کی شائستگی، قانون کی پاسداری اور نظم وضبط دیکھ کر بہت رشک آتا ہے کہ کاش ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہونے لگے۔ پھر یہ سوال اور بھی زیادہ دل دکھاتا ہے کہ آخر ہم یہ سب کیوں نہیں کرسکتے؟ اپنے ملک سے باہر جاکر ہر قدم پر ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ ہم سب اپنے نظام کو برا بھلا کہہ کر اور اس کے لیے دوسروں کو ذمے دار قرار دے کر خود بری الذمہ ہوجاتے ہیں حالانکہ ہم سب اس کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں نہ اپنے حقوق کا احساس ہے نہ فرائض کا۔ قانون ہمارے لیے ایک بے معنی لفظ ہے۔ تہذیب اور شائستگی سے ہم رفتہ رفتہ بہت دور ہوگئے ہیں۔

غریب اور ان پڑھ لوگوں کی کیا شکایت کریں' امیر اور تعلیم یافتہ بلکہ بارہا یورپ و امریکا تک ہو آنے والے لوگوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہم بے حس ہو چکے ہیں۔ دوسروں کو دیکھ کر بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔ خیر' یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ شاید کسی کے پاس بھی ان کا جواب نہیں ہے۔ نہ عوام کے' نہ حکمرانوں کے' نہ سیاست دانوں اور افسر شاہی کے بادشاہوں کے پاس اس سوال کا جواب ہے۔ ہمارے ہاں ہر شخص کے پاس صرف سوال ہی سوال ہیں یا پھر حیلے اور عذر۔

استنبول کے اتاترک ائرپورٹ کے باہر بھی سماں ایسا ہی حسین اور دلفریب تھا جیسا کہ ائرپورٹ کے اندر تھا۔ لگتا تھا ہم کسی یورپی ملک میں آ گئے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اچھائیوں کے لیے یورپ اور امریکا کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب سلطنتِ عثمانیہ کی حدود یورپ اور ایشیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بحر و بر پر ترکوں کی حکمرانی تھی۔ سمندروں میں ان کے تجارتی اور جنگی جہازوں کے بیڑے رواں دواں رہتے تھے اور ساری دنیا ان سے خائف رہتی تھی۔ ترکوں نے انگریزوں کی سازشوں کے ذریعے مشرقِ وسطیٰ کے علیحدہ ملکوں کے قیام سے پہلے ہی ان ملکوں میں ریل گاڑی چلا دی تھی۔ جس وقت لندن کی سڑکوں کو روشن کرنے کے لیے تیل کے لیمپ روشن کیے جاتے تھے' اس وقت ترکی کے شہر بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے تھے۔ ترکوں کا نام سن کر ہی بڑے بڑے شہنشاہوں اور سپہ سالاروں کے رنگ پیلے پڑ جاتے تھے۔ سامانِ حرب میں ترکوں نے جدید ترین اسلحہ ایجاد کر لیا تھا جس کی مدد سے وہ دشمنوں پر فتح حاصل کر سکتے تھے۔ ان کی ہلال نما تلواریں یورپ کے جنگجوؤں کی بھاری بھرکم سیدھی تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کاٹ دار تھیں۔

آج یہ وہی ترکی تھا جہاں ہم ایک بار پھر سیر و تفریح کی غرض سے پہنچے تھے۔

ائرپورٹ کے باہر دور تک خوبصورت منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ سبزہ زار' کشادہ' خوبصورت سڑکیں' قطار در قطار درختوں کی سجاوٹ۔ ائرپورٹ کی عمارت شہر سے کافی دور ہے اس لیے کافی فاصلے تک عمارتوں اور آبادی کے آثار نظر نہیں آتے۔

ائرپورٹ سے نکلتے ہی ایک بہت بڑا نیون سائن جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے جس پر انگریزی میں جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔

"ISTANBUL GATEWAY OF HIDDEN TREASURES"

"یعنی..... استنبول' پوشیدہ خزانوں کا دروازہ۔"

"یار' یہاں تو پوشیدہ خزانے بھی ہیں۔" بٹ صاحب نے فرمایا "مگر ہمارے فلمی ہدایت کار حسن عسکری "خزانے کی تلاش" بنانے کے لیے مصر کیوں گئے تھے؟"

ہم اس حماقت آمیز سوال کا کیا جواب دیتے۔ البتہ خان صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دے دیا' بولے "انہیں مصر میں کون سے خزانے مل گئے تھے جو استنبول آ جاتے۔"

بٹ صاحب کو کچھ دیر بعد خود ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' کہنے لگے "دراصل پوشیدہ خزانوں سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہاں قدیم زمانے کے بے مثال نمونے موجود ہیں۔"

یہ ایک حقیقت بھی ہے' استنبول اور ترکی دنیا کی تین عظیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے۔ پہلے رومنوں نے یہاں حکومت کی اور اپنی یادگاریں چھوڑیں۔ ان کے جانے کے بعد بازنطینی حکومت کا دور آیا اور انہوں نے اس سرزمین کو اپنی ثقافت' تہذیب اور ہنرمندی سے مالا مال کر دیا۔ بازنطینی دور ختم ہوا تو سلطنتِ عثمانیہ کا دور شروع ہو گیا۔ ترک دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلابِ رواں کی طرح دنیا کے تین براعظموں میں پھیل گئے۔ ایشیا' افریقہ' یورپ میں عثمانی حکومت کے جھنڈے لہرانے لگے۔ اس زمانے میں ایسا لگتا تھا جیسے ترکوں کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جس ملک کو چاہیں فتح کر سکتے ہیں۔ ان کی طاقت بے پناہ ہے جس کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔

آج کا استنبول ان تینوں عظیم اور قدیم تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ کہنے کو ترکی کا دارالحکومت انقرہ ہے لیکن اس کا اصل مرکز استنبول ہی ہے جہاں دنیا بھر سے ہر سال ہزاروں لاکھوں سیاح آتے ہیں اور یہاں کے نادر نمونوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ یہاں بازنطینی دورِ حکومت کے محلات' چرچ اور دیگر قابلِ دید یادگاریں بھی ہیں اور عثمانی دور کی مساجد' قلعے اور شاندار عمارتیں بھی موجود ہیں۔ استنبول ایک ایسا شہر ہے جس کے قابلِ ذکر مقامات کو دیکھنے کے لیے ہفتوں درکار ہیں۔

ان دنوں استنبول کی آبادی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ ہے۔ یہ شہر صحیح معنوں میں مشرق اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ قدیم آبادیاں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ جوں کی توں موجود ہیں۔ شہر کے جدید حصے دور دور تک پھیل چکے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کچھ کم نہیں ہوتی۔ پھر جبکہ یہاں ہر روز ہزاروں سیاحوں کی آمد و رفت بھی جاری رہتی ہے لیکن ہمارے شہروں میں انسانوں کا جو بے پناہ ہجوم نظر آتا ہے' استنبول میں ایسا

نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ نظم وضبط اور سلیقہ ہے۔ ٹریفک بے اندازہ ہے لیکن بڑے نظم وضبط کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ لوگ ٹریفک کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ہم جتنی بار بھی ترکی گئے ہیں' یہاں قانون شکنی کے مناظر دیکھنے میں نہیں آئے۔ مہذب اور شائستہ لوگ بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ٹریفک بھی مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور اور کراچی کی سڑکوں پر بدنظمی اور ہجوم دیکھ کر جو گھبراہٹ ہوتی ہے' استنبول میں ایسا محسوس نہیں ہوتا۔

استنبول کو ترکی کا تجارتی اور کاروباری دارالحکومت سمجھ لیجئے۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہاں کا اسٹاک ایکس چینج اور چیمبر آف کامرس دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اس سے ترکی کی معیشت اور اقتصادی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایشیا' افریقہ اور یورپ کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے عالمی تجارت اور کاروبار کے لیے بہت اہم مرکز ہے۔

استنبول پہنچ کر ایک اور احساس بھی ہوتا ہے۔ یہ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ اعزاز دنیا میں کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں ہے۔ یہی بات سیاحوں کی کشش اور دلچسپی کا سبب ہے۔ قانون کی عمل داری اور امن وامان کی صورت حال قابل رشک ہے۔ آپ سارے شہر میں دن اور رات کے کسی بھی حصے میں اکیلے گھومتے پھریں۔ (اگر آپ عورت ہیں تب بھی) قدیم چھت والے پراسرار بازاروں میں گھومیں یا جدید ترین شاپنگ سینٹرز سے لطف اندوز ہوں۔ دور دراز یادگاروں کو دیکھیں یا ساحل سمندر پر حد نظر تک پھیلے ہوئے ریستورانوں' قہوہ خانوں اور تفریح گاہوں میں گھومتے پھریں' آپ ہر جگہ بالکل محفوظ و مامون ہیں' آپ کی جان و مال کو مطلق کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ترکی کے قالین اپنی ندرت' حسن اور پائیداری کے لیے مشہور ہیں اور نسبتاً کم قیمت ہوتے ہیں۔ ترکی میں مقامی دستکاریوں کے دیگر نمونے بھی سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔

ہماری ٹیکسی کشادہ' خوبصورت اور ہموار سڑک پر یوں تیرتی ہوئی جارہی تھی جیسے پانی میں مچھلی۔ نہ کوئی جھٹکا' نہ رکاوٹ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی میں جدید ترین سڑکوں کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ یہاں یورپ کے ممالک کی طرح تمام جدید ترین سہولتیں موجود ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں بسیں چوبیس گھنٹے چلتی ہیں اور سفر کا سب سے سستا ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قابل تعریف خوبی ان کی پابندئ اوقات ہے۔ بسیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں اور عموماً مقررہ وقت پر ہی چلتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان کی آمد ورفت کے وقت میں خلل پڑے۔ استنبول میں ٹرام بھی چلتی ہے اور کافی زمانے پہلے کی کراچی کی ٹرام کی طرح خستہ اور آثار قدیمہ نہیں ہوتی بلکہ جدید ترین ٹرام شہر کی سڑکوں پر محوخرام نظر آتی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور خوش شکل اور خوش پوش تھا۔ ترکوں کے بارے میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ یہ قوم اچھا کھانے' اچھا پہننے اور اچھی طرح رہنے کی قائل ہے۔ اسی لیے جسے دیکھئے تندرست وتوانا۔ خوش لباس اور خوش مزاج نظر آتا ہے۔ بدمزاج' خشک مزاج اور قنوطی ترک ہم نے ایک بھی نہیں دیکھا۔ ایک اور بات جو اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی دیکھنے والوں کو متاثر کرتی ہے' وہ ترکوں کا مخرہ پن انداز ہے۔ ترک قدر آور بھی ہوتے ہیں اور درمیانہ قد بھی۔ لیکن ان کی چال ڈھال اور انداز میں فخر کی شان نظر آتی ہے۔ سینہ تنا ہوا' گردن فخر سے بلند۔ اس قوم میں کسی قسم کا احساس کمتری نہیں ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ قوم کبھی غلام نہیں رہی۔ طویل عرصے تک دنیا کے بہت سے حصوں پر حکمراں رہی ہے۔ ویسے حکمران تو ہم برصغیر کے مسلمان بھی رہے ہیں۔ صدیوں اس ملک پر حکومت کی ہے لیکن بہت سا ہاتھی سے دشمن سے شکست مان لی۔ اس شکست میں خود اپنوں کی بے وفائی اور غداری کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ لیکن طویل عرصے حکمرانی کرنے کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے محکوم ہوئے تو یا پست قنوطیت' مایوسی اور احساس کمتری نے انہیں گھیر لیا۔ انگریزوں کی غلامی نے ہمارا قومی مزاج ہی بدل کر رکھ دیا۔ ہر افسر کو حضور پرنور' جناب والا' غریب پرور کہنا اور خود کو احقر' کمترین' نیاز مند ٹھہرانا ہمارے خمیر میں داخل ہوگیا۔ غلامی کے یہ جراثیم اس طرح ہمارے رگ وپے میں پیوست ہوگئے ہیں کہ انگریز حکمرانوں کے جانے کے بعد ہم نے ''کالے انگریزوں'' کی غلامی قبول کرلی۔ ایک فدویانہ جذبہ ہم پر طاری ہوگیا۔ اب ہماری قوم ہر صاحب اختیار کے سامنے ہاتھ جوڑنے' منتیں کرنے اور گھگھیانے کی عادی ہوچکی ہے۔ چاہے وہ ''صاحب'' کا چپراسی ہی کیوں نہ ہو۔

ترکی میں یہ بیماری نہیں ہے۔ وہ آزاد اور خودمختار تھے اور آج بھی آزاد اور خودمختار ہیں۔ ان کے قدم زمین پر لیکن نگاہ آسمان پر ہوتی ہے۔ منت سماجت اور خوشامد کرنا تو ترکوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ ایک بہادر' خوددار اور غیور قوم میں جو

یہاں موجود ہونی چاہئیں ترک ان سے مالا مال ہیں۔ بہادری انہیں ورثے میں ملی ہے۔ وہ اپنے قومی حقوق پر سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ کسی سے مرعوب بھی نہیں ہوتے۔ سوویت یونین کے دورعروج میں جب یہ دنیا کی دوسری سپر پاور تھی اور یورپ کے کئی ملکوں کو اس نے اپنی فوجی طاقت اور ٹینکوں کی مدد سے روند ڈالا تھا' اس وقت ترکی ہی ایک ایسا ملک تھا جو سرحدوں کے نزدیک ہونے کے باوجود سوویت یونین کی بے پناہ طاقت سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ ترک روسیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں قہر وغضب سے گھورتے تھے۔ سوویت یونین کو بھی اس ملک کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترک ایک بہادر قوم ہے۔ یہاں کا ہر شہری فوجی تربیت حاصل کرتا ہے اور ضرورت کے وقت ملک کے دفاع کی خاطر سپاہی بن کر دشمن کی راہ روکنے کے لیے کھڑا ہوجاتا ہے۔ ترک کبھی ایک زمانے میں بہت وسیع سلطنت کے حکمراں رہے ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی صدیوں برصغیر پر حکومت کی ہے۔ لیکن حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو مایوسی' محرومی اور شکست خوردگی کے احساس نے گھیر لیا اور انہوں نے انگریزی حکومت کی غلامی اختیار کرلی۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ اس ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے نصف صدی بعد تک آج بھی ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ ایک علیحدہ اور طویل بحث طلب موضوع ہے۔

غیر آباد علاقہ ختم ہونے کے بعد ہماری ٹیکسی آبادی کے علاقوں میں داخل ہوگئی۔ ہم لوگ آپس میں گردونواح کی عمارتوں' سڑکوں اور باغوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ترک ٹیکسی ڈرائیور اس تمام عرصے میں بالکل خاموش رہا۔ حالانکہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ترک ٹیکسی ڈرائیور بھی کافی باتونی ہوتے ہیں۔

سوال یہ تھا کہ ہم کہاں جائیں؟ کس علاقے کے ہوٹل میں قیام کریں؟ جہاں تک ہمارا تجربہ تھا ہمارے خیال میں قیام وطعام کے لیے استنبول کا بہترین علاقہ المستقیم اسکوائر یا المستقیم چوک ہے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب نے اسے ہمیشہ مستقیم چوک ہی کہا۔ یہ استنبول کا سب سے زیادہ بارونق خوبصورت اور مصروف ترین چوک ہے جس سے مختلف سمتوں کو سڑکیں جاتی ہیں۔ ہر طرف بازار' اسٹورز' نائٹ کلب' ریستوران' ہوٹل اور نوادرات کی دکانیں ہیں۔ یہ ایک ایسا چوک ہے جس میں ہر وقت چہل پہل رہتی ہے۔ ٹرام آرہی ہے اور جارہی ہے۔ ایک طرف بسوں کے ذریعے آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہے۔ ٹیکسی ایک لمحے میں دستیاب ہوجاتی ہے۔ یہ بہت وسیع اور کشادہ چوک ہے۔ اس کے درمیان میں ایک سرسبز تختہ ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس ایک چوک سے مختلف بڑی اور چھوٹی سڑکیں مختلف سمتوں کو جاتی ہیں لیکن ٹریفک کی روشنیوں کا اتنا اچھا بندوبست ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی ابتری' بدنظمی اور افراتفری پیدا نہیں ہوتی۔ اس چوک میں سیاح اور مقامی مردوخواتین بیٹھ کر گھنٹوں تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ جب اکتائے تو ساتھ ہی کسی سڑک یا نفلی سڑک اور گلی میں داخل ہوکر کسی ریستوران میں چلے گئے یا پھر چوک ہی میں واقع چھوٹے چھوٹے خوبصورت ریستورانوں سے ڈونر کباب یا شے ورلے کر کوک یا کسی اور مشروب کی ایک بوتل لے کر پھر بینچ پر آکر بیٹھ گئے۔

صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں کے لحاظ سے ترکی مغربی ملکوں کا ہم پلہ ہے۔ المستقیم چوک میں گرد وغبار کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ لوگ بے فکری سے کھانے پینے کی دکانوں سے کباب وغیرہ بنوا کر وہیں کھڑے ہوکر کھا لیتے ہیں۔ چوک میں واقع ریستورانوں میں بیٹھنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے اور نہ ہی پاکستان کی طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنے ریستوران کے سامنے کرسیاں اور میزیں ڈال کر گاہکوں کی خاطر داری کرنے لگے۔ یہاں کے فٹ پاتھوں پر بھی ریستوران ہیں لیکن انتظامیہ نے ان کی باقاعدہ منظوری دی ہے اور یہ ایسے علاقوں میں ہیں جہاں آمد ورفت میں رکاوٹ کا اندیشہ نہ ہو۔ دراصل فٹ پاتھ کے ریستورانوں کا کلچر یورپ کے ملکوں کی بہت بڑی دین ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں بھی سڑکوں پر ریستوران اور قہوہ خانے نظر آتے ہیں مگر یورپی شہروں میں یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

ب۔م۔ استنبول کی حدود میں داخل ہوگئے اور پھر بھی کچھ نہ بولے تو ٹیکسی ڈرائیور کو لب کشائی پر مجبور ہونا پڑا۔ دراصل ہم آس پاس کے متنوع اور حسین مناظر اور عمارات کو دیکھنے میں اتنے زیادہ مصروف تھے کہ یہ احساس تک نہ ہوا کہ اب ہم شہری حدود میں داخل ہوچکے ہیں اور ٹیکسی والے کو اپنی منزل کا پتا بتانا ضروری ہے۔

''ایکسکیوزمی سر!'' اچانک ٹیکسی ڈرائیور جب بولا تو ہمیں اس کی موجودگی کا احساس ہوا' ورنہ اب تک ہم اسے

بھولے ہوئے تھے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ جیسے ایک خودکار ٹیکسی میں سفر کررہے ہیں۔

''یوگوٹو ہوٹیل؟'' مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کو کسی ہوٹل میں جانا ہے تو اس کا نام تو بتائیں۔

ہم نے فوراً جواب دیا ''المستقیم چوک۔''

''اوکے!'' اس نے مختصر جواب دے کر سر ہلایا اور ٹیکسی کا سفر جاری رہا۔

المستقیم چوک استنبول کے مشرقی یعنی پرانے حصے میں واقع ہے۔ ابھی ہم جدید استنبول سے گزر رہے تھے جو کسی مغربی شہر کی تصویر پیش کررہا تھا۔ باسفورس کا طویل اور کشادہ پل عبور کرنے کے بعد شہر کی دوسری جانب شہر کا پرانا حصہ ہے۔ یہ بھی میل ہا میل تک پھیلا ہوا ہے۔ وسیع کشادہ سڑکوں کے ساتھ ساتھ یہاں نسبتاً تنگ سڑکیں اور گلیاں بھی ہیں۔ یہ شہر کیونکہ پہاڑی زمین پر ہے اس لیے جگہ جگہ نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہے۔ اونچی نیچی بل کھاتی ہوئی پختہ گلیاں اور پھر ان سے گزرنے کے بعد سمندر کے ایک کنارے پر ریستوران اور رہائشی مکانات ایک حسین منظر پیش کرتے ہیں۔

ہم آس پاس کے نظاروں میں کھوئے رہے۔ استنبول واقعی سر تا پا ایک عجائب گھر ہے۔ اسے جس قدر دیکھئے' اتنا ہی زیادہ حسین لگتا ہے اور پھر اس کے دوسرے حسین پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں' جس طرح طلسم ہوشربا اور الف لیلہ میں کہانی سے کہانی نکلتی رہتی ہے اسی طرح استنبول میں ایک منظر کے اندر سے دوسرا منظر برآمد ہوتا رہتا ہے اور دیکھنے والا حیران ہو کر نت نئے مناظر اور تماشے دیکھتا رہتا ہے۔

کافی دیر گزر گئی تو بٹ صاحب نے ہمیں ٹہوکا دیا اور آہستہ سے بولے ''آفاقی صاحب! ویسے تو یہ اپنا ترک بھائی ہے پھر بھی بندہ بشر تو ہے۔''

ہم نے حیرت سے انہیں دیکھا ''یہ آپ نے کون سا انکشاف کردیا ہے۔''

کہنے لگے ''یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں' بالکل خاموش ہے۔''

خان صاحب بگڑ کر بولے ''یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اگر ٹیکسی ڈرائیور باتیں کرتے ہیں تو تمہیں شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ بہت باتونی ہیں۔ اگر نہیں بولتے تو انہیں گونگا سمجھ لیتے ہو۔ بھائی' یہ شریف اور معقول آدمی ہے۔ شاید انگریزی نہیں جانتا اس لیے بلاوجہ بول بول کر ہمارے کان نہیں کھا رہا۔ تم کو اس پر بھی شکایت ہے۔''

لیجئے' آخر کار ہم نے باسفورس کا کشادہ تاریخی پل عبور کرلیا اور پرانے شہر میں سے گزرتے ہوئے ایک بہت وسیع اور کشادہ چوک میں پہنچ گئے۔ استنبول کے پرانے علاقوں کے بارے میں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ ہمارے پرانے لاہور جیسے علاقے ہیں۔ جی نہیں' مشرقی استنبول کا جدید حصہ بھی بہت ترقی یافتہ ہے۔ البتہ پرانے علاقوں کا منظر پرانے روایتی شہروں جیسا ہی ہے۔ لیکن بہت صاف ستھرا۔ اس علاقے میں بھی جدید عمارتیں' ہوٹل اور شاپنگ سینٹرز کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے ان میں نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ یہاں بھی پتلون قمیص کوٹ اور مغربی لباس میں ملبوس خواتین کثرت سے نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں پرانے طرز کا لباس بھی نظر آجاتا ہے مگر بہت کم۔ یہ حقیقت ہے کہ ترکی اب واقعی ایک جدید ملک بن چکا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جانب ٹیکسی روک لی۔ ہمارے سامنے المستقیم چوک تھا جس سے ہر طرف کشادہ سڑکیں مختلف سمتوں میں جاتی نظر آرہی تھیں۔ یہ چوک مختلف رنگا رنگ جھنڈوں سے آراستہ ہے۔ ہر طرف ٹریفک کی ریل پیل ہے۔ دکانیں' شاپنگ سینٹرز' ٹرام کاریں' ٹیکسیاں' بسیں' کاریں اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے غول کے غول۔ ان میں سیاحوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ المستقیم چوک ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ یہ خوبصورتی سادگی اور جدت کا امتزاج ہے۔ پہل پہل اتنی زیادہ رات گئے تک یہاں دن ہی نکلا رہتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کو روک کر پہلی بار ہم لوگوں کو پلٹ کر دیکھا۔ مسکرایا اور پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا کہ ہم کون سے ہوٹل میں جانا پسند کریں گے؟

یہاں ہم پہلے بھی آچکے تھے اور بعد میں اعجاز درانی کے ساتھ بھی گئے تھے۔ اعجاز صاحب کے ساتھ ہم اسی چوک کی ایک نسبتاً تم چوڑی سڑک پر سے گزر کر ایک بل کھاتی ہوئی نسبتاً تنگ نما سڑک پر سے گزر کر کئی موڑ مڑنے کے بعد ایک کھلی جگہ پہنچے تھے۔ جہاں ''جہانگیر ہوٹل'' میں قیام کیا تھا۔ المستقیم چوک اور جہانگیر ہوٹل کے ناموں سے یوں لگتا ہے جیسے ہم پاکستان کے کسی شہر میں ہیں۔ ویسے بھی ترکی کے تمام شہر اپنے اپنے سے لگتے ہیں حالانکہ زبان کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یعنی ..... زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔

بیشتر لوگ انگریزی سے نابلد ہیں مگر زبان کی کمی ان کی محبت اور اشاروں کی زبان سے پوری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات زبان کے حوالے سے بہت سے دلچسپ لطیفے بھی ہو گئے لیکن کسی وقت بھی بدمزگی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ہم جانتے تھے کہ یہاں مختلف سڑکوں پر بہت سے ہوٹل ہیں جو معیار کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ بھی ہیں اور درمیانے بھی۔ یورپ کے شہروں کی طرح ترکی میں بھی صفائی اور ٹریفک کا انتظام بہت اچھا ہے۔ گندگی' بے پروائی اور غیر ذمے داری کہیں دیکھنے میں نہیں آتی اس لیے درمیانہ درجے کے ہوٹلوں میں بھی آرام سے رہ سکتے ہیں۔

''کیوں بھئی' کون سے ہوٹل جانا ہے؟'' خان صاحب نے ہم سے پوچھا۔

اب ہم ٹیکسی ڈرائیور کو کیا سمجھاتے اور بتاتے کہ زبان کی رکاوٹ درمیان میں حائل تھی۔ یہی مناسب سمجھا کہ ایک طرف کھڑی سے اتر جائیں اور پیدل گھوم کر مناسب ہوٹل تلاش کریں۔

ہم نے ٹیکسی والے سے کہا ''ڈراپ اس ہیئر Drop us here' اس نے حیرت سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہاں کوئی ہوٹل نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر زبان کی سہولت ہوتی تو وہ ہم سے یہ سوال بھی کر لیتا مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بلاوجہ ایک دوسرے کا وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟

اس نے بڑی فرمانبرداری سے ہمارا سامان نکال کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

ہم نے پوچھا ''ہاؤ مچ فیئر'' یعنی کرایہ کتنا بنتا ہے؟

اس نے میٹر کی جانب اشارہ کردیا۔

ہم نے اندر سرڈال کر میٹر کا مطالعہ کیا تو اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ بے شمار ہندسے اور لاتعداد صفر نظر آرہے تھے۔ ظاہر ہے استنبول میں میٹر ترکی کرنسی میں رقم بتاتے ہیں۔

ہم نے خان صاحب سے کہا ''خان صاحب! ہم تو خراب میں بہت کمزور ہیں' آپ انجینئر ہیں۔ ذرا بل دیکھ کر رقم بتائیے۔''

خان صاحب نے بھی میٹر کا بغور مطالعہ کیا مگر فیل ہو گئے' کہنے لگے ''بھائی' یہ تو لاکھوں میں ہے۔''

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور پر بھروسا کرنا مناسب سمجھا اور پوچھا ''ہاؤ مچ ڈالرز؟''

اس نے فوراً حساب لگا کر بتا دیا۔ قریب قریب 37 ڈالر بنتا تھا۔ راستہ بھی ہم نے بہت طویل طے کیا تھا۔ سو چاترک بھائی ہے' ہم کو دھوکا تو نہیں دے گا۔ لہٰذا رقم نکال کر اس کے حوالے کردی۔

خان صاحب نے مشورہ دیا ''باقی کے تین ڈالر اسے ٹپ میں دیں آخر ہمارا ترک بھائی ہے۔''

ہم نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے ان کی یہ فرمائش بھی منظور کرلی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے خلوص سے ''السلام علیکم'' کہا گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

''اب ہم کیا کریں گے؟'' بٹ صاحب نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ ہوٹل تلاش کریں گے۔ آپ لوگ اپنے سوٹ کیسوں کو رسی سے باندھ لیں اور ہمارے پیچھے آئیں۔''

فٹ پاتھ پر بہت رش تھا۔ اول تو ہم یہی فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ نو دس بلکہ گیارہ سڑکوں میں سے کون سی سڑک پر جائیں۔ سڑکوں کے نام ترکی زبان میں درج تھے جو ہمارے لیے بے کار تھے۔ اگر ہم سڑکوں کے نام پڑھ بھی لیتے تو یہ کیسے جانتے کہ ہمیں مطلب کا ہوٹل کہاں ملے گا؟ اللہ کا نام لے کر اسی فٹ پاتھ پر چل پڑے جس پر ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں اتارا تھا۔

خان صاحب کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور وہ ماشاء اللہ' سبحان اللہ کی گردان لگائے ہوئے تھے۔

ہم نے کہا ''خان صاحب! خدا کا خوف کیجئے۔ عورتوں کو دیکھنے کے بجائے ہوٹل تلاش کیجئے۔''

یہ بھی غنیمت تھا کہ ہوٹلوں کے نام انگریزی میں بھی لکھے ہوتے ہیں۔

راستے میں ہمیں ایک دو شاندار ہوٹل نظر آئے۔ باہر کے شیشوں میں سے اندر کا روشن اور آراستہ ماحول نظر آرہا تھا۔ مسافروں کی چہل پہل بھی تھی اور استقبالیہ پر اسمارٹ خواتین بھی دور سے جگمگا رہی تھیں۔ خان صاحب ہر ہوٹل کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے۔

''بہترین ہوٹل ہے۔ بس یہی ٹھیک رہے گا۔''

ہم نے کہا ''خان صاحب! باہر کھڑے باوردی چوکیدار اور اندر کے ماحول کو دیکھ کر اندازہ لگا لیجئے کہ یہ کتنا مہنگا ہوگا۔''

بولے ''تو پھر کیا ہوا' آخر سیر کرنے آئے ہیں' کسی سرائے میں تو ٹھہرنے سے رہے۔''

ہم نے ان کی بات ان سنی کردی۔ وجہ یہ تھی کہ اب بٹ صاحب بھی لاحول پڑھنے میں کافی رواں ہو گئے تھے۔ ایک طرف سبحان اللہ اور دوسری طرف لاحول ولا قوۃ۔ ہم اس مقابلے بازی سے تنگ آگئے۔

''دیکھو بھائی' ہم ساری زندگی اس فٹ پاتھ پر یا استنبول کی سڑکوں پر پیدل نہیں چل سکتے' آپ لوگ پہلے ہوٹل تلاش کیجئے۔ دوسرے کام بعد میں ہو جائیں گے۔''

فٹ پاتھ کو ایک نسبتاً کم چوڑی سڑک نے کراس کیا تو ہم

اس چھوٹی سی سڑک پر ہو لیے۔ سوچا کہ اس سڑک پر یقیناً درمیانہ درجے کے ہوٹل مل جائیں گے اور کچھ دیر بعد اللہ نے ہماری سن لی۔ ایک اچھا خاصا معقول ہوٹل ہمارے سامنے تھا جس کا نام یونیورسل یا یونائیٹڈ ہوٹل تھا۔ سامنے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اندر کا ماحول بھی مناسب نظر آیا۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ زیادہ بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ دروازے کے باہر چوکیدار وغیرہ کا تکلف بھی نظر نہیں آیا۔

ہم وہیں رک گئے۔ ”آپ لوگ سامان کے پاس ٹھہریے۔ ہم پتا کر کے آتے ہیں۔“

”بھائی‘ ہمیں پردیس میں یوں اکیلا چھوڑیں گے؟“

”اکیلے نہیں‘ آپ دونوں ہیں۔“

خان صاحب بولے ”میں تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔“

”اور میں بھی“ بٹ صاحب نے جوابی ضد کے طور پر کہا۔

ہم نے کہا ”تو پھر اس سامان کی حفاظت کون کرے گا؟“

”یار‘ یہ مسلمان لوگ ہیں‘ ترک بھائی ہیں۔ یہ بہت ایماندار ہوتے ہیں۔“

ہم نے کہا ”ٹھیک ہے۔ تو پھر ہم سامان کے پاس رک جاتے ہیں۔ آپ دونوں ہوٹل کے بارے میں معلومات کر آیئے۔“

دونوں حضرات کی باچھیں کھل گئیں اور وہ خوشی خوشی ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہم آس پاس کی رونق دیکھنے لگے۔

کچھ دیر بعد خان صاحب بھاگے بھاگے آئے۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا آپ کے پیچھے پولیس لگ گئی؟“

بولے ”ارے نہیں۔ ہوٹل بہت اچھا ہے۔ کرایہ بھی معقول ہے۔ میں بٹ صاحب کو کاؤنٹر پر کھڑا کر کے آیا ہوں تاکہ اس عرصے میں کوئی اور ہمارے کمرے نہ لے لے۔ آپ فوراً چلیے‘ کام بن گیا ہے۔“

”اور یہ سوٹ کیس کون اٹھائے گا؟“ ہم نے بٹ صاحب کے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

”لیجیے‘ وہ لوڈر صاحب بھی آ گئے۔“

اسمارٹ لباس میں ایک اسمارٹ اور خوبصورت ترک نوجوان مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بیچ پوچھیے تو کسی فلم کا ہیرو لگتا تھا مگر قسمت دیکھیے کہ ایک معمولی ہوٹل میں لوڈر تھا۔

اس نے ”السلام علیکم“ کہہ کر مصافحہ کیا۔ سوٹ کیس اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹرالی میں رکھے اور مسکرا کر کہا ”کم وزی“ یہ کہہ کر وہ ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

ہم بادل ناخواستہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

”یار! ہوٹل کیسا ہے‘ زیادہ مہنگا تو نہیں ہے؟“ ہم نے خان صاحب سے چلتے چلتے پوچھا۔

”بالکل نہیں‘ یوں سمجھئے کہ مفت ہے۔“

استقبالیہ پر تین خواتین تشریف فرما تھیں۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور طرح دار خاتون کے سامنے بٹ صاحب کھڑے چوکیداری کر رہے تھے۔ تینوں خواتین نے یورپ کے دستور کے مطابق نصف آستینوں کی کھلے گلے کی سفید قمیص اور نیلے اسکرٹس پہن رکھے تھے۔ خوشبو سے وہ مہک رہی تھیں۔ اس پر ان کی گرم جوش مسکراہٹ سونے پر سہاگہ۔

”آپ پاسپورٹ نکالیے اور یہ فارم بھریے“ خان صاحب نے تین فارم ہمارے سامنے رکھ دیے۔

”آپ لوگوں کا کارڈ میں پُر نہیں کروں گا۔ آپ خود ہی کیجیے۔“

”نو پرابلم“ دونوں حضرات نے مستعدی سے فارم لے لیے اور اندراج شروع کر دیا۔

معلوم ہوا کہ فی کمرا نو ڈالر کرایہ تھا۔ بعد میں دیکھے تو کمرے بھی اچھے تھے۔ سروس کے لیے مرد مقرر تھے لیکن بستر وغیرہ بنانے اور صفائی کرنے کے لیے خواتین کی ڈیوٹی تھی۔

”یہ دیکھیے“ خان صاحب نے ایک کھڑکی کھول کر ہمیں دکھائی ”کتنا اچھا منظر ہے؟“

واقعی بہت چہل پہل اور رونق تھی۔

”بستر دیکھیے‘ کتنا آرام دہ ہے“ انہوں نے بیڈ پر بچوں کی طرح اچھلتے ہوئے کہا۔

”اور باتھ روم بھی بہت اچھے ہیں“ بٹ صاحب تھے۔

کسی بھی معاملے پر ان دونوں حضرات کا اتفاق کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ مگر یہ معجزہ رونما ہو چکا تھا۔ خدا جانے راز کیا تھا۔

بعد میں بٹ صاحب نے راز بھی فاش کر دیا‘ بولے ”آفاقی صاحب‘ خان صاحب نے بتایا ہے کہ یہاں تو انگریزوں سے بھی بڑھ کر انگریزیت ہے۔ آپ نے سڑک پر عورتوں کا لباس نہیں دیکھا؟ لاحول ولاقوۃ۔ مگر اس ہوٹل کے اسٹاف کا لباس بہت شریفانہ ہے۔ عورتوں کی آنکھوں میں شرم وحیا بھی ہے۔ دیکھا نہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتیں۔ پھر یہ کہ اسٹاف میں کافی مرد بھی شامل ہیں۔

السلیم چوک بھی بالکل نزدیک ہے۔ ایک گلی مڑ کر سڑک پر گئے اور سیدھے استقبیم چوک پہنچ گئے۔“

ہم حیران ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ خان صاحب نے انہیں بہت خوبی سے شیشے میں اتارا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خان صاحب کو اپنے مطلب کا ماحول اور رونق بھی میسر آ گئی تھی۔ ایک خاتون ریسپشنسٹ سے انہوں نے علیک سلیک بھی کر لی تھی جن کا نام حبیبہ تھا۔

”کتنا اچھا اسلامی نام ہے“ بٹ صاحب نے خوش ہو کر انہیں بتایا۔

ہوٹل واقعی معقول اور اچھا تھا۔ خان صاحب نے بٹ صاحب سے جو بھی سچ جھوٹ بولا تھا وہ اپنی جگہ مگر ہمیں اس ہوٹل میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔

”اب جلدی سے فریش ہو جایئے۔ پھر لابی میں چلیں گے“ خان صاحب نے مشورہ دیا۔ ہم نے کہا ”اتنی جلدی کیا ہے۔ کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔ کافی یا قہوہ منگا کر پیتے ہیں۔“

”اے آفاقی صاحب! ہم سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ آرام کرنے کی کیا ضرورت ہے‘ کیا آپ تھک گئے ہیں؟“

”نہیں تو۔“

”بس تو پھر جلدی سے تیار ہو کر نیچے پہنچ جایئے۔ کافی وہیں بیٹھ کر پئیں گے۔ انسان کو بند کمرے کے بجائے کھلی جگہوں کا لطف اٹھانا چاہیے۔“

ہمارے کمرے تیسری منزل پر ایک ساتھ تھے..... چھوٹا سا ہوٹل تھا مگر بہت خوبصورت اور سلیقے کا تھا۔ مختصر سے کمروں کے لیے دو لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔

”اور پتا ہے آپ کو‘ یہاں لفٹ بوائے کی جگہ لفٹ گرل ہے۔“

خان صاحب نے مطلع کیا تو ہمیں یاد آیا کہ ایک نیلی وردی والی چست و چالاک قبول صورت لڑکی نے ہمیں لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچایا تھا۔ خان صاحب کے لیے یہ بوس کی حیثیت رکھتا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ بٹ صاحب نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خان صاحب نے ان کو مسمریزم کے ذریعے اپنا معمول بنا لیا ہے۔

تیار ہو کر ہم لوگ لفٹ پر پہنچے۔ بٹن دبایا۔ لفٹ حاضر ہو گئی مگر بالکل خالی۔ اس کے اندر نہ آدم نہ آدم زاد۔

”ہائیں‘ لفٹ گرل کہاں چلی گئی؟“ خان صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

”اچھا فی الحال تو نیچے چلیے‘ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

خود ہی ہم نے لفٹ کا بٹن دبایا اور لابی میں پہنچ گئے۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو سیاح خواتین کا ایک خوشبودار ہجوم اوپر جانے کا منتظر تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ سب مسکرائیں۔ ہم بھی مسکرائے۔

”کیا خیال ہے‘ دوبارہ اوپر نہ چلیں؟“ خان صاحب نے چپکے سے کہا۔

”کیوں؟“

”میں اپنا پین کمرے میں بھول آیا ہوں۔“

ہم نے کہا ”رہنے دیجیے۔ پین سے آپ کا کیا واسطہ۔ ضرورت پڑی تو ہم اپنا پین حاضر کر دیں گے۔“

خان صاحب مایوس ہو کر لفٹ سے باہر نکل آئے۔

بٹ صاحب نے ہم سے کہا ”ان کا خیال ہے کہ دوسری بار جب یہ اوپر جائیں گے تو انہیں لفٹ گرل مل جائے گی۔ اس امید میں یہ صبح سے شام تک لفٹ کی سواری کر سکتے ہیں۔“

ہم نے خان صاحب کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے مسکرائے ”چلیں بھائی‘ جہاں آپ چلنا چاہتے ہیں۔“

ہوٹل کی لابی میں خوب رونق تھی۔ خان صاحب بہت خوش تھے۔

بولے ”آفاقی صاحب‘ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ترکی اتنا اچھا ملک ہے۔ اس نے تو یورپ کی یاد تازہ کر دی۔“

ہم نے کہا ”پہلے ہمیں پیٹ پوجا کرنی چاہیے۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

”واقعی‘ آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا کہ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔“

بٹ صاحب بولے ”آپ کا پیٹ تو میموں کو دیکھ کر ہی بھر جاتا ہے۔ کھانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

”دیکھیے‘ اگر آپ کو ترکش کباب کھانے ہیں یا ڈونر کباب اور شے ورما سے پیٹ بھرنا ہے تو ہم سڑک کے کنارے کسی ریستوران سے خرید سکتے ہیں۔ وہاں بیٹھنے کا بندوبست نہیں ہوتا‘ بس خریدو اور کھاؤ۔“

”آپ کا مطلب ہے ”Take Away“ خان صاحب نے لقمہ دیا۔

”اس کا مطلب یہی ہوتا ہے“ بٹ صاحب بولے ”مگر مشکل یہ ہے کہ جب تک انگریزوں کی مثال نہ دی جائے‘ آپ کا دل نہیں بھرتا۔“

خان صاحب نے ان کی بات ان سنی کر دی‘ کہنے لگے ”ابھی ہم یہاں کئی دن رہیں گے۔ ڑکش کباب تو کھاتے ہی رہیں گے۔ کیوں نہ کسی ریستوران میں چل کر ترکی کھانا

کھائیں۔''

کچھ دور چل کر ہی ہمیں ایک ٹرکش ریستوران نظر آ گیا یا غلول یا اسی قسم کا ترک نام تھا۔ بٹ صاحب نے اسے فوراً بغلول ریستوران کا نام دے دیا اور بعد میں جب بھی کھانے کی فرمائش کرتے تو یہی کہتے کہ ''بغلول ریستوران'' چلتے ہیں۔

ریستوران تو بہت نفیس اور خوبصورت تھا۔ ہر چیز صاف ستھری' ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی۔ میز کرسیاں بہت عمدہ تھیں۔ بٹ صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ ریستوران میں ویٹریس ایک بھی نہیں تھی۔ نوجوان اسمارٹ لڑکے سرخ کوٹ اور نیلی پتلون میں ملبوس سروس پر مامور تھے۔ ظاہر ہے کہ خان صاحب کو یہ بات ہرگز پسند نہیں آئی۔

''کسی اور ریسٹورنٹ میں نہ چلیں'' انہوں نے تجویز پیش کی۔

''اس میں کیا خرابی ہے؟'' ہم نے پوچھا ''ابھی تو آپ نے کھانا چکھا تک نہیں ہے۔''

بٹ صاحب بولے ''مگر انہوں نے ماحول کو چکھ لیا ہے۔ سروس کرنے والے تمام مرد ہیں۔ انہیں تو گورے گورے ہاتھوں سے کھانا منگوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

ہم نے انہیں سمجھایا ''خان صاحب! ویٹریس نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ٹورسٹ خواتین کی تو کمی نہیں ہے۔''

ترکی سیاحوں کی جنت ہے۔ ہر ملک' قوم اور نسل کے سیاح جوق در جوق یہاں آتے ہیں۔ ان میں یورپ والوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہوتی ہے۔ ویسے بھی استنبول کو دیکھ کر کسی یورپی شہر کا ہی گمان گزرتا ہے۔ پرانے علاقوں اور نئی عمارتوں کی وجہ سے یہاں مشرق و مغرب کا ''بہترین امتزاج'' نظر آتا ہے لیکن مغربیت کا فی نمایاں ہے۔

ایک ویٹر نے بڑے ادب سے مسکرا کر مینو پیش کیا۔

بٹ صاحب نے کہا ''السلام علیکم۔''

ویٹر چونک پڑا۔ پھر مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

''مسلم؟'' اس نے پوچھا۔

''یس' مسلم فرام پاکستان۔''

ویٹر نے خوش ہو کر فوراً مصافحہ کیا اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر ادب سے سلام کیا۔

''پاکستان' پاکستان..... مسلم' ویری گڈ۔''

ہم سب نے باری باری اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی مطلع کر دیا کہ پاکستانی مہمان آئے ہیں۔ وہ سب باری باری مسکراتے ہوئے آئے اور علیک سلیک کے بعد رخصت ہو گئے۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے ترکوں کی محبت دیکھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہے۔

انگریزی سے وہ سبھی پیدل تھے' جو صاحب بہت اچھی انگریزی دان تھے ان کی انگریزی بھی خاصی ٹوٹی پھوٹی تھی اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

ویٹر نے اپنا نام غیوب یا کچھ اسی قسم کا بتایا۔ جواب میں ہم سب نے بھی اپنے نام بتائے۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا کھائیں۔'' اس نے کام چلاتی انگریزی میں کہا اور پھر مختلف کھانوں کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے لگا جو سمجھ سے بالا تھیں۔ اس کے انداز میں اس قدر خلوص اور اپنائیت تھی کہ انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ پھر بھی ہم اتنے بہت سے کھانے تو نہیں کھا سکتے تھے۔

''ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ تو ہم سے کھانے کا بل بھی نہیں لیں گے۔''

''جی نہیں۔ یہ بے چارہ تو ویٹر ہے' مالک تو نہیں ہے اور اگر مالک بھی ہوتا تو ہمیں مفت کھانا نہ کھلاتا۔''

''اور کیا'' خان صاحب بولے ''اگر گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا؟ بھوکا ہی مرے گا۔''

ہم نے کہا ''یہ خاطر داری اور بل نہ لینے کا رواج ہمارے ملک تک ہی محدود ہے۔''

ویٹر ہماری باتیں خاموش کھڑا سن رہا تھا۔

''بھئی اس کو آرڈر تو دو۔''

''مگر کیا آرڈر دیں؟''

بٹ صاحب کو فوراً ترکیب سوجھ گئی ''انکل بٹکل والا کھیل یاد ہے نا؟ بس اسی کے ذریعے کھانے کا نمبر نکال لیتے ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر انکل بٹکل کرتے ہوئے اچھے لگو گے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے؟''

''دیکھنے والوں کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔''

بہر حال اندازے سے کھانے کا آرڈر دے دیا گیا۔

ویٹر نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور اپنی زبان میں بہت سی باتیں کیں۔ خلاصہ اس گفتگو کا غالباً یہ تھا کہ ''آپ نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ آپ ٹرکش کھانے کھا کر خوش ہو جائیں گے۔''

ہم کو ترکی کے کھانوں کا تجربہ تھا۔ سچ پوچھیے تو ذائقے کے اعتبار سے یہ ہمارے کھانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

مرچ مسالہ بھی ان میں استعمال ہوتا ہے مگر بہت کم۔ البتہ شوقین حضرات کے لیے میز پر سرکہ میں بھیگی ہوئی ہری مرچیں اور چٹنیاں رکھ دی جاتی ہیں کہ جتنا چاہو مرچ مسالہ استعمال کرو۔

ترکی کھانے انتہائی لذیذ ہوتے ہیں اور ہم لوگوں کے ذوق کے مطابق بھی ہیں۔ حلال وحرام کا یہاں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ گوشت سو فیصد حلال ہی استعمال ہوتا ہے۔ یورپین ریستورانوں میں انگریزی کھانے فراہم کیے جاتے ہیں' جن میں حرام گوشت بھی شامل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حرام کھانے والوں کو حرام کھلانے میں ہرج بھی کیا ہے جبکہ سیاحوں کی اکثریت انگریزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب وہ ترکی کھانے چکھ لیتے ہیں تو پھر ایسا چسکا پڑتا ہے کہ بڑے ذوق وشوق سے کھاتے ہیں، جیسے کہ ہمارے پاکستانی کھانے یورپ اور امریکا میں بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ گورے اور گوریاں ''سوسو'' کرتے جاتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ٹشو سے ناک صاف کرتے جا رہے ہیں' پیشانی پر پسینا ہے لیکن مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ یہی صورت حال ترکی کھانوں سے متعلق بھی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ترکی کھانوں میں مرچ مسالہ کم ہوتا ہے۔

یہاں زیتون کے تیل کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ سبزیاں بھون کر اور تل کر پکائی جاتی ہیں۔ پلاؤ وغیرہ ہماری ہی طرح کا ہوتا ہے — ایک خاص چیز یہ ہے کہ یہ سبزیوں کے اندر مختلف سبزیاں اور قیمہ بھر کر انہیں تلتے ہیں اور یہ اس قدر خوش ذائقہ ہوتے ہیں کہ کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہے مگر جی نہیں بھرتا۔ مثلاً بڑے سے بینگن کے اندر بہت سی چیزیں بھر کر ابالتے اور تلتے ہیں۔ آلو بھی اسی طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹرش کباب مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور ان کا لطف بیان سے باہر ہے۔ چپاتی اور روٹی بھی استعمال ہوتی ہے مگر یہ گھروں میں نہیں بنائی جاتی۔ کھانا یہاں مہنگا نہیں ہے۔ چلتے پھرتے مختلف مقامات پر صاف ستھرے کاؤنٹر سے کباب روٹی میں بھروالیں اور ایک کوک کا ڈبا لے لیں تو بہت سستا اور مزے دار کھانا کھا لیتے ہیں۔ درمیانہ درجے کی ریستورانوں اور ہوٹلوں میں بھی کھانا زیادہ مہنگا نہیں ہے بشرطیکہ آپ ترکی لیرا میں حساب نہ لگائیں ورنہ یقیناً بے ہوش ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بل عموماً امریکی ڈالر کے حساب سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ترکی لیرا میں بھی رقم لکھ دی جاتی ہے۔ یورپ کی طرح یہاں بھی ہر چیز کا بل اور رسید باقاعدگی سے دی جاتی ہے۔ یہ شرف غالباً ہمارے ہی ملک کو حاصل ہے کہ اکثر جگہوں پر نہ بل اور نہ رسید۔ یہی وجہ ہے کہ اربوں روپے ٹیکس میں بچا لیے جاتے ہیں جس کا نقصان غریب عوام اور ملک کو ہوتا ہے مگر ہمارے دکان داروں اور تاجروں کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ خود غرضی' مفاد پرستی اور ناجائز منافع خوری ہماری رگ رگ میں سما چکی ہے۔ ان خرابیوں کو کیسے دور کریں اور کون یہ فریضہ ادا کرے' بس کسی معجزے ہی کا انتظار کر سکتے ہیں۔

غیوب (یا غیور) جو بھی کھانا لے کر آیا بہت مزے دار تھا۔ سبزیوں کی کثرت تھی۔ صرف پلاؤ میں گوشت نظر آیا۔ خوب پیٹ بھر کر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کھایا۔

''مسلمان ملک میں آنے کا فائدہ دیکھا؟'' بٹ صاحب نے کھانا کھاتے ہوئے فرمایا۔

''کیا؟''

''یہاں ہم مزے دار کھانا پیٹ بھر کر اور کسی ڈر کے بغیر کھا سکتے ہیں۔''

کھانے کے ساتھ ہم نے کوک منگائی۔ ویٹر یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنی زبان میں کچھ کہتا ہوا چلا گیا۔ جس میں ''مسلم'' کا لفظ بار بار استعمال ہو رہا تھا۔ غالباً وہ اس بات پر خوش تھا کہ ہم مسلمان ہیں اس لیے شراب وغیرہ نہیں پیتے کرتے ہیں۔

کھانے کے بعد کافی آئی اور اس کے بعد بل بھی آ گیا۔ بہت بڑی رقم تھی لیکن شکر ہے کہ ڈالرز میں بھی رقم درج تھی۔

بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ ویٹر کو بہت زیادہ ٹپ دی جائے' کیونکہ وہ ہمارا مسلمان بھائی ہے۔

''کیوں نہ اسے ڈبل بل دے دیا جائے۔ یعنی بل کے مساوی رقم ٹپ میں دے دی جائے؟''

خان صاحب نے چار ڈالر کا بجٹ منظور کیا۔ جب چار ڈالر ویٹر کو دیے گئے تو اس نے شکریہ ادا کرکے صاف انکار کر دیا۔ ایک لمبی تقریر کر دی جس کا خلاصہ ہم نے یہ نکالا کہ پاکستان کے مسلم بھائیوں کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ٹپ دے کر شرمندہ نہ کریں۔

ہم لوگ ریستوران سے بہت خوش ہو کر باہر نکلے۔

استنبول کے بارے میں ہم نے جو پمفلٹ دیکھے تھے' ان میں سوشل سرگرمیوں کی بہتات تھی۔ یہ ایک سیکولر اور ترقی پسند ملک ہے' اس لیے ہر طرح کی تفریح بلا روک ٹوک یہاں میسر ہے۔ نائٹ کلب بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کیبرے رقص بھی ہوتے ہیں۔ میوزک اور ڈانس کے پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ ساحل کے کنارے واقع ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بہت زیادہ محفل آرائی ہوتی ہے۔ بار ہر جگہ موجود ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے یہ یورپ والوں کو اپنا ہی شہر لگتا ہے۔

ترکی کو اگر جزیرہ نہیں تو جزیرہ نما ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے تین اطراف سمندر ہے۔ ایک جانب خشکی ہے جو اسے یورپ سے ملاتی ہے۔ ساحلِ سمندر بہت خوبصورت اور آراستہ ہیں۔ سمندر کا پانی صاف شفاف اور نیلا ہے۔ کشتیاں، بجرے' بحری جہاز ہر وقت پانی میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ استنبول میں گھومتے پھرتے ہوئے کہیں نہ کہیں سمندر کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے۔ رات کے وقت کشتیوں اور جہازوں کی روشنیاں اور ساحلوں پر روشنیوں کی چمک دمک کی وجہ سے ایک طلسماتی منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ ترکی کے ہر شہر کے اردگرد سمندر ضرور ہے۔

استنبول میں اور سارے ترکی میں سڑکوں کا نظام بہت عمدہ ہے اور سڑکیں بھی یورپ کے مانند ہیں۔ شہر میں بہت اچھی بسیں، ٹرام کاریں اور ٹیکسیاں ٹرانسپورٹ کا بہت اچھا اور سستا ذریعہ ہیں۔ یہاں رکشے' گدھا گاڑی' رکشا وغیرہ نظر نہیں آتے۔ موٹر سائیکلیں اور اسکوٹر ضرور ہیں، مگر بہت کم۔

ترک یوں تو مجموعی طور پر بہت دوستانہ مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ بہت جلد تکلف ہو جاتے ہیں۔ غرور یا داری کا عنصر اس قوم میں نظر نہیں آتا۔ البتہ ''فخر'' ایک ایسی علت ہے جو کہ ترکوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جسے انگریزی میں پرائڈ Pride کہتے ہیں۔ انہیں اپنی ہر چیز پر فخر ہے۔ احساسِ کمتری اور ترک دو متضاد چیزیں ہیں۔ انگریزی سے ناواقفیت پر انہیں ذرا بھی احساسِ ندامت نہیں ہے۔ اپنی زبان پر بھی وہ فخر کرتے ہیں۔ اخبارات زیادہ تر ترکی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ سائن بورڈ وغیرہ بھی ترکی میں ہی لکھے جاتے ہیں لیکن سیاحوں کی سہولت کے لیے انگریزی بھی لکھ دی جاتی ہے۔

ترکوں کی دوستی بہت لطف انگیز ہے لیکن پاکستانیوں کے ساتھ تو انہیں بہت زیادہ محبت ہے۔ بلکہ عقیدت کہنا زیادہ درست ہوگا۔ وہ ''پ'' کی جگہ ''ب'' استعمال کرتے ہیں اس لیے پاکستان کو ''باکستان'' کہتے ہیں۔ پاکستانیوں سے مل کر ان کے چہرے چمک اٹھتے ہیں۔ ''پاکستان' مسلم گردیش'' گردیش ترکی زبان میں دوست کو کہتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا اور محسوس کیا کہ ہم سے مل کر وہ نہال ہو جاتے ہیں۔ عقیدت داری جاتے ہیں۔ مہدی حسن کے گانے کے مطابق ہم یہ کہتے نظر آتے ہیں۔ ''اپنی جاں نذر کروں' اپنی وفا پیش کروں۔''

اس روز استنبول کی کچھ سیر ہم نے پیدل کی۔ کچھ ٹرام' بسوں اور ٹیکسیوں کے ذریعے کی۔ ہر شکل میں بہت لطف آیا۔ دکانیں' اسٹور' ریستوران' ہوٹل بھی صاف ستھرے اور مغربی انداز کے لیکن ہمارے اندازے کے مطابق یہاں کپڑے اور جوتے وغیرہ قدرے مہنگے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے پاکستان کے مقابلے میں۔

بٹ صاحب اور خان صاحب یادگار کے طور پر یہاں سے کچھ خریدنا چاہتے تھے۔ کپڑے بہت مہنگے تھے۔ سامان آرائش بھی کافی قیمتی تھا۔ جوتوں میں البتہ قیمتیں کم نظر آئیں۔ ترکی میں جوتے بہت عمدہ بنتے ہیں۔ معقول قیمت پر اچھے جوتے بھی مل جاتے ہیں۔

بہت غور وخوض کے بعد بٹ صاحب نے جوتے خریدنے کا فیصلہ کیا اور دو جوڑے خرید لیے۔ ایک اپنے لیے اور ایک اپنی بیگم کے لیے۔

ہم نے پوچھا ''آپ کو ان کے پیر کا سائز معلوم ہے؟''

وہ ناراض ہو گئے ''کمال کرتے ہیں آپ۔ وہ میری بیوی ہے آخر۔ مجھے اس کے پیر کا سائز نہیں معلوم ہوگا؟''

ہم تو چپ ہو گئے مگر خان صاحب نے پوچھ لیا ''بتاؤ' کیا سائز ہے ان کے جوتے کا؟''

بولے ''یہی جو میں نے خریدا ہے۔''

''مگر کوئی نمبر تو ہوگا؟''

بولے ''مجھے نمبر یاد نہیں رہتے۔''

''تو پھر کس حساب سے آپ نے جوتا خرید لیا؟''

کہنے لگے ''میری بیوی کا پیر مجھ سے دو نمبر چھوٹا ہے۔ بس یہی حساب ہے۔''

ہم نے کہا ''بٹ صاحب! ہر جگہ جوتوں کے نمبروں میں فرق ہوتا ہے۔''

کہنے لگے ''آفاقی صاحب' آپ بھی کیسی بے وقوفی کی باتیں کرنے لگے ہیں۔''

ہم نے کہا ''آپ دونوں کی صحبت میں جو رہتے ہیں۔''

کہنے لگے ''جس نمبر کا جوتا مجھے فٹ آتا ہے' اس سے دو نمبر کم کا جوتا میری بیوی کے لیے موزوں ہے۔ بس یہ حساب ہے۔''

خان صاحب بولے ''بٹ صاحب' آپ کو یہ جوتے کتنے میں پڑے؟''

انہوں نے سادگی سے بل دیکھ کر رقم بتا دی۔

''پھر تو سستے جوتے پڑ گئے۔''

ہم ہنسنے لگے تو کچھ دیر بعد بٹ صاحب کو بھی احساس ہوا

کہ ان پر فقرہ چست کیا گیا ہے۔

وہ بھی ہنسنے لگے۔ ''اول نمبر کے فراڈ ہو'' یہ ان کے پیار کی انتہا تھی۔

کھوم پھر کر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

ہم نے دیکھا کہ بٹ صاحب کا ''لاحول'' پڑھنے کا اوسط بہت کم تھا حالانکہ لاحول پڑھنے کے تمام اسباب موجود تھے۔

ہوٹل پہنچ کر لابی میں بیٹھے تو خان صاحب وہیں چپک کر رہ گئے۔

''بس۔ کچھ دیر یہیں ستائیں گے۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ میموں کو دیکھو گے۔''

''یار! میموں کو بھی دیکھ لیں گے' میری آنکھوں میں کوئی ایسا آلہ تو نہیں لگا ہے۔ جس سے میں صرف غیر میموں کو ہی دیکھوں' میمیں نظر ہی نہ آئیں۔''

ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا ''بٹ جی' آج آپ کی لاحول پڑھنے کی شرح بہت کم رہی؟''

بولے ''آخر ہمارا بر اور اسلامی ملک ہے۔''

خان صاحب جل کر بولے ''مگر میموں کی ٹانگیں اور بے ہودہ ننگے لباس تو یہاں بھی ہیں۔''

اطمینان سے کہنے لگے ''اس کی خیر ہے۔ اینوں کو کچھ رعایت تو دینی ہی پڑتی ہے۔''

خان صاحب کا خیال تھا کہ اب بٹ صاحب بھی ان چیزوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔

ہوٹل کے صوفے پر بیٹھتے ہی بٹ صاحب کو حضرت ایوب انصاریؓ کے روضے کا خیال آ گیا۔

''دیکھیے' صاف سن لیجئے' اب ہم سب سے پہلے حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر جائیں گے۔''

ان کا مطالبہ بہت معقول تھا اس لیے فوراً قبول کر لیا گیا۔

خان صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کہاں چلے؟''

''استقبالیہ والی لڑکی سے پوچھتا ہوں کہ حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار تک جانے کا کیا طریقہ ہے اور وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

ہم نے کہا ''اگر محض یہی ارادہ ہے تو چپکے سے بیٹھ جائیے' ہمیں سب معلوم ہے۔''

بولے ''کیا ہرج ہے اگر تفصیل پتا چل جائے اور پھر ذرا ٹانگیں بھی سیدھی کر لوں گا۔''

''یہ کہو کہ ٹانگیں دیکھ لوں گا۔'' بٹ صاحب چپ نہ رہ سکے مگر خان صاحب ان کا یہ جملہ سننے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئے' ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ استقبالیہ پر موجود خاتون سے بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ واپس آئے تو ایک پمفلٹ ان کے پاس تھا۔

''یہ لیجئے' ساری معلومات اس میں درج ہیں۔''

ہم نے کہا ''پمفلٹ اٹھانے میں تو ایک منٹ لگتا ہے۔ آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

بولے ''یار! اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کچھ تمہید تو باندھنی ہی پڑتی ہے۔''

بٹ صاحب نے ان کی بات کو نظر انداز کر کے فوراً پمفلٹ اٹھا لیا۔ رنگین چھپا ہوا پمفلٹ تھا۔ اس میں تمام معلومات تفصیل سے درج تھیں۔ حضرتؓ کے روضے کی تصویر بھی اس پر چھپی ہوئی تھی۔

ہم نے کہا ''پمفلٹ پڑھنے کی تکلیف نہ کریں۔ ہم کل صبح آپ کو وہاں لے جائیں گے۔''

رات کا کھانا ہم نے برابر والے ایک شے ورما کے کاؤنٹر سے خرید کر کھایا۔ ڈونر کباب اور ٹرکش کباب بہت مزے دار تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے کھا گئے۔ بقول خان صاحب اس کا لطف مزید دوبالا ہو گیا تھا کہ کھاتے تقسیم چوک کے نزدیک ہی تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور رونق تھی۔ خان صاحب کو یہ انداز بہت پسند آیا۔

کہنے لگے ''میرا خیال ہے کہ ریستوران کے مقابلے میں یہ سسٹم بہت اچھا ہے۔ سستا بھی ہے اور مزیدار بھی۔''

''اس کے علاوہ آپ کی دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔'' بٹ صاحب نے کہا۔

''ہاں' یہ بھی ہے۔ ایک نکتہ کی دو مزے ہیں'' خان صاحب ڈھٹائی سے بولے۔

رات گئے سب اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ صبح نو بجے تیار ہو کر ڈائننگ ہال میں ملنے کا پروگرام طے پایا۔

یورپ کے شہروں کے مقابلے میں استنبول میں ناشتا بھی ہر قسم کا دستیاب ہے اور بہت مزے دار ہوتا ہے۔ ہم نے تو ٹرکش کباب ہی پر گزارا کیا۔ ایک ابلا ہوا انڈا بھی کھا لیا۔ یہ بوفے بریک فاسٹ تھا اس لیے ہر قسم کی چیزوں کی فراوانی تھی ورنہ مشکل پڑ جاتی۔ مثلاً ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور ناشتا طلب کیا تو کسی کی سمجھ میں ہماری بات ہی نہ آئی۔ ابلا ہوا انڈا۔ آملیٹ' ٹوسٹ' مکھن' جوس کے بارے میں سمجھانا مشکل ہو گیا تھا۔

خان صاحب خاصے خوش خوراک ہیں۔ بٹ صاحب اس کم نہیں ہیں۔

ہم سے کہنے لگے ''خوب پیٹ بھر کر کھا لیں۔''

''کیوں؟'' ہم نے پوچھا ''کیا اس کے بعد کھانا نہیں ملے گا۔''

''یار سمجھا کرو۔ جب اللہ میاں نے ناشتے میں ہی لنچ کا بھی بندوبست کر دیا ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہو گا۔''

ہم نے کہا ''بھائی' آپ سچ کہتے ہیں مگر ہر شخص اپنے ظرف اور اوقات کے مطابق ہی کھا سکتا ہے۔ ہاں' یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بریف کیس میں رکھ کر لنچ کے لیے بھی ساتھ لے جائیں۔''

''خبردار' یہ چوری اور دھوکا دہی ہو گی۔ کم از کم ترکی جیسے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ایسی حرکت کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

ناشتا تو معمول کے مطابق ناشتا کیا تھا لیکن خان صاحب اور بٹ صاحب نے اس قدر بے حلق ہو کر کھایا تھا کہ اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نے مشورہ دیا کہ ''فوری طور پر بابل قدمی کیجئے تاکہ جو کچھ کھایا ہے وہ پیٹ میں بیٹھ جائے۔''

بٹ صاحب سر پیٹ کر بولے ''غلطی ہو گئی۔ لاہور سے آتے وقت نمک سلیمانی رکھنا بھول گئے۔ لکڑ ہضم پتھر ہضم چیز ہے اور آزمودہ ہے۔''

خان صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا ''آپ نے کتنی بار اور لکڑیاں کھانے کے بعد نمک سلیمانی سے ہضم کیے ہیں؟''

ہم نے کہا ''بہتر ہے کہ ہم لوگ کچھ دور پیدل ہی چلیں تاکہ حضرت ایوب انصاریؓ کے روضے تک پاپیادہ چلیں تاکہ ثواب بھی دگنا ہو جائے۔''

''جیسے شہنشاہ اکبر بیٹے کی منت ماننے کے لیے اجمیر شریف تک پاپیادہ گیا تھا؟'' بٹ صاحب نے فوراً اپنی تاریخ دانی کا ثبوت فراہم کر دیا۔

خان صاحب کی کوشش تھی کہ باہر جانے سے پہلے مس بالووہ سے (کچھ اسی قسم کا نام تھا) ضرور ملاقات کر لیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کی آنکھ بچا کر استقبالیہ پر متعین اس خوش شکل اور ہنس مکھ لڑکی سے خاصی بے تکلفی کر لی تھی۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ انہوں نے اس بے چاری کو یقیناً سٹرکی کا بھی جھانسا دیا ہے۔

''مگر اس لڑکی سے ملنے کی ضرورت کیا ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''آپ بھی میرے ساتھ آ جائیے۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

ہم دونوں ان کے ساتھ ہو لیے۔

لڑکی نے ان کا بہت خوش دلی سے مسکرا کر خیر مقدم کیا۔ وہ انگریزی بھی اچھی خاصی بولتی تھی۔ بٹ صاحب کے خیال میں وہ خان صاحب سے زیادہ اچھی انگریزی بولتی تھی۔

ہیلو ہیلو کے بعد خان صاحب نے کہا ''مس عالووہ! ہم دراصل آج حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں' آپ ہمیں وہاں تک پہنچنے کا آسان اور سستا طریقہ بتا سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں'' وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''یہ تو میرا فرض ہے۔ دیکھیے' ان کا روضہ استنبول کے مغربی علاقے میں واقع ہے۔ اس کو ایوب سلطان کا ڈسٹرکٹ کہتے ہیں۔ یہ علاقہ حضرت ایوبؓ ہی کے نام سے منسوب ہے۔''

''بہت خوب'' بٹ صاحب نے اردو میں کہا ''جیسے لاہور میں داتا گنج بخشؒ کے مزار کا علاقہ داتا صاحب کے نام سے مشہور ہے۔''

''جی' مجھ سے کچھ کہا؟'' لڑکی نے اخلاقاً مسکرا کر پوچھا۔

''جی نہیں۔ یہ دراصل ہمارے پاکستان کے ایک بہت بڑے ولی کے مزار کا تذکرہ کر رہے ہیں۔''

''کیا آپ کے پاکستان میں بھی ولی ہوتے ہیں؟''

''پہلے ہوتے تھے۔ اب تو ان کے مزار اور برکات ہی رہ گئی ہیں۔''

''ٹھیک کہا آپ نے'' اس نے سنجیدگی سے کہا ''اب تو دنیا میں ولی پیدا ہونے ہی بند ہو گئے ہیں۔ کہیں بھی کوئی ولی نہیں ہوتا۔''

ہم نے کہا ''مگر نبی بہت سے پیدا ہونے لگے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں ہر سال چند لوگ نبی ہونے کا اعلان کرتے رہتے ہیں اور ایک صاحب تو مستقل نبی بن چکے ہیں جن کے ورثا آج کل نبوت کر رہے ہیں۔''

وہ حیران رہ گئی ''کیا مطلب' یعنی کوئی شخص خود بخود نبی بن گیا۔ اور اس کا سارا خاندان بھی نبی بن گیا؟''

ہم نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے مختصر طور پر قادیانیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی پھر بولی ''دنیا میں کیسے کیسے عجیب واقعات ہونے لگے ہیں۔''

حضرت ایوب انصاریؓ کے روضے تک جانے کے بارے میں اس نے کہا کہ آپ بس سے بھی وہاں جا سکتے ہیں۔ (بس کا نمبر ہمیں یاد نہیں رہا) ٹیکسی بھی لے سکتے ہیں اور

ڈولموں سے بھی جاسکتے ہیں۔''

''ڈولموں! وہ کیا چیز ہے؟''

وہ ہنسنے لگی' کہنے لگی'' یہاں یہ طریقہ ہے کہ اگر آپ مکمل ٹیکسی نہ کرنا چاہیں تو دوسرے مسافروں کے ساتھ مل کر کرایہ بانٹ لیتے ہیں۔ ترکی زبان میں اس کو ڈولموں کہا جاتا ہے۔''

ہمیں یاد آیا کہ ایران میں بھی یہی دستور ہے کہ ایک ٹیکسی میں چار مسافر سوار ہوجاتے ہیں اور کرایہ آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔ ہم نے اسلامی انقلاب کے بعد بھی تہران میں یہ طریقہ رواج استعمال دیکھا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ مرد اور عورتیں بلا جھجک ایک ہی ٹیکسی میں سوار ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ خواتین حجاب اور لمبے کوٹ میں ملبوس ہوتی ہیں۔ چہرہ ڈھانپنے کا وہاں رواج نہیں ہے۔ جینز اور پتلون کے اوپر پوری آستین کا کوٹ یا عبا ہوتا ہے۔ چہرے اور سر پر حجاب ہوتا ہے۔ بعض خواتین تو ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرلیتی ہیں۔ (یہ 1987ء کی بات ہے) اس لباس کے اندر وہ جدید ترین فیشن کے مغربی ملبوسات پہنتی ہیں اور دفتر یا کام کی جگہ پہنچ کر کوٹ اور حجاب اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیتی ہیں۔ اندر سے اسکرٹ میں ملبوس ایک مکمل مغربی خاتون برآمد ہوجاتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ اور کام کرنے والی فیشن ایبل خواتین کا دستور ہے۔ عام خواتین ایسا نہیں کرتیں۔ ایران میں حجاب اور پردے کی اتنی سخت پابندی ہے (اس وقت تھی) کہ غیر ملکی اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی حجاب اور پردے کے دوسرے لوازمات کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

ہم یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلے تو بٹ صاحب بڑبڑا رہے تھے۔'' یہ کون سی معلومات ہیں۔ ٹیکسی والا بھی ہمیں وہاں پہنچا دیتا۔''

''تم تو جاہل ہو'' خان صاحب نے کہا'' آپ کو ڈولموس کے بارے میں پتا تھا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر ایک نئی بات معلوم ہوگئی نا۔ بھائی' انسان اسی طرح سیکھتا اور علم حاصل کرتا ہے۔ اگر پوچھیں گے نہیں تو معلومات کیسے حاصل کریں گے؟''

خان صاحب کا مشورہ تھا کہ ہمیں ڈولموس کے ذریعے چلنا چاہیے۔

''مگر ڈولموس ڈھونڈیں گے کہاں؟ کیا ہر ٹیکسی والے کو روک کر پوچھیں گے کہ بھائی' آپ ڈولموس تو نہیں ہیں؟''

خان صاحب نے کہا'' آسان بات ہے۔ جس ٹیکسی میں مختلف لوگ سوار ہوتے نظر آئیں یقیناً وہی ڈولموس ہوگی۔ یا پھر ہم کسی بھی ٹیکسی والے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم پوری ٹیکسی کے بجائے ڈولموس کے ذریعے جانا چاہتے ہیں۔''

ہم نے کہا'' ہم تین مسافر ہیں' صرف ایک اضافی مسافر کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''بھائی! یہ کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھنے کے چکر میں ہیں سمجھا کرو'' بٹ صاحب نے راز فاش کردیا۔

بہرحال ڈولموس کا ارادہ منسوخ کرکے ٹیکسی کے ذریعے جانے کا فیصلہ ہوا۔

''کیوں نہ ہم بس کے ذریعے چلیں؟'' خان صاحب نے مشورہ پیش کیا۔

''دیکھو خان صاحب! خدا کا خوف کرو۔ ہم اللہ کے ایک نیک بندے کے مزار پر جارہے ہیں مگر آپ عورتوں کی تاکنے سے باز نہیں آتے۔''

خان صاحب کچھ شرمندہ اور لاجواب سے ہوگئے۔

حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کا پتا استنبول میں کسی بھی شخص سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اگر بس کے ذریعے جانا چاہیں تو بس نمبر بھی ہر کوئی بتادے گا۔ خاتا کہ ترکی کے لوگ سیکولر ہوگئے ہیں مگر حضرت ایوب انصاریؓ کی عقیدت کے معاملے میں سب پکے مسلمان ہیں۔

حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار ایک پہاڑی پر ہے۔ یہ دراصل ایک بہت وسیع اور خوبصورت بڑے قبرستان کا حصہ ہے جس کے اندر مزار ہے۔ اس مسجد کے مینار دور ہی سے نظر آجاتے ہیں۔ یہ مسجد اور اطراف کی عمارتیں سلطان محمود دوم نے تعمیر کرائی تھیں۔ 1459ء میں استنبول کی فتح کے چھ سال بعد یہ مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ یہاں پہلے بھی ایک پرانی مسجد تھی لیکن ایک زلزلے کی وجہ سے وہ شہید ہوگئی تھی۔ موجودہ مسجد بھی اس قدر پرانی ہے کہ اسے استنبول کی قدیم ترین مسجد کہا جاسکتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر قدیم طرز کی ہے۔ استنبول کی دوسری مساجد سے مختلف طرز کی بھی ہے۔ استنبول میں آرکیٹکٹ حضرات نے جن مساجد کے نقشے بنائے تھے' وہ نہایت شاندار' پُرشکوہ اور قابلِ دید ہیں۔ ان کا طرزِ تعمیر بھی قدرے مختلف ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابی تھے۔ اپنی والدہ محترمہ کی طرف سے ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتے داری بھی تھی۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد لگ بھگ سات ماہ تک حضرت ایوب انصاریؓ کے مہمان رہے تھے۔ اس کے بعد مسجد نبویؐ میں منتقل ہوگئے تھے۔

حضرت ایوب انصاریؓ کا اصلی نام خالد بن زید تھا۔ کہتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ کی خاطر انہوں نے اپنے خاندان اور آلِ اولاد کو ترک کرکے بازنطینی دور میں مختلف علاقوں کا دورہ کیا جہاں وہ اسلام کا پیغام پہنچانے کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی تبلیغ دین کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ بازنطینی حکومت کا زمانہ تھا جو پورے جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور ان کا بہت اثر اور رسوخ تھا۔

استنبول اور ترکی میں حضرت ایوب انصاریؓ شام سے ہوکر پہنچے تھے۔ شام میں یرموک کے مقام پر عربوں اور بازنطینی افواج کے مابین 632 عیسوی میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی جس میں عربوں نے بازنطینی فوج کو شکست سے دوچار کردیا تھا۔

عربوں کا دورِ عروج شروع ہوا تو انہوں نے دنیا کی بہت بڑی بڑی حکومتوں کو تہس نہس کردیا۔ مسلمان عربوں کا رُخ جس طرف کارخ کرتا تھا' فتح وکامرانی ان کے قدم چومتی تھی۔ اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ مسلمان ناقابلِ تسخیر ہیں۔ جہاد پر ایمانی ان کی سب سے بڑی قوت تھی۔ وہ ایک ایسے جذبے اور ولولے سے سرشار تھے کہ قیصر وکسریٰ کی بے پناہ قوت بھی ان کے سامنے خس وخاشاک کے مانند بکھر کر رہ جاتی تھی۔ رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد اسلام کی فتوحات کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تھا' جس کی تاریخ میں مشکل سے ہی مثال ملتی ہے۔ یہ منگولوں کی طرح اجڈ' وحشی اور خونخوار نہ تھے۔ اسلامی لشکر شہریوں' خواتین' بچوں اور بوڑھوں کو فتح کے بعد مکمل تحفظ فراہم کرتا تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ بھی انصاف روا رکھا جاتا تھا۔ قتل وغارت اور تباہی وبربادی ان کا شیوہ نہ تھا۔

اسلامی لشکر کا سیلاب رواں 678-674 عیسوی میں قسطنطنیہ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ قسطنطنیہ کا جب مسلمانوں نے پہلی بار محاصرہ کیا تھا' حضرت ایوب انصاریؓ اس لشکر کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے جنگ میں بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ اسی دوران میں وہ وفات پاگئے لیکن کسی غزوے میں ان کی وفات نہیں ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ وہ ضعیف العمری اور بیماری کی وجہ سے انتقال کرگئے تھے۔

اس وقت تک مسلمانوں نے قسطنطنیہ کو فتح نہیں کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ انہیں قلعہ کی فصیل کے نزدیک ہی دفن کردیا گیا تھا کیونکہ قسطنطنیہ پر بازنطینی قابض تھے۔ اس دور میں بھی ان کا مزار مرجع خاص وعام بن گیا تھا اور دور دور سے لوگ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور زیارت کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بازنطینی بھی اپنی مشکلات کے حل کے لیے مزار پر آکر دعائیں مانگتے تھے۔ اگر بارش کی وجہ سے خشک سالی اور قحط کی صورت حال پیدا ہوجاتی تھی تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی بازنطینی لوگ حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر جاکر دعائیں مانگتے تھے۔

یہ ایک دلچسپ سی بات ہے کہ مسلمان اولیائے کرامؒ اور بزرگ ہستیوں کے مزاروں پر مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی جاکر فریاد کرتے ہیں اور دادرسی کی درخواست کرتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہم نے اپنے بچپن میں اپنی آنکھوں سے ہندوؤں کو جوق در جوق مسلمان اولیائے کرامؒ کے مزاروں پر جاکر روتے' گڑگڑاتے اور منتیں مانتے دیکھا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ' بابا فرید گنج شکرؒ اور داتا صاحبؒ کے علاوہ ہر بزرگ کے مزار پر ہندو اور دوسرے غیر مسلم چڑھاوے چڑھاتے اور نذرانے پیش کرتے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے دعا بھی کرتے ہیں۔ غیر مسلموں میں اس رجحان کا ایک سبب ان کا ضعیف الاعتقاد ہونا بھی ہے۔ وہ کسی ایک خدا پر تو یقین رکھتے نہیں' کئی مذاہب میں جس طرح راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اپنے دین اور اللہ پر پختہ ایمان ہوتا ہے' غیر مسلموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مطلب براری کے لیے ہر در وازے اور آستانے پر چلے جاتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں تو ان کی سن لی جائے گی۔ ہم مسلمانوں میں بھی ضعیف العقیدہ لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ پیر فقیر' عامل' جادوگر ہر ایک کے پاس جاکر اپنی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنتی پیروں کی بہتات ہے جو دونوں ہاتھوں سے اپنے'' مریدوں'' کو لوٹتے ہیں اور بعض اوقات تو عزت آبرو بھی لوٹ لیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں مگر جہالت اور کم عقیدگی کی وجہ سے لوگ پھر بھی مختلف چکروں پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ بہرحال' اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔

بازنطینی حکومت کے دور میں حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار ملبے تلے دب کر غائب ہوگیا تھا۔ محاصرے کے دوران میں انہوں نے وفات پائی تھی۔ انہیں قلعے کے نزدیک ہی دفن کردیا گیا اور مسلمان لشکر بے نیل ومرام واپس لوٹ گیا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ حضرت ایوب انصاریؓ کی قبر ہی ایک دن فتح قسطنطنیہ کا سنگ بنیاد بنے گی۔

بازنطینی دور حکومت کے خاتمے کے بعد اس علاقے کی کھدائی کے دوران میں ایک کتبہ نما پتھر برآمد ہوا تھا جس پر

کوفی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا کہ ایوب انصاریؓ اس جگہ مدفون ہیں۔ ہمیں مسجد کے نگراں حضرات نے بتایا کہ اس وقت جس جگہ مسجد اور روضہ ہے' اس کے نزدیک ہی یہ کتبہ یا پتھر دریافت ہوا تھا۔ روضے سے اس جگہ کا فاصلہ چند فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اب یہ جگہ مسجد کے صحن میں شامل ہے۔

یہ کہانی ہم لوگوں نے استنبول میں سنی تھی لیکن بعد میں مطالعے کے دوران میں معلوم ہوا کہ بعض محققین نے اس واقعے کو غلط قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 1143 عیسوی میں بازنطینی حکمراں مینیئل اول کے عہد میں ایک عرب سیاح نے اس جگہ کا سراغ لگایا تھا جس کے بعد زمین کی کھدائی کی گئی اور حضرت ایوبؓ کی قبر دریافت کی گئی۔

ہوٹل میں ہماری ملاقات ایک بزرگ لبنانی سے ہوئی جو سالہا سال سے استنبول میں مقیم تھے اور انہوں نے ایک ترک خاتون سے شادی کر لی تھی۔

اس لحاظ سے وہ بھی ترک ہی ہو گئے تھے۔ ان کی بیوی بچے بھی استنبول ہی میں رہتے تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں یہ صاحب ہمیں تنہا بیٹھے ترکی قہوے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ترکی قہوہ نوش جان کرنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ترکی قہوہ بہت گاڑھا اور سیاہ سیال کے مانند ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس میں دودھ اور چینی ڈالنے کا تکلف نہیں کرتے بس اسی تلخ مشروب کو گھونٹ گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے زیادہ لذیذ مشروب اور کوئی نہیں ہوتا۔

ان صاحب سے ہماری ملاقات کا بہانہ یہ بنا کہ وہ قہوہ پینے کے ساتھ ساتھ ایک انگریزی اخبار کا مطالعہ بھی فرما رہے تھے۔ ان کے سر اور مونچھوں کے بال برف کے مانند سفید تھے۔ داڑھی صفاچٹ تھی۔ گورے چٹے اور صحت مند شاندار آدمی تھے۔ پہلی نظر میں انہیں دیکھ کر ان پر کسی ترک کا گمان گزرتا تھا۔ ادھر ہم لوگوں کی یہ حالت تھی کہ..... زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم..... کے باعث گونگوں بہروں کی طرح پھرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی انگریزی بولنے والا یا بولنے والی مل جاتی تو اپنی خوش بختی پر رشک کرتے اور اس کو گھیر کر بیٹھ جاتے۔

سب سے پہلے بٹ صاحب کی نظر انگریزی اخبار پر اور پھر ان بزرگ پر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے ''وہ دیکھیں' سامنے.....''

ہم نے سامنے دیکھا مگر کوئی قابلِ ذکر چیز نظر نہ آئی۔

کہنے لگے ''ان بڑے میاں کو دیکھیے۔''

ہمارے ملک میں بڑے میاں کا خطاب پانے والا انتہائی ضعیف' لاغر اور خستہ حال شخص ہوتا ہے مگر باہر کے ملکوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی بہت صحت مند اور خوش باش نظر آتے ہیں۔ بالوں کی سفیدی کے سوا ان میں بزرگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس لیے ہم نے بھی ایک ایسے ہی ''دیسی بڑے میاں'' کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔

''آپ کس بڑے میاں کی بات کر رہے ہیں؟ یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔''

بٹ صاحب جھنجلا کر بولے ''بھائی۔ وہ سامنے والی میز پر کون بیٹھا ہے؟''

دیکھا تو وہاں ایک صحت مند' خوش پوش' ماڈرن' بڑی عمر کے صاحب نظر آئے۔

''آپ کا مطلب ان صاحب سے ہے جو انگریزی اخبار پڑھ رہے ہیں؟''

''بالکل۔''

''ان میں دیکھنے والی کیا خاص بات ہے؟ ایسے لوگ تو بہت نظر آتے ہیں۔''

''بھائی' سمجھا کرو۔'' انہوں نے سمجھایا ''وہ انگریزی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی سے واقف ہیں۔ چلیں' ان کے پاس والی میز پر بیٹھتے ہیں۔ بات چیت کا بہانہ بھی مل ہی جائے گا۔''

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ بعض اوقات اپنے ہم زبان تو کیا غیر زبان بولنے والے کو دیکھ کر بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ صحیح کہا ہے روسو نے کہ ''انسان حیوانِ مجلسی ہے'' مجلس آرائی اور بات چیت کے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوتا۔

اس وقت استنبول کے اس ہوٹل میں ایک انگریزی اخبار پڑھنے والے بڑے صاحب کو دیکھ کر ہمیں بھی کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کا لطف آ گیا۔

ان کے برابر والی میز پر بیٹھ کر ہم نے کافی کا آرڈر دیا اور ویٹر سے کہا کہ دودھ اور چینی ضرور لائے۔ بلکہ ممکن ہو سکے تو بالائی یا کریم بھی لے آئے۔

یہ ویٹر انگریزی سے نابلد تھا۔ اسے دودھ چینی اور کریم کا مطلب سمجھانا بہت مشکل تھا۔ اس نے ترکی زبان میں سوالات شروع کر دیے۔ آپ نے کبھی کھیل ''ٹونٹی کوئسچنز'' یا کسوٹی کھیلا ہو گا جس میں بیس سوالوں کے اندر درست جواب مل جائے تو جواب دینے والا کامیاب قرار پاتا ہے؟

ویٹر نے ہم سے ترکی زبان میں ٹونٹی کوئسچنز کا کھیل شروع کر دیا تو وہ بزرگ متوجہ ہوئے۔ بڑی شفقت سے

مسکرائے اور پھر دیئر کو ترکی زبان میں ہمارا مطلب سمجھایا۔

دیئر تو رخصت ہوگیا۔ ہم اس بہانے ان کے پاس جا بیٹھے۔ تعارف کی رسم ادا ہوئی۔ وہ کافی دلچسپ اور پڑھے لکھے نکلے۔ استنبول اور ترکی کے بارے میں انہوں نے ہمیں بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں۔ ان کا نام ''الخرامی'' تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک لمبا سا نام تھا جو ہمیں یاد نہیں رہا۔ ہم انہیں ''الخرامی'' ہی کہتے رہے۔

انہیں بتایا کہ ہم حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کو دیکھ کر آئے ہیں۔ مزار کی دریافت کے بارے میں جو باتیں سنی تھیں وہ بھی ان کے گوش گزار کیں۔ وہ مسکرائے' مصنوعی دانتوں کے ساتھ ان کی مسکراہٹ بہت دلکش لگتی تھی۔

کہنے لگے ''حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ 1203 عیسوی کے بعد ایک عرب سیاح ذکریا القزوینی بھی یہاں آئے تھے۔ وہ بازنطینی حکومت کا زمانہ تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار میں نے بھی دیکھا ہے مگر اس کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بازنطینی لوگ بارش نہ ہونے کی وجہ سے جب قحط سالی اور خشک سالی کا شکار ہوتے ہیں تو مزار کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور بارش کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ دعا اکثر قبول ہو جاتی ہے اور خوب بارش ہوتی ہے۔''

بہرحال یہ بات طے ہے کہ حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا جب کھدائی کے دوران میں اس کے آثار ملے۔ اس کے بعد ایک مزار بھی تعمیر ہوگیا۔ الخرامی صاحب کا کہنا تھا کہ سلطان محمود دوئم کے عہد میں مزار کو اس کی موجودہ جگہ پر منتقل کیا گیا تھا۔

ہم نے روضے کا نظارہ کیا تو عجیب روحانی کیفیت طاری ہوگئی۔ روضے کے اردگرد لوہے کا جنگلا ہے۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا تناور درخت بھی ہے۔ الخرامی صاحب کے بقول یہ ایک ٹہنی تھی مگر جب اسے روضے کے احاطے میں منتقل کیا گیا تو یہ ایک بہت بڑے درخت میں تبدیل ہوگئی اور آج بھی یہ درخت موجود ہے۔

بٹ صاحب نے روضے کے نزدیک پہنچتے ہی منہ ہی منہ میں کچھ آیات پڑھیں اور پھر پانی تلاش کرنے لگے۔

''پانی کی کیا ضرورت ہے۔ سامنے والی دکان سے کوک لے آؤ۔'' خان صاحب نے مشورہ دیا۔

''جاہلوں جیسی باتیں مت کیا کرو۔ کوک سے وضو تو نہیں کیا جاسکتا۔ میں وضو کے لیے پانی تلاش کر رہا ہوں۔ ہمیں یہاں کم از کم دو رکعت نماز تو پڑھنی چاہیے۔''

مسجد کے اندر تلاش کے بعد پانی بھی دستیاب ہوگیا۔ تینوں نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ وضو کیا اور ایک طرف اس صحن میں کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھ کر حضرت کی روح کو ایصال ثواب کے لیے دعا کی۔

یہ جگہ اس وقت بھانت بھانت کے سیاحوں سے بھری پڑی تھی جن میں میموں کی اکثریت تھی۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں کیمرے ہاتھوں میں لیے مزار کی اور ایک دوسرے کی تصاویر بنانے میں مصروف تھیں۔ ہم لوگوں کو ایک گوشے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر سیاح بہت حیران ہوئے اور بڑی دلچسپی اور جستجو کے ساتھ ہمیں دیکھنے لگے۔ کچھ نے ہماری تصویریں بھی بنالیں۔

سلام پھیرا تو ایک خلقت ہمارے آس پاس جمع تھی۔ بٹ صاحب نے فوراً لاحول پڑھنی شروع کردی۔ خان صاحب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

دو خواتین ہمارے نزدیک آئیں اور پوچھنے لگیں ''معاف کیجئے' اگر برا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھیں؟''

''ضرور پوچھیے'' خان صاحب کی خوشی سے باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

''آپ لوگ یہاں کھڑے ہو کر کیا کر رہے تھے؟''

ہم نے کہا ''آپ نے دیکھا نہیں کہ ہم سجدے کر رہے تھے' بیٹھتے بھی تھے۔''

''مگر آپ ایسا کیوں کر رہے تھے؟''

ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ایک بہت بزرگ اور قابل قدر مسلمان شخصیت کا مقبرہ ہے۔ ہم لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ پھر دوبارہ آنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔ اس لیے شکرانے کی نماز پڑھ رہے تھے۔

''اوہ' آئی سی'' ان میں سے ایک خاتون بولیں ''گریٹ فل پریئر!'' (Grateful Prayer)

''یہی سمجھ لیں۔''

وہ رخصت ہونے لگیں تو خان صاحب بے اختیار ان کی طرف بڑھے مگر بٹ صاحب نے ہاتھ تھام کر انہیں روک لیا۔

''کہاں چلے یار؟ کسی جگہ تو باز آجایا کرو تم اب انہیں حضرت ایوب انصاریؓ کے بارے میں بتانے جارہے ہو۔ تمہیں خود ہی کچھ پتا نہیں ہے تو ان کو کیا بتاؤ گے؟''

خان صاحب گھور کر رہ گئے مگر کچھ بولے نہیں۔

آپ کے محبوب قلم کار کی روزگار رنگ سفرناموں کی یہ دلچسپ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ مزید حیرت آفرین واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

عظیم ترین مقابلے

تحریر: سامیہ علی

کھیلوں کی دنیا میں عموماً حیرت انگیز واقعات جنم لیتے رہتے ہیں لیکن باقاعدہ کھیلوں کا مسلسل انعقاد بالآخر ایک دن تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اولمپک کھیلوں کا آغاز اب اگرچہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اور صدیوں پرانے اس سلسلے کو ماضی کی طرح آج بھی جوش و خروش کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس کی یہی تمام تر جزئیات ہی اس تحریر کا خاصہ ہے۔

ابتدائی اولمپک کھیلوں میں فاتحین کو صرف زیتون کی ایک ٹہنی انعام میں ملتی تھی

اٹھائیسویں اولمپک کھیلوں کا آغاز یونان کے شہر اور دارالحکومت ایتھنز میں تیرہ اگست سے ہو چکا ہے اور مقابلے اٹھائیس اگست تک جاری رہیں گے۔ ''جدید اولمپکس'' کے نام سے پکارے جانے والے ان کھیلوں کا احیا ایک حوالے کے مطابق 1896ء میں یونان کے شہر ایتھنز ہی میں پہلی بار منعقد کرائے گئے مقابلوں سے ہوا تھا۔ جبکہ ایک اور خیال یہ ہے کہ ''جدید اولمپکس'' 1896ء سے پہلے چار بار یعنی 1859ء، 1870ء، 1875ء اور 1889ء میں ایتھنز ہی میں منعقد کرائے جا چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کھیلوں کو ''انٹرنیشنل اولمپک گیمز'' کے نام سے منعقد کرایا گیا تھا۔

ہر چار سال بعد منعقد ہونے والے کھیلوں کے یہ مقابلے اس سے پہلے 2000ء میں آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں منعقد

ہوئے تھے اور ان میں 199 ممالک کے 10,651 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا۔ ان مقابلوں میں صرف افغانستان کے کھلاڑی شامل نہیں ہو سکے تھے۔

اتھنز میں منعقد ہونے والے مقابلوں کے لیے پینتیس مختلف مقامات پر انتظامات کیے گئے ہیں۔ جہاں دنیا بھر کے کھلاڑی طرح طرح کے مقابلوں میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کریں گے۔ ان مقابلوں میں تیراندازی، نشانہ بازی (بندوق اور پستول سے)، گولہ پھینکنا، نیزہ پھینکنا، ڈسکس تھرو، مختلف قسم اور فاصلوں کی دوڑیں، طرح طرح کی چھلانگیں، شمشیر زنی، جوڈو کراٹے، تائی کوانڈو، ریسلنگ، باکسنگ، ہیراکی، ڈائیونگ، ٹینس، ٹیبل ٹینس، فٹ بال، فیلڈ ہاکی، ویٹ لفٹنگ، سائیکلنگ، والی بال اور جمناسٹک کے مقابلے شامل ہیں۔ ان تمام مقابلوں میں اول، دوم اور سوم آنے والوں کو سونے، چاندی اور کانسی کے تمغے دیے جاتے ہیں۔

''اولمپک گیمز'' دراصل ایک قدیم یونانی تہوار کی یاد دلاتے ہیں جو یونان کے شہر اولمپیا میں ہر چار سال بعد منعقد کیا جاتا تھا۔ اس تہوار کو بعد میں ایک مقابلے کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس میں ورزش، جسمانی کرتب، ادب اور موسیقی وغیرہ کے کمالات کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ان ہی مقابلوں کی مناسبت سے ''اولمپیاڈ'' کو بھی اہمیت حاصل ہوئی جو کہ دراصل ان مقابلوں کے درمیان کا چار سالہ وقفہ ہوتا تھا اور اس کے مطابق یونانی مختلف واقعات کی تاریخوں کا حساب رکھتے تھے۔

سیکڑوں سال قبل یونان میں شروع ہونے والے ان کھیلوں یا مقابلوں کی ابتدا ایک روایت کے مطابق اس وقت ہوئی جب ہرکولیس (یا ہیراکلس) نے ریاست ایلس کے میدانی علاقے میں ایک دوڑ جیتی۔ اس جیت کی خوشی میں ہرکولیس نے اعلان کرایا کہ یہ دوڑ ہر چار سال بعد منعقد کرائی جایا کرے۔ ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ جب زیوس (یا جیوپیٹر) نے آسمانوں پر اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے (اپنے باپ) کرونس کو شکست دی تو اس تقریب یا میلے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔

یونانی دیومالائی کہانیوں کے مطابق کرونس، جو زیوس کا باپ تھا، اپنی حکمرانی اور شہنشاہیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنی ہی ہر اولاد کو ہڑپ ہوتے ہی کھا لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی ریہا کو یہ بات سخت ناپسند تھی اور اس کی تمام تر خوشامدیں اور درخواستیں کرونس کو اپنی اس قبیح حرکت سے باز نہ رکھ سکیں۔ بالآخر جب زیوس پیدا ہوا تو ریہا نے اسے کرونس سے پوشیدہ کر کے ایک بھاری پتھر (چٹان کا ٹکڑا) کپڑے میں چھپا کر اور اسے اپنا بچہ کہہ کر کرونس کے حوالے کر دیا۔ اس طرح زیوس اپنے ہی باپ کی خوراک بننے سے بچ گیا اور پھر اس بچے نے جوانی میں کرونس اور دیگر دیوہیکلوں کے خلاف انقلاب برپا کر دیا اور انہیں شکست دی۔

زیوس یا جیوپیٹر کو یونانی دیوتاؤں کا جد امجد یا رب الارباب تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسے رومن اپنی سلطنت کا سرپرست سمجھتے تھے۔ اسے آسمانوں کا مالک (یا دیوتا) بھی کہا جاتا تھا اور اسے بارش، طوفان اور کڑک چمک کا خدا مانا جاتا تھا۔ یوں اسے یونانی دیوتاؤں میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

پرانی روایات اور کہانیوں کی روشنی میں زیادہ قرین قیاس یہ لگتا ہے کہ اولمپک میلہ 884 قبل مسیح تک (گویا تقریباً اڑتیس سو سال قبل) محض ایک مقامی میلے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی زیادہ اہمیت ایک مذہبی تہوار یا میلے کی سی تھی۔ پھر 884 قبل مسیح میں ایلس کے بادشاہ اینفیٹس (EPHITUS) نے اس کو وسعت دینے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے اس نے دیگر حکمرانوں سے معاہدے کیے تاکہ دوسرے علاقوں کے شہری اور کھلاڑی بھی ان مقابلوں اور میلوں میں شریک ہو سکیں۔ یونانی ترتیب کے مطابق ان مقابلوں یا میلوں کی درمیانی مدت چار سال مقرر کی گئی اور انہیں ''اولمپیاڈ'' کا نام دیا گیا۔ اولمپک میلہ کو ان ''اولمپیاڈ'' کی ابتدائی تقریب سمجھا جاتا تھا۔

بعض دیگر روایات کے مطابق اس میلے کو دوبارہ 776 قبل مسیح میں نئے سرے سے ترتیب دیا گیا اور ان بعد کے شواہد کے مطابق یہی پہلے ''اولمپیاڈ'' تصور کیے جاتے ہیں۔

ابتدا میں یہ میلہ محض ایک مذہبی حیثیت رکھتا تھا اور لوگ یہاں اپنے مشترکہ معبودوں کی عبادت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس میلے میں چند رسومات بھی شامل کی گئیں لیکن درحقیقت اولمپیا کے مقام پر 572 قبل مسیح میں اس میلے کے انعقاد سے اسے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پندرھویں اولمپیاڈ تک اس میلے کا واحد ''کھیل'' ایک ٹانگ والی دوڑ (SINGLE FOOT RACE) تھی۔ اس دوڑ کا فاصلہ اسٹیڈیم کی لمبائی کے برابر یعنی دو سو گز تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میلوں یا مقابلوں میں دوسرے کھیلوں کو بھی شامل کیا جاتا رہا اور بعد میں اس ''ایک ٹانگ والی دوڑ'' کا فاصلہ بھی بڑھا کر چار سو گز کر دیا گیا۔ یہ فاصلہ اسٹیڈیم کی لمبائی کا دوگنا تھا، اور یہ 724 قبل مسیح میں کیا گیا۔ بعد میں اس میں اضافہ ہوا اور

پھر یہ دوڑ اسٹیڈیم کے چوبیس چکروں کے برابر (تقریباً ڈھائی میل) طویل ہو گئی اور 720 قبل مسیح میں مقابلے کا حصہ بنی۔

رفتہ رفتہ ان میلوں میں دوسرے مقابلے بھی شامل ہوتے گئے اور 708 قبل مسیح کے میلے میں کشتیوں (ریسلنگ)، باکسنگ (688 قبل مسیح) 680 قبل مسیح میں رتھوں کی دوڑ (یا چیریٹ ریس) اور پنج کرتیم (باکسنگ اور ریسلنگ کی مشترکہ شکل یا گویا آج کی فری اسٹائل ریسلنگ) کو بھی مقابلوں کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس طرح ان میلوں میں کل مقابلوں یا کھیلوں کی تعداد پچیس ہو گئی تھی، لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ تمام مقابلے کسی ایک میلے یا ''اولمپک'' میں اکٹھے منعقد نہیں کیے جاتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان مقابلوں کے فاتحین کو صرف ایک ''جنگلی زیتون کی شاخ'' انعام میں دی جاتی تھی لیکن مقامی اور علاقائی حکومتیں اور ادارے اپنے اپنے علاقے کے کھلاڑیوں کو فتح کی خوشی میں اپنے طور پر انعامات سے نوازتے تھے۔

ان دنوں ان مقابلوں میں حصہ لینے والوں کو ایک مہینہ پہلے ایلس میں پہنچنا ہوتا تھا تاکہ اس دوران ان کی روحانی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کی جا سکے۔ یہ کام پہلے سے مقرر کردہ منصفین (یا ججوں) کی نگرانی میں کیا جاتا تھا۔

اولمپک کھیلوں کے ابتدائی دنوں میں میلے کے لیے صرف ایک دن مقرر ہوتا تھا۔ 680 قبل مسیح میں یہ مقابلے دو دن کے کر دیے گئے اور ان میں رتھوں کی دوڑ (یا چیریٹ ریس) شامل کی گئی۔ 632 قبل مسیح میں یہ مدت پانچ دن کر دی گئی مگر ان میں صرف تین دن کھیلوں کے لیے مقرر تھے۔ پہلا دن مذہبی تقریبات اور قربانیوں اور کھلاڑیوں کی رجسٹریشن وغیرہ کے لیے مقرر ہوا اور آخری دن تقسیم انعامات، دعائے تشکر اور رسمی اختتام کے لیے۔

ابتدائی اولمپکس میں کھلاڑی بالکل عریاں ہو کر کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دراصل کھلاڑیوں کو صرف لنگر (یا شارٹس) پہن کر کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت تھی، مگر ایک بار ایک کھلاڑی نے اپنا لنگر جان بوجھ کر اس لیے گم کر دیا کہ اسے مقابلے میں ذرا سی بھی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بس پھر تو سب ہی ننگے ہو گئے۔ لیکن ساتھ ہی ان مقابلوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کو دیکھنے کے لیے بھی خواتین کے داخلے پر پابندی تھی۔ یہ اور بات کہ اس پابندی کا کھلاڑی کی عریانیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس پابندی کی وجہ یہ تھی کہ یہ کھیل زیوس (جیوپیٹر) دیوتا کے نام پر ہوتے تھے جسے مردانہ (یا مذکر) تقدس کا دیوتا مانا جاتا تھا اس لیے عورتوں کی ان کھیلوں میں کسی بھی طور شمولیت ممکن نہیں تھی۔ اسی زمانے میں عورتوں نے بھی بعض مقابلے شروع کر رکھے تھے جو ہیرا گین (HERAEAN) فیسٹیول کے نام سے آرگو کے مقام پر منعقد کرائے جاتے تھے۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں اولمپیاڈ کا یہ میلہ اپنے علاقائی کھلاڑیوں اور تماش بینوں کے ساتھ ساتھ لیبیا اور مصر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور ان میلوں میں جسمانی مقابلوں کے علاوہ ذہنی آزمائشوں نے بھی اپنا وجود منوانا شروع کر دیا۔ اب ان میلوں میں ادیب اور شاعر بھی شامل ہونے لگے تھے اور وہ اپنی نثری اور نظمی تخلیقات لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ ان کے علاوہ مجسمہ ساز آ کر تماش بینوں کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ کھانے پینے کی اشیا کے اسٹال لگنے شروع ہوئے تو علاقائی ڈشیں لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بنیں اور پھر دیگر اشیا کی تجارت خاص طور سے گھوڑوں کے تجار اور بیوپاری بھی ان میلوں کے دنوں میں جمع ہونے لگے تھے۔

ان دنوں ان میلوں میں شرکت کے لیے اولمپیا جانا اگرچہ آسان نہیں تھا مگر ان میں شرکت کے لیے دور دراز کے علاقوں سے ہر قسم کی تکالیف اٹھا کر آنا ایک متبرک سفر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اپنے دور کے عظیم افراد ان میلوں میں شریک ہو کر ان کی اہمیت کو مزید بڑھاتے تھے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ مشہور استاد اور فلسفی افلاطون نے ستر سال کی عمر میں ان مقابلوں میں شرکت سے انہیں رونق بخشی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ اولمپکس کا آغاز یونان میں اور یونانیوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس لیے شاید یونان سے باہر ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی یا یہ کہ یونانیوں کے بغیر یہ یکسر فراموش کر دیے جائیں گے، مگر ایسا نہیں تھا۔ جب یونان کی عظمت خاک میں مل گئی۔ اولمپک تب بھی قائم رہے اور انہیں رومیوں نے ایک نئے انداز سے جاری رکھا۔ مگر انہوں نے یونانی روایتی مقابلوں کی جگہ اپنی پسند اور طرز کے جنہیں وہ بہادرانہ مقابلے کہتے تھے، کھیلوں کو ان میں شامل کیا۔ ان میں تیغ زنی وغیرہ کو شامل کیا اور عام کھلاڑیوں کی جگہ گلیڈیٹرز (تیغ زنی اور مار دھاڑ) کے مقابلے شروع کر ڈالے۔

پھر 394ء میں رومن حکمران تھیوڈوسیس اعظم نے حکماً اولمپک کھیلوں پر پابندی لگا دی مگر اس وقت تک ان کھیلوں کے مقابلوں یا میلوں کو ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا

تھا اور یہ پابندی کے وقت راکھ کے اندر ایک چنگاری چھوڑ گئے تھے جو انیسویں صدی میں ایک بار پھر شعلہ بن گئی۔

بیرن پائرڈی دو برٹین (BARON PIERRE DE COUBERTIN) کو جدید اولمپکس کا بانی کہا جاتا ہے۔ یہ فرانسیسی شہری خاصی حد تک اس اعزاز کا مستحق ہے، لیکن دراصل اس کو ان کھیلوں کے احیاء کی تحریک انگلستان سے ملی تھی۔

1612ء میں رابرٹ ڈوور نامی ایک انگریز نے گلوکیسٹر شائر کے مقام پر کوٹس وولڈ ہلز نامی چھوٹے سے قصبے میں پرانے اولمپک کھیلوں کا ایک طرح سے ''برطانوی متن'' شروع کیا۔ یہ مقابلے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر منعقد نہیں کیے گئے تھے پھر بھی ان میں تاشوں کے کھیل، شطرنج اور رقص کے علاوہ دوڑوں، چھلانگوں (لانگ جمپ، ہائی جمپ وغیرہ)، گولہ پھینکنے، کشتیوں اور گھڑ دوڑ کے مقابلے شامل تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا نے اولمپک کھیلوں کے طرز پر مقابلے منعقد کروائے تھے لیکن ان کی تفصیلات کہیں دستیاب نہیں ہیں کہ یہ کب اور کن کھیلوں میں کرائے گئے تھے مگر انیسویں صدی میں اولمپک کا خیال انگلستان میں اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ 1832ء میں لندن کے چیلسی اسٹیڈیم میں بیرن ڈی ہیرنگر نے ایک اولمپک میلہ منعقد کیا۔ پھر 1838ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کی یاد میں منعقد تقریبات کے موقع پر ایک اور میلے کا انعقاد کیا گیا جس میں تیغ زنی، جمناسٹک، تیر اندازی، کشتی رانی، نشانہ بازی اور سب سے مختلف مگر اہم کھیل کرکٹ کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس قسم کے مقابلے انگلستان کی شروپشائر کاؤنٹی میں مچ ویلاک (MUCH WENLOCK) کے مقام پر اولمپک میلہ کی شکل میں شروع کیے گئے اور انہیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ میلہ 1850ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس میں رکاوٹوں کی دوڑ، چھلانگیں، دوڑیں، فٹ بال وغیرہ شامل تھے، لیکن ان کے ساتھ کرکٹ کے مقابلے بھی ان میلوں کا حصہ تھے۔ ان میلوں اور مقابلوں کے انتظام اور انعقاد کا سہرا ولیم پنی بروک کے سر ہے جو ساری زندگی جسمانی صحت اور جسمانی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں رہا۔ بنیادی طور پر یہ کھیل نوعمر کھلاڑیوں کے لیے مخصوص تھے اور ان میں ایک دوڑ تو صرف سات سال سے کم عمر بچوں کے لیے تھی۔

1861ء میں پنی بروک نے شار پشائر اولمپین ایسوسی ایشن قائم کی جو چار سال بعد ہی نیشنل اولمپین ایسوسی ایشن میں تبدیل ہوگئی۔ بروک کا مقصد دراصل بین الاقوامی سطح پر اولمپکس کو منظم کرنا تھا تاکہ ان مقابلوں میں شرکت کرنے والے ممالک میں جسمانی تربیت اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ پنی بروک اپنے اس مقصد کے حصول میں تو پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا لیکن 1890ء میں بیرن پائرڈی کو برٹین نے جو ایک فرانسیسی باشندہ تھا، بروک سے ملاقات کی۔ کیونکہ وہ خود بھی بروک کی طرح جسمانی تربیت اور تعلیم کی وسعت کا حامی اور ایک لحاظ سے اس کا معاون تھا۔

کوبرٹین 1863ء میں پیدا ہوا تھا۔ 71-1870 کے دوران پروسیا کے ہاتھوں فرانس کی شکست کے اثرات کو ابھی پوری طرح محسوس نہیں کر سکتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ فرانس کی شکست کی ایک اہم وجہ فرانسیسیوں کی جسمانی کمزوریاں تھیں (یعنی وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں جسمانی طور پر کمزور تھے۔) کوبرٹین خود ایک باکسر، تیغ زن اور اچھا کشتی راں تھا۔ اسے برطانیہ میں اپنے خیالات کی پذیرائی کے زیادہ مواقع نظر آئے اور اسی لیے اس نے برطانیہ کے کئی دورے کیے جہاں اس نے تعلیمی اداروں اور اسکولوں وغیرہ میں کھیلوں کی تنظیموں کا بار ہا بہت غور سے جائزہ لیا اور پھر 1889ء میں وہ اپنی خواہشات اور خیالات کو مزید وسعت دینے کے لیے امریکا بھی گیا اور پھر وہ 1890ء ہی کے سال میں کوبرٹین نے مچ ویلاک کے مقام پر پنی بروک سے ملاقات کی تاکہ اولمپین سوسائٹی کے قیام کے لیے عملی اقدامات کیے جاسکیں۔ اس لگاتار محنت اور بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1892ء میں اولمپکس کو ایک عالمی یا بین الاقوامی مقابلے کے طور پر شروع کرنے کی ابتدا کے لیے کارروائی شروع کی تو گئی لیکن اسے زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ بلکہ اس کوشش میں کسی قسم کی امداد کے بجائے امریکا، برطانیہ اور فرانس میں اس خیال کو بار بار رد کیا گیا۔

آخر 23 جون 1894ء کو اس کے بارہ ممالک کے اُنہی نمائندوں کے ایک اجلاس کی صدارت کی جنہوں نے مشترکہ طور پر اور منفرد طور پر اولمپک کھیلوں کے دوبارہ اجرا کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ''یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی اور اس اجلاس کے نتیجے میں انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی (آئی۔ او۔ سی) کا قیام عمل میں آیا تاکہ 1900ء میں پیرس میں جدید اولمپک کھیلوں کے انعقاد کی تیاریاں کی جاسکیں، لیکن پھر کوبرٹین کے ہی اصرار اور لگاتار کوششوں سے یہ مقابلے 1896ء میں پیرس کے بجائے ایتھنز میں منعقد کرانے کا فیصلہ کرلیا گیا اور ایتھنز کا انتخاب صرف اس لیے کیا گیا کہ ''اولمپک'' کو قدیم مقابلوں کا احیا قرار دیا جاسکے جو صدیوں قبل وہاں ہر کولیس یا

جیو پیٹر کے دور میں شروع ہوئے تھے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جدید اولمپکس کا احیا 1896ء میں کوبرٹین کی کاوشوں کے نتیجے میں شروع ہونے والے کھیلوں سے نہیں ہوا تھا بلکہ ان کھیلوں کا احیا تو خود یونانیوں نے کوبرٹین کی پیدائش سے بھی پہلے کر دیا تھا اور یہ اولمپک مقابلے (یا اولمپک گیمز) 1896ء سے قبل چار مرتبہ 1859ء، 1870ء، 1875ء اور 1889ء میں ایتھنز میں منعقد کرائے جا چکے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں یونانی حکومت کے قیام کے بعد اولمپیا کے باسیوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ قدیم یونانیوں ہی کی اولاد ہیں ان کھیلوں کو دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ دراصل قدیم یونانی دور میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کو ہیلینک پاپولیشن (HELLENIC POPULATION) یا تمام یونانیوں کے اتحاد کی علامت قرار دیا جاتا تھا۔ اس تصور کو یونانیوں نے فراموش نہیں کیا اور جو بھی انیسویں صدی میں یونانی سلطنت کا قیام عمل میں آیا یونانیوں نے اپنے اتحاد کی اس صدیوں پرانی ''علامت'' کو نئے سرے سے زندہ کر دیا۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی اہم ہے کہ 1833ء میں الیگزینڈر سوٹسوز نے قدیم اولمپک کھیلوں کی تاریخ بیان کر کے اور ان کی شان میں قصیدے لکھ کر لوگوں کو اپنی صدیوں پرانی روایات یاد دلائیں۔

1896ء کے اولمپک کھیلوں کا ایتھنز میں انعقاد بھی ایک طرح سے مغربی تہذیب اور معاشرتی ورثے میں یونانیوں کے تاریخی اور معاشرتی تعاون اور اشتراک کا اعتراف تھا۔

اولمپک کھیلوں کا احیا بھی درحقیقت ایک محض تفریحی پروگرام کا اجرا نہیں کہا جاسکتا۔ دراصل انیسویں صدی میں بہت سی تعلیمی، سائنسی اور معاشرتی جہتیں دنیا کے سامنے آئیں اور اس صدی کے ابتدا ہی سے کچھ ایسی ایجادات کو روشناس کرایا جانے لگا جن سے لوگوں کے درمیان ذہنی اور جغرافیائی فاصلے مٹنے لگے۔ اس ضمن میں ریلوے اور ٹیلی گرام دو بہت ہی اہم ایجادات تھیں، جنہوں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کی اہلیت اور طویل فاصلے نسبتاً کم مدت میں طے کرنے کی صلاحیت نے انسانوں کے اندر ایک دوسرے سے مسابقت کے جذبوں کو اور بھی ابھارا۔ یوں ان کوششوں کو تیز تر کرنے میں مدد ملی کہ ایک شخص یا ایک گروہ دوسرے شخص یا دوسرے گروہ کی کاوشوں اور کامیابیوں کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید بہتر بنا سکے۔ رفتہ رفتہ بین الاقوامی کانفرنسوں اور جلسوں کے ذریعے عالموں، ادیبوں اور سائنس دانوں کو ایک دوسرے کے کاموں، تحقیقات اور خیالات سے نہ صرف متعارف نہیں کرایا گیا بلکہ انہیں مل جل کر علوم کی ترقی اور انفرادی اور اجتماعی نتائج کے لیے کام کرنے کے بہتر مواقع بھی میسر آئے۔

اس قسم کی کاوشیں لوگوں میں مسابقت اور دوسروں سے بہتر ہونے کی جدوجہد کے جذبات کو ابھارنے میں بڑی اہم ثابت ہوئیں اور پھر یہ جذبہ کھیلوں کے میدان میں بھلا کیوں نہ پیدا ہوتا۔ یہی وہ دیگر وجوہات تھیں جو اولمپک گیمز کے احیا میں اہم ثابت ہوئیں تاکہ انفرادی اور اجتماعی مسابقت اور مقابلوں کو شریفانہ اور دوستانہ انداز میں ایک منظم طریقے سے جلا بخشی جائے۔

ادھر 1896ء میں جب اولمپک کھیلوں کو ایک بار پھر ایتھنز میں منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا تو اس کی راہ میں متعدد رکاوٹیں تھیں اور ان میں خود یونان کی حکومت نے بھی اس کی مخالفت کی لیکن جب اسکندریہ کے ایک بااثر شاہنشد.....

جیارجیوس ایوروف نے ایتھنز میں ایک اولمپک اسٹیڈیم کی تعمیر کے لیے لولاکھ تیس ہزار سونے کے سکے پیش کیے تو تمام مخالفتیں ختم ہوگئیں اور پھر یونان کے بادشاہ نے خود 5 اپریل 1896ء کو پہلے جدید اولمپک گیمز کے آغاز کا اعلان کیا۔

1896ء کے ان اولمپک مقابلوں میں جو کھیل شامل کیے گئے ان میں سائیکلنگ، شمشیر زنی (فینسنگ)، جمناسٹک، ہائی جمپ، لانگ جمپ، پول والٹ، ٹرپل جمپ، ڈسکس تھرو، دوڑیں، سوئمنگ (مختلف مقابلے)، نشانہ بازی، ریسلنگ، ویٹ لفٹنگ (وزن اٹھانا)، شاٹ پٹ اور ٹینس کے مقابلے شامل تھے۔ ان کھیلوں کا باضابطہ افتتاح برطانیہ کے بادشاہ جارج اول نے کیا اور ان میں چودہ ممالک کے 241 کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ 6 اپریل 1896ء سے 15 اپریل 1896ء تک ہونے والے ان کھیلوں میں سب سے زیادہ یونانی کھلاڑی شریک ہوئے۔ جرمنی اور فرانس کے کھلاڑیوں کی تعداد گو یونانی کھلاڑیوں کے مقابلے میں کم تھی مگر دوسرے تمام ملکوں سے زیادہ تعداد میں ان دو ممالک کے کھلاڑی ایتھنز کے کھیلوں میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان کھیلوں میں کل تینتالیس (43) مختلف مقابلے ہوئے۔

1896ء کے اولمپکس کی ایک دلچسپ بات تو یہ رہی کہ

امریکی کھلاڑی جیمز کونولی نے ٹرپل جمپ میں پہلی پوزیشن حاصل کرکے جدید اولمپکس کے پہلے چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کھیلوں کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو صرف چاندی کے تمغے دیے گئے اور ان کے ساتھ زیتون کی شاخوں سے بنے تاج پہنائے گئے۔ ایک جرمن کھلاڑی کارل شومین نے چار مختلف مقابلوں میں پہلی پوزیشن حاصل کرکے ان مقابلوں کا سب سے بہتر کھلاڑی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کھیلوں کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا مقابلہ طویل فاصلے کی دوڑ تھا، اور اسے ایک یونانی چرواہے نے جیت کر اپنے وطن کا نام بلند کیا۔

دوسرے جدید اولمپکس فرانس کے شہر پیرس میں 1900ء میں ہوئے۔ ان کھیلوں میں چوبیس مختلف کھیلوں کے ایک سو چھبیس مقابلے ہوئے۔ پیرس اولمپکس میں چھبیس ملکوں کے بارہ سو بچیس کھلاڑیوں نے حصہ لیا اور ان مقابلوں کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں کرکٹ کے کھیل کو بھی شامل کیا گیا تھا، اور بات یہ ہے مقابلہ صرف دو ملکوں فرانس اور برطانیہ کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج سے ایک سو چار سال پہلے اولمپک مقابلوں میں کرکٹ کی ٹیم بھیجنے والا فرانس اب تک اپنی کرکٹ ٹیم تیار نہیں کرسکا ہے۔ پیرس اولمپکس کا دورانیہ سب سے زیادہ تھا۔ یہ 14 مئی 1900ء کو شروع ہوئے اور اختتام 28 اکتوبر کو ہوا۔ ان کھیلوں میں کرکٹ کے علاوہ گالف کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ مگر پیرس میں چونکہ انہی دنوں ایفل ٹاور نیا نیا تعمیر ہوا تھا اور لوگوں کو اولمپکس سے زیادہ اس میں کشش محسوس ہو رہی تھی اس لیے پیرس کے یہ مقابلے زیادہ لوگوں کی توجہ کا باعث نہ بن سکے۔

اور پھر یہی بات 1904ء میں ہونے والے اولمپکس کی تھی جن کے انعقاد کے لیے امریکی شہر شکاگو کا انتخاب کیا گیا تھا مگر امریکی صدر روزویلٹ کے اصرار پر انہیں امریکی ریاست مسوری کے شہر سینٹ لوئیس (یا سینٹ لوئی) میں منتقل کردیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں سینٹ لوئیس میں ''لوئیزیانا پرچیز'' کے نام سے ایک بڑی صنعتی نمائش بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس لیے امریکی صدر کا خیال تھا کہ اولمپکس میں شرکت کے لیے آنے والوں کو اس نمائش سے بھی دلچسپی ہوگی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک تو امریکا اور یورپ کے درمیان طویل فاصلہ اور پھر گراں سفری اخراجات۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کھیلوں میں کل 681 کھلاڑی شریک ہوئے اور ان میں بھی 525 امریکا اور کینیڈا سے تھے۔ ''لوئیزیانا پرچیز'' نامی نمائش دنیا کی جدید ترین مصنوعات کو روشناس کرانے کے لیے تیار کی گئی تھی اور اس میں موٹر گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور برقی آلات کی تشہیر کا انتظام کیا گیا تھا مگر غیر ملکی کھلاڑیوں اور تماش بینوں کی قلیل تعداد اور کل کھلاڑیوں کی بھی بہت کم تعداد کی وجہ سے سینٹ لوئی اولمپکس صرف پانچ دن میں ختم ہوگئے۔ ان کھیلوں کی تاریخیں 29 اگست سے 3 ستمبر 1904ء تک تھیں۔

ایک اور دلچسپ بات ابتدائی اولمپکس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ کھلاڑیوں پر یہ پابندی نہیں تھی کہ وہ صرف اپنے ملک کی نمائندگی ہی کریں گے۔ کئی ابتدائی کھیلوں میں بعض اتھلیٹس نے نہ صرف دوسرے ملکوں کی طرف سے حصہ لیا بلکہ بعض نے تو ایک سے زیادہ ملکوں کی نمائندگی بھی کی لیکن یہ سلسلہ صرف تھوڑے عرصے ہی جاری رہا اور اس کا مقصد بھی کھلاڑیوں میں مقابلے کے جذبوں کو ابھارنا تھا۔

1896ء میں جدید اولمپکس کے احیا کے بعد سے منعقد ہونے والے ان مقابلوں کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

1896ء ایتھنز۔ یونان
1900ء پیرس۔ فرانس
1904ء سینٹ لوئی، امریکا
1908ء لندن۔ برطانیہ
1912ء اسٹاک ہوم سویڈن
1920ء اینٹ ورپ۔
1924ء پیرس، فرانس
1928ء ایمسٹرڈیم، ہالینڈ
1932ء لاس اینجلز، امریکا
1936ء برلن۔ جرمنی
1948ء لندن۔ برطانیہ
1952ء ہیلسنکی، فن لینڈ
1956ء میلبورن، آسٹریلیا
1960ء روم۔ اٹلی
1964ء ٹوکیو۔ جاپان
1968ء میکسیکو سٹی، میکسیکو
1972ء میونخ۔ مغربی جرمنی
1976ء مونٹریال۔ کینیڈا
1980ء ماسکو۔ روس
1984ء لاس اینجلز، امریکا
1988ء سیول۔ جنوبی کوریا
1992ء بارسیلونا۔ اسپین
1996ء اٹلانٹا (جارجیا) امریکا
2000ء سڈنی۔ آسٹریلیا

کھیلوں کے مختلف مقابلوں میں تمغے حاصل کرنے والے چند نمایاں ملکوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ملک	سونے	چاندی	کانسی	کل تمغے
امریکا	872	658	586	2116
روس	395	319	296	1010
برطانیہ	180	233	225	638
فرانس	188	193	217	598
	179	143	157	479
سویڈن	136	156	177	469
مشرقی جرمنی	159	150	136	445
ہنگری	150	135	158	443
متحدہ جرمنی	137	138	160	435
آسٹریلیا	102	110	138	350
مغربی جرمنی	77	104	120	301
فن لینڈ	101	81	114	296
بھارت	8	3	8	16
پاکستان	3	3	4	10

اوپر دی گئی تفصیلات میں دو سو یا اس سے زیادہ تمغے حاصل کرنے والوں کے ساتھ ہم نے بھارت اور پاکستان کو بھی شامل کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سونے کے تمام تمغے ان دونوں ملکوں نے ہاکی کے مقابلوں میں جیتے۔ بھارت تو ہر ملک سے پہلے بھی اولمپکس میں ہاکی میں سونے کے تمغے جیت چکا تھا (1928ء میں نیدرلینڈ کو 3-0 سے 1932ء میں جاپان کو گولوں کی اوسط پر، 1936ء میں جرمنی کو 8-1 سے اور 1948ء میں برطانیہ کو 4-0 سے ہرا کر اولمپک چیمپئن بنا) تقسیم ملک کے بعد بھارت نے ہاکی میں چار بار سونے کا تمغہ جیتا (1952ء میں نیدرلینڈ کو 6-1 سے ہرایا، 1956ء میں پاکستان کو 1-0 سے ہرایا، 1964ء میں بھی پاکستان کو 1-0 سے ہرایا اور 1980ء میں اسپین کو 4-3 سے شکست دی)۔

پاکستان نے قیام ملک کے اگلے ہی سال یعنی 1948ء میں لندن اولمپکس میں شرکت کی۔ یہ مقابلے لندن کے ویمبلے اسٹیڈیم میں منعقد کیے گئے تھے۔ 29 جولائی سے 14 اگست تک ہونے والے ان مقابلوں میں 59 ممالک کے 4104 کھلاڑی شامل ہوئے جن میں 3714 مرد تھے اور 390 خواتین۔ ان مقابلوں کی اس خصوصیت کے علاوہ کہ پاکستان پہلی بار بین الاقوامی کھیلوں میں شرکت کررہا تھا، ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ پہلی بار برطانیہ میں ہوم۔ ٹی وی پر دکھائے جارہے تھے۔ یہ اور بات کہ ابھی برطانیہ میں بہت کم گھروں میں ٹیلی وژن آئے تھے۔ دوسری اہم اور دلچسپ بات یہ تھی کہ 1938ء کے اولمپک میں ہنگری کی شوٹنگ چیمپئن ٹیم کے ایک رکن کروئی ٹاکاس کا دایاں بازو (جس سے وہ نشانہ لگاتا تھا) ایک گرینیڈ کے دھماکے سے اڑ گیا۔ ٹاکاس نے جلد ہی بائیں ہاتھ سے نشانہ بازی کی مشق شروع کردی اور 1948ء کے مقابلوں میں ایک بار پھر دس سال پرانی فارم کی یاد دلا کر سونے کا تمغہ جیتا۔

1948ء کے لندن اولمپکس کا افتتاح شاہ برطانیہ کنگ جارج ششم نے کیا تھا۔ ان مقابلوں میں پاکستان کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکا۔ ہماری ہاکی ٹیم نے اپنا پہلا سونے کا تمغہ 1960ء کے روم اولمپکس میں بھارت کو 1-0 سے ہرا کر اس کی برسوں پرانی برتری کو ختم کرکے جیتا۔ اس کے بعد 1968ء میں آسٹریلیا کو 2-1 سے اور پھر 1984ء میں فیڈرل ری پبلک آف جرمنی کو 2-1 سے ہرا کر سونے کے تمغے حاصل کیے۔

سونے کے علاوہ پاکستان نے تین بار دوسری پوزیشن پر آکر چاندی کے تمغے (1956ء، 1964ء اور 1972ء میں) اور دو بار تیسری پوزیشن حاصل کرکے (1976ء اور 1992ء میں) کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ 1960ء اولمپکس میں پاکستان کو پہلا سونے کا تمغہ دلانے والا واحد گول کھیل کے بارہویں منٹ میں ہوا تھا۔

اس معرکۃ الآرا مقابلے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ 1960ء کی پاکستانی فاتح ہاکی ٹیم میں مشہور کھلاڑی منیر ڈار بھی شامل تھے۔ اس خاندان (ڈار) کے دو اور افراد بھی پاکستانی ہاکی ٹیموں کا حصہ بنے جنہوں نے 1968ء اور 1984ء میں پاکستان کے لیے سونے کا تمغہ جیتا۔ 1968ء

کی ہاکی ٹیم میں منیر ڈار کے بھائی تنویر ڈار اور 1984ء کی ٹیم میں منیر کے بھتیجے اور تنویر ڈار کے صاحب زادے توقیر ڈار شامل تھے۔ اولمپک مقابلوں میں مردانہ فیلڈ ہاکی 1908ء میں اور زنانہ فیلڈ ہاکی 1980ء میں شامل کی گئی۔

ہاکی کے علاوہ پاکستان نے کئی اور مقابلوں میں بھی شرکت کی مگر اب تک صرف دو اور کانسی کے تمغے پاکستان کے حصے میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک پاکستانی پہلوان محمد بشیر نے 1960ء کے ریسلنگ مقابلوں میں اور دوسرا پاکستانی باکسر حسین شاہ نے 1988ء اولمپکس میں جیتا تھا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اولمپک کھیلوں کو کچھ عرصہ سے ''گرما'' اور سرما'' کے اولمپکس میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ یہ کھیل اب ''سمر اولمپکس'' (جو اب منعقد ہو رہے ہیں) اور ونٹر اولمپکس کے نام سے منسوب کردیے گئے ہیں۔ ونٹر اولمپکس 1994ء، 1998ء اور 2002ء میں منعقد کرائے جاچکے ہیں اور ان کا درمیانی وقفہ بھی چار سال ہی ہے۔

اولمپک کھیل اب تک 1896ء کے بعد سے تین بار منعقد نہیں کرائے جاسکے ہیں۔ اور یہ سب عالمی جنگوں کے دوران (یعنی 1916ء میں پہلی عالمی جنگ اور 1940ء اور 1944ء میں دوسری عالمی جنگ کے باعث) ہوا۔ اب تو ہر شخص کی دعا ہے کہ ایسا کوئی حادثہ رونما نہ ہو جو دنیا کو پرامن اور تفریحی مقاصد سے روکنے کا باعث بنے۔

دنیا نے تو صحت مند اور چاق و چوبند جسمانی طور پر مکمل افراد کے ساتھ ساتھ ان لوگوں پر بھی توجہ دینی شروع کردی ہے جو کسی جسمانی معذوری کا شکار ہیں۔ چنانچہ 1960ء سے پیرالمپکس (PARALYMPIC SPORTS) کے نام سے ہر چار سال بعد مقابلوں کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ ان مقابلوں میں معذور افراد کو مقابلوں کا موقع ملتا ہے اور ان کی کامیابی اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1960ء میں روم میں ہونے والے ایسے مقابلوں میں 23 ممالک کے چار سو کھلاڑیوں نے شرکت کی تھی، جبکہ 2000ء میں سڈنی میں منعقدہ پیرالمپک گیمز میں 123 ممالک کے 3843 کھلاڑی شریک ہوئے۔ ان کھیلوں کا انعقاد بھی اولمپک گیمز کے فوراً بعد ہی ہوتا ہے۔ ویسے تو جسمانی طور پر معذور افراد کے پہلے مقابلے 1948ء میں انگلستان میں اسٹوک مینڈیویل کے مقام پر منعقد کیے گئے تھے، جن میں وہیل چیئر پر بیٹھے کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا مگر یہ پہلے مقابلے صرف برطانوی شہریوں کے لیے منعقد کرائے گئے تھے لیکن چار سال بعد یعنی 1952ء کے مقابلوں میں نیدرلینڈ (ہالینڈ) کے کھلاڑیوں نے بھی حصہ لیا۔ اولمپک مقابلوں میں معذور افراد کی شمولیت کا اہتمام 1960ء سے کیا گیا اور انہیں ایک الگ مقابلے کی شکل دے دی گئی۔ دیکھیں آگے چل کر انتشار اور دہشت اور خوف کی ماری دنیا انسانیت اور فلاح خلق کے لیے کیا کرتی ہے۔

جہاں تک 2004ء کے اولمپکس کا تعلق ہے، اس کے لیے ایتھنز میں جو ''اولمپک ویلج'' (OLYMPIC VILLAGE) قائم کیا گیا ہے اس میں سولہ ہزار کھلاڑیوں اور ان کے افسران کے لیے مفت رہائش اور دیگر سہولتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

ان کھیلوں میں 202 ممالک کی شرکت متوقع ہے اور ایک اندازے کے مطابق 45 لاکھ سے زیادہ تعداد میں شائقین شرکت کریں گے۔ اس کے مطابق (تشہیری مواد اور معلوماتی شائع شدہ اشیا) ان ممالک کو بھیجا جاچکا ہے جن کا وزن 55 ٹن بنتا ہے۔ اس کے علاوہ الیکٹرانک ذرائع سے لاکھوں کی تعداد میں معلوماتی ترسیلات الگ ہیں۔

میزبان شہر ایتھنز کے وسط میں ارموا سٹیڈیم اور اولمپیا سٹیڈیم یا اسٹریٹ کے کارنر پر اب تک کا سب سے بڑا ''اولمپک اسٹور'' قائم کیا گیا ہے۔

اوآ کا کمپلیکس میں نیا تعمیر ہونے والا ویلوڈروم بن کر تیار ہوچکا ہے۔ جس کی چھت کی لمبائی 145 میٹر اور چوڑائی 106 میٹر ہے اور اس کا وزن 3400 ٹن ہے۔

اس اولمپک کے موقع پر پہلی بار ''اولمپک اخبار'' ویب سائٹ پر دستیاب ہوگا اور دنیا کے کسی بھی علاقے میں گھر بیٹھے کمپیوٹر پر آپ تازہ ترین باتصویر اطلاعات دیکھ سکیں گے۔

یہ تمام وسیع انتظامات سالہا سال سے ہو رہے تھے۔ یہ ایک دن کا کام نہیں اور اس قدر عظیم پروگرام کو مختصر وقت میں مناسب طور پر منعقد کرانا تو کسی طور بھی ممکن نہیں ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ 2008ء کے اولمپکس کے لیے چین کے شہر بیجنگ میں کئی سال سے تیاریاں کی جارہی ہیں۔ ان تمام انتظامات کو دیکھ کر پانچویں صدی قبل مسیح کے یونانی شاعر نیذار کا یہ مقولہ بالکل درست لگتا ہے کہ:

''جس طرح دن میں سورج سے زیادہ روشن کوئی ستارہ نہیں، اسی طرح دنیا میں اولمپک سے بڑا کوئی مقابلہ نہیں۔''

♣

ایک دفعہ میں استاد کو اپنے ساتھ فلم اسٹوڈیو لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ استاد کے تعارف کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے قارئین کو ان کے بارے میں معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ کون ہیں اور کس مزاج کے ہیں۔ ان جیسی شخصیت نرگس کے ہزاروں سال رونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ (یہاں فلم اسٹار نرگس مراد نہیں ہے)

استاد بہت دنوں سے کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ میں نے جب ان سے ان کی اداسی کا سبب دریافت کیا تو ایک گہری سانس لے کر بولے ''مجھ کو ارتباط فلاڈلفیا ہوگیا ہے۔''

اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ فلاڈلفیا کسی شہر کا نام ہے۔ لیکن یہ ارتباط فلاڈلفیا کیا تھا' یہ صرف استاد ہی جانتے تھے اور استاد سے مزید کچھ معلوم کرنے کی حماقت کرتا تو وہ اسی قسم کی دو چار باتیں اور بول دیتے اور میں سر پیٹتا رہ جاتا اس لیے میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی تھی۔

اس زمانے میں کراچی کے اسٹوڈیو کی رونقیں بحال تھیں۔ فلمیں بنتیں اور لوگ شوق سے فلموں کو دیکھا بھی کرتے تھے۔ فنکاروں سے ملاقات کرنے اور ان سے بات کرنے کی خواہش بھی ہوا کرتی اور اب تو یہ حال ہے کہ فنکار برابر میں آکر بیٹھ جائے تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کون ہے؟ بلکہ وہ بے چارہ بہانے بہانے سے اپنا تعارف خود ہی کرا دیتا ہے۔ گفتگو

مماثل

تحریر: منظر امام

استاد محبوب نرالے عالم کی بدحواسیاں اور شوخیاں ہمیشہ کسی نہ کسی واقعہ کو جنم دیتی رہی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہر کام میں اپنے نام کی لاج بھی رکھتے ہیں۔ اب ایک عجیب مخمصے میں انہوں نے ایک نامور اور معروف فلمی ہیروئن کو ڈال دیا ہے اور دوسروں کو اپنی صداقت کا یقین دلانے کے لیے اپنے ساتھ ایسے ثبوت بھی لئے پھر رہے ہیں کہ جو چکر بازوں کو بھی چکرا دینے کے لیے بہت خوب ہیں۔

ایک نوجوان حسینہ سے برس ہا برس پوشیدہ تعلقات کی دلچسپ داستان

کچھ اس قسم کی ہوا کرتی ہے۔

''کیا بتاؤں جناب! کس بلا کی گرمی ہے'' فنکار ایک بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''جی ہاں جناب! گرمی تو بہت ہے۔'' دوسرا جواب دیتا ہے۔

''اور جناب' اس گرمی میں لوڈ شیڈنگ ایک اور مصیبت ہے۔'' فنکار بات آگے بڑھاتا ہے۔ ''لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ٹی وی کے پروگرام نکل جاتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی کل خبرنامہ نہیں دیکھ سکا۔''

''میں تو صاحب اپنی سیریل کی چوتھی قسط دیکھنے بیٹھا کہ لائٹ چلی گئی۔''

''اپنی سیریل! اوہ..... تو آپ کیمرا مین ہیں؟''

''نہیں جناب!'' فنکار بدمزہ ہو کر کہتا ہے۔ ''میں آرٹسٹ ہوں۔ سیریل میں لیڈنگ رول کر رہا ہوں۔ آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔''

تو جناب آج کل فنکاروں کا یہ حال ہے لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا جب فنکاروں کو بہت حیرت اور رشک سے دیکھا جاتا تھا۔ بہرحال میں ایک دن استاد محبوب نرالے عالم جیسے فنکار کو اپنے ساتھ فلم اسٹوڈیو لے گیا۔

گیٹ میں داخل ہوتے ہی استاد کے انداز ہی بدل گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دن وہاں کوئی رقص وغیرہ فلمایا جا رہا تھا جس کے لیے کئی لڑکیاں بلوائی گئی تھیں۔ یہ لڑکیاں رنگین لباسوں میں ملبوس گھومتی پھر رہی تھیں۔

''واہ' یہاں تو درجنوں زرباں اور زرقامیں ہیں۔'' استاد نے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''استاد! آپ جب تک ان لڑکیوں کے دیدار سے خوش ہوتے رہیں' میں ایک منٹ میں آتا ہوں'' میں نے کہا۔

استاد کو اس وقت میری کیا پروا ہو سکتی تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں؟ وہ ان کے لیے ''گھور بین'' بنے رہے۔ گھور بین استاد کی اپنی اصطلاح ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سو فیصد درست ہے۔ استاد دوربین کو گھور بین کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مشین کے ذریعے دور کی چیزیں نہیں دیکھی جاتیں بلکہ عورتوں کو گھورا جاتا ہے۔ اس لیے وہ دوربین کو گھور بین کہا کرتے۔

میری واپسی تقریباً آدھ گھنٹے میں ہوئی اور لان کی صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ ان عورتوں یا لڑکیوں نے چاروں طرف سے استاد کو گھیر رکھا تھا اور استاد ایک وجد اور ترنگ کے عالم میں ان کو اپنی شاعری سنائے جا رہے تھے۔

''میں قلزمی تو ہست بود۔ ڈھم ڈھم۔ تیرا چہرہ سکندر اعظم' ڈھم ڈھم۔ تیرے گیسوبالوں کی طرح ڈھم ڈھم۔ فردنما' دردنما' ارد نمائے بے کسی بے تی' بے بنی' بے آ' بے جا' ڈھم ڈھم۔''

استاد کو پروا ہی نہیں تھی کہ سننے والیوں کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ ہنستے ہنستے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو چار پیٹ پکڑ کر گھاس پر لوٹ رہی تھیں۔ دو چار بری طرح چیخ رہی تھیں۔ جیسے ان پر ہسٹریا کے دورے پڑ گئے ہوں۔ غرض استاد نے وہاں ایک ہڑبونگ سی برپا کر دی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر استاد کا بازو تھام لیا ''استاد چلیں یہاں سے'' میں نے کہا ''آپ کو رضوی صاحب بلا رہے ہیں۔''

''خبردار!'' استاد نے ایک جلالی کیفیت میں اپنا بازو میری گرفت سے چھڑا لیا ''بے مزا جتھم بے لے ہنر' پٹاخ چہ کردی باور۔''

نہ جانے استاد کیا کہہ گئے تھے؟ میں نے جب دوبارہ استاد کو لے جانا چاہا تو ان میں سے ایک لڑکی نے کہا ''یہ آپ ان کو کہاں لے جا رہے ہیں' اتنے دنوں بعد تو ایک تماشا ہمارے ہاتھ آیا ہے۔''

''سن لیا استاد!'' میں نے استاد کو غیرت دلائی ''یہ سب تمہیں تماشا سمجھ رہی ہیں۔''

''یہ عالم شادمان دحشت بے آرام فروغ ہے'' استاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

اب خدا جانے استاد کیا کہہ گئے تھے۔ وہ اس وقت اتنی ترنگ میں تھے کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ استاد ان کے ساتھ ہی رقص کا مظاہرہ شروع کر دیتے یا ان میں سے دو چار پر عاشق ہو جاتے۔ استاد کے عشق کا فلسفہ میں جانتا ہوں۔ یعنی بقول استاد کے جو سب سے زیادہ نفرت کرے اس سے زیادہ گالیاں دے' اسی کو اپنا سچا محبوب سمجھو۔ کیونکہ اس کی نفرت جیتنے کا اور جدوجہد کا حوصلہ دلاتی ہے۔''

یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں استاد کو کس طرح وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں انہیں رضوی صاحب کے کمرے میں لے آیا۔ جہاں استاد کا پہلے ہی تعارف ہو چکا تھا۔ اس وقت رضوی صاحب کے ساتھ کئی فلم اسٹار تہمینہ بھی موجود تھی اور بھی کچھ لوگ تھے۔ استاد کمرے میں داخل ہوئے اور پہلی ہی نگاہ میں انہوں نے گویا سب کو فتح کر لیا۔ انہوں نے کسی اور پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ بلکہ سیدھے تہمینہ کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے اور بڑے ادب سے جھک کر

بولے ''نرخ ارزاں عالم بالا دوبارہ آمد کا شکریہ۔ میں عندلیب مرغ آفریدہ کب سے محوِ طلب دیدار ساقی ہوں۔''

تہمینہ اس عجیب و غریب زبان کو سن کر گھبرا سی گئی۔ خود میں بھی سٹپٹا گیا تھا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ استاد کمرے میں داخل ہو کر سلام دعا وغیرہ کریں گے۔ اس کے بعد جا کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمائیں گے لیکن استاد نے کوئی تکلف ہی نہیں کیا تھا۔

''استاد!'' میں نے مجبوراً استاد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید خرافات بولنے سے روکا۔ ''آپ نے شاید انہیں پہچانا نہیں' یہ مشہور فلم اسٹار تہمینہ ہیں۔''

''ہاں' ہاں۔ میں جانتا ہوں'' استاد کا لہجہ بہت خوابناک اور رومانی ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب بہت صاف زبان میں گفتگو فرما رہے تھے ''لیکن تم لوگ نہیں جانتے کہ میرا اور ان کا ساتھ جنم جنم کا ہے۔ یہ پچھلے جنم میں میرے ساتھ رہ چکی ہیں۔''

میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ استاد نے یہ ایک نیا ڈراما شروع کر لیا تھا۔

''کیا بکواس ہے؟'' تہمینہ بھی بھڑک اٹھی ''بوڑھے انسان' تم یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں اندرون خانہ مانی بے آب و بے برتن ہوں'' استاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میں چتر مانی ہوں۔ شعلہ رساں و بے ضرر فتنہ ہوں۔ میں اندوختہ اور آموختہ ہوں لیکن جو بھی ہوں' وہ صرف تمہارے لیے ہوں' صرف تمہارے لیے۔''

وہاں ایسی پچویشن ہو گئی کہ خود مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب یہی بہتر تھا کہ میں استاد کو کسی طرح یہاں سے لے جاؤں ''چلیں استاد!'' میں نے استاد کا ہاتھ تھام لیا ''وہاں اسٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی ہے' چل کر دیکھتے ہیں۔''

میں نے استاد کا بازو تھاما تھا اور استاد نے تہمینہ کا بازو تھام لیا اور اسے جھنجوڑ کر بولے ''اب بتاؤ' تم نے میرے لیے جو چکن بریانی بنائی تھی' وہ کہاں ہے؟ شریر کہیں کی' بریانی بنائی میرے لیے اور کھلا دی کسی اور کو۔''

''رضوی صاحب! خدا کے لیے مجھے اس پاگل آدمی سے بچائیں'' تہمینہ دہائی دینے لگی تھی۔

''ارے رضوی صاحب کیا بچائیں گے' یہ تو خود چکن بریانی کھا کر بیٹھے ہیں'' استاد نے غصے سے کہا ''ناہنجار' ستمگر بے جا' چہار درد و ریش اور چہار مغز۔''

''منظر صاحب!'' اب رضوی صاحب بھی بول پڑے۔ ''یہ آپ کس آدمی کو یہاں لے آئے ہیں؟''

''خبردار!'' استاد دہاڑے ''میں آدمی نہیں' قل قلانوس ہوں۔ ارسطالیس ہوں اور ابلاغ عامہ ہوں۔ ایک دن تم لوگ میری بات پر ضرور یقین کرو گے۔ میں اور یہ دونوں پچھلے جنم میں ایک ساتھ رہ چکے ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے اس کا۔ پورا زمانہ بلکہ آفتاب عالم تاب بھی جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

ان کی اس خوبی سے تو میں بھی واقف تھا۔ وہ چاہے کچھ بھی اوندھی سیدھی حرکتیں کرتے رہیں لیکن جھوٹ بولنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا اور وہ بھی اتنا بڑا جھوٹ کہ وہ فلم اسٹار تہمینہ کو پچھلے جنم میں اپنی محبوبہ کہہ رہے تھے۔ پتا نہیں یہ کیا سلسلہ تھا؟

''آپ جائیں' یہاں سے باہر چلے جائیں'' رضوی صاحب نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا'' استاد نے اچانک تہمینہ کا ہیر تھام لیا ''حسن کی دیوی ملکۂ ذیشان و بہار ستانی۔ تم مجھے یوں خوار و زبوں و بدحال دیے مثال نہیں کر سکتیں۔ یاد کرو' تم نے ایک بار سکندر اعظم کے کہنے پر مجھے دھکے دیے تھے۔ یاد کرو

اقابلا
قسط وار سیریل میں
تاریک براعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور سفلی کے مقابلے برملا ہوتے تھے۔ وحشی قبائل اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابل یقین سرگزشت..... ان تاریک اور گمنام جزیروں کی کہانی..... جہاں تہذیب کا کوئی داخل نہیں تھا..... انسانوں کی خاطر معصوم اور شیر خوار بچوں کو نیزوں پر اچھالا جاتا تھا عجیب الخلقت اور خوفناک دیوتاؤں کے مجسموں کو تازہ خون سے غسل دیا جاتا تھا..... نوخیز حسیناؤں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی
کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آئی ہے
قیمت فی حصہ 60 روپے
23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802551-5895313
e-mail:kitabiat1970@yahoo.com

جب میں اور تم قرانما کے تالاب کے کنارے مگر مچھ کھایا کرتے تھے۔''

تہمینہ کا یہ حال تھا کہ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ رضوی صاحب نے میرا بھی لحاظ نہیں کیا اور کچھ آدمیوں کی مدد سے استاد محبوب کو اسٹوڈیو سے باہر پھنکوا دیا گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ باہر آ گیا تھا۔ ایسی شرمندگی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ استاد نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

باہر آتے ہی میں استاد پر برس پڑا۔ ''یہ آپ نے کیا حرکت کی تھی استاد۔ اس قسم کی حرکت آپ کو زیب نہیں دیتی۔ آپ نے تو ایسی بے عزتی کروا دی ہے کہ میں اب کبھی ان لوگوں کو اپنا منہ نہیں دکھا سکوں گا۔''

''کیا تم بھی مجھے جھوٹا سمجھتے ہو؟'' استاد نے ایک گہری سانس لی ''میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ لڑکی پچھلے جنم میں میرے ساتھ تھی' میری محبوبہ رہ چکی ہے۔''

استاد نے یہ جملہ سلیس اردو میں بیان کیا تھا۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ استاد کے سر سے ابھی تک بھوت نہیں اترا ہے۔ ''خدا کے واسطے استاد! یہ باتیں رہنے دیں۔ ہم کوئی دیو مالائی دور میں نہیں ہیں کہ اگلا اور پچھلا جنم ہمارے سامنے آئے۔''

''مت کرو یقین' بوالہوس ونشاط انگیز!'' استاد مجھ پر بھی برس پڑے ''لیکن میرے پاس ثبوت ہے۔ میں ایک دن ثبوت دکھا کر رہوں گا۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس' بتائیں؟''

''خاموش۔ میں اس وقت عندلیب چمن زار ہوں'' استاد نے اتنا کہہ کر اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

میں نے استاد کو ان کے دولت کدے تک چھوڑ دیا۔ راستے بھر ہم دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اب اس وقت تک استاد سے بات نہیں کروں گا جب تک ان کا مزاج ٹھکانے نہیں آ جاتا۔ وہ اس قسم کے تماشے تو کرتے ہی رہتے تھے لیکن اس بار تماشے کی نوبت کچھ اور ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب وغیرہ سے میرے بھی تعلقات کے کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد استاد کی جانب سے ایک حیرت انگیز اطلاع ملی۔ اطلاع پہنچانے والا ایک مستند شخص تھا۔ اس نے بتایا ''ارے صاحب! آپ کے استاد نے کیا غضب کر دیا ہے۔''

''کیوں..... کیا ہوا ہے انہیں؟''

''وہ ایسٹرن اسٹوڈیو کے سامنے بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا!'' میں یہ سن کر واقعی حیران رہ گیا تھا ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''آپ خود جا کر دیکھ لیں تو آپ کو یقین آ جائے گا۔''

اور میں استاد کو دیکھنے کے لیے ایسٹرن اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ استاد نے واقعی وہاں ایک تماشا لگا رکھا تھا۔ وہ ایک ٹینٹ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے اور چاروں طرف عجیب وغریب انداز کے بینر نظر آ رہے تھے۔ ایک پر لکھا تھا ''تہمینہ کس کی۔ استاد کی۔ استاد کس کے' تہمینہ کے۔''

ایک پلے کارڈ پر درج تھا ''موجۂ خلاق محبت زرگاں''۔ دوسرے پر یہ مطالبہ تھا ''وہ میرے پچھلے جنم کی یتیم ویسیر و باہمگیں تھی'' تیسرے پر یہ مطالبہ تھا ''نگاہِ لطف و کرم عنایت نہ ہوئی تو بندہ خوشاب دخوراب کو جان فرتن کر دے گا'' پتا نہیں یہ کیا لکھوا دیا تھا انہوں نے۔ بہرحال ان کے چاروں طرف اسی قسم کی چیزیں تھیں اور وہ ان کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آس پاس کے لونڈے لپاڑے بھی اس تفریح میں دل کھول کر حصہ لے رہے تھے۔ استاد کی صورت میں انہیں ایک مزے دار چیز مل گئی تھی۔

مجھے دیکھ کر استاد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا ''استاد! یہ کیا ڈراما ہے؟'' میں نے پوچھا ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں' کیا تماشا ہے یہ؟''

''تم کو تو معلوم ہے کہ وہ جادوگر قتالۂ عالم' دوشیزۂ بردوش وسبک سر میری محبوبہ رہ چکی ہے'' استاد نے اسٹارٹ لے لیا۔

''کیا بکواس ہے'' میں نے استاد کو بیچ میں ٹوک دیا ''آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ پر مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔ پولیس آپ کو گرفتار بھی کر سکتی ہے۔ آپ خوامخواہ کسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''خوامخواہ نہیں۔ میرے پاس ثبوت بھی ہے'' استاد نے وہی پرانی بات دہرائی۔

''آخر کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''یہ قیدِ ملاحظہ چشم ماروژن'' استاد نے اتنا کہتے ہوئے کچھ تصویریں میرے ہاتھ پر رکھ دیں ''خود دیکھ لو۔''

وہ بہت پرانی تصویریں تھیں بلیک اینڈ وائٹ۔ جن میں زردی جھلکنے لگی تھی۔ ایک دو جگہ سے وہ خستہ ہو کر ٹوٹ بھی چکی تھیں لیکن ان تصویروں کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ بلاشبہ استاد ہی کی تصویریں تھیں۔ یعنی اس وقت کی جب آگش جوان تھا۔ استاد کی داڑھی بھی نہیں تھی۔ وہ بالکل بانکے بنے ہوئے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہر تصویر میں تہمینہ تھی' ہاں وہی تہمینہ۔ وہی فلم اسٹار' جس کو دیکھ کر استاد اپنی پچھلے جنم کی محبوبہ پکارا اٹھے تھے۔ سو فیصد وہی' اس میں کسی قسم کا شبہ ہی نہیں تھا۔ وہی آنکھیں' وہی چہرہ' وہی قد۔ وہی دل کشی سب کچھ وہی۔ خدا جانے یہ کیسا بھید تھا۔ میں تو واقعی ان تصویروں کو دیکھ کر چکرا گیا تھا۔

''دیکھا' میں دروغ بر گردن راوی تو نہیں ہوں نا؟'' استاد نے معصومیت سے پوچھا ''یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟''

''پتا نہیں۔ میں تو پاگل ہو رہا ہوں یہ سب دیکھ کر'' میں نے کہا۔ ''یہ بھید میری سمجھ سے باہر ہے۔ فلیش مان لیا کہ یہ آپ ہی کی محبوبہ ہے۔ پھر بھی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''تو اور کیا کروں۔ میرے پاس براہِ راست راستۂ سنگ مادل کون ہے؟''

''جناب! ذرا بات سنیں'' کسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے رضوی صاحب اپنے دفتر کے دو چار آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بے حد غصے میں نظر آ رہے تھے۔ ''آپ ذرا میری بات سن لیں۔''

بت پرستی

عربوں میں بتوں کو لانے والا آدی عمر بن لحی تھا یہ خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ ایک مرتبہ یہ بیمار ہو گیا تو کسی نے اس سے کہا کہ شام کی سرزمین بلقا کے نزدیک ایک چشمہ ہے' اگر وہاں جا کر نہائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ جب یہ وہاں گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہیں تو لوگوں نے اس کو بتایا کہ ان بتوں سے ہم بارش پاتے ہیں' اپنے دشمن پر غالب رہتے ہیں۔ عمر بن لحی ان سے کچھ بت مانگ کر لایا اور ان کو لا کر خانہ کعبہ میں نصب کر دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مجھے جہنم کا نظارہ کرایا گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک پوتہ قد' سرخ رنگ کا مرنجاں مرنج انسان ہے اور آگ کے اندر اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا ہے میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے تو مجھے بتایا گیا کہ یہی عمر بن لحی ہے جس نے عربوں کو بت پرستی کی طرف بلایا اور اس سرزمین پر بحیرہ وصیلہ ساقبہ عامی کی رسومات نکالیں عمر بن لحی ایک کاہن تھا۔ اس کی کنیت ابوثمامہ تھی ایک جن ابوثمامہ کا موکل تھا۔ انہیں نے اس جن کو استعمال کیا ابلیس کی ترغیب پر اس موکل جن نے ابوثمامہ کو مخاطب کر کے کہا ''اے ابوثمامہ اٹھ تہامہ کو کوچ کر' اپنے آپ کو سعد سلامہ پہنچا پھر جدہ کے کنارے جا وہاں تجھے ریت کے نیچے دفن مورتیاں ملیں گی' انہیں نکال کر تہامہ لا۔ اپنے سرداروں سے خوف نہ کھا۔ اس کے بعد اہل عرب کو ان بتوں کی دعوت دے۔'' ابوثمامہ اپنے موکل جن کی وجہ سے حرکت میں آیا۔ حج کے موقع پر اس نے لوگوں کو بتوں کی پوجا کرنے کی دعوت دی۔ عرب کے سرداروں نے اس کو قبول کیا۔

اس طرح عمر بن لحی نے ابلیس کی بے انتہا مدد کی۔ وہ تمام بت جو حضرت نوح کے سیلاب میں گم ہو گئے تھے پھر کارآمد ہو گئے۔ شیطان نے ان کے ذریعے ان گنت لوگوں کو شرک میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوا۔ شیطان نے کہا ''عمر بن لحی بڑا کام کا آدمی تھا خود تو دنیا سے کوچ کر گیا لیکن اس کے بوئے بیج کا پودا اب بھی سرسبز و شاداب ہے۔''

ماخوذ: (فرار تلبیسی ابلیس علامہ ابن جوزی)
مرسلہ: مشرف حسین ندیم، لیاقت پور

تفصیل سے باتیں ہوں تاکہ فوری طور پر یہ تماشا تو ختم ہو۔''

''ٹھیک ہے' آپ انہیں اندر لے آئیں۔''

میں نے استاد کے پاس جا کر ان سے کہا ''استاد! آپ کو اندر چلنا ہوگا۔ تہمینہ نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

استاد کی باچھیں کھل اٹھیں۔ انہوں نے اسی وقت بھوک ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پبلک کے سامنے ایک عدد تقریر بھی کر ڈالی۔ ان کی تقریر عشق اور حسن کے فلسفے پر تھی۔ اور محبت میں صبر کی اہمیت بیان کی گئی تھی۔ استاد کی تقریر کچھ اس انداز کی تھی ''میرے ہم وطنو! افلاطونیا کے رہنے والو! باشندگان گور و کنار یہ عشق مشک ہے۔ آتش ہے' نمرود ہے' قالین ہے۔ بستر ہے اور تبرک ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مضبوط و دوام رہیں اور بقا کر لیں فنا کر لیں۔ اتنا عشق کریں کہ سمندر خشک ہو جائے اور یہ جوانی ہی سب کچھ ہے۔ جیسے تہمینہ اور چاہے روزینہ۔ مثال ابرق بہ طوق ہوں۔ گھنٹی فیل ٹمن اور چقماق کی قسم۔ میں نے عشق کیا اور منزل مقصود گنجینۂ مراد ہے پیر ہو گیا۔''

پتا نہیں لوگوں نے کتنی بات سمجھی اور کتنی نہیں سمجھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ سب ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ استاد نے وہیں پر بھوک ہڑتال ختم ہونے کی خوشی میں دو عدد بن کباب کھائے۔ دو گلاس مالٹے کا جوس پیا اور میرے ساتھ اسٹوڈیو کی طرف ایک نئے معرکے کے لیے چل پڑے۔ مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن استاد کو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ تہمینہ نے انہیں طلب کیا تھا۔

رضوی صاحب کے کمرے میں تہمینہ شعلۂ جوالا بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ استاد کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھی ''تم..... دو کوڑی کے انسان۔ تم نے مجھے بدنام کر کے رکھ دیا۔ میری عزت خاک میں ملا دی۔ تم نے میری ساکھ برباد کر دی۔ تماشا بنا دیا ہے مجھے۔ میں تمہیں گرفتار کروا دوں گی۔'' وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا بولتی رہی تھی۔

میں نے اور رضوی صاحب نے بڑی مشکلوں سے اسے خاموش کرایا تھا۔

''دیکھو اے حسینۂ عالم اور قتال بازیگر'' اب استاد نے بولنا شروع کیا ''تم پچھلے جنم میں میرے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں مار کو پولو کے ساتھ ملتان گئے تھے۔''

''بند کرو یہ بکواس۔'' تہمینہ چیخ پڑی۔

اس پر استاد نے وہی تصویریں نکال کر سامنے کر دیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر خود تہمینہ کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔

''یہ..... یہ..... جھوٹ ہے'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''میں تو اس مسخرے کو جانتی بھی نہیں۔ میں اس کے ساتھ تصویریں کیسے اتروا سکتی ہوں۔''

''یہ اپنے پچھلے جنم کی بات کر رہے ہیں تہمینہ!'' میں نے کہا۔

''ارے جہنم میں گیا پچھلا جنم'' وہ جھلا کر بولی ''یہ شخص فراڈ ہے' جھوٹا ہے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

''تم یہ بتاؤ' یہ تصویریں تمہاری ہیں یا نہیں؟'' رضوی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں' یہ تو' یہ تو بالکل میری تصویریں ہیں'' وہ بوکھلا کر بولی۔ ''لیکن میں نے اس کے ساتھ تصویریں نہیں کھنچوائیں اور یہ تو بہت پرانی تصویریں ہیں۔''

''اسی لیے تو میں پچھلے جنم کی بات کر رہا ہوں'' استاد نے کہا ''یہ معاملہ پچھلے جنم کا ہے' تم یاد کرو..... اپنی یادداشت بے ہنگام پر لاتِ کیف بھر دسا کرو۔ مہمیز شب کو سورج کے ساتھ ملا دو۔ الفکر کو اژدہا سمجھو تو پھر سب کچھ یاد آ جائے گا۔''

''میرے خدا! میں تو پاگل ہو جاؤں گی'' تہمینہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔

اس زمانے میں جعلی تصویروں کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ استاد کے پاس بالکل اصل تصویریں تھیں۔ ان میں کوئی جھول نہیں تھی لیکن یہ سب کچھ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ اس وقت استاد کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تھی جو میدان مار لینے کے بعد فاتح کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

''تہمینہ! تمہاری کوئی جڑواں بہن تو نہیں تھی'' میں نے پوچھا ''جیسا فلموں میں ہوا کرتا ہے۔''

''ہرگز نہیں'' اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی ''اگر کوئی ہوتی بھی تو اس تصویر کے لحاظ سے میری عمر اس کی ہونی چاہیے تھی۔''

یہ بات سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ تصویریں واقعی بہت پرانی تھیں لیکن تہمینہ کے خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔

''اچھا فرض کریں یہ پچھلے جنم میں آپ کی محبوبہ تھی تو اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ اب تو وہ جنم ختم ہو گیا۔ اب تو یہ کوئی اور دور ہے۔''

''اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا'' استاد نے کہا ''یہ وعدہ اس نے اقاطوش کے سامنے کیا تھا لیکن وعدے کے بعد یہ غائب ہو گئی۔ اور اب ملی ہے اسی لیے اس کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔''

''کیا دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' تہمینہ بھڑک اٹھی ''میں تم جیسے جھڑوں سے شادی کروں گی؟''

''میں کچھ نہیں جانتا'' استاد اڑے ہوئے تھے ''اگر تم نے ایفائے وعدہ عہد و پیمان مرتب نہیں کیا تو میں پوری دنیا کو بتا دوں گا۔ تمہاری یہ تصویریں بر سرِ روزگار ہو جائیں گی۔''

شاید استاد بر سرِ عام کہنا چاہتے ہوں گے لیکن بر سرِ روزگار کہہ گئے تھے۔

''کیا واقعی یہ پچھلا جنم وغیرہ کچھ ہوا کرتا ہے؟'' رضوی صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں نے بھی اس بارے میں سن رکھا ہے'' میں نے جواب دیا ''لیکن قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میرا صرف ایک ہی جنم ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تہمینہ کے ساتھ ایسا ہی ہو۔''

''یہ بکواس ہے'' تہمینہ بول پڑی ''اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے بھی یاد آنا چاہیے تھا۔ میں نے اس قسم کی فلمیں دیکھ رکھی ہیں لیکن مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا اور اگر فرض کریں مجھے واپسی آ گیا' میں پچھلے جنم میں بدقسمتی سے اس آدمی کے ساتھ تھی تو اس جنم میں پاگل نہیں ہو گئی ہوں جو اس شخص کی محبوبہ کہلاؤں۔''

کچھ عجیب دلچسپ اور مضحکہ خیز سی صورتِ حال ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسا تماشا کبھی پیش نہیں آیا ہوگا لیکن استاد کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ جہاں جاتے' ہنگامہ برپا کر دیتے۔ اس قسم کی صورتِ حال ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتی تھی۔ استاد زندہ باد! انہوں نے تہمینہ اور رضوی صاحب کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

''دیکھو بھائی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس بے چاری کا پیچھا چھوڑ دو۔'' رضوی صاحب نے کہا ''بھول جاؤ کہ پچھلے جنم میں کیا ہوا تھا۔ تمہاری اس حرکتوں کی وجہ سے میری فلم کا نقصان ہو جائے گا۔ ذرا خیال کرو' کچھ لے دے کر معاملہ رفع دفع کرو۔''

''کیا تم نے مجھے اسپغول بے جان سمجھ رکھا ہے؟'' استاد برا مان گئے۔

''ایک تو اس کی زبان اپنی سمجھ میں نہیں آتی'' رضوی صاحب نے بے بسی سے میری طرف دیکھا ''نہ جانے کیا' کیا بولتا ہے۔''

''میں آسان تشریح کو سلیس بھی کر سکتا ہوں'' استاد نے کہا ''لیکن شرط مدام یہ ہے کہ اس کو پچھلی باتیں یاد آ جائیں' یہ ڈرامہ کر لے پھر جس طرح میں پچھلے جنم میں بے آب و گیاہ دور دراز واپس چلا گیا تھا۔ اسی طرح آج بھی ہو جاؤں گا۔''

''لیکن میں یاد کیا کروں؟'' تہمینہ پریشان ہو کر بولی ''مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔''

یہ ایک دلچسپ لیکن سنجیدہ کیس تھا۔ میں نے اور رضوی صاحب نے اس موضوع پر بہت سوچا۔ اب ہمیں بھی یہ گمان ہونے لگا تھا کہ یہ کہیں واقعی جنم وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے۔ استاد کی خود اعتمادی اور ان تصویروں سے تو یہی بات ظاہر ہو رہی تھی۔ رضوی صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ ان کے ذہن میں فوری طور پر ایک بات آ گئی ''یار۔ کیوں نہ تہمینہ کی تحلیلِ نفسی کروا دی جائے۔'' انہوں نے کہا ''ایک ماہر نفسیات میرے دوست ہیں۔ وہ تہمینہ کی یادداشت کریدکر کر دیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو خود سوچو' کیا دھانسو پبلسٹی ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ بالکل سچا واقعہ' اس کی خوب پبلسٹی کرائی جائے پھر اس موضوع پر فلم بنا دی جائے۔''

تہمینہ کو جب اس تحلیلِ نفسی کی تجویز کا علم ہوا تو وہ غصے سے بھڑک اٹھی ''کیا سب کے سب پاگل ہو گئے ہو جو ایک پاگل کی باتوں میں آ گئے۔''

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے تہمینہ'' رضوی صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ''یہ سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا

شگفتہ پبلیشرز
اردو کی تفریحی ادب کا ایک زیارت
پورے ہونا چھوڑیں، مسکرانا نہ بھولیں۔ تمام کتابیں آج ہی منگوائیں
گھر کی مرغی — حکیمی شیکسی
قیمت -/30 روپے
آپ کے سر پر — بے وقوف
شرارت — بی وی کی تلاش
مسٹر مداری — الو کی دُم
اور ہنسی...
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

ایک شاندار ایڈونچر ہوگا۔ ایک نیا تجربہ ہوگا تمہارے لیے اور فرض کرو اگر اس شخص کی بات سچ نکلی تو یہ ایک سنسنی خیز بات ہوگی۔ پوری دنیا تم سے واقف ہو جائے گی۔''

''کیا پچھلے جنم میں' میں اندھی تھی یا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا جو ایسے شخص سے محبت کرنے لگی۔''

''اب کیا بتایا جائے' اب یہ مجید تو تحلیلِ نفسی ہی کے ذریعے سامنے آئے گا۔''

بہر حال بہت مشکلوں سے رضوی صاحب نے تہمینہ کو اس بات پر راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ اپنی تحلیلِ نفسی کروالے۔ استاد بھی اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے ایک مطالبہ بھی کر دیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اس موقع پر وہ خود بھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے کہا ''میں اس قضیۂ بے مہر کو آمادۂ استحقاق کر دوں گا۔ جو کچھ میں یاد دلا سکتا ہوں۔ وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں اس کے جنم جنم کا ساتھی ہوں' باراتی ہوں اور براتی ہوں۔''

استاد کی اس دلیل میں وزن تھا۔ اس لیے ان کی یہ بات مان لی گئی کہ اس تاریخی موقع پر وہ خود بھی وہیں موجود ہوں گے۔ جس ماہر نفسیات کو یہ کام کرنا تھا' ان کا نام کامران مرزا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور نفسیات داں تھے لیکن یہ کیس ان کے لیے بھی بے پیدہ اور حیرت انگیز تھا۔

اس تماشے میں سب سے بری حالت تہمینہ کی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو استاد کا گلا گھونٹ دیتی لیکن مجبور ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برعکس استاد بالکل پُرسکون تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے آدھی جنگ جیت لی ہے اور آدھی تحلیلِ نفسی کے بعد جیت لیں گے۔

بہر حال ہم سب ایک بڑے تماشے کے لیے ڈاکٹر کامران مرزا کے پاس پہنچ گئے۔ ان کو بھی استاد اور تہمینہ کی تصویریں دکھائی گئیں جن کو دیکھ کر ان کو غش آنے لگا تھا۔ پھر ایک کمرے میں ہم سب جمع ہوئے۔ تہمینہ کو ایک آرام دہ کاؤچ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں' استاد اور رضوی صاحب اس کمرے میں موجود تھے۔

''اب میں تم پر مصنوعی نیند طاری کروں گا۔'' کامران مرزا نے تہمینہ سے کہا ''اس کو ہپناٹزم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نیند کے عالم میں تمہارا لاشعور آزاد ہو جائے گا اور تم میرے یا اس شخص کے حوالوں کے جواب دو گی۔ تمہارا شعور یا لاشعور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ بیان کر دے گا۔ تم سے اس نیند کے عالم میں غیر اخلاقی سوالات نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی تم ان کے جواب کی پابند ہو گی' کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے'' تہمینہ نے اپنی گردن ہلا دی۔

پھر ڈاکٹر کامران مرزا نے اپنا تنویمی عمل شروع کر دیا۔ وہ واقعی اس فیلڈ کے ماہر انسان تھے۔ ذرا سی دیر میں تہمینہ گہری نیند میں تھی۔

''تم سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو جس کا نام استاد محبوب نرالے عالم ہے؟''

''نہیں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''ایک دو برس پیچھے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں ملاقات ہوئی ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ یہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔''

''کچھ اور پیچھے جاؤ۔ پانچ دس برس۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں' ہرگز نہیں۔ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنے بچپن میں چلی جاؤ۔ جب بہت سے چہرے تمہارے لیے نا آشنا تھے۔ یاد کرو' ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ شخص تم سے ملا ہو؟''

''میں اپنے بچپن میں ہوں۔ بہت سے لوگ میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ بہت سے چہرے ہیں ان میں یہ نہیں ہے' بالکل نہیں۔''

''اچھا' اب تم اپنے بچپن سے بھی پیچھے چلی جاؤ۔ پچھلے جنم میں۔''

''اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں محسوس کر رہی۔''

''یاد کرو' اب استاد بول پڑے ''پچھلے جنم میں تمہارا نام زرخانہ تھا۔ تم ادغام مملکت ناجیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔''

''ایک تو یہ شخص اتنی عجیب زبان بولتا ہے کہ اچھا خاصا شخص پاگل ہو کر رہ جائے۔'' کامران مرزا نے جھلا کر کہا۔

''استاد۔ تم اپنی قابلیت رہنے دو'' میں نے استاد کے شانے پر تھپکی دی ''یہ نازک معاملہ ہے۔ تمہاری جناتی زبان سے تہمینہ کا دماغی توازن بھی خراب ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کس طرح مدعائے اظہار کروں؟'' استاد نے بے بسی ظاہر کی۔

''آسان بات کرو'' میں نے کہا ''اس بدنصیب کو کچھ یاد بھی دلانا ہے تو آسان الفاظ میں یاد دلاؤ۔''

''دیکھو تہمینہ!'' استاد نے اسے مخاطب کیا ''ہم دونوں فرانخون کے زمانے میں لاہور میں تھے۔ ایک بار ملتان بھی گئے تھے۔ ہم نے گوالیار میں تصویریں کھنچوائیں تھیں'' استاد نہ جانے کیا کیا بولے جا رہے تھے۔

اور ہم لوگوں کا یہ حال تھا کہ ہم ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ استاد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ انہوں نے ہمیں ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ کامران مرزا بھی پیٹ پکڑ کر ہنسے جا رہے تھے۔ ایسے لوگ ان کے پاس پہلی بار آئے ہوں گے۔ لیکن استاد کی ہر بات کے جواب میں وہ صرف یہی کہہ رہی تھی کہ اندھیرا' صرف اندھیرا' اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ساتھ پچھلے جنم وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے'' کامران مرزا نے بالآخر اعلان کر دیا ''جو کچھ بھی ہے' بس اتفاق ہے۔''

''آپ اس کو ہونس میں لائیں تو پھر بتاتا ہوں'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کامران مرزا نے تہمینہ کو نیند سے بیدار کر دیا تھا۔

''ہاں' اب بتاؤ استاد! یہ کیا سلسلہ ہے'' ہم سب نے استاد کی طرف دیکھا۔

''سلسلہ یہ ہے کہ اس بے چاری کے ساتھ واقعی کوئی پچھلا جنم نہیں ہے'' استاد نے کہا۔

''کیا!'' ہم سب پر جیسے بجلی گر پڑی تھی ''تو پھر یہ سب کیا تھا؟'' میں نے پوچھا ''تمہارے پاس تہمینہ کی جعلی تصویریں کہاں سے آ گئیں؟''

''یہ تصویریں جعلی نہیں ہیں بلکہ تہمینہ کی ماں کی ہیں'' استاد نے انکشاف کیا۔

پھر استاد کی زبانی جو کہانی ہمیں معلوم ہوئی۔ وہ اچھی خاصی دلچسپ کہانی تھی۔

تہمینہ کی ماں کسی زمانے میں کوٹھے پر گایا کرتی تھی۔ تہمینہ اس وقت صرف چھ ماہ کی تھی۔ ایک دن استاد نے اسے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئے۔ استاد اس زمانے میں بہت رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ رنگین مزاج تو وہ اب بھی تھے لیکن اس رنگین مزاجی کو ان کی نا قابلِ فہم زبان نے تباہ کر دیا تھا۔ تو ہوا یہ کہ تہمینہ کی ماں بھی استاد کا دم بھرنے لگی اور وہ دونوں کچھ دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ وہ تصویریں اسی زمانے کی یادگار تھیں۔ پھر وقت نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ استاد کہیں اور چلے گئے۔ تہمینہ کی ماں کہیں اور۔ اور ایک دن اس کا انتقال ہو گیا۔

پھر تہمینہ بڑی ہو کر فلم انڈسٹری میں آ گئی۔ ماں کی موت کے وقت اس کی عمر صرف تین برس کی تھی۔ اس لیے اسے اپنی ماں کے خدوخال بھی یاد نہیں رہے تھے اور اس کے پاس ماں کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی لیکن یہ اتفاق تھا کہ وہ بالکل اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ لیکن اسے خود اس بات کا احساس نہیں تھا۔ زمانے نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھری تھی۔ پھر کسی نے اس کی پرورش کی اور بڑی ہو کر اس نے فلم انڈسٹری جوائن کر لی۔

ایک بار استاد نے کسی شوٹنگ کے دوران میں اس کو دیکھ لیا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ روزینہ کی بیٹی ہے۔ وہ اس کے پاس گئے لیکن تہمینہ پر کامیابی کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ اس نے استاد کی بات ہی نہیں سنی اور اسے جھڑک کر اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ پھر وہ اس بات کو اور استاد کو بھول بھی گئی تھی۔

استاد بھنا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت قسم کھالی تھی کہ وہ اس توہین کا ضرور بدلہ لیں گے۔ حالانکہ یہ سب کچھ استاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ لیکن جب سنک سوار ہو جائے تو پھر کون سوچتا ہے اور استاد پر بھی سنک سوار ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ عظیم الشان تماشا کر ڈالا۔

یہ اتفاق تھا کہ میں استاد کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے گیا۔ جہاں تہمینہ سے اس کی ملاقات ہوئی اور استاد نے اپنے ڈرامے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھالیا۔ انہوں نے جب اپنی کہانی ختم کی تو ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

''آپ نے تو کمال کر دیا استاد'' میں نے کہا ''پوری فلم انڈسٹری کو ہلا کر رکھ دیا۔''

تہمینہ اس وقت بالکل خاموش تھی۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آنے لگی تھی۔ وہ ماں جو بالکل اسی کی طرح تھی اور جس کو تہمینہ نے بہت پہلے کھو دیا تھا۔ جس کے دھندلے سے نقوش بھی اس کے ذہن میں موجود نہیں تھے۔

''اب ذرا اپنے رضوی صاحب سے دریافت مطلب کر کہ میں افتخار بے جا و سرمایہ حیات کے ناٹک کا اسیر ہوں یا نہیں؟'' استاد نے کہا۔

''کیا مطلب ابتداد! ذرا آسان کر کے بتائیں۔''

''مطلب یہ کہ میں اداکاری کر سکتا ہوں یا نہیں؟''

رضوی صاحب نے آگے بڑھ کر استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ صرف اداکاری ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں کیا۔''

استاد ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ اس بار تہمینہ بھی ان کی ہنسی میں ساتھ دے رہی تھی۔

ایک شاندار ایڈونچر ہوگا۔ ایک نیا تجربہ ہوگا تمہارے لیے اور فرض کرو اگر اس شخص کی بات سچ نکلی تو یہ ایک سنسنی خیز بات ہوگی۔ پوری دنیا تم سے واقف ہو جائے گی۔''

''کیا پچھلے جنم میں' میں اندھی تھی یا میرا دماغ خراب ہوگیا تھا جو ایسے شخص سے محبت کرنے لگی۔''

''اب کیا بتایا جائے' اب یہ بھید تو تحلیلِ نفسی ہی کے ذریعے سامنے آئے گا۔''

بہرحال بہت مشکلوں سے رضوی صاحب نے تہمینہ کو اس بات پر راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ اپنی تحلیلِ نفسی کروالے۔ استاد بھی اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے ایک مطالبہ بھی کر دیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اس موقع پر وہ خود بھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے کہا ''میں اس قضیۂ بے مہر کو آمادۂ استحقاق کر دوں گا۔ جو کچھ میں یاد دلا سکتا ہوں۔ وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں اس کے جنم جنم کا ساتھی ہوں' باراتی ہوں اور جاتا ہوں۔''

استاد کی اس دلیل میں وزن تھا۔ اس لیے ان کی یہ بات مان لی گئی کہ اس تاریخی موقع پر وہ خود بھی وہیں موجود ہوں گے۔ جس ماہر نفسیات کو یہ کام کرنا تھا' ان کا نام کامران مرزا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور نفسیات داں تھے لیکن یہ کیس ان کے لیے بھی پے چیدہ اور حیرت انگیز تھا۔

اس تماشے میں سب سے بری حالت تہمینہ کی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو استاد کا گلا گھونٹ دیتی لیکن مجبور ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برعکس استاد بالکل پُرسکون تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے آدھی جنگ جیت لی ہے اور آدھی تحلیلِ نفسی کے بعد جیت لیں گے۔

بہرحال ہم سب ایک بڑے تماشے کے لیے ڈاکٹر کامران مرزا کے پاس پہنچ گئے۔ ان کو بھی استاد اور تہمینہ کی تصویریں دکھائی گئیں جن کو دیکھ کر ان کو غش آنے لگا تھا۔ پھر ایک کمرے میں ہم سب جمع ہوئے۔ تہمینہ کو ایک آرام دہ کاؤچ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں' استاد اور رضوی صاحب اس کمرے میں موجود تھے۔

''اب میں تم پر مصنوعی نیند طاری کروں گا۔'' کامران مرزا نے تہمینہ سے کہا ''اس کو ہپناٹزم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نیند کے عالم میں تمہارا لاشعور آزاد ہو جائے گا اور تم میرے یا اس شخص کے حوالوں کے جواب دو گی۔ تمہارا شعور یا لاشعور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ جو کچھ تمہی ہے وہ بیان کر دے گا۔ تم سے اس نیند کے عالم میں غیر اخلاقی سوالات نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی تم ان کے جواب کی پابند ہو گی' کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے'' تہمینہ نے اپنی گردن ہلا دی۔

پھر ڈاکٹر کامران مرزا نے اپنا تنویمی عمل شروع کر دیا۔ وہ واقعی اس فیلڈ کے ماہر انسان تھے۔ ذرا سی دیر میں تہمینہ گہری نیند میں تھی۔

''تم سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو جس کا نام استاد محبوب نرالے عالم ہے؟''

''نہیں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''ایک دو برس پیچھے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں ملاقات ہوئی ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ یہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔''

''کچھ اور پیچھے جاؤ۔ پانچ دس برس۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں' ہرگز نہیں۔ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنے بچپن میں چلی جاؤ۔ جب بہت سے چہرے تمہارے لیے نا آشنا تھے۔ یاد کرو' ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ شخص تم سے ملا ہو؟''

''میں اپنے بچپن میں ہوں۔ بہت سے چہرے میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ بہت سے چہرے لیکن ان میں یہ نہیں ہے' بالکل نہیں۔''

''اچھا' اب تم اپنے بچپن سے بھی پیچھے چلی جاؤ' اپنے پچھلے جنم میں۔''

''اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں محسوس کر رہی۔''

''یاد کرو' اب استاد بول پڑے ''پچھلے جنم میں تمہارا نام زرخانہ تھا۔ تم ادغام مملکت ناجنیر سے تعلق رکھتی تھیں۔''

''ایک تو یہ شخص اتنی عجیب زبان بولتا ہے۔ اچھا خاصا شخص پاگل ہو کر رہ جائے۔'' کامران مرزا نے جھلا کر کہا۔

''استاد۔ تم اپنی قابلیت رہنے دو'' میں نے استاد کے شانے پر تھپکی دی ''یہ نازک معاملہ ہے۔ تمہاری بناتی زبان سے تہمینہ کا دماغی توازن بھی خراب ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کس طرح مدعائے اظہار کروں؟'' استاد نے بے بسی ظاہر کی۔

''آسان بات کرو'' میں نے کہا ''اس بدنصیب کو کچھ یاد بھی دلانا ہے تو آسان الفاظ میں یاد دلاؤ۔''

''دیکھو تہمینہ!'' استاد نے اسے مخاطب کیا ''ہم دونوں فراغون کے زمانے میں لاہور میں تھے۔ ایک بار ملتان بھی

گئے تھے۔ ہم نے گوالیار میں تصویریں کھنچوائیں تھیں'' استاد نہ جانے کیا کیا بولنے لگے تھے۔

اور ہم لوگوں کا یہ حال تھا کہ ہم ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ استاد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ انہوں نے ہمیں ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ کامران مرزا بھی پیٹ پکڑ کر ہنسے جا رہے تھے۔ ایسے لوگ ان کے پاس پہلی بار آئے ہوں گے۔ لیکن استاد کی ہر بات کے جواب میں وہ صرف یہی کہہ رہی تھی کہ اندھیرا' صرف اندھیرا' اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ساتھ پچھلے جنم وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے'' کامران مرزا نے بالآخر اعلان کر دیا ''جو کچھ بھی ہے' بس اتفاق ہے۔''

''آپ اس کو ہوش میں لائیں تو پھر بتاتا ہوں'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کامران مرزا نے تہمینہ کو نیند سے بے دار کر دیا تھا۔

''ہاں' اب بتاؤ استاد! یہ کیا سلسلہ ہے'' ہم سب نے استاد کی طرف دیکھا۔

''سلسلہ یہ ہے کہ اس بے چاری کے ساتھ واقعی کوئی پچھلا جنم نہیں ہے'' استاد نے کہا۔

''کیا!'' ہم سب پر جیسے بجلی گر پڑی تھی ''تو پھر یہ سب کیا تھا؟'' میں نے پوچھا ''تمہارے پاس تہمینہ کی جعلی تصویریں کہاں سے آ گئیں؟''

''یہ تصویریں جعلی نہیں ہیں بلکہ تہمینہ کی ماں کی ہیں'' استاد نے انکشاف کیا۔

پھر استاد کی زبانی جو کہانی ہمیں معلوم ہوئی۔ وہ اچھی خاصی دلچسپ کہانی تھی۔

تہمینہ کی ماں کسی زمانے میں کوٹھے پر گایا کرتی تھی۔ تہمینہ اس وقت صرف چھ ماہ کی تھی۔ ایک دن استاد نے اسے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئے۔ استاد اس زمانے میں بہت رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ رنگین مزاج تو وہ اب بھی تھے لیکن اس رنگین مزاجی کو ان کی ناقابلِ فہم زبان نے تباہ کر دیا تھا۔ تو ہوا یہ کہ تہمینہ کی ماں بھی استاد کا دم بھرنے لگی اور وہ دونوں کچھ دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ وہ تصویریں اسی زمانے کی یادگار تھیں۔ پھر وقت نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ استاد کہیں اور چلے گئے۔ تہمینہ کی ماں کہیں اور۔ اور ایک دن اس کا انتقال ہو گیا۔

پھر تہمینہ بڑی ہو کر فلم انڈسٹری میں آ گئی۔ ماں کی موت کے وقت اس کی عمر صرف تین برس کی تھی۔ اس لیے اسے اپنی ماں کے خدوخال بھی یاد نہیں رہے تھے اور اس کے پاس ماں کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی لیکن یہ اتفاق تھا کہ وہ بالکل اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ لیکن اسے خود اس بات کا احساس نہیں تھا۔ زمانے نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھری تھی۔ پھر کسی نے اس کی پرورش کی اور بڑی ہو کر اس نے فلم انڈسٹری جوائن کر لی۔

ایک بار استاد نے کسی شوٹنگ کے دوران میں اس کو دیکھ لیا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ روزینہ کی بیٹی ہے۔ وہ اس کے پاس گئے لیکن تہمینہ پر کامیابی کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ اس نے استاد کی بات ہی نہیں سنی اور اسے جھڑک کر اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ پھر وہ اس بات کو اور استاد کو بھول بھی گئی تھی۔

استاد بھنا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت قسم کھالی تھی کہ وہ اس توہین کا ضرور بدلہ لیں گے۔ حالانکہ یہ سب کچھ استاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ لیکن جب سنک سوار ہو جائے تو پھر کون سوچتا ہے اور استاد پر بھی سنک سوار ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ عظیم الشان تماشا کر ڈالا۔

یہ اتفاق تھا کہ میں استاد کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے گیا۔ جہاں تہمینہ سے اس کی ملاقات ہوئی اور استاد نے اپنے ڈرامے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیا۔ انہوں نے جب اپنی کہانی ختم کی تو ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

''آپ نے تو کمال کر دیا استاد'' میں نے کہا ''پوری فلم انڈسٹری کو ہلا کر رکھ دیا۔''

تہمینہ اس وقت بالکل خاموش تھی۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آنے لگی تھی۔ وہ ماں جو بالکل اسی کی طرح تھی اور جس کو تہمینہ نے بہت پہلے کھو دیا تھا۔ جس کے دھندلے سے نقوش بھی اس کے ذہن میں موجود نہیں تھے۔

''اب ذرا اپنے رضوی صاحب سے دریافت مطلب کرو کہ میں افتخار بے جاد سرمایہ حیات کے ناٹک کا اسیر ہوں یا نہیں؟'' استاد نے کہا۔

''کیا مطلب ابتدا؟ ذرا آسان کر کے بتائیں۔''

''مطلب یہ کہ میں اداکاری کر سکتا ہوں یا نہیں؟''

رضوی صاحب نے آگے بڑھ کر استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ صرف اداکاری ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں کیا۔''

استاد ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ اس بار تہمینہ بھی ان کی ہنسی میں ساتھ دے رہی تھی۔

فلمستان

قسط:119

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ھی نظر آتے ھیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ھوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ آپ کی ذھن رسا کی پرورش میں کوئی کمی واقع ھو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ھمارے ایسے ھی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ھیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رھے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ھائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انھیں اپنے عہد کی ھر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اُس کے بارے میں آگاھی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ھے۔ آیئے ھم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ھوتا ھے۔

ادب و صحافت سے فلمی دُنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

دلیپ کمار نے جب اپنی اداکاری کا ایک مخصوص انداز اپنایا تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اداکاری کے شعبے میں ہالی ووڈ کے متذکرہ اداکار مارلن برانڈو سے متاثر ہیں۔ مارلن برانڈو کا مکالمے ادا کرنے کا مخصوص انداز تھا۔ وہ دھیمی آواز میں منہ ہی منہ میں یوں بولتے تھے کہ اس کو سننا اور سمجھنا آسان نہ تھا۔ ان کے چہرے پر عموماً سنجیدگی طاری رہتی تھی اور کئی مناظر میں ان کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے محروم نظر آتا تھا۔ دلیپ کمار کی اداکاری، خصوصاً رومانی مناظر اور ڈرامائی مناظر کی اداکاری، میں بھی یہی رنگ جھلکتا تھا لیکن اس بات میں سچائی اس لیے نظر نہیں آتی کہ دلیپ کمار نے اپنی اداکاری کا آغاز چالیس کی دہائی کے آخر میں کیا تھا اور 1947ء میں فلم ''جگنو'' کی نمائش کے بعد ہی وہ ایک مقبول اور معروف اداکار بن گئے تھے جبکہ مارلن برانڈو کی پہلی فلم ''دی مین'' 1950ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ گویا ان کی پہلی فلم جب ریلیز ہوئی اس وقت دلیپ کمار ایک صاحب طرز اداکار بن چکے تھے اور مقبولیت کی بلندیوں پر تھے۔

اس لیے دلیپ کے مارلن برانڈو سے متاثر ہونے کا تصور درست نہیں ہے لیکن جہاں تک اداکاری کے شعبے میں اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا سکہ چلا دینے کا تعلق ہے، اس معاملے میں دونوں ہی فنکار اپنی اپنی جگہ یکتا اور منفرد تھے۔

دلیپ کمار کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ان کی دوسری فلم ''ملن'' کو بہت سراہا گیا مگر اسے بھی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

...ں آفس پر کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ فلم ''جگنو'' نے انہیں ...ب دم اسٹار بنا دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے پے در پے کئی ...ہٹ فلموں میں کام کیا اور بہ صغیر کے فلم بینوں کے محبوب ...ار بن گئے۔ اپنے عہد کے ان دو عظیم اداکاروں میں صرف ...یں مشترک تھیں۔ ہاں، ایک اور قدر مشترک یہ بھی کہ ...ابتداء میں دلیپ کمار کو بھی اداکاری سے رغبت نہ تھی۔ یہی ...حال مارلن برانڈو کا تھا۔ اگر وہ اپنی بہن کے دیکھا دیکھی یا اس ...شورے پر نیویارک میں اداکاری کے تربیتی ادارے میں ...داخلہ نہ لیتے تو شاید کبھی اداکار نہ بن پاتے۔ انہوں نے اس ...سے پہلے جتنے بھی کام کیے تھے انتہائی بے دلی اور بے پروائی سے ...کیے تھے لیکن اداکاری میں انہیں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے جس اسکول میں داخلہ لیا... وہاں ان کی استاد شیلا ایڈر نے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی یہ لڑکا تھیٹر کی اداکاری میں بہت نام پیدا کرے گا۔ ان کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور صرف ایک سال کے عرصے میں مارلن برانڈو نے اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کرالیا اور وہ نیویارک میں تھیٹر کے قابل ذکر اداکاروں میں شمار ہونے لگے۔

مارلن برانڈو نے اداکاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی، اگرچہ اپنی اداکاری کا اسلوب انہوں نے بذات خود تراشا تھا۔ اس کے برعکس دلیپ کمار نے کسی تربیتی ادارے میں تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ فلمیں دیکھ کر اور دو فلموں میں کام کرنے کے بعد میں انہوں نے اداکاری کے رموز سے

واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے آگے ان عظیم فن کاروں کا موازنہ کرنا بے محل ہوگا۔

دلیپ کمار کی داستان تو آپ سن ہی چکے۔ اب ان کے ہم عصر مارلن برانڈو کا قصہ بھی سن لیجئے جو 80 سال کی عمر میں جولائی 2004ء میں انتقال کر گئے۔ البتہ ایک اور معاملے میں وہ اور دلیپ کمار ایک جیسے تھے۔ دلیپ کمار نے ساٹھ سال کے فلمی کیریئر میں صرف 50 فلموں میں کام کیا جبکہ لگ بھگ اتنے ہی عرصے میں مارلن برانڈو نے صرف چالیس فلموں میں اداکاری کی۔ اس کا سبب ان کی سستی اور تن آسانی کے علاوہ یہ بھی تھا کہ وہ بہت موڈی اداکار تھے۔ اپنی مرضی سے اپنی پسند کے کردار قبول کرتے تھے جو کہ اس وقت ہالی ووڈ کا عام رواج نہ تھا۔ انہوں نے نپولین کی زندگی کے بارے میں بنائی جانے والی فلم میں کام کرنے سے گریز کیا اور اسٹوڈیو کے تقاضوں سے بچنے کے لیے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ سخت ذہنی اور اعصابی دباؤ کا شکار ہیں اس لیے کام نہیں کر سکتے مگر اسٹوڈیو والے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے فلم کا شیڈول ملتوی کر دیا اور اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ جب مارلن برانڈو اسپتال سے باہر نکلیں تو انہیں چھاپ لیا جائے۔ انہیں مقدمے کی دھمکی بھی دی گئی۔ بہرحال برانڈو کو اپنی خواہش اور پسند کے خلاف اس فلم میں کام کرنا پڑا۔ اس فلم نے ان کے نام کی وجہ سے خاصا اچھا بزنس کیا تھا لیکن خود مارلن برانڈو کے خیال میں اور ان کے پرستاروں کی رائے میں، یہ ایک بری فلم تھی جس میں مارلن برانڈو جیسے فنکار کو ضائع کر دیا گیا۔ یعنی مارلن برانڈو کا انداز ہ درست تھا۔

مارلن برانڈو نے شہرت اور دولت بھی بہت کمائی، بہت صدمے بھی اٹھائے جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ پہلے ان کے ابتدائی حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ مارلن برانڈو کو فطری اور سب سے بالکل مختلف اداکاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ 1972ء میں کافی عرصے بعد انہوں نے فلم ''گاڈ فادر'' میں مرکزی کردار کیا اور اس کردار کو ناقابلِ فراموش بنا دیا۔ اس کے بعد انہیں ''گاڈ فادر آف امریکن ایکٹرز'' کا لقب دیا گیا۔ اس فلم میں انہیں آسکر ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اس فلم کو کلاسیکی فلموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مارلن برانڈو کی کامیابیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا اور انہوں نے کئی فلموں میں کام کیا جنہیں شاہکار مانا جاتا ہے۔ انہیں آسکر ایوارڈ حاصل کر سکے لیکن وہ دوسروں کے لیے ایک مشعلِ راہ تصور کیے گئے۔ جیمز ڈین، پال نیومین اور رابرٹ ڈی نیرو جیسے عظیم اداکاروں نے ان کا اثر قبول کیا۔ دوسروں کے لیے ان کی پیروی کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ انہیں خطرناک اور حقیقی اداکاری کا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی اداکاری، بول چال اور مکالموں کی ادائیگی کا انداز ہی یکسر مختلف تھا، جسے کوئی دوسرا فنکار کوشش کے باوجود بھی نہیں اپنا سکتا تھا۔

مارلن برانڈو کا تعلق ایک معمولی گھرانے سے تھا۔ وہ اپریل 1924ء میں امریکی ریاست نبراسکا میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ اداکارہ تھیں لیکن کسی خاص شہرت کی حامل نہ تھیں۔

مارلن برانڈو بچپن ہی سے موڈی، خودسر اور من موجی تھے۔ وہ شریر بھی تھے اور حساس اور درشت مزاج بھی۔ مسکراہٹ اور ہنسی بہت کم ان کے چہرے پر نمودار ہوتی تھی۔ فلموں میں بھی انہوں نے اپنا یہی انداز برقرار رکھا۔ وہ فلموں میں بھی بہت کم مسکراتے تھے۔ قہقہہ مار کر ہنسنا تو جیسے ان کی سرشت میں تھا ہی نہیں۔

ان کے مضبوط جسم اور درشت مزاجی کے پیشِ نظر فیصلہ کیا گیا کہ وہ فوج کے لیے موزوں رہیں گے لیکن کچھ عرصے بعد ہی انہیں ملٹری اسکول سے نکال دیا گیا۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی اسکولوں سے نکالے جا چکے تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے نیویارک آزمائی کے لیے نیویارک جانے کا فیصلہ کیا جہاں ان کی بہن اداکاری کے ایک اسکول میں تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ بہن کی دیکھا دیکھی اور اس کے کہنے پر مارلن برانڈو نے بھی اس اسکول میں داخلہ لے لیا۔ خیال یہی تھا کہ وہ اس اسکول سے بھی نکال دیے جائیں گے لیکن خلافِ توقع تھیٹر کا ماحول اور اداکاری مارلن کو پسند آ گئی اور پہلی مرتبہ انہوں نے کوئی کام پوری دلچسپی اور دل جمعی کے ساتھ کیا اور صرف ایک سال کے مختصر عرصے میں وہ نیویارک کے نوجوان اور نووارد اداکاروں میں نمایاں ہو گئے۔

پہلی بار انہیں شہرت یافتہ ہدایت کار ایلیا کازان کی فلم ''اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر'' (A STREET CAR NAMED DESIRE) سے ملی تھی۔ مارلن برانڈو کو بہت سہولت حاصل تھی کہ 1947ء میں اسی ڈرامے میں انہوں نے اسٹیج پر کام کیا تھا اور ان کی اداکاری کو بے حد پسند کیا گیا تھا۔ ہدایت کار ایلیا کازان کی نظروں میں وہ اسی وقت سے سما گئے تھے۔ ایلیا کازان ترکی نژاد تھے لیکن امریکا میں آباد ہو گئے تھے۔ انہیں ہالی ووڈ کی چوٹی کے اداکاروں میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ایلیا کازان اور مارلن برانڈو کے مابین ایسی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی کہ بعد میں ان دونوں نے اکٹھے جن فلموں میں بھی کام کیا وہ کلاسیکی اور یادگار حیثیت اختیار کر گئیں۔

''اے اسٹریٹ کار'' معروف امریکی ڈراما نویس ٹینیسی ولیم کے اسی نام کے اسٹیج ڈرامے پر فلمائی گئی تھی۔ فلمی شہرت و ریاست کے لیے ذہین اور ہنرمند ایلیا کازان نے اس میں بہت خوب صورت تبدیلیاں کی تھیں اور ہیرو کے طور پر ہالی ووڈ کے ممتاز اور چوٹی کے اداکاروں کو نظر انداز کر کے مارلن برانڈو کا انتخاب کیا تھا۔ مارلن برانڈو اسٹیج پر بھی یہ کردار بہت خوب صورتی سے ادا کر چکے تھے، مگر اس ڈرامے کو دیکھنے والے زیادہ نہ تھے۔ جب اس کو فلم کے روپ میں پیش کیا گیا تو ساری دنیا میں اس کا شہرہ ہو گیا اور مارلن برانڈو راتوں رات اسٹار بلکہ سپر اسٹار بن گئے۔ مارلن برانڈو کی شخصیت اور اداکاری میں فلم بینوں کو ایک بالکل مختلف اداکار نظر آیا تھا جو اپنی اداکاری کے حسن کی وجہ سے ان کے دلوں میں اس طرح گھر کر گیا کہ پھر آئندہ 60 برس تک اس کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ ''اسٹریٹ کار'' کے لیے مارلن برانڈو کو بہترین اداکار کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ یہ فلم 1951ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ ڈرامے کی گہرائی، ایلیا کازان کی ہدایت کاری اور مارلن برانڈو کی اداکاری نے اسے ایک مختلف قسم کی فلم کا روپ دے دیا تھا۔ دیکھنے والوں نے ایسی فلم اور ایسا فطری اداکار پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس پر ایلیا کازان کی بے داغ اور خوب صورت ہدایت کاری نے اس کی اہمیت اور تاثر میں چار چاند لگا دیے تھے۔

''اسٹریٹ کار'' مارلن برانڈو کے لیے کامیابیوں اور مقبولیت کا پیامبر بن کر آئی تھی۔ اس کے بعد برانڈو نے پے در پے کئی فلموں میں منفرد اور دل میں اتر جانے والے کردار ادا کیے اور اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔ انہوں نے فلم بینوں کو اداکاری کے ایک یکسر مختلف انداز سے متعارف کرایا تھا جس نے ان کے دلوں پر ایسا گہرا نقش ثبت کر دیا کہ پھر ساری زندگی وہ مارلن برانڈو کی عظمت اور صلاحیتوں کے معترف رہے۔

قومِ عاد

قومِ عاد کا مشہور شہر احقاف ہے۔ احقاف کی موجودہ حالت دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہاں کوئی عظیم قوم تھی۔ ہزاروں برس پہلے یہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا لیکن تبدیلیٔ آب و ہوا کے باعث صحرا و ریگ زار بن کر رہ گیا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ ایک لق و دق صحرا ہے، جس کے اندرونی حصے میں جانے کی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ 1843ء میں بوہریا کا ایک فوجی سپاہی ایک عرب رہنما کے ساتھ اس علاقے کو دیکھنے گیا۔ جب اس نے وہاں جانے کا ارادہ کیا تو عرب نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ عرب تو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ سپاہی اکیلا ہی اس طرف گیا۔ اس کا بیان ہے صحرا کا یہ حصہ ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے اور جو چیز وہاں گرتی ہے ریت میں غرق ہو جاتی ہے۔ ریت باریک فاسفورف کی مانند ہے اس نے ایک دیگچے کو رسی سے باندھ کر وہاں پھینکا۔ پانچ منٹ میں وہ دیگچہ وہاں غرق ہو گیا اور رسی کا سرا گل سڑ گیا۔

تفسیر سورہ احقاف از البلیہ کا ناول
مرسلہ: مشرف حسین ندیم، لیاقت پور

برجستگی

حضرت داغ دہلوی ایک مرتبہ اپنے عزیز شاگرد کے پاس مہمان تھے۔ ایک دن شام کے وقت استاد اور شاگرد دونوں برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سامنے چھ سات برس کا شاگرد کا بچہ کھیل رہا تھا۔ اسے جو شرارت سوجھی تو جھٹ کمال صفائی سے بلبل کا پنجرہ کھول کر بیچاری بلبل کو زنجیر پہنا دی۔ شاگرد موصوف اپنے بیٹے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ اس شوخی پر مسکرائے اور استاد کو متوجہ کیا اور بولے۔

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبل ناشاد کا

حضرت داغ نے برجستہ کہا

کھیل کے دن ہیں، لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

(مرسلہ: ظفر اقبال تبسم وڑائچ، جودھ پور خانیوال)

برانڈو نے بھی دلیپ کمار کی طرح پیسے بٹورنے کے لیے زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا مگر جن فلموں میں کام کیا ان میں اداکاری کا ایسا اسلوب پیش کیا جسے نہ پھر کبھی کوئی دہرا سکا اور نہ ہی اس کی نقالی کر سکا۔ بظاہر مارلن برانڈو اسکرین پر ایک عام آدمی کی طرح روزمرہ کی زندگی کا کردار پیش کرتے نظر آتے تھے لیکن جس اداکاری کو لوگ سہل سمجھتے تھے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مارلن برانڈو کو ''اداکاروں کا گاڈ فادر'' اور ''اداکاروں کا اداکار'' جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے وہ انہوں نے اپنی پہلی فلم ''دی مین'' میں بھی بہت اچھی کی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے ایک زخمی فوجی کا کردار ادا کیا جو اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ اس کردار کا تمام کرب انہوں نے بڑی مہارت سے اسکرین پر پیش کر دیا تھا مگر قسمت نے یاوری نہ کی اس لیے یہ فلم ہٹ نہ ہو سکی۔ اس لیے معدودے چند دیکھنے والے بھی بھول گئے کہ مارلن برانڈو نام کا کوئی اداکار بھی ہالی ووڈ میں رفعتوں کی انتہا کو چھونے کے لیے منتظر ہے۔

فلم ''ویواز پاٹا'' میکسیکو کی جنگِ آزادی اور بغاوت کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ ایک بار پھر کازان اور مارلن برانڈو نے ایک عظیم شاہکار کو جنم دیا تھا۔ برانڈو نے اس فلم میں نظام سے بغاوت کرنے والے ایک نوجوان کا کردار کیا تھا جو کہ ایک اکھڑ، بہادر اور بے خوف جاں باز ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے گروہ کا لیڈر بن گیا۔ جب حکمران نے عاجز آ کر باغیوں کے وفد کو شرفِ ملاقات بخشا اور برانڈو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باغیانہ انداز میں گفتگو کی تو ہم دنگ رہ گئے۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی وفد کے نمائندوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور زپاٹا کے نام کے گرد سرخ روشنائی سے ایک دائرہ بنا دیا۔ یہ واقعہ یاد آتے ہی زپاٹا کو اس کی یہ گستاخی پسند نہ آئی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ارکانِ وفد کی فہرست میں سے نوجوان کے نام کے اردگرد سرخ روشنائی سے ایک دائرہ بنا دیا۔ مطلب یہ کہ یہ شخص خطرناک ہے اس پر گہری نظر رکھی جائے۔ لیکن دائرہ بناتے ہی زپاٹا کو وہ منظر یاد آ گیا جب خود اس جوشیلے اور نڈر نوجوان کی جگہ کھڑا اپنی گفتگو کے انگارے اگل رہا تھا اور حاکم نے اس کے نام کے گرد سرخ روشنائی سے ایک دائرہ بنا دیا تھا۔ یہ واقعہ یاد آتے ہی زپاٹا کو پرانے دن اور پرانے واقعات بھی یاد آ گئے۔ اس کو احساس ہوا کہ آج وہ آتشِ دہن نوجوان جس انداز میں گفتگو کر رہا ہے ایک روز اس نے بھی اسی کمرے میں حاکم وقت کے ساتھ اسی لہجے میں گفتگو کی تھی۔ اس منظر میں برانڈو نے بدلتے ہوئے تاثرات اور اضطراب کے ذریعے انہوں نے ایک بھی مکالمہ ادا کیے بغیر جس خوب صورتی سے اس منظر کو پیش کیا دیکھنے والوں کو آج بھی یاد ہے۔ اس میں مارلن برانڈو کی اداکاری کے علاوہ منظر نامہ نویس اور ہدایت کار الیا کازان کی ہنرمندی کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔

ایسے ہی مناظر اور اداکاری کے مظاہر تھے جنہوں نے مارلن برانڈو کو اپنی فلمی زندگی کے آغاز ہی میں ایک لیجنڈ اور نادر روزگار فنکار بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی عمدہ اداکاری کے ساتھ فلم بینوں، فلم سازوں اور نقادوں کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ ''عظیم ترین اداکار'' اور ''اداکاروں کے اداکار'' کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ جب انہوں نے ایک طویل وقفے کے بعد فلم ''گاڈ فادر'' میں مافیا کے ایک سربراہ کا کردار ادا کیا۔۔۔ تو مالی ووڈ نے انہیں ''اداکاروں کے ''گاڈ فادر'' کا نام دے دیا۔

''گاڈ فادر'' ایک انتہائی دلچسپ اور خطرناک مافیا کی کہانی ہے جس میں سے ایک گروہ کے سربراہ کا کردار مارلن برانڈو نے ادا کیا تھا۔ اس قسم کے موضوعات کی فلموں میں ہمیشہ قتل و خون، فائرنگ، دھماکے اور خوفناک ایکسیڈنٹ دکھائے جاتے ہیں۔ مافیا کا باس ایک انتہائی کرخت چہرہ اور درشت لہجے میں بات کرنے والا ہنر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مارلن برانڈو نے ''گاڈ فادر'' میں ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ نہ کسی کو ظلم اور غیض و غضب کا نشانہ بنایا۔ نہ گولیاں چلائیں اور نہ ہی بلند اور درشت آواز میں مکالمے ادا کیے۔ یہ ہدایت کار اور مارلن برانڈو کے کمالِ فن کی انتہا قرار دی جا سکتی ہے۔ مارلن برانڈو نے اس فلم میں عجیب و غریب میک اپ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کے رخساروں کے اندر روئی یا کوئی اور چیز رکھ دی گئی تھی جس کی وجہ سے مسوڑھوں کے دونوں کناروں کا

ابھرا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں مکالمے بولتے تھے اس ایک گاڈ فادر بننے کے بعد بھی نہ تو انہوں نے درشت لہجہ اپنایا نہ ہی اپنی آواز میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے کے لیے اس کو بلند کیا۔ یہ عجیب و غریب قسم کا ''گاڈ فادر'' دیکھ کر فلم بین حیران رہ گئے۔ انہوں نے نہایت تحمل اور نرمی سے گفتگو کی اس میں تحکم کا انداز نمایاں تھا اور دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا تھا کہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی خواہ وہ ڈانٹ ڈپٹ اور چیخ و خروش کا مظاہرہ کریں یا نہ کریں۔ انہوں نے اپنی شخصیت پر ایک مرعوب کن ہستی کا لبادہ چڑھا لیا تھا۔ ان کا انداز بھی عام آدمیوں کی طرح سوٹ یا اوور کوٹ تھا اور لب و لہجہ بھی نرم اور ملائم۔ لیکن ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سننے والوں کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا، اور نہ ظاہر کرتے ہوئے بھی سارے لوگ ان سے مرعوب اور خوف زدہ نظر آتے تھے۔ اس قسم کے کرداروں اور کردار سازی کے حیرت انگیز نمونوں کی وجہ سے مارلن برانڈو کو اپنے عہد ہی کا نہیں بلکہ تاریخ کا عظیم اداکار بھی قرار دیا گیا۔

ان کے بعض کردار ادا کیے ہوئے بعض مکالمے ہمیشہ کے لیے دیکھنے والوں کے دلوں پر نقش ہو گئے۔ مثلاً جب ''اٹریکٹ کار'' میں وہ ''سیلا'' کہہ کر پکارتے ہیں تو یہ چیخ سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ گاڈ فادر میں ان کا ایک مکالمہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ انہوں نے اپنی مخصوص مدھم آواز میں کہا۔

''(ترجمہ) میں اسے ایک ایسی آفر دوں گا جسے وہ مسترد نہیں کر سکے گا۔''

اس فقرے کی ادائیگی میں تجسس، رعب، دھمکی اور تحکم شامل تھا۔ حالانکہ انہوں نے اپنی آواز ذرا بھی بلند نہیں کی تھی۔ اس فلم میں بہترین اداکاری پر مارلن برانڈو کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

دراصل مارلن برانڈو اور باکسنگ چیمپئن محمد علی میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں نڈر، انصاف پسند اور حق کے لیے حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانے والے تھے۔ محمد علی نے اپنی باکسنگ کے عروج میں ویت نام کی جنگ کے لیے بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی باکسنگ کے کئی بہترین سال ضائع ہو گئے۔ مقدمہ بازی اور لوگوں کے لعن طعن کا نشانہ بنے سو الگ۔ لیکن جب وہ دوبارہ باکسنگ رنگ میں آئے تو انہوں نے بزورِ بازو اپنا چھینا ہوا ٹائٹل کا اعزاز واپس لے لیا۔

مارلن برانڈو بھی ایک حق پسند اور انسانیت دوست شخص تھے۔ انہوں نے امریکا کے اصلی باشندوں کے حقوق کے لیے جدوجہد میں اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال ضائع کر دیئے۔ ان کے خلاف میڈیا میں زوردار مہم چلائی گئی جس کی وجہ سے عام فلم بین برانڈو سے متنفر ہو گئے۔ یہاں تک کہ فلم سازوں نے انہیں فلموں میں کاسٹ کرنا بند کر دیا۔ ایک عظیم اداکار کے ساتھ یہ ''حسنِ سلوک'' جسے کئی بار آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا، افسوس ناک ہی نہیں شرمناک بھی تھا۔

آیئے۔ پہلے مارلن برانڈو کے فنی سفر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مارلن برانڈو کو جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اداکاری سے کوئی رغبت نہ تھی۔ ہمارے ہاں ہر فنکار یہی بیان دیتا ہے کہ مجھے بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا۔ اداکاروں کے اداکار برانڈو نے ایسا بیان کبھی نہیں دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ انٹرویو دینے سے بھی گریز کرتا تھا۔ صحافیوں سے کتراتا تھا اور کئی بار ان سے جھگڑ بھی پڑا تھا۔ اگر وہ اتنا بلند پایہ فنکار نہ ہوتا تو شاید میڈیا اسے فراموش ہی کر دیتا اور آج کوئی اس کے نام سے واقف تک نہ ہوتا۔

مارلن برانڈو 3 اپریل 1924ء کو امریکی ریاست نبراسکا کے شہر اوماہا میں پیدا ہوا۔ پڑھنے لکھنے سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ باڈی بلڈنگ کا وہ نوعمری ہی سے شوقین تھا یہی وجہ ہے کہ جب اس نے فلموں میں اپنی مخصوص جیکٹ اور ٹی شرٹ پہن کر اداکاری کی تو اس کی مردانہ وجاہت مزید نمایاں ہو گئی۔ اس کے ترشے ہوئے طاقت ور بازو جو چھوٹی آستین کی شرٹ میں اور نمایاں ہو جاتے تھے دیکھنے والوں کو سحر میں مبتلا کر دیتے تھے۔ برانڈو وہ اداکار ہے جس نے امریکا میں ٹی شرٹ کا رواج عام کر دیا۔ سپر اسٹار بن جانے کے بعد بھی وہ بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر پتلون اور ٹی شرٹ پہنے گھومتا پھرتا تھا، جبکہ ہالی ووڈ کے فنکار قیمتی کاروں اور مہنگے ملبوسات کے عاشق ہوتے ہیں۔ برانڈو کو یہ ''اعزاز'' حاصل ہے کہ وہ اکثر اسکولوں سے نکالا گیا یہاں تک کہ ملٹری اکیڈمی نے بھی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی غنیمت جانا تھا۔ ذرا سوچیے کہ اگر وہ لکھ پڑھ کر انجینئر، ڈاکٹر بن جاتا یا ملٹری اسکول میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ فوجی عہدے تک پہنچ جاتا تو دنیا ایک مایہ ناز اداکار سے محروم ہو جاتی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

اپنے شہر اور ماحول سے اکتا کر اس نے نیویارک جانے کا ارادہ کیا جہاں اس کی بہن ایک معروف تربیتی ادارے میں ایکٹنگ کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔ برانڈو کا ایسا کوئی

ارادہ تو نہ تھا لیکن بہن اس کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر اپنے اسکول میں لے گئی تو وہاں کے ماحول اور اداکاری کے فن سے متاثر ہو کر برانڈو اسی اسکول میں داخلہ لینے پر مصر ہو گیا۔

اس کا ٹیسٹ لیا گیا، جو زیادہ کامیاب نہ تھا لیکن جہاں دیدہ استاد اس کی صلاحیتوں کو بھانپ گئے تھے۔ اسے داخلہ بھی مل گیا اور اس نے دل و جان سے اداکاری سیکھنے پر توجہ دینی شروع کر دی۔ ایک سال کے اندر ہی اس کی اداکاری نے اسکول کے اساتذہ اور ڈراما دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اس نے بہت جلد اسٹیج اداکاری میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پیدا ہی تھیٹر میں اداکاری کے لیے ہوا ہے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے اس کے شوق اور وارفتگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک مشہور فلمی مؤرخ ڈیوڈ تھامسن نے اس کے بارے میں لکھا تھا ''آپ اس کی فن کارانہ زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جب اس نے تھیٹر کی اداکاری پر عبور حاصل کر لیا تو اس نے اسٹیج کو خیر باد کہہ دیا۔''

فلموں کی طرف وہ دولت کے لالچ میں نہیں گیا تھا۔ اسے پیسے سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے زمانے میں وہ ہالی ووڈ کا سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا اداکار تھا۔ حالانکہ وہ دور ہالی ووڈ میں درجن بھر سے زیادہ معروف و مقبول اور قد آور اداکاروں کا دور تھا۔ گیری کوپر، کلارک گیبل، ہمفرے بوگارٹ، گریگری پیک، ہنری فونڈا، کیری گرانٹ، جارجس بوائر، جیمز اسٹیوارٹ، اسٹیوٹ گرینجر، رابرٹ ٹیلر جیسے اداکار ہالی ووڈ پر چھائے ہوئے تھے مگر مارلن برانڈو ان سے بالکل مختلف اداکاری کا انداز لے کر اسکرین پر نمودار ہوا تھا۔ وہ سب سے الگ اور سب سے مختلف اور منفرد تھا۔ اس جیسی اداکاری فلم بینوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اچھے اور عظیم اداکاروں کی اس وقت بھی کمی نہ تھی مگر برانڈو کا معاملہ یہ تھا۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

برانڈو کی پہلی فلم ''دی مین'' 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن اس فلم کا کوئی چرچا نہ ہوا۔ حالانکہ اس نے ایک زخمی فوجی کا کردار بہت خوبی سے نبھایا تھا۔ ہدایت کار ایلیا کازان نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ اسے اسٹیج پر بھی اداکاری کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ تھیٹر میں اس نے تینیسی ولیم کے شاہکار ڈرامے ''اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر۔'' (A STREET CAR NAMED DESIRE) میں لاجواب اداکاری کی تھی۔ ایلیا کازان نے سوچا کہ اگر اسی ڈرامے کو مارلن برانڈو کے ساتھ فلم کے قالب میں ڈھالا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس نے یہ منصوبہ ایک بڑے فلم ساز اسٹوڈیو کو پیش کیا۔ وہ لوگ تو سکہ بند، نامور بڑے اداکاروں کے قائل تھے۔ مارلن برانڈو ان کے لیے ایک بالکل نیا نام تھا مگر ایلیا کازان کے انتخاب کو بھی وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح ''اسٹریٹ کار'' کے لیے مارلن برانڈو کا انتخاب کر لیا گیا۔ یہ فلم 1951ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم نے دھوم مچا دیں۔ اس کا اتنا شہرہ ہوا کہ بڑے بڑے نقاد، فلم ساز اور ہدایت کار بھی بطور خاص یہ فلم دیکھنے کے لیے سینما گھروں میں گئے اور ایک بالکل ''برانڈیو'' اداکار کی اداکاری اور شخصیت کا کمال دیکھ کر سحر ہو گئے۔

''اسٹریٹ کار'' برانڈو کی دوسری فلم تھی مگر اس نے اس کو اسٹار بنا دیا تھا۔ اس نے ہر ایک کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ پہلی فلم میں وہ ایک مغرور فوجی تھا۔ دوسری فلم میں اس کا کردار قطعی مختلف تھا۔ عموماً بڑے منصف اپنے ناولوں کی فلمیں دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن ایلیا کازان اور برانڈو نے اس ڈرامے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ خود تینیسی ولیم نے فلم دیکھنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا اور کہا ''ان کاٹوں کے ساتھ کوئی دوسرا اداکار اس طرح انصاف نہیں کر سکتا تھا۔''

سچ تو یہ ہے کہ مصنف نے جیسا کردار سوچا تھا برانڈو اسی کو من و عن اسکرین پر پیش کر دیا تھا۔ کسی نئے اداکار کی سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد مارلن برانڈو نے اپنے نام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

1953ء میں اس کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں ''دیوار پاپا'' اور جولیس سیزر۔ یہ دونوں فلمیں لاجواب تھیں اور برانڈو کی اداکاری سونے پر سہاگہ تھی۔ اس کا انداز و اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سال ان دونوں فلموں کے لیے اسے بہترین اداکار کے طور پر نامزد کیا گیا، مگر وہ آسکر ایوارڈ حاصل نہ کر سکا۔ ''جولیس سیزر'' میں برانڈو نے مارک انتھونی کے کردار میں جان ڈال دی تھی۔

اگلے سال 1954ء میں برانڈو کی فلم ''دی وائلڈ ون'' (جنگلی) ریلیز ہوئی تو فن اداکاری پر مارلن برانڈو کے نام کا ٹھپا لگ گیا۔ اس فلم میں وہ معاشرے کا باغی تھا اور یہ کردار اس نے بھرپور انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ سراپا ایک باغی نظر آتا تھا۔ اس کی چال ڈھال، بولنے کا انداز حرکات و سکنات نے فلم بینوں کو ایک انوکھے کردار سے متعارف کرایا۔

ابتدا میں برانڈو نے جلد جلد فلموں میں اداکاری کی۔ اسی سال یعنی 1954ء میں اس کی ایک اور معرکتہ الآرا فلم ''آن دی واٹر فرنٹ'' کی نمائش ہوئی۔ اس کا ہدایت کار بھی ایلیا کازان تھا۔ یہ ایک بھٹکے ہوئے، مضطرب اور پراگندہ مزاج نوجوان کی کہانی ہے جو بندرگاہ پر کام کرتا ہے۔ اس فلم میں برانڈو کا کردار پہلے کرداروں سے مختلف ہے۔ اس فلم میں وہ ایک باکسر ہے لیکن بعد میں حالات کے دباؤ کے تحت وہ مخبری کرنے لگتا ہے جہاں سے اس کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔

مارلن برانڈو کی مذکورہ بالا فلموں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جولیس سیزر کے تاریخی اور دیو مالائی کردار کے علاوہ برانڈو نے ہمیشہ عام امریکیوں کی زندگی کے کردار ہی ادا کیے اور اس قدر خوب صورتی اور مہارت سے ادا کیے کہ دیکھنے والوں کو ان پر حقیقت کا گمان گزرنے لگا۔ مارلن برانڈو نے فلمی اداکاری پر اپنی مخصوص چھاپ لگا دی تھی۔

''آن دی واٹر فرنٹ'' (ON THE WATER FRONT) کی ریلیز تک مارلن برانڈو ایک انتہائی مقبول اور معروف اداکار بن چکا تھا۔ اگر کہا جائے کہ مارلن برانڈو جیسا اداکار نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی اس کے بعد فلم اسکرین نے ایسا اداکار دیکھا تو غلط نہ ہوگا۔ فلم ''آن دی واٹر فرنٹ'' کے لیے مارلن برانڈو کو بہترین اداکار کا ایوارڈ دیا گیا۔ درحقیقت دیکھا جائے تو مارلن برانڈو کے بیشتر کردار آسکر کے مستحق تھے اور کئی فلموں میں اس کو آسکر کے لیے نامزد بھی کیا گیا۔

اب مارلن برانڈو کا ایک مخصوص انداز بن چکا تھا جس کی کوئی دوسرا اداکار نقل نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس کی اداکاری کے اسٹائل سے بہت سے اداکار متاثر ضرور ہوئے، اور انہوں نے اس کی روشنی میں نت نئے تجربات کیے۔

''گائیز اینڈ ڈولز'' (GUYS AND DOLLS) میں مارلن برانڈو نے اپنی پہلی فلموں سے یکسر مختلف کردار کیا۔ یہ ایک مزاحیہ کردار تھا۔ کہاں ''واٹر فرنٹ'' اور ''اسٹریٹ کار'' کا باغی اور ناراض ہیرو مارلن برانڈو اور کہاں گلوکاری؟۔ لیکن برانڈو ہر کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کا قائل تھا۔

''سیوناراء'' ایک رومانی موضوع تھا۔ یہ فلم 1957ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس فلم میں وہ ایک بالکل نئے اور مختلف روپ میں نظر آیا۔ اس کی اداکاری کے معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کردار کے لیے بھی اس کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ آخر یہ کس قسم کا اداکار تھا ہر قسم کے کرداروں کو کھال کی طرح اوڑھ لیتا تھا اور وہ اس قسم پر پوری طرح فٹ نظر آتے تھے؟ یہ وہ زمانہ تھا جب ہالی ووڈ کے بہت بڑے اور نامور اداکار بھی عموماً ایک ہی قسم کے کرداروں کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ پوسٹر پر ان کا نام دیکھتے ہی فلم بین اندازہ کر لیتے تھے کہ یہ کس قسم کی فلم ہوگی۔ مگر مارلن برانڈو کا معاملہ سب سے مختلف تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہٹ ہو جانے والے کردار دوبارہ آفر نہیں کیے گئے، لیکن اس نے انہیں قبول نہیں کیا۔ جس شخص نے 60 سال کے طویل عرصے میں صرف چالیس فلموں میں کام کیا ہو وہ کرداروں کے انتخاب کے معاملے میں کتنا محتاط ہوگا۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اسے بہت بڑے بڑے معاوضے بھی پیش کیے جاتے رہے لیکن وہ من موجی فنکار تھا۔

وہ ہالی ووڈ کے نمائشی اور بناوٹی ماحول میں سب سے مختلف اور منفرد نظر آتا تھا۔ نہ قیمتی اور خوب صورت لباس، نہ شان دار کاریں، نہ ہی فنکاروں والے نخرے یا گلیمر۔ وہ ان سب چیزوں سے بالاتر تھا۔ ایک ٹی شرٹ اور پتلون میں ملبوس اپنی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر سوار وہ کسی جگہ بھی نمودار ہو جاتا تھا۔ ایک عام آدمی کے حلیے میں اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہالی ووڈ کے عظیم ترین اداکاروں میں سے ایک ہے۔

چلتے چلتے اسی زمانے کا ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ شاید یہ ہم پہلے بھی کسی وقت سرسری طور پر بیان کر چکے ہیں۔

فرہاد زیدی اور ہم ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ ہماری دانت کاٹی دوستی تھی مگر لڑائی جھگڑے بھی ہوتے رہتے تھے۔ روٹھنے منانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا جس میں روٹھنا ہمارے حصے میں اور منانا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ یہ ان کے مزاج اور محبت کا سبب تھا ورنہ ہماری دوستی بے غرض اور بے لوث تھی اور آج تک اسی طرح قائم ہے۔

اس زمانے میں اداکارہ مارلین منوز بھی بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ ادھر مارلن برانڈو کا بھی شہرہ تھا۔ فرہاد زیدی سے ہمیں ایک اختلاف یہ بھی رہتا تھا کہ وہ فلمیں دیکھنے کے شوقین نہیں تھے۔ ہم دونوں اکثر آخری بس سے رات کو ماڈل ٹاؤن جایا کرتے تھے۔ کئی بار پیدل ہی لڑتے جھگڑتے یا باتیں کرتے ہوئے مال روڈ سے ماڈل ٹاؤن چلے جاتے۔ ان دنوں لاہور اور ماڈل ٹاؤن بالکل الگ بستی لگتے تھے۔ راستے میں اندھیرا اور ویرانی تھی یا کھیت اور کھلے میدان تھے۔ البتہ مسلم ٹاؤن کے پُل پر چند عمارتیں ضرور تھیں۔ راستہ بالکل اندھیرا تھا۔ بجلی کی روشنیاں فیروز پور روڈ پر کافی عرصے بعد نصب کی گئی تھیں۔

ایک روز ہم دونوں مال روڈ پر ٹہل رہے تھے کہ ہم نے کہا

''زیدی صاحب۔ مارلن برانڈو کی بڑی زبردست فلم لگی ہے۔ کیوں نہ آج آخری شو دیکھیں۔''

وہ کسی شاعرانہ سوچ میں تھے۔ بولے ''یار تم ایسی گندی فلمیں مت دیکھا کرو۔ وہ تو بہت سیکسی عورت ہے اور کپڑے بھی بہت کم پہنتی ہے۔''

دراصل وہ مارلن برانڈو کو مارلین مونرو سمجھ رہے تھے۔

ہم نے کہا ''وہ سیکسی ضرور ہے مگر عورتوں کے لیے نہیں، مردوں کے لیے!''

''کیا مطلب؟''

ہم نے کہا ''بھائی مارلن برانڈو مرد ہے۔ مارلین مونرو عورت ہے۔ دونوں اپنی جگہ غضب کے فنکار ہیں۔''

وہ اڑ گئے۔ کہنے لگے ''یہ نہ سمجھنا کہ میں فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم اس طرح مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔''

ہم نے زیادہ اصرار کیا تو بولے ''اچھا شرط لگا لو۔ مارلن برانڈو مرد نہیں عورت ہے۔''

ہم نے فوراً شرط لگالی۔ اسی وقت سینما گھر کی راہ لی جہاں فلم ''آن دی واٹر فرنٹ'' کا فوٹو شیٹ سجا ہوا تھا۔ ہم نے انہیں دکھایا کہ ''یہ دیکھو۔ مارلن برانڈو ایسا ہوتا ہے۔''

وہ شرط تو ہار گئے مگر ہار نہیں مانی۔ بولے ''اس قسم کی فضول باتوں پر میں زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ تم شرط جیت گئے ہو۔ چلو تمہیں شیزان میں چائے پلا دیتا ہوں۔''

1958ء میں مارلن برانڈو نے فلم ''ینگ لائنز'' میں کام کیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ برانڈو نے اس میں ایک جرمن فوجی افسر کا کردار ادا کیا تھا۔

اور پھر اس کے بعد ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ مارلن برانڈو کی موڈی طبیعت اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کی وجہ سے فلم ساز اسے فلموں میں کاسٹ کرنے سے کھبرانے لگے۔ 1958ء کے بعد مارلن برانڈو کی کوئی قابلِ ذکر فلم نمائش کے لیے پیش نہیں کی گئی۔ اس دوران میں مارلن برانڈو نے فلم ''میوٹنی آن دی باؤنٹی'' (MUTINY ON THE BOUNTY) نامی فلم میں بھی کام کیا جو آسٹریلیا کے دور دراز جزائر میں بنائی جارہی تھی۔ دراصل ''باؤنٹی'' ایک بحری جہاز کا نام تھا جس کے عملے نے کپتان کے خلاف بغاوت کردی تھی۔

فلم کے لیے لوکیشن کا انتخاب مارلن برانڈو کی مرضی سے کیا گیا۔ جب فلم کا یونٹ شوٹنگ کے لیے جزیرے میں پہنچا تو برانڈو صاحب ایک مقامی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔

اس طرح فلم کے کام میں ہرج پیدا ہونے لگا۔ مزید یہ کہ کہانی اور ہدایت کاری کے معاملات میں برانڈو نے مداخلت شروع کردی جسے ہدایت کار نے پسند نہیں کیا۔ فلم بنانے کے لیے صرف دو ہی راستے تھے۔ انہیں مارلن برانڈو اور ہدایت کار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ قرعۂ فال برانڈو کے کام نکلا چونکہ وہ بہت مقبول اور نامور اداکار تھا۔ فلم ساز اس کو نظر انداز کرنا برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ جب ہدایت کار کو اس کے فرائض سے سبکدوش کیا گیا تو ہالی وڈ کے دوسرے نامی گرامی ہدایت کاروں نے بھی اس فلم کی ہدایت کاری سے معذرت کردی۔ برانڈو صاحب نے فوراً اپنی خدمات پیش کردیں۔ فلم ساز ان کی نارسائی مول نہیں لے سکتے تھے چنانچہ برانڈو کو اس فلم کی ہدایت کاری کے فرائض سونپ دیئے گئے۔

اس کے بعد وہی معاملے تھے کہ بقول حسرت موہانی ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

یعنی عشق و محبت کا معاملہ بھی جاری تھا اور ہدایت کاری بھی چل رہی تھی۔ ہدایت کاری کے معاملے میں برانڈو نے کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اسے علی حجر بھی نہیں تھا لیکن وہ زور شور سے ہدایت کاری کرنے میں جت گیا۔

یہ فلم بہت مہنگی ہوگئی۔ مزید ستم یہ کہ جب فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو بہت بڑے بجٹ کے باوجود فلاپ ہوگئی۔ اس کی ناکامی نے بھی برانڈو کو بہت بری طرح متاثر کیا۔ رفتہ رفتہ برانڈو کی فلموں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اتنا بڑا سپر اسٹار سستی کی انتہائی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ اس کی کوئی قابلِ ذکر ریلیز نہیں ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ فلم ساز اور فلم بین مارلن برانڈو کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔

جب فلم ساز فرانسس فورڈ کپولا نے فلم ''گاڈ فادر'' بنانے کا فیصلہ کیا تو مرکزی کردار کے لیے مارلن برانڈو کا انتخاب کیا۔

''گاڈ فادر'' ایک لحاظ سے فلمی صنعت میں برانڈو کا دوسرا جنم تھا۔ اس فلم نے ایک بار پھر برانڈو کی اداکاری کے جھنڈے گاڑ دیئے اور سب کو احساس دلایا کہ وہ کتنا عظیم اداکار ہے۔ یہ فلم 1972ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اور انتہائی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم نے برانڈو کو بہترین ہدایت کار کو تو شہرت دوام بخشی ہی تھی مگر گینگسٹر فلموں کی تاریخ میں بھی اس کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

نقادوں اور فلم بینوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک لافانی فلم

اس میں برانڈو نے اداکاری کا ایک ایسا معیار قائم کردیا ہے جسے توڑنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مارلن برانڈو کی مشہور اور کامیاب فلموں میں ''دی لاسٹ ٹینگو ان پیرس'' (1973ء) بھی شامل ہے جس میں انہوں نے ایک بار پھر آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

فلم ''وہائٹ سینڈز'' ''اپوکلپس'' (1979) اور ''ڈان جون ڈی مارکو'' (1995) بھی اس کی یادگار فلمیں ہیں۔ مارلن برانڈو کو فلم ''سپرمین'' میں ہیرو کے باپ کا کردار پیش کیا گیا۔ اس مختصر کردار کے لیے انہوں نے چالیس لاکھ ڈالر معاوضہ وصول کیا جو کہ اس زمانے کے اعتبار سے ناقابلِ تصور تھا۔

مارلن برانڈو کی کامیاب اور مشہور فلمیں یہ ہیں:

1۔ دی مین (1950)
2۔ اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر (1951)
3۔ دی ایسی سینرز (1953)
4۔ دی آنلڈون (1954)
5۔ آن دی واٹر فرنٹ (1954)
6۔ دی لاسٹ ٹینگو ان پیرس (1972)
7۔ دی گاڈ فادر (1992)
8۔ اپوکلپس (1979)
9۔ دی میسوری بریکس (1976)
10۔ ون آئیڈ جیک (1961)

مارلن برانڈو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر موٹر سائیکل پر گھومنے والی ہالی وڈ کی سڑکوں پر گھومنے کے شوقین تھے۔ وہ رنگین مزاج بھی تھے۔ انہوں نے لاتعداد رومانس کیے مگر شادیاں صرف تین کیں جن سے ان کے دس بچے ہوئے۔

چالیس سال کی عمر کے بعد مارلن برانڈو خوش خوراکی اور آرام طلبی کے باعث موٹاپے کا شکار ہوگئے تھے۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں وہ بے انتہا موٹے ہوگئے۔ ان کا وزن 250 پونڈ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ موٹاپا کم کرنے کے لیے انہوں نے ڈائٹنگ اور ورزشیں بھی شروع کردی تھیں مگر بے انتہا موٹاپے پر قابو نہیں پاسکے۔

مارلن برانڈو کے حصے میں شہرت، دولت اور من پسند زندگی کے ساتھ ساتھ ایسے بھی آتے رہے۔ ان کی نوجوان بیٹی کی بوائے فرینڈ کو برانڈو کے بیٹے نے قتل کردیا تھا جس کے بعد وہ ذہنی پریشانیوں اور مقدمات کا شکار رہا۔ اس کی بیٹی نے خودکشی کرلی۔ یہ صدمہ بھی اس کے لیے کم نہ تھا۔ ایک المیہ یہ بھی تھا کہ اس کی تین شادیوں میں سے کوئی ایک شادی بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس اعتبار سے وہ ایک غم زدہ اور دل شکستہ انسان تھا۔

مارلن برانڈو کے انتقال کی خبر کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ آخری دنوں میں وہ مالی لحاظ سے دیوالیہ اور پریشان تھا لیکن اگلے ہی دن خبر آئی کہ مارلن برانڈو اپنے پیچھے 21.6 ملین ڈالر کے اثاثے چھوڑ گیا ہے۔

مارلن برانڈو کی نجی زندگی ہمیشہ بھاری پردوں میں مستور رہی۔ اس نے اپنی آخری وصیت میں وارثوں کو اپنے ترکے سے محروم کردیا۔ آخری دنوں میں بھی اس کی آمدنی پانچ لاکھ ڈالر سے زیادہ تھی۔ اس کی جائداد 21 ملین یعنی سوا دو کروڑ ڈالر سے زیادہ مالیت کی ہے جن میں اس کا ایک گھر شامل ہے۔ جس کی قیمت ایک کروڑ ڈالر ہے۔ اس نے اور بھی جائدادیں اور اثاثے چھوڑے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مالی اعتبار سے خوش حال اور مطمئن تھا۔ زیادہ دولت کمانے کا اسے کبھی شوق نہیں رہا۔ اس کے اثاثوں میں قیمتی مصوری کے شاہکار بھی شامل ہیں۔ اس نے اپنی وصیت میں ایک ٹرسٹ بنانے کی ہدایت بھی کی ہے اور اپنی دو گمنام خاتون دوستوں کے لیے ماہانہ آمدنی بھی چھوڑی ہے۔ مرنے سے دو ہفتے پہلے اس نے اپنی وصیت میں تبدیلیاں بھی کی تھیں۔

مارلن برانڈو ایک عجیب و غریب موڈی انسان تھا۔ اسے نہ دولت سے رغبت تھی نہ شہرت سے پیار تھا۔ جب وہ اداکار بنا اور اگلی ہی فلم میں دنیا کا معروف ترین ایکٹر تسلیم کرلیا گیا تو بھی اس کے رویے اور سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ اسے دولت نے خوش کیا۔ نہ شہرت نے۔ ہالی وڈ جیسے رنگین شہر میں وہ اپنی موٹر سائیکل پر گھومتا پھرتا تھا۔ وہ مہنگے ریستورانوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اسے ہالی وڈ کی حسیناؤں سے ملنے کا بھی کوئی شوق نہ تھا حالانکہ ہالی وڈ کی شاید ہی کوئی ہم عصر اداکارہ ہو جو مارلن برانڈو کی قربت کی خواہاں نہ رہی ہو مگر وہ ان سب سے بے نیاز تھا۔ اس نے ان حسین ہیروئنوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس نے جو تین شادیاں کیں ان میں سے کوئی بھی معروف اداکارہ یا حسین و جمیل یورپین عورت نہیں تھی۔ اسے ایشیائی، اور مغربی تہذیب و تمدن سے دور رہنے والی، لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ وہ انہی سے محبت کرتا تھا۔ ان ہی کے ساتھ رہ کر خوشی اور اطمینان محسوس کرتا تھا۔

مارلن برانڈو میں ایک معصوم اور اداس روح تھی۔ وہ فلموں میں بھی بہت کم مسکراتا تھا اور حقیقی زندگی میں بھی۔ اس کو کبھی کسی نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ایک ناخوش اور غیر مطمئن انسان نظر آتا تھا۔ خوشی جیسے اس کے نزدیک

ایک ان جانی اور بے معنی چیز تھی۔ اس نے فلموں میں کردار بھی ایسے ہی منتخب کیے جن میں قیمتی لباس، قیمتی کاریں، شان دار گھر اور عشق و محبت نہیں تھی۔ وہ دکھ بھرے کردار ادا کر کے ہی مطمئن ہوتا تھا۔ عام رومانی ہیرو کے کردار اسے پسند نہیں تھے۔ شاید وہ اپنی فلموں کو بھی اپنے دکھوں کے اظہار کا ایک ذریعہ ہی سمجھتا تھا۔ مگر اسے دکھ کیا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ نہ جان سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برانڈو اپنے خیالات، احساسات اور مسائل کو اپنے تک ہی محدود رکھتا تھا۔ اس کا کوئی راز دار نہ تھا جسے وہ اپنا حال دل سناتا۔ اسی لیے وہ ایک پُراسرار ہستی کی طرح ساری زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ایک ایسا شخص جسے دنیا کی ہر نعمت اور راحت حاصل تھی۔ اس قدر آدم بیزار، غمگین اور بے تعلق کیوں تھا؟ کاش کوئی یہ راز جان سکتا۔ یہ راز وہ اپنے ساتھ ہی لے کر دنیا سے چلا گیا۔

فلموں میں برانڈو ایک مضطرب، بے چین اور موڈی کردار نظر آتا تھا۔ لحہ لحہ اس کا موڈ بدلتا رہتا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اگلے لمحے وہ کس قسم کے تاثرات کا اظہار کرے گا۔ یہ اس کے اندر کی آگ تھی جو اسے بے چین رکھتی تھی۔ دراصل اصل زندگی میں بھی وہ ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اسکرین پر اداکاری کرنے کی ضرورت ہی کبھی پیش نہیں آئی۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی فلموں میں بھی نظر آتا تھا۔ اسی لیے اس کی اداکاری دیکھنے والوں کو مسحور اور مسمرائز کر دیتی تھی۔ وہ ایک معمول کی طرح اس کے اشاروں پر چلتے اور اس کی حرکات و سکنات کے مطابق ایک نئی دنیا میں کھو جاتے تھے۔

اس کی شخصیت اور سراپا بھی مجموعۂ اضداد تھا۔ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ انتہائی حساس بھی تھا۔ وہ کبھی اچانک غضب ناک اور ناراض ہو جاتا تھا اور کبھی مہر و محبت کا نمونہ نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک حیوانی کشش تھی۔ اس نے باغیانہ کردار بھی اسی خوبی سے ادا کیے جس طرح نرم و ملائم انسانوں کے کردار ادا کیے۔ ''ویواز پاٹا'' اور ''گائیز اینڈ ڈولز'' اس کے ان متضاد کرداروں کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ماہرین نفسیات اور نقادوں کے خیال میں وہ سرتاپا روح تھا۔ لیکن ایک پرانی روح زخمی، دکھی اور مصیبت زدہ۔ اس کے اندر کا دکھ اس کے کرداروں میں بھی جھلکتا تھا۔ یہی وہ دکھ تھا جس نے دنیائے فلم میں اداکاری کے انداز اور اقدار کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے 1950ء کی دہائی میں جن فلموں میں کام کیا تھا ان کی وجہ سے اس دہائی کو امریکی فلموں کی عظیم ترین اور ناقابل فراموش دہائی قرار دیا جاتا ہے۔ صرف ایک شخص نے اپنی اداکاری اور شخصیت سے امریکی فلمی صنعت کو بدل کر رکھ دیا۔

برانڈو کو ڈسپلن، نظم و ضبط اور مروجہ انسانی اقدار سے کوئی غرض تھی نہ دلچسپی۔ اس کی اداکاری کا کسی سے بھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ انوکھا اور اپنی قسم کا ایک ہی اداکار تھا۔ اس کے ساتھ کسی حد تک جیمز ڈین اور منٹگمری کلفٹ کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ دونوں ہی اداکار، جو اداکاری کے فن میں ایک انقلاب لے کر آئے تھے، بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بے چینی، اندرونی دکھ اور اضطراب ان دونوں اداکاروں میں بھی نمایاں خصوصیت تھی مگر انہیں زندگی نے زیادہ مہلت نہ دی ورنہ وہ بھی مارلن برانڈو کے ہم عصر اور اس کے ہم پلہ کہلاتے..... شاید۔

فلمی نقادوں کا خیال ہے کہ جس طرح ایلوس پریسلے نے موسیقی کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنا وجود مقبول تر ہوتا جا رہا ہے، اسی طرح مارلن برانڈو نے اداکاری کے شعبے میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ایلوس پریسلے نے اپنے زمانے میں ساری دنیا کو دیوانہ کر دیا تھا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے بعد بھی پریسلے کی شہرت اسی طرح اس کی تاثیر بڑھتی جائے گی۔ مارلن برانڈو کے بارے میں وقت نے شاید یہی مستقبل لکھ دیا ہے۔

''گون وِد دی وِنڈ'' اور ''کاسابلانکا'' کو اداکاری کے اعتبار سے دنیا کی عظیم ترین فلمیں تصور کیا جاتا ہے، جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ لیکن مارلن برانڈو نے ''اسٹریٹ کار'' کو اداکاری سے ان فلموں کے سحر کو ماند کر دیا۔ اداکاری کے ان ناقابل فراموش یادگار دور میں بھی جس شخص نے اپنا سکہ جمایا، حواس کی انفرادیت اور صلاحیتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔

برانڈو بڑبڑاہٹ اور زیر لب مکالموں کی وجہ سے شہرت اختیار کر گیا۔ اس نے سب سے مختلف اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جو کردار نہایت سہولت اور خوب صورتی سے ادا کیے انہیں چھونے کی جرأت گریگری پیک، کیری کوپر، ہمفرے بوگارٹ اور کلارک گیبل جیسے فنکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ عظیم اداکار نہ تھے بلکہ اس لیے کہ ان کی روح کے اندر وہ دکھ، بے چینی اور اضطراب کی شعلہ نہ تھا جس سے برانڈو سرتاپا دوچار ہوا تھا۔

آج کے اداکاروں دسٹن ہاف مین اور رابرٹ ڈی نیرو میں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ جیمز ڈین بھی اسی کے

قدم پر چلنے والا فنکار تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی برانڈو کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ آج کے بڑے سے بڑے فنکاروں میں بھی وہ لپک اور چمک نہیں ہے جس کا مظاہرہ پچاس سال پہلے مارلن برانڈو نے کیا تھا۔

مارلن برانڈو کو کبھی کوئی نہ سمجھ سکا نہ ہی شاید سمجھ سکے گا۔ ممکن ہے اس کو نہ سمجھنا ہی اس کی عظیم اداکاری کا راز تھا، جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

اس کے تذکرے کے ساتھ ہی برصغیر کا انوکھا اداکار دلیپ کمار بھی یاد آتا ہے جس نے پچاس سال پہلے اداکاری کا جو معیار پیش کیا آج بھی کوئی اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہالی وڈ میں ہوتا تو شاید اسے بھی ساری دنیا اسی طرح سراہتی لیکن وہ برصغیر تک محدود تھا لیکن پھر بھی اس میں اور برانڈو میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ کرب، دکھ، بے چینی، اضطراب، پُراسراریت، دولت سے بے نیازی۔ ان دونوں فنکاروں نے اپنے اپنے دکھ اپنے کرداروں کے لیے ساری دنیا میں بانٹ دیئے۔

نقادوں کے خیال میں مارلن برانڈو کی پانچ فلموں کی مثال شاید بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ ان فلموں کے نام یہ ہیں!

1۔ اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر (1951)

یہ عجیب و غریب کردار دوبارہ کوئی اس خوبی سے ادا نہ کر سکے گا۔

2۔ دی گاڈ فادر (1972)

اس فلم میں عمر، میک اپ اور لائٹنگ نے بھی برانڈو کی اداکاری کو یادگار بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

3۔ آن دی واٹر فرنٹ (1954)

اسٹریٹ کار کے ہدایت کار ایلیا کازان نے برانڈو سے ایک بار پھر ناقابل فراموش کام لیا تھا۔

4۔ ایپوکلیپس ناؤ APOCALYPSE (1975) NOW اس فلم میں برانڈو موٹا، گنجا اور بھاری بھرکم ہو چکا تھا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا لیکن اس کردار کو حقیقی رنگ دینے کے لیے ایسے ہی برانڈو کی ضرورت تھی۔

5۔ دی آئی لینڈ آف ڈاکٹر موریو THE ISLAND OF DR.MOREAU(1996)

اس فلم میں برانڈو نے ایک شیطانی دماغ رکھنے والے شخص کا کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ جسمانی پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ فلم برانڈو کی ابتدائی فلموں کے ایج سے بالکل مختلف تھی مگر برانڈو نے اپنے حلیے کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

ناصر کاظمی نے کہا ہے ؎

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

دنیا تو دائم آباد رہے گی لیکن بعض لوگوں جیسے دوبارہ دیکھنے میں نہیں آتے۔

ان ہی میں مارلن برانڈو بھی تھا۔

گڈ بائی برانڈو..... تم اپنی برانڈ کے واحد اداکار تھے!

☆☆☆

مارلن برانڈو کے ضمن میں ہم نے ہالی وڈ کے جن بڑے اور معروف اداکاروں کا تذکرہ کیا ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ دراصل وہ درنامور اور مقبول فنکاروں کا دور تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہالی وڈ میں زیادہ شہرت، باکس آفس کی کشش اور زیادہ معاوضہ وصول کرنے والے مرد اداکار تھے۔ ان کے مقابلے میں خاتون فنکاراؤں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ پوسٹر پر اور فلم کی پبلسٹی پر بھی سب سے پہلے اور نمایاں نام مرد اداکار ہی کا درج کیا جاتا تھا۔ حسین و جمیل ایکٹریسوں کی اس زمانے میں کمی نہیں تھی جن میں سے کئی اداکارائیں بہت اعلیٰ فنکار بھی تھیں لیکن تلخ ظریفی یہ ہے کہ اولیت پھر بھی مرد اداکاروں ہی کو حاصل تھی اور یہ رجحان آج بھی موجود ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مغربی دنیا میں خواتین برابری کی دعوے دار ہیں اور مرد کی برتری تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اپنی دانست میں مغرب کی عورت نے ''مکمل آزادی'' حاصل کر لی ہے لیکن قانونِ فطرت کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔ آج بھی اتنی ترقی کے باوجود مغربی معاشرے میں بھی مرد ہی کو برتری حاصل ہے۔

ہالی وڈ کی فلموں کا یہ رجحان ہندوستان کی فلموں میں بھی جاری رہا۔ وہاں بھی مرد اداکار ہی سرفہرست رہے۔ سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرتے رہے اور انہی کے ناموں کو دیکھ کر فلم بین کسی فلم کو دیکھنے جاتے تھے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اداکاراؤں کو مقبولیت حاصل نہ تھی یا ان کے نام پر فلم بین سینما کا رخ نہیں کرتے تھے۔ لیکن ذرا تصور کیجیے کہ اپنے سنہری دور میں بھی ہندوستان کی فلمی صنعت پر مرد اداکاروں ہی کا سکہ چلتا تھا۔ ایک زمانے میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند برصغیر کی فلمی دنیا کے ''تین بڑے'' نام کہلاتے تھے۔ ان کے معاوضے بھی زیادہ تھے اور مقبولیت بھی۔ حالانکہ اسی دور میں نرگس، مدھو بالا، مینا کماری، وجنتی مالا جیسی بے مثال فنکارائیں بھی فلمی دنیا میں جلوہ گر تھیں، جن کے پرستاروں کی تعداد کم نہ تھی لیکن پھر بھی سرفہرست مرد اداکاروں ہی کا نام تھا۔ یہ رجحان کافی حد تک آج بھی جاری ہے۔ مثلاً عامر خان،

شاہ رخ خان اور سلمان خان بھارت کے سپر اسٹار ہیں۔ آج بھی وہی کیفیت ہے کہ بڑی بڑی نامور ہیروئنیں ان کے ساتھ کام کرنے کی آرزومند رہتی ہیں اور ان کے ساتھ کام کر کے شہرت اور مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ آپ ہمیں دقیانوسیت کا طعنہ دیں تو یہ آپ کا حق ہے لیکن ہماری ذاتی رائے میں قدرت نے مرد ذات یا نر ہی کو فوقیت دی ہے۔ جانوروں کو دیکھیے یا انسانوں کو۔ نر کو مادہ پر فوقیت حاصل ہے اور مادہ اپنے نر کا حکم ماننے کو اپنا فرض جانتی ہے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جس کے بارے میں پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے۔

ہم نے ہالی ووڈ کے صفِ اول کے ممتاز اور مقبول ترین اداکاروں کی فہرست میں جو نام درج کیے ہیں وہ مکمل نہیں ہیں۔ دراصل وہ ہالی ووڈ میں بہترین اداکاروں کا زمانہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی اداکاری کا انداز مختلف اور مخصوص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ درجن بھر سے زیادہ سپر اسٹار ہالی ووڈ پر اور دنیا بھر کے فلم بینوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ جن اداکاروں کا ہم نے نام نہیں لیا ان میں جان وین بھی شامل ہیں جنہیں فلمی دنیا میں ''ڈیوک'' کہا جاتا تھا۔ وہ عموماً ویسٹرن فلموں میں اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے اور مردانہ حسن کا نمونہ تھے۔ وہ اپنی قسم کے انوکھے اداکار تھے۔ بڑی عمر میں انہیں کینسر نے آلیا۔ اس زمانے میں اس مرض کا جدید ترین علاج میسر نہ تھا۔ جان وین کا آپریشن کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ فلموں میں کام کرتے رہے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف فلموں ہی کے بہادر اور نڈر ہیرو نہیں ہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی ایک جرأت مند اور باحوصلہ انسان ہیں۔ وہ ان اداکاروں میں سے ہیں جن کا کوئی اسکینڈل کبھی سننے میں نہیں آیا۔

اسی طرح اداکار برٹ لنکاسٹر بھی اپنی قسم کے انوکھے فنکار تھے۔ وہ سرکس کے راستے فلموں میں آئے تھے۔ بے حد پھرتیلے اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ انہوں نے بعد میں ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ایسے اداکار ہیں جو ہر قسم کے کرداروں کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ اسی زمانے کے ایک جنگ جو اور بہادر کردار کرنے والے اداکار کرک ڈگلس بھی تھے جن کا بیٹا مائیکل ڈگلس آج کل ایک بڑا اسٹار ہے۔ کرک ڈگلس نے بھی عام طور پر مار دھاڑ کے کردار ہی کیے یا پھر ایکشن فلموں میں کام کیا لیکن ان کا انداز اور اداکاری کا معیار انوکھا تھا۔ ان کی ہمہ جہتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تین بار آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔ انہوں نے کئی تاریخی پس منظر کی فلموں میں بھی اداکاری کی اور ہر بار اپنے کردار کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ ایک خوش شکل، اسمارٹ اور مردانہ حسن سے بہرہ ور اداکار تھے۔ اس لیے بہت مقبول تھے۔

اس زمانے میں نہ اداکاروں کی کمی تھی، نہ ہدایت کاروں اور فلم سازوں کی، لیکن ہر ایک نے اپنے لیے ایک مخصوص میدان بھی چن رکھا تھا، اور اسی میں کمال حاصل کیا تھا۔

آج کل تو اداکاری کی تربیت یونیورسٹیوں، کالجوں اور مختلف اداروں میں دی جاتی ہے۔ پچاس ساٹھ سال قبل بھی ایسے ادارے موجود تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور کے بڑے اور نامور ہیرو تربیت حاصل کیے بغیر ہی فلموں میں آئے تھے اور اپنا سکہ جمالیا تھا۔ مثلاً جان وین گھڑ سواری میں کمال دکھانے کے حوالے سے فلموں میں آئے۔ برٹ لنکاسٹر پھرتی اور جسمانی قوت کے بل پر اداکار بنے۔ کرک ڈگلس نے بھی کسی جگہ طویل تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ دراصل فنونِ لطیفہ کو اسکولوں اور کالجوں میں نہیں سکھایا جاسکتا۔ اس کے لیے قدرتی صلاحیت، رجحان اور ذوق ہونا ضروری ہے۔ اگر تربیتی کورس کی پابندی عائد کر دی جاتی تو ہالی ووڈ کے نامور اداکاروں کی بہت بڑی تعداد کو اسکرین پر نمودار ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔

کرک ڈگلس جنگ و جدل کی فلموں میں کام کرتے تھے اور جان جوکھوں میں ڈال کر مشکل کام بھی اسٹنٹ مین کی بجائے بذاتِ خود کرنے پر اصرار کرتے تھے جس کی وجہ سے قریب قریب ہر فلم میں وہ زخمی ضرور ہوئے۔ ایک فلم میں ان کا کان کٹ گیا تھا۔ دوسری فلم میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہوگئے۔ ایک اور فلم میں ان کی انگلی کٹ گئی تھی۔ ایک تاریخی فلم ''وائی کنگز'' میں ایک عقاب نے حملہ کر کے ان کی آنکھ زخمی کر دی تھی۔ وہ ہر مردانہ فن پر عبور رکھتے تھے خواہ شمشیر زنی ہو، نشانہ بازی ہو، شاہ سواری ہو یا اور کوئی خطرناک قسم کا کردار، وہ ہر ایک کے ساتھ بخوبی عہدہ برا ہوتے تھے۔ انہوں نے مختلف قسم کے کردار ادا کیے ہیں اور اپنی ہر فلم میں پسند کیے گئے۔

فلم ''اسپارٹکس'' قدیم رومن پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے ایک غلام کا کردار ادا کیا تھا جسے زندہ رہنے کے لیے خطرناک مقابلے کرنے پڑتے ہیں۔ اس فلم میں برطانوی اداکار سر لارنس اولیور نے بادشاہ کا کردار کیا تھا۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز ترین اسٹیج اور فلم ایکٹر تھے مگر کرک ڈگلس نے انہیں گہنا کر رکھ دیا تھا۔ دراصل ان کا کردار ہی اتنا

مضبوط اور جان دار تھا کہ فلم بینوں کی ہمدردیاں ہر وقت ان کے ساتھ تھیں۔ انہیں عوام کے جذبات سے کھیلنے کا ہنر آتا تھا جسے وہ بہت خوب صورتی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کا ہنسنے اور قہقہہ مارنے کا انداز بھی انوکھا تھا۔ جب وہ ہنستے تھے تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے اور ان کے موتیوں جیسے سفید چمک دار دانت نمایاں ہو جاتے تھے۔ بہت سے تماشائی ان کی ہنسی ہی کے پرستار تھے۔

انہوں نے بیشتر کردار ایسے کیے جن میں جاں بازی، سرفروشی اور کسی مقصد کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کا جذبہ نمایاں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر کردار اور ہر فلم مقبول اور کامیابی سے ہم کنار ہوتا تھا۔ انہیں خود پر مکمل اعتماد حاصل تھا۔ اس زمانے میں عام طور پر کئی سپر اسٹار ایک فلم میں یک جا نہیں ہوتے تھے مگر فلم ''اسپارٹکس'' میں کرک ڈگلس نے لارنس اولیور، ٹونی کرٹس، جان آئر لینڈ، سر چارلسٹن لافٹن جیسے دیو قامت اداکاروں کے مقابلے میں کام کیا اور نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ مذکورہ بالا اداکاروں میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا سمجھا جاتا تھا اور کسی فلم کی مقبولیت اور کامیابی کے لیے ان میں سے ایک ہی نام کافی سمجھا جاتا تھا۔ کرک ڈگلس کو اپنی اداکاری پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ کرداروں کا انتخاب بھی غور و خوض کے بعد کرتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی شاید ہی کوئی فلم فلاپ ہوئی ہو یا ان کے کردار کو پسند نہ کیا گیا ہو۔ فلم ساز اور ہدایت کار بھی انہیں موزوں کرداروں ہی میں کاسٹ کرتے تھے۔ اس فلم (سپارٹکس) میں برطانوی اداکارہ جین سائمنز نے ہیروئن کا کردار کیا تھا۔

کرک ڈگلس فلموں ہی میں نہیں عام زندگی میں بھی ایک نڈر اور بہادر انسان تھے۔ مثلاً ''اسپارٹکس'' جو کہ خود ان کی ذاتی فلم تھی۔ اس کا منظر نامہ انہوں نے ایک ایسے مصنف سے لکھوایا تھا جس پر کمیونسٹ ہونے کا الزام تھا۔ وہ زمانہ بیکاری کا تھا۔ جب کمیونزم کے خلاف امریکی قوم اور حکومت سخت نفرت کا اظہار کرتی تھی اور کمیونزم سے وابستگی رکھنے والوں کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسی لیے کمیونزم کے نظریات سے ہمدردی رکھنے والے چھپے پھرتے تھے اور ہر کوئی ان سے فاصلہ رکھنے میں ہی عافیت سمجھتا تھا۔ مگر کرک ڈگلس کے کردار کی یہ عظمت تھی کہ انہوں نے بلا خوف و خطر ایک اتنی بڑی اور مہنگی فلم کا اسکرین پلے لکھنے کے لیے ایک کمیونسٹ کہلانے والے مصنف ڈالٹن کا انتخاب کیا جو... بلکہ صحیح ثابت ہوا۔ ڈالٹن نے اس فلم کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ''اسپارٹکس'' کو آج بھی ہالی ووڈ کی یادگار فلموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کرک ڈگلس کی جرأت مندی سے حوصلہ پا کر اور بھی کئی ایسے فنکار اور مصنف ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کرنے لگے جن پر کمیونسٹ ہونے کا شبہ تھا۔ یہ ایک جان جوکھوں کا کام تھا مگر کرک ڈگلس نے دوسروں کو راہ دکھا دی تھی۔

کرک ڈگلس کی داستان اپنی جگہ۔ بجائے خود ایک کہانی لگتی ہے۔ ان کا تعلق بلغاریہ سے تھا۔ انہوں نے روسی دور حکومت میں ایک معمولی کسان کے گھر میں جنم لیا تھا جو قطعی ان پڑھ اور دیہاتی تھا۔ ابھی وہ نوعمر ہی تھے کہ ان کا خاندان امریکا منتقل ہو گیا۔

کرک ڈگلس نے عہد کیا تھا کہ جو کام ان کے آباؤ اجداد نہ کر سکے تھے وہ ضرور کریں گے لہٰذا انہوں نے تعلیم حاصل کرنے پر توجہ دی۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک اتھلیٹ تھے اور جسمانی تناسب کا نمونہ تھے۔ وہ کشتی بھی لڑتے تھے اور باڈی بلڈنگ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا خاندان یہودی تھا۔

جسمانی ورزش اور کشتی کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ انہیں ڈراموں میں اداکاری کرنے کا بھی شوق تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ پیدائشی اداکار ہیں اور ان میں اداکاری کی بے انداز صلاحیتیں ہیں۔ اساتذہ کے مشورے پر انہوں نے آرٹ اکیڈمی میں بھی داخلہ لے لیا جس سے ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی۔

ہالی ووڈ اور برطانیہ کے بیشتر اداکاروں نے اپنے ہنر کا آغاز تھیٹر کے ڈراموں سے کیا تھا۔ کرک ڈگلس بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ جیسا کہ بارلن برانڈو کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے ایک ہی سال کے اندر تھیٹر میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیا تھا مگر پھر فلموں کی طرف چلے گئے۔ تھیٹر کے ماہرین ساری زندگی افسوس کرتے رہے کہ فلموں نے تھیٹر کے ایک بے مثال اداکار کو چھین لیا۔

کرک ڈگلس کو ہالی ووڈ کے فلم سازوں نے ڈراموں ہی سے دریافت کیا تھا۔ ہالی ووڈ کے فلم ساز اور اداکار باقاعدگی سے ڈراموں اور تھیٹر پر نظر رکھتے تھے اور باصلاحیت لوگوں کو اڑا کر لے جاتے تھے۔ کرک ڈگلس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔

ہالی ووڈ کے ایک ایجنٹ کی ان پر نظر پڑی اور اس نے فوراً فلم سازوں کو ان کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح کرک ڈگلس کو کسی جدوجہد کے بغیر اس وقت کی معروف ہیروئن باربرا اسٹینوک کے ساتھ ایک فلم میں کام کرنے کا موقع ملا۔

فلم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر بطور اداکار کرک ڈگلس فلم سازوں کی نظروں میں آ گئے۔

ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کا آغاز فلم ''چیمپئن'' سے ہوا تھا۔ اس فلم میں، جو کہ ایک معروف باکسر کی زندگی پر بنائی گئی تھی انہوں نے باکسر کا کردار کیا۔ ابھی ان کی ابتدا تھی لیکن اداکاری کا جو مظاہرہ انہوں نے کیا اس پر انہیں سال کے بہترین اداکار اور آسکر ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ ان کا پہلا آسکر ایوارڈ تھا جس نے سارے ہالی ووڈ کو چونکا کر رکھ دیا۔

فلم سازوں کو کرک ڈگلس کے روپ میں ایک مردانہ حسن اور وجاہت کا نمونہ مل گیا تھا۔ ان پر اس قسم کے کرداروں کی آفرز کی بارش ہو گئی مگر کرک ڈگلس نے بہت احتیاط سے کام لیا اور صرف اچھے کرداروں پر ہی توجہ دی۔

انہیں بہت اچھے کردار پیش کیے گئے جن کی وجہ سے ان کی شہرت، مقبولیت اور دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ انہوں نے ایک ویسٹرن کاؤ بوائے فلم میں ''دی پیمپئن'' سے بالکل مختلف کردار ادا کیا اور ایک ویسٹرن فلموں میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اس کا نام تھا ''دی لاسٹ ٹرین فرام گن ہل'' اس فلم میں انہوں نے ایک بہادر قانون نافذ کرنے والے انسان کا کردار بہت خوبی سے ادا کیا تھا۔ ہالی ووڈ کے نامور ہدایت کاران کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند رہنے لگے۔

کرک ڈگلس پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ انہیں بہترین فلمیں اور بہترین کردار مل رہے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت مختصر عرصے میں سپر اسٹار بن گئے۔

1952ء میں انہوں نے فلم ''دی بیڈ اینڈ دی بیوٹی فل'' میں یکسر مختلف قسم کا کردار ادا کیا اور ایسی خوب صورتی سے ادا کیا کہ اس فلم میں بھی انہیں آسکر ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ ان کی کامیابی اور خود اعتمادی کا بین ثبوت تھا۔

مگر کرک ڈگلس نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ جس قسم کے کرداروں میں انہیں پسند کیا گیا تھا وہ ہر ہار ان سے مختلف کردار کرنا چاہتے تھے۔ ایکشن اور بہادر ہیرو کے بعد جب انہوں نے عالمی شہرت یافتہ مصور وان گوگ کے کردار کو قبول کیا تو سب حیران رہ گئے کہ کہاں جنگجو ہیرو اور کہاں ایک نامور مصور کی زندگی کے حالات پر مبنی فلم۔ مگر کرک ڈگلس نے چیلنج قبول کر لیا اور اس حساس اور دکھی مصور کی زندگی کی ایسی بھرپور اور متاثر کن عکاسی کی کہ دیکھنے والے حیران اور نقاد انگشت بدنداں رہ گئے۔ کہاں سپارٹکس، گن ہل اور کہاں ایک مصور کی زندگی پر مبنی فلم ''دی لسٹ فار لائف'' (زندگی کی ہوس)۔ کرک ڈگلس ہر کام کو دل و جان سے کرنے کے قائل تھے۔ اس فلم میں انہوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا اور ایسی بھرپور اور دل گداز اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ ایک بار پھر آسکر ایوارڈ ان کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ اتنی کم مدت میں یکے بعد دیگرے تین آسکر ایوارڈ حاصل کر لینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

فلم بینوں اور نقادوں کو بالآخر ان کی اداکارانہ عظمت کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کرک ڈگلس نے اپنی اداکاری کا لوہا منوا لیا تھا اور یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی ایک مخصوص ٹائپ کے اداکار نہیں ہیں، بلکہ ہر فن مولا ہیں اور ہر قسم کے کردار یکساں خوبی سے ادا کر سکتے ہیں۔

کرک ڈگلس درجنوں ممتاز سپر اسٹارز کی کہکشاں میں جلوہ گر ہو چکے تھے لیکن ہالی ووڈ کے دوسرے عظیم فنکاروں کی طرح ان کی اداکاری کا انداز بھی بالکل منفرد اور مختلف تھا۔ نہ وہ کسی سے مشابہ تھے اور نہ ہی ان کی اداکاری میں کسی دوسرے فنکار کی جھلک ہی نظر آتی تھی۔ اس دور کو ہالی ووڈ کا سنہری دور بلاوجہ ہی نہیں کہا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اداکاروں، اداکاراؤں، ہدایت کاروں، لکھنے والوں اور فلم سازوں کے علاوہ موسیقاروں اور گلوکاروں کا جو جمگھٹا اس زمانے میں دیکھنے میں آتا تھا۔ چالیس پچاس سال گزر جانے کے بعد اب خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کے بڑے سے بڑے ہیرو بھی ان لوگوں کے سامنے بالشتیے نظر آتے ہیں۔ ہیروئنوں کو دیکھیے تو اس زمانے کی ہیروئنوں کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ نہ تو صورت شکل کے اعتبار سے اور نہ ہی اداکاری کے معیار پر وہ ان کے نزدیک بھی نہیں آ سکتیں۔ نہ ہی وہ موضوعات، کہانیاں اور کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بہر حال زمانے کا یہی دستور ہے۔ وقت جب کروٹیں بدلتا ہے تو سارے زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ صورتیں، وہ رعنائیاں، وہ کمالِ فن اور ہنرمندی اب قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں؟

کرک ڈگلس کی شخصیت اور سراپا ایک شعلہ فشاں تھا جس نے ہر ایک کو اپنے انداز میں متاثر اور مسحور کر لیا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے باکسنگ چیمپئن کے کردار سے شہرت کا آغاز کیا ہو پھر تاریخی کلاسیکی داستانوں کا جیتا جاگتا کردار بن گیا۔ کبھی وہ آتش تھا تو کبھی شعلہ۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ سپارٹکس کا رومن جنگی غلام وان گاگ جیسے عدیم المثال مصور کا جذباتی اور انتہائی حساس کردار بھی کر سکتا ہے؟ مگر کرک ڈگلس نے یہ سب کر دکھایا۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ایک نگینے کی مانند تھا۔ ہر ایک کا رنگ اور چمک دمک کا

انداز مختلف تھا۔ کسی ایک کا دوسرے کے ساتھ موازنہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ البتہ اگر آج کے سپر اسٹارز سے ان کا موازنہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ نام کروز کا بھلا اس عہد کے اداکاروں سے کیا مقابلہ؟ ڈیمی مور اور جولیا رابرٹس جو آج فن کی دیویاں کہلاتی ہیں۔ جین وائمن۔ انگرڈ برگ مین سے کیا مقابلہ کرسکتی ہیں مگر وہ اُس دور کی ضرورت تھے اور یہ آج کی نسل کی مانگ ہیں۔ وقت کے ساتھ بھی کچھ بدل جاتا ہے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے

کرک ڈگلس کی اضطرابی طبیعت محض اداکاری تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے فلمیں بھی پروڈیوس کیں اور اپنے لیے موزوں کردار تراشے۔ اس کی ایک فلم ''پاتھ آف گلوری'' (فتح کا راستہ) جب ریلیز ہوئی تو اس کی زیادہ پذیرائی نہ ہوئی لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس فلم کو کلاسیکی فلموں کے زمرے میں شمار کیا گیا۔ کرک ڈگلس نے اپنے چہرے کے مضطرب تاثرات اور آنکھوں کی بدلتی ہوئی کیفیتوں سے اس کردار کو یادگار کردار بنا دیا تھا۔

کرک ڈگلس کی ایک فلم ''آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ'' جنگ عظیم کے زمانے کی کہانی تھی۔ اس فلم میں اس نے قطعی مختلف کردار بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایکشن فلموں سے اداکاری کا آغاز کرنے والا یہ فنکار کس قدر ذہین اور حساس ہے جو ہر قسم کے کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے پر قادر ہے۔

کرک ڈگلس کی فلم ''لونلی آر دی برو'' (LONELY ARE THE BRAVE) نے بھی بہت کامیابی حاصل کی پھر اگلی فلم ''ٹو ویکس ان این اور ٹاؤن'' (TWO WEEKS IN AN OTHER TOWN) نے اس کی اداکارانہ عظمت میں چار چاند لگا دیئے اور بڑے بڑے نک چڑھے نقاد بھی اس کی اداکاری کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئے۔

کرک ڈگلس کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان سب کا تعلق شوبزنس سے ہے۔ بڑے بیٹے مائیکل ڈگلس کا شمار ہالی ووڈ کے صفِ اول کے اداکاروں میں ہوتا ہے۔ ایک ان پڑھ۔ گمنام کسان کے بیٹے نے دنیا بھر کو اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کا معترف کرلیا۔ کیا اس کا یہی کارنامہ کچھ کم ہے؟

☆☆☆

دنیا میں بعض اوقات ایسے واقعات بھی رونما ہوجاتے ہیں جو ناقابلِ یقین ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں قمر یورش کی کتاب ''جانے پہچانے لوگ'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب مختلف نامور شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ خاکہ نویسی اردو میں ایک پسندیدہ اور معروف صنف ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور محمد حسین آزاد جیسے لوگوں نے بھی ایسے قلمی خاکے لکھے ہیں کہ جو اردو ادب کا جھومر بن گئے۔ خاکہ نویسی اور بھی کئی معروف اور صاحبِ فن لوگوں نے کی اور خاکہ نویسی کا حق ادا کردیا۔ عصمت چغتائی نے (اب یہ بھی مرحوم ہوچکی ہیں) اپنے مزاح نویس بھائی عظیم بیگ چغتائی کا جو خاکہ ''دوزخی'' کے نام سے لکھا تھا وہ اردو ادب میں ایک ممتاز و لیکن مستند تحریر کی حیثیت اختیار کرگیا۔

قمر یورش کے خاکے بھی ایک خاص مزاج اور کیفیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے انشاء پردازی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سیدھے سادے الفاظ میں اپنے تاثرات اور مشاہدات لکھ دیئے ہیں۔ انہیں بہت سے ادیبوں، شاعروں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جن کا احوال انہوں نے سادہ اور سہل الفاظ میں بیان کردیا لیکن ان کے یہ ذاتی مشاہدات اور تاثرات بعض نامور شخصیتوں کی زندگیوں کے ایسے رخ بھی پیش کرتے ہیں جو پہلے نامعلوم تھے۔

قمر یورش نے ایک لکھنے والے کی حیثیت سے نام پیدا کیا اور اسی حوالے سے انہوں نے اپنے زمانے کی بڑی بڑی نامور ہستیوں سے ملاقاتیں کیں۔ جن میں سے اکثر کے کافی قریب ہونے کا موقع بھی انہیں ملا۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کے بارے میں ان کا خاکہ پڑھ کر ہمیں بہت سے واقعات یاد آگئے لیکن جس طرح قمر یورش نے ان سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ بجائے خود ایک دلچسپ کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مختلف لوگوں کے بارے میں بھی انہوں نے اپنے ذاتی تاثرات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو ہم بھی قریب سے جانتے ہیں اور یہ بات کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ قمر یورش نے جو لکھا سچ لکھا اور سچ کے سوا کچھ اور نہیں لکھا۔

مگر سب سے پہلے تو خود قمر یورش کا تعارف ہوجائے تو بہتر ہے چونکہ اکثر پڑھنے والوں کے لیے شاید یہ ایک ان جانا سا نام ہو۔

قمر یورش نے لکھنے والے کی حیثیت سے نام پیدا کیا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ خود تعلیم یافتہ انسان نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ.....

''یہ شخص جو اپنے آپ کو بہت بڑا ادیب ظاہر کرتا ہے تیسری جماعت فیل ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں یہ سختی بستہ چھوڑ کر اسکول سے بھاگا تھا تو پھر بھی دوبارہ اسکول کا رخ نہیں

کیا۔ نہ ہی اس نے پرائیویٹ طور پر کسی ماسٹر سے تعلیم حاصل کی۔ پڑھنا کیا خاک تھا یہ تو پیدائشی آوارہ گرد تھا۔ دھوپ ہو یا تیز بارش کا طوفان ہو، یہ شخص ہوائی چپل پہنے ہوئے سڑک پر پیدل مارچ کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ ہمیشہ سر ہے ننگا ہوتا ہے۔ سر کے لیے اس کو ٹوپی یا چھتری خریدنے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔''

''قمر یورش جو نئی پرانی کتابیں فروخت کرکے پیسے کماتا ہے تھوڑا اپنے آپ پر اور زیادہ دوستوں کی مہمان نوازی پر خرچ کردیتا ہے۔ اس کے کپڑے عموماً میلے کچیلے پھٹے پرانے ہوتے ہیں۔ یہ پانی سے بہت ڈرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نہانے سے مہلک اثر جاتی ہے تو انسان کمزور نظر آتا ہے۔''

اب منٹو صاحب سے قمر یورش کی پہلی ملاقات کا احوال سنیے!

''یہ دسمبر 1954ء کا ذکر ہے..... میں نے ٹھیک نو بجے سعادت حسن منٹو کے مکان پر جا کر دستک دی۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نکلی جو سادے سفید گھریلو لباس میں ملبوس تھی۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ میں سعادت حسن منٹو سے ملنا چاہتا ہوں۔

اس نے میرے میلے کچیلے یا دو میل سے لتھڑے ہوئے کپڑے دیکھ کر ٹالی میں گردن ہلائی اور کہا کہ منٹو صاحب نہیں مل سکتے۔

میں نے نرمی سے پوچھا ''کیوں نہیں مل سکتے؟ مجھے تو ان سے ضرور ملنا ہے۔''

عورت نے چڑ کر ترش روئی سے کہا ''تم سے ایک مرتبہ کہہ دیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتے۔ خواہ انہوں نے تمہیں ملنے کے لیے خود ہی کیوں نہ بلایا ہو۔'' پھر اس نے پیشانی پر بل ڈال کر نفرت سے پوچھا ''تم بڑے نواب صاحب کی کوٹھی سے تو نہیں آئے؟''

میں نے اس عورت کو سعادت حسن منٹو کی نوکرانی سمجھا اور جل کر جواب دیا ''میں ساری دنیا کے نوابوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں تو ریلوے ورکشاپ کا مزدور ہوں۔''

اس عورت نے تنگ آ کر پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو مسٹر..... ڈاکٹر نے منٹو صاحب کو عام لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس لیے تم ان سے نہیں مل سکتے۔''

ہم دونوں بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں اچانک منٹو صاحب دروازے کی طرف آتے۔ دبلا پتلا چھریرا بدن، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، درمیانہ قد، چمپئی رنگ، بے قرار موٹی موٹی آنکھیں اور آنکھوں پر سنہرے فریم کی نازک سی عینک اور نگاہوں میں بیک وقت وحشت اور ذہانت کا امتزاج۔ سر پر لمبے لمبے بال، انہوں نے نہرو کٹ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ سگریٹ کا لمبا کش لگاتے ہوئے انہوں نے اس ادھیڑ عمر عورت سے پوچھا ''کیا بات ہے صفیہ۔ آج تمہارا موڈ خراب کیوں ہے؟''

عورت نے چڑ کر جواب دیا ''موڈ خراب کیوں نہ ہو۔ ہر کوئی اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلا آتا ہے اور آ کر کہتا ہے کہ مجھے سعادت حسن منٹو سے ملنا ہے۔''

منٹو صاحب نے پوچھا ''مجھ سے کون ملنا چاہتا ہے؟''

عورت منٹو صاحب کی بیوی صفیہ بانو تھیں جنہیں میں غلطی سے نوکرانی سمجھ رہا تھا۔ صفیہ بانو نے میری طرف حقارت سے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ حضرت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تم بڑے نواب صاحب کی کوٹھی سے آئے ہو تو یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام دنیا کے نوابوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں تو ریلوے ورکشاپ کا مزدور ہوں۔ مجھے منٹو صاحب سے ضرور ملنا ہے۔ مجھے ان سے ضروری کام ہے۔''

سعادت حسن منٹو مسکرائے اور بے تکلفی سے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگے ''آؤ بھائی۔ اندر آجاؤ۔ میں بھی تمہاری طرح قلم کا مزدور ہوں۔ تم ہتھوڑا چلاتے ہو۔ میں قلم چلاتا ہوں۔ صبح سے شام تک ان تھک محنت کرنے کے باوجود ہم دونوں بھوکے مرتے ہیں۔ نہ تمہاری محنت کا پھل تمہیں ملتا ہے نہ میری محنت کا ٹھیک معاوضہ ملتا ہے۔''

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

صفیہ بانو پھر کمرے میں آئیں اور سعادت حسن منٹو پر دباؤ ڈال کر کہنے لگیں ''آپ آج ان سے ملاقات نہ کریں۔''

وہ بضد تھیں۔ شاید صفیہ بانو نے اپنے نامور شوہر سے میری ملاقات کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا تھا۔ صفیہ بانو کی تلخ آواز میں عاجزی کا رنگ تھا۔ سعادت حسن منٹو نے صفیہ بانو سے کہا ''دیکھو صفیہ۔ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں ان لوگوں سے ملتا رہوں گا۔'' پھر وہ مختصر سا جواب دے کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں ملتے ہوئے مسکرانے لگے۔ ایک دلکش مسکراہٹ جیسے ان کے سارے وجود پر چھا گئی۔

میں نے منٹو صاحب کی طرف دیکھ کر افسردگی سے کہا۔ ''رہنے دیجئے منٹو صاحب۔ میں پھر کبھی حاضر ہوجاؤں گا۔ ممکن ہے آج کی یہ ملاقات ان محترمہ کو ناگوار گزری ہو۔''

منٹو صاحب نے میرا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کہا ''نہیں بھائی۔ کوئی بات نہیں۔ میں عام آدمیوں سے مل کر خوش ہوتا ہوں مگر ڈاکٹر ہمیں عام لوگوں سے ملنے سے منع کرتے ہیں۔ یہ میری بیوی صفیہ ہے۔ یہ بڑی سیدھی سادی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اللہ میاں کی گائے ہے۔ یہ ڈاکٹر کے حکم کو اللہ کا حکم سمجھتی ہے اور میں ہوں کہ ان باتوں کا خیال ہی نہیں کرتا۔''

سعادت حسن منٹو صاحب سے ہمیں بھی شرفِ ملاقات حاصل رہا ہے اور ہمیں اکثر ان کے لکشمی مینشن والے فلیٹ میں صبح، شام اور رات کے وقت جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ افسوس کہ قمر یورش صاحب نے اپنی پہلی ملاقات میں جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہمارے مشاہدے اور تجربے سے قطعی مختلف ہے۔ منٹو صاحب ہم پر بہت مہربان تھے۔ ہمارے دفتر ''آفاق'' میں آتے رہتے تھے۔ شفقت فرماتے تھے۔ ہمارے سوالات کا جواب بھی دیتے تھے مگر اتنی طویل اور دکھ بھری گفتگو ہم نے کبھی ان کی زبان سے نہیں سنی۔ نہ ہی کبھی وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ ملاقاتیوں اور دوستوں کے لیے ڈرائنگ روم موجود تھا۔ وہیں وہ محفل جماتے تھے اور اپنے مطلب اور پسند کی گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی زبان کبھی استعمال نہیں کی جو قمر صاحب نے تحریر فرمائی ہے۔

صفیہ بھابی کو ہم نے صرف دو تین بار ہی دیکھا تھا۔ وہ کبھی ڈرائنگ روم میں بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ بہت باوقار اور خوش پوش خاتون تھیں۔ ان پر نوکرانی کا گمان کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ ہی منٹو صاحب انجان لوگوں کے سامنے اپنی بیگم کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنی بیگم کے بہت قدر دان تھے۔ شکایت صرف یہ تھی کہ وہ ان کی کثرت شراب نوشی اور صحت کے پیشِ نظر بہت محتاط رہتی تھیں۔ منٹو صاحب جب اونے پونے داموں افسانے بیچ کر شراب پر صرف کرنے لگے تو انہوں نے ناشروں سے کہا کہ وہ معاوضہ براہِ راست انہیں دیا کریں۔ منٹو صاحب نے کبھی کھلے عام اس پر احتجاج نہیں کیا۔ صفیہ بھابی کو ان کے ان دوستوں سے نفرت تھی جو خود شراب پینے کے لیے انہیں بھی شراب پلانے لے جاتے تھے۔ منٹو صاحب کی صحت پر اس کا جو اثر پڑتا تھا اس کا اندازہ ایک بیوی اور ماں ہی لگا سکتی ہے۔

افسوس کہ منٹو صاحب سے قمر یورش صاحب کی پہلی ملاقات کا احوال ہمیں متاثر نہ کر سکا۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یکسر مختلف رہا ہے۔ عام طور پر وہ اپنی بیوی کی بات کو اس طرح ٹالتے بھی نہیں تھے۔ گفتگو کے لیے انہیں ہم خیال لوگوں کی اور مے نوشی کے لیے ہم مذاق لوگوں کی حاجت رہتی تھی۔ وہ مختصر بات کرتے تھے..... اپنے گھریلو حالات اور بیوی بچوں کے بارے میں وہ عموماً گفتگو نہیں کرتے تھے۔

قمر یورش صاحب نے لکھا ہے کہ..... منٹو صاحب ان دنوں سخت بیمار تھے۔ بیماری کی وجہ شاید شراب تھی۔

قمر صاحب کا یہ ''شاید'' بھی قابلِ داد ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات سے قطع نظر براہِ راست ان کی بیماری کا سب سے بڑا سبب شراب ہی تھی۔

البتہ کرشن چندر کے بارے میں انہوں نے منٹو صاحب کی جو باتیں تحریر کی ہیں وہ کافی حد تک درست معلوم ہوتی ہیں۔ قمر صاحب نے اپنی تحریر میں یہ ظاہر کیا ہے جیسے کہ منٹو صاحب ان سے بہت بے تکلف تھے اور ہر طرح کی باتیں کر لیتے تھے حالانکہ منٹو صاحب کے قریبی دوست بھی جانتے ہیں کہ یہ ان کی عادت نہ تھی۔

اب ذرا کرشن چندر کے بارے میں منٹو صاحب کی باتیں سنیے!

''وہ میرے ساتھ کرشن چندر کی باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے، دیکھو یورش یہ کرشن چندر اپنے نام کے آگے کس ٹھاٹ سے ایم، اے ٹانکتا ہے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''وہ اب اپنے نام کے آگے ایم، اے نہیں لکھتا۔ منٹو صاحب کرشن چندر تو آپ سے محبت کرتا ہے۔ آپ خوا مخواہ اس غریب پر برستے ہیں۔''

منٹو صاحب نے چڑ کر کہا ''میں کب ان سے نفرت کرتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ.....''

آگے میں مسئلہ خود ہی سمجھ گیا۔ منٹو کی انا کا مسئلہ تھا۔

انہوں نے پوچھا ''کیا غالب بی اے تھا؟ کیا شیکسپیئر ایم، اے تھا۔ کیا کالی داس پی ایچ ڈی تھا؟''

کہنے لگے ''کرشن چندر بہت غلط نویس ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''کرشن چندر ایک جگہ لکھتا ہے کہ سمندر پایاب تھا، یعنی ٹخنوں تک۔ دھت تیرے کی!''

یہ لب ولہجہ بھی منٹو صاحب کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ یاد رہے کہ منٹو صاحب کئی سال تک بمبئی میں کرشن چندر سے ملتے رہے تھے۔

منٹو صاحب نے قمر صاحب کے اصرار پر پاگل خانے کا ایک واقعہ سنایا۔

(وہ علاج کی غرض سے کچھ عرصے کے لاہور کے پاگل خانے میں رہے تھے۔ مقصد دراصل انہیں مے نوشی سے بچانا تھا۔ دماغی حالت کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا)

منٹو صاحب نے کہا ''ایک روز پاگل خانے میں میرا جانگیہ گم ہو گیا۔ میں اپنے ایک پاگل دوست صدیق کے ساتھ اسے ڈھونڈتا رہا۔ پاگل خانے کی ایک ایک بیرک دیکھی۔ ایک ایک پاگل سے پوچھا بھئی ہمارا جانگیہ جو سرخ لٹھے کا ہے گم ہو گیا ہے، تم نے تو نہیں دیکھا۔ سب پاگل لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ بعد میں صدیق پاگل نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''منٹو صاحب۔ آپ کو شاید پتا نہیں یہ پاگل بڑے پکے چور ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں چرا لیتے ہیں اور چرا کر چھپا دیتے ہیں پھر بتاتے نہیں۔ کیا بتاؤں منٹو صاحب، یہ تو دل سے راز اور آنکھوں کا سرمہ تک اڑا لیتے ہیں۔''

خیر! ہم شام تک جانگیہ ڈھونڈتے رہے مگر وہ نہ ملا۔ آخر جب میں مایوس ہو گیا اور شام کو بیرک میں بند ہونے کا وقت آیا تو صدیق نے بڑے اطمینان سے اپنی قمیص اٹھا کر پوچھا ''منٹو صاحب۔ دیکھیے۔ کہیں یہ آپ کا جانگیہ تو نہیں۔ یہ میرا ہاتھ نہ دھوتے ہوئے نکلے کے قریب پڑا ملا تھا۔''

میں نے دیکھا ہمدرد کا سرخ جانگیہ صدیق پہنے ہوئے تھا جسے میں اور وہ دونوں مل کر ہمارے پاگل خانے کی بیرکوں میں ڈھونڈتے رہے تھے۔''

قمر صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شام وہ منٹو صاحب کے پاس پہنچے تو ان کا حلیہ بہت بنا سنورا ہوا تھا۔ انہوں نے صاف شفاف سفید کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس ان کے ہاتھ میں تھی۔ منٹو صاحب نے پہلے تو ان سے فرمائش کی کہ ''وائمن کارنز'' سے انہیں شراب لا دیں۔ ان کے انکار پر منٹو صاحب ان کے ہمراہ چل پڑے۔

میٹرو ہوٹل کے پیچھے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے انہوں نے کتوں اور بھکاریوں کو کھانا چن کر کھاتے ہوئے دیکھا تو قمر یورش کو بہت کراہیت محسوس ہوئی۔

منٹو صاحب نے کہا ''تم مشاہدے سے کتراتے ہو۔ شاید تم نے یہ کراہیت آمیز منظر زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں یہ مناظر ہندوستان کے بڑے شہروں میں کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔''

میٹرو ہوٹل کے عقب میں ہوٹل کے ملازمین کے کوارٹرز تھے۔ وہیں انگریزی شراب کی ایک دکان بھی تھی۔ جب ہم دکان میں داخل ہوئے تو ایک گورا چٹا نوجوان ملاجس کی کلین شیو تھی اور سیاہ بال خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس نے منٹو صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا اور ساتھ ہی کہا ''جناب۔ ابھی ابھی آپ کے نام پر ایک شخص دو بوتل وہسکی لے کر گیا ہے۔ اس نے آپ کا نام لیا اور ہم نے فوراً تعمیل کر دی۔''

منٹو صاحب نے کہا ''جی ہاں۔ وہ شخص یہ ہے۔ یہ حضرت آپ سے شراب لے کر گئے تھے۔ یہ کہتے ہیں راستے میں دونوں بوتلیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ واللہ اعلم ٹوٹی بھی ہیں یا یونہی انہوں نے ڈکار مارے بغیر ہضم کر لی ہیں یا چھپا کر رکھ لی ہیں۔ خیر..... یہ حضرت شراب کے معاملے میں ہر قسم کی بے ایمانی کو جائز سمجھتے ہیں۔''

اتنے میں ایک ملازم لفافے میں بوتل ڈال کر لایا اور اس نے وہ بوتل منٹو صاحب کو بڑی عقیدت سے پیش کی۔ بوتل منٹو صاحب نے میرے حوالے کر دی (قمر صاحب کو شراب سے نفرت تھی) جب باہر نکلے تو انہوں نے گلہ کیا۔ منٹو صاحب۔ یہ کیا ڈراما ہے؟ آپ نے مجھ بے گناہ کو خوا مخواہ مجرم بنا دیا۔ میں کب یہاں سے دو بوتلیں لے کر گیا تھا؟

یہ سن کر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے ''یار خواجہ قمر یورش۔ ان سے میرے نام پر کوئی بھی دو بوتلیں لے کر نہیں گیا۔ یہ شخص اس وقت مجھے نشے میں سمجھ کر بے وقوف بنا رہا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بے وقوف بن جاؤں؟''

یہ زبان منٹو صاحب کبھی اپنی گفتگو میں استعمال نہیں کرتے تھے نہ ہی وہ دل کھول کر خوب ہنستے تھے۔ ہم نے انہیں بارہا دیکھا۔ ایک متانت، سنجیدگی اور دکھ کا احساس ان کے چہرے پر موجود رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی مسکراتے ضرور تھے۔ ان کے کسی بے تکلف قریبی دوست نے بھی انہیں دل کھول کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو لوگ منٹو صاحب سے ملے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس زبان اور لب ولہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ بیشتر دوستوں اور دانشوروں سے وہ پیر پرستانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ ظہیر کاشمیری جیسے ثقہ شخص کو وہ صرف ''ظہیر'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بہرحال، قمر صاحب کے تجربات شاید مختلف ہیں۔

''ایک اور واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ انارکلی سے ان کے گھر کی طرف آتے ہوئے میں نے ایک جگہ ''آبِ حیات ہوٹل'' لکھا ہوا دیکھا۔ ہم دونوں بڑے اطمینان سے جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیرا آیا۔ سعادت حسن منٹو نے آرڈر دیا کہ دو گلاس آبِ حیات لاؤ۔

بیرے نے جواب دیا ''جناب! آبِ حیات تو کسی شربت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے ہوٹل کا نام ہے۔ ہمارے پاس ہر طرح کے شربت موجود ہیں۔ میں نے آبِ حیات

شربت کا نام آج تک نہیں سنا۔"

منٹو صاحب نے چڑ کر کہا "تو پھر آپ نے باہر بورڈ پر آبِ حیات ہوٹل کیوں لکھا ہوا ہے اور شربت کی بوتلیں کیوں سجا رکھی ہیں۔ اس بورڈ سے آبِ حیات مٹا کر "واہیات ہوٹل" لکھوائیں۔

یہ منٹو صاحب کے انتقال سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے۔

ان کی وفات پر نہ کہیں ٹریفک بند ہوئی۔ نہ کوئی ہڑتال ہوئی اور نہ ہی ریڈیو نے منٹو صاحب کے متعلق کوئی خاص پروگرام نشر کیا۔

مزنگ میں میانی صاحب کی جنازگاہ میں جب نمازِ جنازہ پڑھنے لگے تو زیادہ تر طالبِ علم باہر کھڑے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔

ایک دوست نے جنازگاہ سے باہر آ کر پوچھا "یہ نوجوان باہر کیوں کھڑے ہیں؟"

انہوں نے کان میں کہا "ان کو نمازِ جنازہ پڑھنی نہیں آتی۔"

وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا "تم تو اندر چلو۔"

میں نے کہا "مجھے بھی نماز پڑھنا نہیں آتی۔"

نماز کے بعد جب منٹو صاحب کی میت کو لحد میں اتارنے لگے تو میں نے دیکھا کہ دعائے فاتحہ پڑھانے والے مولوی بہت پستہ قد تھے۔ وہ مجھے کسی الف لیلوی داستان کے جادوگر بونے نظر آتے تھے۔ انہوں نے سر پر لمبوتری سی جوکروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔

میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سعادت حسن منٹو کفن پھاڑ کر اٹھ بیٹھیں اور یہ کہہ کر جھگڑا نہ کھڑا کر دیں کہ یہ کیا فراڈ ہے۔ تم نے میری توہین کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ اسی لیے میری فاتحہ کے لیے اتنے چھوٹے قد کا آدمی لائے ہو۔ میں اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔ میرے لیے عبدالستار خان نیازی جیسا لمبا چوڑا مولوی فاتحہ کے لیے لاؤ گے تو میں دفن ہوں گا، ورنہ انکار کر دوں گا۔"

مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا چونکہ موت کے پنجے کی گرفت کافی مضبوط تھی۔

قمر صاحب نے فیض احمد فیض کے بارے میں لکھا ہے کہ "مزدوروں کے جلسے میں ایک شخص عموماً گھنٹا دو گھنٹا پہلے آ جاتا تھا اور ایک کرسی کھینچ کر ایک کونے میں لے جا کر خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے اپنے خیالات میں کھویا رہتا۔ یہ شخص گندمی رنگ، درمیانے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ عام لوگ رات کو خواب دیکھتے ہیں مگر یہ شخص دن کو کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر دل میں اندازہ لگاتا تھا کہ یہ ضرور کوئی خفیہ پولیس کا انسپکٹر ہے۔ میں اس بات کا بھی معترف تھا کہ یہ جونس کے پروں کی طرح سفید اور صاف شفاف لباس میں ملبوس خفیہ انسپکٹر ہے، بہت شریف آدمی ہے۔ یہ شخص ہمارے جلسوں میں کرائے کے غنڈوں سے حملے نہیں کراتا اور نہ ہی باوردی پولیس سے جلسہ ختم ہونے کے بعد ہمارے ساتھیوں کو زدوکوب کرتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شک پڑتا تھا کہ جیسے نشئے انداز میں وہ کچھ بڑبڑاتا بھی ہے۔ میں کافی عرصے تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ عرصہ دراز بعد ایک مزدور ساتھی نے بتایا کہ وہ برصغیر کا ممتاز ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض ہے۔"

بہت کم لوگوں نے انہیں مزدوروں کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ میں نے اکثر ان کی تقریریں سنی ہیں۔ فیض صاحب کا شعر پڑھنے کا انداز بھی سب سے جدا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ شعر نہیں پڑھ رہے کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ فیض صاحب یا تو مغرور ہیں یا ضرورت سے زیادہ بے نیاز ہیں۔ کسی کو لفٹ نہیں کراتے۔ یہ بات نہیں ہے۔ میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ جب خاص دوستوں کا حلقہ ہو تو پھر وہ اپنے دل پسند موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ جس وقت وہ علم و دانش کے موتی رولتے تھے ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ان کی گوتمی مسکراہٹ میں بڑی کشش تھی۔ یہی ان کی شان محبوبی تھی۔ فیض صاحب اپنی ذات کو کائنات سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ چاند کو بھی اپنی دھرتی کا ایک ٹکڑا تصور کرتے تھے۔ وہ پاکستان کے ان پسند دانشوروں میں واحد شاعر تھے جنہوں نے اپنے آپ کو "ڈی کلاس" کیا تھا اور اپنی زمین بلا معاوضہ کسانوں میں تقسیم کر دی تھی۔

"میں فیض صاحب کی خدمت میں تیس سال بعد حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فیض صاحب بہت بدل گئے تھے۔ نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ عادات کے لحاظ سے ان میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ اب واقعی کپتان دکھائی دیتے تھے۔ ان میں جوانوں کی سی پھرتی آ گئی تھی۔ اب وہ چاق و چوبند رہتے تھے حالانکہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ اب ان میں جیتے کی سی لپک آ گئی تھی اور شاعری میں بھی توانائی پیدا ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے حسین خیالوں کی دنیا سے باہر

پُراسرار مجسمہ

سسلی سے جب مسلمانوں کو نکال دیا گیا تو رابرٹ ڈسکرڈ نامی ایک شخص کو ایک مجسمہ نظر آیا جو سنگِ مرمر کے چبوترہ پر نصب تھا اور اس کے سر پر کانسی کا تاج تھا، جس پر لکھا ہوا تھا کہ "جب یکم مئی کو سورج غروب ہوگا تو میرے سر پر سونے کا تاج چمکے گا" اس شخص نے بڑا غور کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ جب یکم مئی کا سورج غروب ہوا تو اس کے سر پر کانسی کے بجائے سونے کا تاج چمکنے لگا۔ اس نے عیسائی مختتین اور سائنس دانوں سے کہا کہ وہ اس معمے کو حل کریں لیکن کوئی اس کا تشفی بخش حل پیش نہ کر سکا۔ اتفاق سے ان کے ہاں ایک مسلمان قیدی تھا۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اس نے کہا کہ مجھے آزاد کرو میں تمہیں اس پریشانی سے نجات کا راستہ بتاتا ہوں۔ انہوں نے اسے آزاد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے کہا جب یکم مئی کو سورج غروب ہونے لگے تو دیکھیں کہ اس کے تاج کا سایہ کس جگہ پڑ رہا ہے۔ اس جگہ کو کھودیں وہاں آپ کو سونے چاندی کے انبار ملیں گے۔ وہ ایک سال انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یکم مئی کا وہ مخصوص دن بھی آ گیا۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو اس وقت جہاں تاج کا سایہ پڑا وہاں انہوں نے نشان لگا لیا اور جب اس جگہ کو کھودا گیا تو وہاں سے زر و جواہر کا گراں بہا خزانہ ملا۔

مرسلہ: ایس اختر ساگر، منڈی بہاؤالدین

فوری پیغام

یہ جاننے کے لیے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے کسی اور سیارے میں بھی ذہنی اور عقلی اعتبار سے کوئی ترقی یافتہ مخلوق بستی ہے سائنس دانوں نے 1974ء میں ریڈیو کے ذریعے ستاروں کے قریب ترین جھرمٹ کی طرف ایک پیغام بھیجا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر انٹ کا یہ پیغام ان ستاروں تک 25000 سال بعد پہنچے گا اور اگر وہاں کوئی ایسی مخلوق ہوئی اور اس نے اس پیغام کا جواب دیا تو اسے زمین تک پہنچنے میں 25000 سال کا عرصہ لگ جائے گا۔ (گویا ایک لاکھ سال کے آدھے حصے میں) ہے نا فوری جواب؟"

مرسلہ: مرتضیٰ احمد خان، لاہور

آ گئے تھے۔

فیض صاحب نے اپنی زندگی میں دولت نہیں بنائی نہ ہی محلات کھڑے کیے ہیں۔ ان کے دوست دنیا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس لحاظ سے وہ دنیا کے امیر ترین انسان تھے۔ جب انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو ان کے گھر میں اتنے لوگ جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔"

آغا شورش کاشمیری کے بارے میں قمر یورش کے تاثرات یہ ہیں کہ وہ ان کی خطابت اور شعلہ انگیز تحریروں سے بہت متاثر تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے بلکہ ان سے عشق کرتے تھے۔ ان سے متاثر ہو کر انہوں نے خود کو آغا شورش بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنا ایک "غلط سلط" مضمون لے کر آغا صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے مضمون دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور میرے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا اور کہا "یہ مضمون غلط ہے۔"

قمر صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ بار بار مضمون لکھ کر آغا شورش کاشمیری کے پاس لے گئے۔

"انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ شکنی کی کہ تم غلط لکھتے ہو۔" ایک روز پھر وہ ایک مضمون بڑی محنت سے لکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انہوں نے کہا "یہ مضمون بھی غلط ہے۔"

انہوں نے جرأت کر کے پوچھا "جناب آغا صاحب اگر میرا ہر مضمون غلط ہے تو صحیح مضمون کیا ہوتا ہے؟"

انہوں نے پاس کھڑے اشرف عطا سے کہا "یار عطا۔ اس منڈے کو بتا کہ صحیح مضمون کیا ہوتا ہے اور غلط کیا ہوتا ہے۔" اشرف عطا مسکرانے لگے۔

اس سے قمر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آغا صاحب انہیں اپنے پرچے "چٹان" میں نہیں چھاپنا چاہتے اس لیے ٹرخا رہے ہیں۔ وہ آغا شورش کے ان "ہتھکنڈوں"..... متنفر ہو گئے۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نہ تو آغا شورش کاشمیری کے انداز خطابت کو اپنائیں گے اور نہ ہی ان کے انداز میں سوچیں گے۔ انہوں نے لکھنے پڑھنے پر خوب محنت کرنا شروع کر دی۔

اس زمانے میں قمر یورش صاحب تیسری فیل ہو کر تازہ تازہ لکھنا سیکھ رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ بھائی جمہوریت کی خاطر پس دیوار زنداں چلے گئے۔ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے تمام اخبارات و رسائل میں لکھنا شروع کر دیا "آغا شورش نے میرے مضامین کا مطالعہ کیا تو انہیں پسند آئے۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور دفتر چٹان بلا کر چائے پیسٹری سے خوب

خاطر مدارات کی اور کہا کہ تم میرے چھوٹے بھائی اقبال یورش مرحوم کی طرح ہو۔ چٹان تمہارا رسالہ ہے۔ جس پر تمہارا جی چاہے لکھو۔ جس کی چاہو تصویر شائع کرو۔'' ان کے مضامین چٹان میں دھڑا دھڑ شائع ہونے لگے۔ آغا شورش ان کے استاد تھے۔ وہ ان کے سامنے طفلِ مکتب تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ آغا صاحب موڈی آدمی ہیں۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ موڈ میں ہوتے تو میری خوب آؤ بھگت کرتے۔ چائے بسکٹ سے تواضع کرتے۔ نہ موڈ ہوتو پہچاننے سے انکار کردیتے۔ یوں دیکھتے جیسے کسی کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں۔

کبھی پانچ دس آدمیوں کے سامنے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر مزاحیہ انداز میں کھڑے ہوجاتے اور کہتے ''اوئے میری جان چھوڑ دے۔ تو کہاں زکام کی طرح مجھے چٹ گیا ہے۔ میں نے تمہارے مضمون چھاپ کر جیل جانا ہے۔ اپنا پریس ضبط کرانا ہے۔ یہ رسالہ ''چٹان'' بند کرانا ہے؟ اوئے تیرا تو آگے پیچھے رونے پیٹنے والا کوئی زندہ نہیں۔ میں تو مفت میں بغیر موت کے مارا جاؤں گا۔ اگر میں جیل چلا گیا تو میرے ڈیڑھ درجن بچے کہاں جائیں گے۔''

تمام دوست مجھ پر ہنس رہے ہیں اور میں ذلیل ہورہا ہوں۔ آخر ایک روز میں نے تنگ آکر کہا ''آغا صاحب۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ آپ غلطی سے صحافی اور لیڈر بن گئے ہیں۔ آپ کو صرف ڈراما نگار ہونا چاہیے تھا۔ جب آپ مجھ پر گرجتے برستے ہیں تو مجھے بالکل آغا حشر کاشمیری کے شاگرد نظر آتے ہیں۔''

قمر یورش کچھ عرصے بعد ''قوم کی خدمت کے لیے'' پھر جیل چلے گئے۔ اس سے پہلے آغا صاحب نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ انہیں بطور تحفہ دیا تھا جو کہ ان کے گھر سے چوری ہوگیا۔

جیل سے آکر وہ آغا صاحب کے پاس گئے تو وہ بڑے پیار اور خلوص سے ملے۔ چائے پیسٹری سے تواضع کی اور بزرگانہ انداز میں سمجھانے لگے کہ ''دیکھو۔ میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ ایک بات کی نصیحت کررہا ہوں۔ تم اپنی زندگی خوا مخواہ برباد نہ کرو۔ میری طرح پریس لگاؤ۔ اپنا پرچا نکالو۔ اپنا بینک بیلنس بناؤ۔ یہ دنیا تمہارا احترام کرے گی ورنہ تم قوم کی خدمت کرتے ہوئے فاقوں سے مرجاؤ گے۔ تمہیں ٹی بی کی بیماری لگ جائے گی۔ تم خون تھوکتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤ گے۔ کوئی شخص میرے پاس آئے گا اور کہے گا، قمر یورش مرگیا ہے۔ اس کے کفن دفن کے لیے چندہ دو!''

قمر صاحب نے ان کی بات بڑے غور اور تحمل سے سنی اور بڑے احترام سے کہا ''آپ کی محبت کا شکریہ، آغا جی۔ جو آپ سے میرے کفن دفن کے لیے چندہ لینے آئے تو آپ اسے جوتے مار کر نکال دینا۔ میں تو روایش آدمی ہوں۔ اتنے میں ہی خوش ہوجاتا ہوں جب لوگ مجھے سینے سے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قمر یورش غریبوں کا ساتھی ہے اور آغا شورش امیروں کا ساتھی ہے۔''

آغا صاحب یہ سن کر غصے میں آگئے اور کہنے لگے ''کون حرام زادہ کہتا ہے کہ میں امیروں، کا ساتھی ہوں۔ میں تو غریبوں کا حامی ہوں۔''

قمر یورش نے آغا شورش کاشمیری کے بارے میں بہت سے مشاہدات اور تجربات رقم کیے ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے خود ہمیں بھی 1951ء میں آغا صاحب کے ساتھ ''چٹان'' میں ایک سال تک کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ قمر یورش نے ان کے جو اوصاف لکھے ہیں بلاشبہ ان میں کوئی شک نہیں ہے مگر ان کے بارے میں جو اپنے ذاتی تجربات تحریر کیے ہیں وہ تلخ سہی مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں بھی کسی حد تک صداقت ہے۔ آغا شورش کاشمیری کے بارے میں ہم اپنے تاثرات اور مشاہدات کافی تفصیل سے لکھ چکے ہیں مگر ان کے کردار کے جس پہلو پر قمر یورش نے روشنی ڈالی ہے ہم بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ اگر زندگی نے آغا صاحب کے بارے میں مزید لکھیں گے مگر قمر صاحب نے جس طرح اپنی خاطر مدارات اور چائے پیسٹری کھلانے کا تذکرہ کیا ہے اس کا ہمیں کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ جب ہم نے رفتہ رفتہ ''ماہی مخواہ'' پر ''چٹان'' کے بیشتر کام سنبھال لیے تو آغا صاحب بہت خوش اور مہربان ہوگئے۔ انہوں نے ہمیں اپنے ذاتی کمرے میں بیٹھ کر لکھنے اور ان کا فون استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ ہم ان دنوں نوائے وقت میں رات کی ڈیوٹی کرکے صبح سائیکل پر سوار ہوکر ماڈل ٹاؤن جاتے تھے۔ آغا صاحب نے ازراہِ کرم ہمیں اپنے ہوٹل کے ایک کمرے میں رات گزارنے کی اجازت بھی دے دی اور نیچے ریستوران کے مالک ملک حیات کو یہ ہدایت کردی کہ ہم جو بھی کھانے پینے کے لیے ان سے طلب کریں وہ مہیا کردیا جائے۔ یہ سب اپنی جگہ مگر ہم نے ایک سال کے طویل عرصے میں آغا صاحب کو کبھی کی چائے پیسٹری سے تواضع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

یہ بھی درست ہے کہ ان گنت خوبیوں کے ساتھ ساتھ آغا شورش میں چند انسانی کمزوریاں بھی تھیں مگر ہم نے احترام ہی سے احتراز کیا۔

قمر صاحب نے مضمون کے آخر میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ بھائی جمہوریت کے سلسلے میں وہ گرفتار ہوکر لاہور جیل میں نظر بند کردیے گئے تھے۔ ان کے بعد آغا شورش کاشمیری بھی گرفتار ہوگئے اور ساہیوال جیل میں رکھے گئے۔ اسی زمانے میں ایک دوست نے قمر صاحب کو بتایا کہ ساہیوال جیل میں ساتھ والی کوٹھڑی میں آغا شورش کاشمیری نظر بند تھے۔ وہ تمہاری بڑی تعریف کررہے تھے اور ساتھ ہی یہ کہہ رہے تھے۔

''ایک روز نخت روزہ چٹان کے دفتر میں قمر یورش کی ماں آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ہمارا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ میں نے قمر یورش کی ماں کو سو روپے دیئے تھے۔''

''مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا چونکہ میری ماں تو اس وقت فوت ہوگئی تھی جبکہ میں دو سال کا تھا۔ اگر آغا شورش صاحب نے میری ماں کو پیسے دیئے بھی ہوتے تو تب بھی انہیں یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ جبکہ یہ ساری بات جھوٹی تھی۔''

ناظم سرحدی نے اسے کیا کہے؟

☆☆☆

سید عبدالحمید عدم مایہ ناز شاعر تھے۔ افسوس کہ وہ کل وقتی سرکاری افسر تھے اور وہ محکمہ لائبریری کے شعبہ اکاؤنٹس میں۔ ان کی زندگی کا بیشتر وقت اور قیمتی حصہ روپے آنے پائی کا حساب کرنے اور کھاتے چیک کرنے میں گزر گیا، لیکن اس کے باوجود وہ پیدائشی شاعر تھے اس لیے شاعری کا یہ جذبہ تمام حالات کے باوجود ابھر کر سامنے آیا اور ''پارٹ ٹائم'' شاعر بننے کے باوجود انہوں نے غضب کی شاعری کی اور بڑے بڑے نامور ہم عصروں کی محفل میں بھی بہت نام پیدا کیا۔ عدم کو شراب خراب بھی کہا جاتا ہے اور رندِ سرمست بھی۔ ان میں جہاں بھر کی خوبیاں تھیں مگر ہزار برائیوں کی ایک برائی یہ تھی کہ وہ بلا ناغہ شراب نوش تھے۔ بے نوشی کرتے تھے اور اس وقت تک کرتے رہتے تھے جب تک ہوش وحواس ساتھ نہ چھوڑ جائیں۔ ہمیں کئی بار انہیں دیکھنے اور ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے اور ہم نے انہیں ایک لاجواب انسان اور بے حد خوب صورت شاعر پایا لیکن ان کی بے نوشی نے ہمیں بھی بہت تکلیف پہنچائی۔ کاش ان میں یہ عیب نہ ہوتا تو غالب کا یہ مصرعہ ان پر بے حد تک صادق آتا تھا کہ.....

ہے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس معاملے میں غالب اور عدم دونوں ہی ولی ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دونوں بادہ خوار تھے لیکن غالب ایک حد میں رہتے تھے۔ یہ تو نہیں کہ جوش صاحب کی طرح گھڑی

ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات
(باتصویر)
مصنف: اسلام حسین
ٹیلی پیتھی کے موضوع پر جدید ترین اور مکمل کتاب
نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال وجواب
کتاب کے چند عنوانات
ٹیلی پیتھی ایک علم، ایک سائنس
ٹیلی پیتھی کا ماضی اور حال
ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
ٹیلی پیتھی میں یوگا کا استعمال
فیئر معمولی، حس ادراک اور روحانی قوتیں
مستقبل کی پیش گوئی
قیمت:-/45 روپے
ڈاک خرچ:-/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895313
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی نمبر 2 کراچی

سامنے رکھ کر جرعہ جرعہ پیتے تھے، لیکن مجاز لکھنوی کی طرح گھڑا سامنے رکھ کر بھی نہیں پیتے تھے۔ عدم نہ گھڑی کے قائل تھے نہ گھڑے کے۔ انہیں شخص پینے سے کام تھا۔ وہی بات تھی کہ.....

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

وہ ایک گونہ بے خودی تک محدود نہیں رہتے تھے بلکہ مکمل بے خودی پر یقین رکھتے تھے۔ غالب کی طرح عدم بھی واعظ، مولوی اور نام نہاد دیندکاروں پر طنز کرنے اور چھیڑ خانی سے باز نہیں رہتے تھے۔ غالب نے کہا۔

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اسی طرح غالب کی مرصع غزل (اور غالب کی کون سی غزل مرصع نہیں ہے) سے بھی ان کا کلام قدرے مناسبت رکھتا تھا۔ غالب کی وہ غزل ذرا یاد کیجئے!

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یہاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اور پھر.....

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

عبدالحمید عدم بھی اس قسم کی چھیڑ خانیوں سے باز نہیں رہتے تھے۔ مثلاً!

اس قدر بوجھ تھا گناہوں کا
حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا

یا پھر.....

میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد الطویل تھا

یہ سب مانتے ہیں کہ اگر عدم بھی غالب کی طرح صرف شاعری ہی کرتے تو خدا جانے کس غضب کے شاعر ہوتے۔ وہ بے حد زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ ان کے پاس شعر کہنے کا وقت صرف رات ہی کا ہوتا تھا۔ جب شعر لکھنے بیٹھتے تو سیکڑوں اشعار لکھ ڈالتے۔ صبح خوشہ چیں انہیں چن کر رکھ لیتے۔ بہت سے کارآمد اشعار بھی ضائع ہو جاتے۔ انہیں بہت دور کی سوجھتی تھی۔ ان کے کلام پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی فکر کتنی بلند تھی۔ وہ بے حد حساس، نیک نفس اور شریف آدمی تھے۔ فیاض اور متحیر بھی تھے۔ پیسے کو ہاتھ کا میل جانتے تھے۔

عدم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ملٹری اکاؤنٹس افسر ہونے کے باوجود بے حد نازک کلام شاعر تھے لیکن صورت شکل اور قد وقامت کے اعتبار سے بھی وہ شاعر ہرگز نہیں لگتے تھے۔

عدم کے بارے میں قمر یورش کے تاثرات ملاحظہ کیجئے!

''جب میں ان سے ملا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عدم مجھے شاعر رومان کے بجائے اچھے خاصے باڈی بلڈر، کے بازیا ناخ کی طرح پہلوان نظر آرہے تھے۔ سانولا رنگ، دیو قامت، وہ شاعر ہرگز نظر نہیں آتے تھے۔ میں ان کی بڑی تعریف سن چکا تھا کہ وہ بڑے خوب صورت شاعر اور بے حد دوست نواز ہیں۔ ان کے پاس روپے پیسے کی بھی کمی نہیں۔ وہ دوستوں پر دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ مجھے رستم زماں گاماں پہلوان کے شاگرد نظر آتے تھے۔ ان کا گول چہرہ، بچوں کی طرح معصوم تھا۔ ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ بعد کی ملاقاتوں سے پتا چلا وہ واقعی جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں۔ عدم صاحب عجز وانکسار کا مجسمہ تھے۔ بات بات پر ہاتھ جوڑتے، انہیں اپنی بڑائی کا کوئی غرور نہ تھا۔ اکثر میس لایا جائے میں دفتر آتے۔ کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے مگر ان کے سوٹ کا کپڑا ہمیشہ فیتی اور نایاب ہوتا تھا۔ جب محفل رنداں میں آتے تو دو چار سو روپے جیب میں ڈال کر آتے (وہ ستر از مانہ تھا اور یہ کافی بڑی رقم تھی) خود پیتے، دوستوں کو بھی پلاتے تھے۔ جب پی لیتے تو بلبل ہزار داستاں بن جاتے۔ کبھی کبھی ان کے ساتھی عالم سرور میں دیکھتے تو ان کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ عدم کو پتا چلتا تو وہ رونے لگتے۔ وہ رونے ہوئے بھی بہت معصوم اور خوب صورت دکھائی دیتے تھے۔ جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا گم ہو جانے پر روتا ہے۔

عدم کی محفل عجیب تھی۔ یہاں ہر وضع اور ہر طرز کا آدمی بے تکلفی سے آتا تھا۔ سب سے برابری کا سلوک ہوتا۔

عدم کو مناظر فطرت سے عشق تھا۔ جب شام کو آسمان پر پھیلی ہوئی لالہ گوں شفق یا رات کو چاندنی کا نکھار دیکھتے تو ان پر مدہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ بن پیے جھومنے لگتے۔ تمام دوستوں کا کام بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ عدم صاحب کے کئی ملنے والے ان کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان سے دغا بھی کر جاتے تھے۔

یورش صاحب نے ان کی دوست نوازی کے کئی واقعات بھی لکھے ہیں۔ یہ ان کی عملی ظرفی کی نشانی تھی۔ وہ دوسروں کے کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ موقع ملتا تو پیدل ہی چل پڑتے۔

عدم بہت حساس تھے۔ اتنے لطیف کہ ایک اچھا شعر انہیں ہفتوں تڑپانے کی قدرت رکھتا تھا۔ گوئٹے، شیلے، کیٹس، بائرن، ورڈز ورتھ، کیٹس، عمر خیام، غالب، حافظ، انیس، ذوق، ناسخ، حالی، بیدل کے سیکڑوں شعر ان کی نوک زبان تھے۔ جب وہ عالم مدہوشی میں ہوتے تو شراب وشباب کے موضوع پر بے تکان شعر سناتے چلے جاتے۔ ایک دن آہ بھر کر کہنے لگے ''آہ..... میری تمام عمر فائلوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئی۔ کاش میں کسی غنچہ دہن کے ساتھ کسی مرغزار میں بیٹھا ہوا بہار کے گیت گاتا اور ستاروں کے سپنے بنتا۔'' پھر کچھ رک کر بولے ''مگر یار محفل بھی بری نہیں ہے۔''

مدہوش عدم کو قابو کرنا مست ہاتھی کو قابو کرنے کے برابر تھا۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور مسعود نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں عدم کو ان کے گھر چھوڑ آؤں۔ میں عدم کو لے کر مینکلوڈ روڈ پر آ گیا۔ لاہور ہوٹل کے پاس ایک ٹانگے والا ملا۔ اس نے فرشی سلام کر کے پوچھا۔

''حضور کہاں جائیں گے؟''

عدم نے بڑی شان بے نیازی سے کہا ''چھاؤنی۔''

ٹانگے والے نے کہا ''دس روپے کرایہ ہوگا۔'' عدم نے سالم ٹانگا لیا۔ عدم اگلی سیٹ پر اور میں پچھلی سیٹ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

جب ٹانگا دھرم پورہ نہر کے پل کے قریب پہنچا تو وہاں دودھیا رنگ کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ عدم نے ایک پنواڑی کی دکان پر ٹانگا رکوایا۔ میں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟''

عدم نے کہا ''ایک کوکا کولا کی بوتل پینی ہے۔''

میں نے کوکا کولا کی بوتل لی اور عدم کو پکڑا دی۔

پھر عدم نے کہا ''ایک بوتل تم پیو گے تب میں پیوں گا۔''

میں نے ایک بوتل اپنے لیے بھی لے لی۔

پھر عدم نے کہا ''ایک بوتل کو چوان بچے گا تب میں پیوں گا۔''

میں نے ایک بوتل کو چوان کو بھی لے کر دی۔

پھر عدم نے کہا ''ایک بوتل گھوڑا پئے گا تب میں پیوں گا۔''

میں سمجھ گیا کہ عدم صاحب شرارت پر تل گئے ہیں۔

میں نے عدم صاحب کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''عدم صاحب تماشا نہ بنیں۔ لوگ ٹانگے کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ جلدی سے پیسے نکالیے۔ پنواڑی آپ کو نہیں جانتا کہ آپ شاعر عدم ہیں۔ وہ ایسے بھی مجھے غنڈا دکھائی دیتا ہے پیسے نہ دینے پر وہ آپ کو نہر میں پھینک دے گا پھر آپ آرام سے عدم آباد پہنچ جائیں گے۔''

یہ سن کر عدم نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اس پنواڑی کو دیا۔

اب مصیبت یہ آپڑی کہ عدم صاحب بقیہ پیسے واپس لینا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے پنواڑی سے پیسے لے کر زبردستی عدم صاحب کی جیب میں ڈالے اور ٹانگا آگے چلا۔ میرے دل میں یہ خدشہ تھا کہ شاید عدم کی جیب میں پرمٹ نہ ہو اور ہم پکڑے جائیں۔ رات حوالات میں رہنا پڑے۔

آخر عدم صاحب کی کوٹھی آئی۔ ہم ٹانگے سے اترے۔ کوچوان کا کرایہ دیا۔ جب عدم نے ڈرتے ڈرتے اپنی کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک چھوٹا لڑکا نکلا۔

عدم نشے کی حالت میں اپنے چھوٹے بیٹے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور روتے ہوئے کہنے لگے ''میں تو پیتا ہی نہ تھا۔'' پھر میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''اس شخص نے مجھے زبردستی پلائی ہے۔'' اور ساتھ ہی کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر نوٹ نکال کر اپنے بیٹے کو دکھانے لگے کہ میرے پاس پیسے بھی ہیں۔

ان کا چھوٹا صاحب زادہ مجھے اور میاں مسعود کو تڑاتڑ گالیاں دینے لگا۔ میں وہاں سے گالیاں کھا کر چپکے سے کھسک آیا۔

میری عدم سے آخری ملاقات دوپہر کے وقت انارکلی بازار میں ہوئی۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ انارکلی میں خریداری کے لیے جا رہے تھے۔ آگے آگے بیگم صاحبہ تھیں اور پیچھے عدم بڑے فرماں بردار شوہر کی طرح جا رہے تھے۔ اب ان کی صحت بری طرح گر چکی تھی۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ البتہ چہرے پر دیسی ہی معصومیت تھی۔ وہ اپنی بیگم کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر یوں چل رہے تھے جیسے کوئی خلا نورد چاند کی زمین پر چل رہا ہو۔

مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے عدم کے کوٹ کا دامن کھینچ

کر کہا۔

''رن مرید''

پھر کیا تھا۔ اتنا کہنے کی دیر تھی کہ جیسے بارود میں آگ لگ گئی۔ عدم نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھگت کبیر کی طرح سر راہ رونے لگے۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

لوگوں نے یہ سمجھا کہ بڑے میاں کی جیب کٹ گئی جو رو رہے ہیں۔ کسی نے پوچھا ''بڑے میاں کیا بات ہے۔ کیوں شور مچا رہے ہیں؟''

عدم نے روتے ہوئے کہا ''وہ بدمعاش قمر یورش مجھے کہتا ہے کہ عدم رن مرید جا رہا ہے۔''

عدم کے منہ سے یہ فقرہ سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔

بیگم کہنے لگیں ''دفع کرو اس بات کو۔ آپ کو شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے۔''

عدم بگھر گئے۔ وہ بضد تھے کہ قمر یورش نے مجھے رن مرید کیوں کہا۔ یہ ہوتا کون ہے ایسی بات کہنے والا؟

ان کی بیگم بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔

اس کے بعد میری عدم سے ملاقات نہ ہو سکی۔

ایک روز احمد ندیم قاسمی صاحب نے بتایا کہ عدم نے شراب چھوڑ دی ہے۔ یہ بیسویں صدی کا معجزہ تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ عدم صاحب اب چائے پی رہے ہیں۔

پھر ایک روز خالد احمد نے بتایا کہ عدم نے داڑھی رکھ لی ہے اور آج کل کثرت سے نمازیں پڑھ رہے ہیں۔

اچانک ایک روز اخبار میں پڑھا کہ وہ اس فانی دنیا سے انتقال فرما گئے ہیں۔

یہ خبر مجھ پر ایٹم بم بن کر گری۔ میں کبھی کبھی عدم کو چڑانے کے لیے کہتا تھا۔ اب شہر میں جی نہیں لگتا۔ عدم جی عدم آباد چلا۔

اور وہ واقعی عدم آباد چلے گئے۔ دور افق کے اس پار، ستاروں سے بھی آگے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔''

عبدالحمید عدم چونکہ الگ تھلگ، اپنی دنیا میں مگن رہنے والے انسان تھے اسی لیے ان کی پی، آر بھی نہ تھی۔ نہ ہی وہ کسی ادبی انجمن ستائش باہمی کے سرگرم رکن تھے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور منتخب دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر خوش ہو جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نفیس طبع اور اعلیٰ مرتبت شاعر ہونے کے باوجود انہیں ادب میں وہ مرتبہ حاصل نہ ہوا جس کے کہ وہ مستحق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سے بہت کم لوگ آشنا ہیں۔ اب ان کا تذکرہ نکل ہی آیا ہے تو عدم کے کچھ اشعار سنیے اور ان کی شاعرانہ لطافت اور اسلوب بیان کا لطف اٹھائیے۔

جو لوگ جان بوجھ کے نادان بن گئے
میرا خیال ہے کہ وہ انسان بن گئے
ہم حشر میں گئے تھے مگر کچھ نہ پوچھیے
وہ جان بوجھ کر وہاں انجان بن گئے
انسانیت کی بات تو اتنی ہے شیخ جی
بدقسمتی سے آپ بھی انسان بن گئے
کانٹے بہت تھے دامن فطرت میں اے عدم
کچھ پھول اور کچھ مرے ارمان بن گئے

میکدہ تھا، چاندنی تھی، میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی، میں نہ تھا
عشق جب دم توڑتا تھا تم نہ تھے
موت جب سر دھن رہی تھی میں نہ تھا
وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذت ہمسائیگی تھی میں نہ تھا
میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا
گیسوؤں کے سائے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی، میں نہ تھا

ہنس کے بولا کرو بلایا کرو
آپ کا گھر ہے آیا جایا کرو
حد سے بڑھ کر حسین لگتے ہو
جھوٹی قسمیں ضرور کھایا کرو
حکم کرنا بھی اک سخاوت ہے
ہم کو خدمت کوئی بتایا کرو
بات کرنا بھی بادشاہت ہے
بات کرنا نہ بھول جایا کرو
تاکہ دنیا کی دلکشی نہ گھٹے
نت نئے پیرہن میں آیا کرو

☆☆☆

حسب معمول پاکستان اور بیرونی ملکوں سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں قارئین نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے، کچھ مشورے دیئے ہیں اور کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں سے بعض میری دانست میں غیر ضروری اور ناقابل فہم ہیں۔ مثال کے طور پر استاد بسم اللہ خاں سارنگی نواز کے بارے میں ایک گزشتہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک تازہ شمارے میں بھی ان کا تذکرہ آیا تو روا روی یا بے دھیانی میں استاد بسم اللہ خاں کو سارنگی نواز کی بجائے طبلہ نواز لکھ دیا گیا حالانکہ ان کے تمام کوائف درست تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ قارئین کی جانب سے خطوط اور پیغامات کا ایک ریلا آ گیا جس میں نشان دہی اور تصحیح کی گئی تھی کہ استاد بسم اللہ خاں طبلہ نواز نہیں، سارنگی نواز تھے۔

غلطیوں کی اصلاح اور نشان دہی کرنے والوں کے ہم حقیقتاً بہت شکر گزار ہوتے ہیں لیکن اس قسم کی غلطیوں کے بارے میں لکھنا اسی طرح ہے کہ جیسے ''کاتا اور لے دوڑی''۔ بھائی، جس شخص نے استاد بسم اللہ خاں کے بارے میں اتنی بہت سی خصوصیات بیان کی ہیں کیا وہ اتنا نہ جانتا ہو گا کہ وہ طبلہ نواز ہیں یا سارنگی نواز؟ لیکن بعض حضرات و خواتین اپنی قابلیت اور معلومات کا اظہار کرنے کے لیے ایسی غلطیوں کو بھی پکڑ لیتے ہیں۔ خط لکھتے ہیں۔ فون کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ بے دھیانی یا روا روی کی گمراہی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک صاحبہ نے ٹیلی فون پر ہمیں ایک طویل لیکچر پلایا۔

ہم سنتے رہے پھر پوچھا ''محترمہ۔ یہ بتائیے کہ استاد بسم اللہ خان کے بارے میں جو معلومات ہم نے فراہم کی ہیں کیا آپ ان سے واقف تھیں؟''

''جی نہیں۔ بہت سی باتیں میرے لیے بالکل نئی تھیں۔''

''پھر آپ یہ سوچیے کہ جو شخص ان کے بارے میں اتنا کچھ بیان کرتا ہے کیا وہ اتنا نہیں جانتا ہو گا کہ وہ طبلہ نواز تھے یا سارنگی نواز؟''

وہ خاموش ہو رہیں۔

''دیکھیے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ عقل کُل یا معلومات کا خزانہ نہیں ہیں۔ غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ کوتاہی بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ معلومات ناقص بھی ہو سکتی ہیں تو کیا ان انسانی غلطیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر معلومات غلط ہیں تو ان کی تصحیح بے شک فرمایئے۔''

انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ خدا جانے قائل ہو گئیں یا ناراض؟

آخر میں سلطان مسعود صاحب کے ایک خط پر مضمون کا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں) تیار ہے

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

اختتام کرتے ہیں۔ سلطان مسعود احمد صاحب گزشتہ چالیس سال سے انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ سرگزشت میں فلمی الف لیلہ بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ چند ماہ کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

''وی سی آر کی ایجاد سے پہلے انگلستان کے سنیما ہالوں میں بھارتی فلمیں دکھائی جاتی تھیں (اسی زمانے میں پاکستانی فلمیں بھی وہاں سینما گھروں میں دکھائی جاتی تھیں مگر نسبتاً کم) یہ سلسلہ اب دوبارہ شروع ہوگیا۔ (بدقسمتی سے پاکستانی فلموں کی نمائش کا سلسلہ قطعی بند ہوگیا ہے) اس لیے بھارتی فلموں کے بارے میں میری معلومات بھی کافی ہیں۔ بریڈفورڈ میں میرے ایک دوست کے پاس سن 1940ء سے لے کر 1965ء کے درمیان بنی ہوئی بلیک اینڈ وہائٹ بھارتی فلموں کی لائبریری موجود ہے جس میں کم از کم تین ہزار فلمیں ہیں۔

''اگست کے ''سرگزشت'' میں وحیدہ رحمان کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔ ''یا وہیں کہ وحیدہ رحمان نے شادی کی یا نہیں؟'' تو عرض ہے کہ وحیدہ رحمان نے بھی ایک ہندو سے شادی کی ہے جو کہ ماضی کا ایک تیسرے درجے کا ہیرو تھا۔ نام ہے کمل جیت۔ اس نے جن فلموں میں کام کیا ہے ان میں ''قوالی کی رات'' ''سہرا'' ہدایت کار محبوب کی ''سن آف انڈیا'' اور ''شگون'' وغیرہ شامل ہیں۔ ''شگون'' میں کمل جیت کی ہیروئن وحیدہ رحمان تھیں۔ شادی کے بعد یہ جوڑا ایک لمبے عرصے کے لیے کینیڈا اچلا گیا تھا۔

کبھی ادا کار راج کمار کے بارے میں بھی لکھیے گا جو کہ میرا پسندیدہ ادا کار تھا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ راج کمار کی پیدائش لورالائی (بلوچستان) کی تھی۔ چونکہ میں بچپن اور لڑکپن اس شہر میں گزار چکا ہوں اور اسی اسکول میں پڑھ چکا ہوں جہاں راج کمار، رحمان اور اسکرپٹ رائٹر سورج سنیم اپنی عمر کے ابتدائی دنوں میں پڑھا کرتے تھے اس لیے قدرتی طور پر انہیں پسند کرتا ہوں۔ راج کمار اور رحمان تو اب نہیں رہے البتہ سورج سنیم سے خط و کتابت رہتی ہے۔''

وحیدہ رحمان کی ایک تیسرے درجے کے ہندو ادا کار سے شادی کی خبر واقعی ہمارے لیے ایک ''اطلاع'' ہے۔ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو اپنے زمانۂ عروج میں گورودت کو کیوں ٹھکرایا تھا جو کہ ایک ذہین، باصلاحیت اور اعلیٰ پائے کا ہدایت کار، فلم ساز اور ادا کار تھا۔ وحیدہ کی بے رخی کے باعث بالآخر اس نے خودکشی کرلی (بیشتر لوگوں کا یہی خیال ہے)۔

وحیدہ رحمان نے جب دلیپ کمار کے ساتھ فلموں میں کام کیا تو ان سے بھی رومان چل پڑا۔ دلیپ کمار اس بارے میں قطعی سنجیدہ نہ تھے۔ بہرحال یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی لیکن وحیدہ رحمان کو اور بھی کئی ممتاز لوگوں نے پسند کیا مگر ان کی کمند کہاں آ کر ٹوٹی؟ ایسی بلندی۔ ایسی پستی؟

جہاں تک راج کمار، رحمان اور سورج سنیم کا تعلق ہے تو ان میں سے کسی سے ہماری ملاقات نہ ہوسکی۔ رحمان بہت اچھے انسان اور اداکار تھے۔ پاکستان میں کیمرا مین مسعود الرحمٰن نے فوٹو گرافی میں بڑا نام پیدا کیا۔ وہ رحمان کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ خاندانی اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اداکار فیصل رحمان مسعود الرحمٰن ہی کے صاحب زادے ہیں۔ مسعود الرحمٰن اور فیصل کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

سورج سنیم کے نام اور کام سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ اول تو بھارتی فلمیں کم دیکھتے ہیں پھر نسب کن غور سے نہیں دیکھتے مگر ان کی شہرت ہے۔

اداکار راج کمار کے بارے میں اگر سلطان مسعود صاحب برا نہ مانیں تو عرض کریں کہ راج کمار کی ہم نے بہت کم فلمیں دیکھی ہیں۔ ان کی اداکاری نے ہمیں کبھی متاثر نہیں کیا بلکہ ہر فلم دیکھنے کے بعد ان کے بارے میں ہماری رائے مزید خراب ہی ہوئی۔ نہ صورت نہ شکل، نہ ڈیل ڈول اور بولنے کا انداز۔ چال ڈھال کا ڈھنگ بھی بے ڈھنگا۔ مگر پتا نہیں وہ اداکار تھے اور سنا ہے کہ بہت نخرے والے تھے۔ خدا کو بیشک دلیپ کمار کا ہم پلہ سمجھتے رہے۔ ان کے بارے میں ہمیں زیادہ کیا کم معلومات بھی نہیں ہیں۔ نہ ہی ان سے متاثر ہیں بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس نخ بیانی کے لیے معافی کے خواستگار ہیں۔

ایک بار محمد علی صاحب اور زیبا بیگم بمبئی گئے تو وہاں سے راج کمار کے گن گاتے ہوئے آئے۔ ''آفاقی۔ کیا غضب کا اداکار ہے۔ مکالموں کی ادائیگی تو اس پر ختم ہے۔ ان کے کہنے پر ان ہی دنوں راج کمار کی ایک فلم دیکھی تو محمد علی کی رائے اور پسند پر حیران ہوئے۔ پھر ایک دن ان سے بحث بھی ہوئی۔ خیر۔ یہ تو اپنی اپنی رائے اور پسند کی بات ہے لیکن عجیب بات ہے کہ بھارت کے نقادوں اور فلم بینوں نے بھی راج کمار کو کبھی بڑے فنکار کا رتبہ نہیں دیا۔ ہاں وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے رہے۔ ان کا تاثرات سے عاری سپاٹ چہرہ اور مکالموں کی اداکاری کا کھڑا، بے لوچ انداز ہمیں کبھی پسند نہ آیا۔ مگر یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔

فلم نگری کی یہ الف لیلہ ابھی جاری ہے اس داستان ہزار رنگ کے مزید واقعات کے لئے آیندہ ماہ کا شمارہ دیکھنا نہ بھولیں۔

دیوارِ چین

تحریر: خرّم جعفری

انسانی عزم و ہمت کے مظاہر دنیا میں جا بہ جا بکھرے نظر آتے ہیں اور یہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ایک بین ثبوت بھی ہے اور دنیا کے حسن میں اضافہ کا ایک سبب بھی۔ ایسے محیر العقول کارناموں میں مشہورِ عالم دیوارِ چین کی تعمیر اور اس کا وجود اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کی تعمیر میں نہ صرف انسان کے مصمم ارادوں بلکہ خوبصورت خیالات اور تحفظ کا احساس بھی شامل ہے۔

بعض اوقات وقت کی ضرورت بھی تاریخ کا حیرت انگیز حصہ بن جاتی ہے

دیوارِ چین قدیم دنیا کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہے۔ اس کو دنیا کا سب سے بڑا تعمیراتی منصوبہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں اس کی تعمیر میں 35 لاکھ افراد نے حصہ لیا جو اس وقت چین کی آبادی کا 70 فیصد تھے، جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس دیوار کی تعمیر میں جتنا میٹریل استعمال ہوا ہے وہ خطِ استوا (EQUATOR) کے گرد آٹھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی دیوار کی تعمیر کے لیے کافی تھا۔

زمانۂ قدیم میں چین کا طرزِ حکومت شہنشاہیت تھا۔ مختلف ادوار میں یہاں مختلف خاندان حکومت کرتے رہے۔ یہ شہنشاہ اندرونِ چین امن و امان کے قیام کے لیے کوشاں رہے اور مختلف قبائل میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں تو کامیاب رہے مگر شمال میں بسنے والے خانہ بدوش قبائل ہر زمانے میں ان حکمرانوں کے لیے مشکلات کھڑی کرتے رہے۔ یہ قبائل خنجر علاقوں کے باسی تھے جہاں بارش کی کمی کی وجہ سے فصلیں اُگانا مشکل تھا۔ اپنا اور اپنے مویشیوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ان قبائل کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ قبائل صنعت و حرفت کے فن سے نا آشنا تھے۔ جبکہ چین کے لوگ لوہا سازی، ریشم سازی اور دیگر صنعتوں میں یکتائے روزگار تھے۔ شمالی قبائل لڑائی اور شکار میں

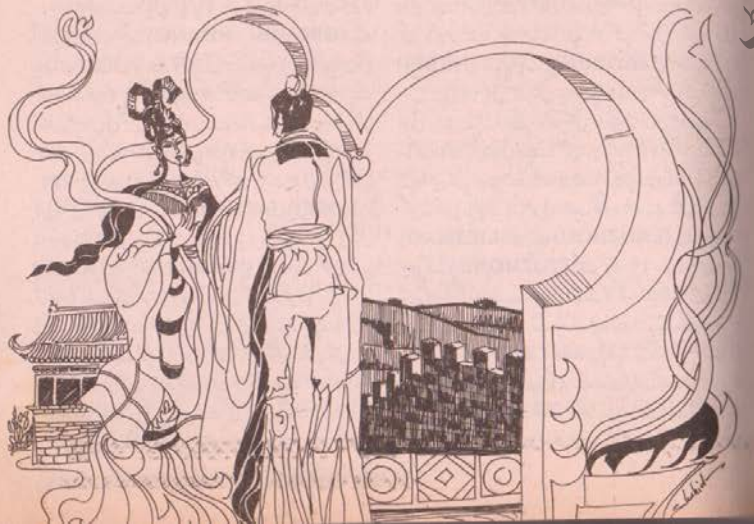

مہارت رکھتے تھے۔

تجارت کے لیے مال کے بدلے مال کا اصول ویسے تو سب کے عظیم تر مفاد میں تھا مگر بعض اوقات ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی کہ یہ خانہ بدوش اپنی من پسند اجناس کے حصول میں ناکام رہتے تو چوری چکاری اور لوٹ مار کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان جنگجوؤں سے نمٹنا ہر دور میں حکمرانوں کے لیے ایک کٹھن مرحلہ رہا۔ ان قبائل سے نمٹنے کے لیے ہر حکمران کے سامنے چار راستے ہوتے تھے۔ اول یہ کہ ان قبائل کو اپنے پڑوس سے دور دھکیلنے کے لیے ان کے خلاف طاقت کا استعمال کیا جائے۔ دوئم دفاعی حصار قائم کیے جائیں۔ سوئم، ان قبائل کے ساتھ معاشی اور سفارتی تعلقات استوار کیے جائیں یا چہارم یہ کہ ان کو دور رکھنے کے لیے دیواریں تعمیر کی جائیں۔ خرابی کی اصل جڑ یہ تھی کہ چینی ان خانہ بدوشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو درندہ صفت اور تہذیب سے عاری انسان تصور کرتے تھے۔ اسی لیے کسی بھی حکمران نے ان سے برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار نہیں کیے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برتری کے احساس کے ساتھ کیے گئے معاہدے کبھی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ شہروں کی حفاظت کے لیے دیواروں اور قلعوں کی تعمیر کا تصور عبرانی اور یونانی اقوام میں موجود تھا مگر چینیوں نے اس تصور کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پوری سلطنت کی حفاظت کے لیے اونچی اونچی دیواریں تعمیر کیں۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ دیوارِ چین کی تعمیر کا آغاز چن شی ہوانگ (QIN SHI HUANG) کے دور میں 221 ق م سے 207 ق م کے درمیان ہوا۔ چن شی چن خاندان کا پہلا شہنشاہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ دیوار کے مختلف حصوں کی تعمیر کا آغاز اس سے ساڑھے پانچ سو سال قبل 770 ق م کے موسم بہار میں ہو چکا تھا۔ یہ 475 ق م سے 221 ق م کا دور ہے جب موجودہ چین سات بڑی ریاستوں چن، چنگ، چو، ہان، زہو (ZHOA)، وی (WEI)، اور یان (YAN) پر مشتمل تھا اور یہ ریاستیں جنگجو ریاستیں (WARRING STATES) جانی جاتی تھیں۔ یہ تمام ریاستیں ایک کمزور مرکز کے تابع تھیں۔ یہ ریاستیں زیادہ تر ایک دوسرے سے ہی نبرد آزما رہتیں اور اپنے اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے دیواریں تعمیر کرتی رہتیں۔ ان میں سے تین ریاستوں چن، زہو اور یان کو شمال سے حملہ آور ہنز (HUNS) قبائل کی طرف سے بھی حملوں کے خطرات لاحق رہتے۔ اس ممکنہ خطرے سے نبرد آزما ہونے کے بعد اور اپنی شمالی سرحدوں کو محفوظ رکھنے کے بعد ان تینوں ریاستوں نے انفرادی طور پر بڑی بڑی دیواروں کی تعمیر شروع کر دی اور وہاں اپنی فوجیں تعینات کر دیں۔ یہ گویا دیوارِ چین کی تعمیر کی ابتدا تھی۔

مغربی چن کے حکمران چن شی ہوانگ نے 221 ق م میں ساتوں ریاستوں کو فتح کر کے ایک متحدہ چین کی بنیاد ڈالی اور یوں وہ چین کا پہلا شہنشاہ قرار پایا۔ ایک مضبوط مرکز کا قیام اس کی بنیادی ترجیح تھی مگر اس کی عوام دشمن پالیسیوں نے عوام میں اضطراب و تشویش کی لہر دوڑا دی۔ عوام سے مالیات حد تک ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ ٹیکس کی شرح اس قدر بلند تھی کہ عوام بہ مشکل ہی جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف شمال میں موجود ہنز قبائل متحدہ چین کی سلامتی کے لیے بدستور خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ان کی طرف سے مستقل دراندازی نے شہنشاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ 'دیوار برائے دفاع' کی روایتی پالیسی پر عمل کرے چنانچہ بادشاہ نے ایک عظیم الشان تعمیراتی منصوبے کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے حکم دیا کہ چن، زہو اور یان کی ریاستوں میں موجود دیواروں کو نہ صرف ایک دوسرے سے مربوط کر دیا جائے بلکہ ان کی طوالت پانچ ہزار کلومیٹر تک بڑھا دی جائے۔ یوں اس عظیم دیوار کی تعمیر کا آغاز ہوا جو شمال میں شانی تونگ سے کر چین کے مغربی حصے تک پھیلی ہوئی ہے۔ چن کی تعمیر کردہ ہوئی دیوار مشرق سے مغرب تک تین بنیادی حصوں میں تقسیم ہوئی ہے۔ مشرقی حصے کا آغاز اندرون منگولیا سے ہوتا ہوا یان کی دیوار تک چلا جاتا ہے جو کہ مشرق میں ہیبی (HEBEI) اور لیاؤننگ (LIAONING) صوبے میں واقع ہے۔ درمیانی حصے میں یہ دیوار اندرون منگولیا سے ہوتی ہوئی دریائے زرد کے ساتھ چلتی ہوئی شانزی صوبے کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔ اصل دیوار کو مضبوط کرنے کے لیے اس میں بہت سے قلعے اور ٹاورز (میناروں) کا اضافہ کیا گیا۔ اس دیوار کا مغربی حصہ گانسو صوبے میں لی ہا (LIEZHAO) اور لانہو (LANZHOU) سے ہوتا ہوا یوہونگ (YUZHONG) تک چلا جاتا ہے۔ چن دور میں تعمیر کی گئی دیوار کے کل اخراجات کا تخمینہ 260 بلین ڈالر کے لگ بھگ لگایا گیا ہے جو کہ پورے امریکا کے موجودہ سالانہ تعمیراتی اخراجات کا نصف ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تعمیر میں بڑے اہرام مصر کی تعمیر کے برابر محنت تھی۔ دیوار کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مزدوروں کو متعلقہ ہولناکیوں کی فراہمی ایک حل طلب مسئلہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سڑک کی تعمیر کا بھی ایک مکمل

ماہ منخسیب

ماہ چاند کو کہتے ہیں اور منخسیب ترکستان کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ وہاں حکم بن ہاشم نامی ایک سائنس دان تھا۔ اس نے یہ چاند بنایا۔ جب سورج کا آخری کنارہ غروب ہوتا تو اس چاند کا پہلا کنارہ اس کنوئیں سے باہر نکلتا۔ جب وہ آہستہ آہستہ اپنی بلندی پر پہنچتا جاتا تو اس کی روشنی سے دس بیس نہیں بلکہ پورا ایک سو میرابع میل کا علاقہ روشن ہو جاتا اور ساری رات چمکتا رہتا۔ ادھر سورج طلوع ہوتا ادھر یہ چاند کنوئیں میں غروب ہو جاتا۔ کوئی چابی دینے یا آگے پیچھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج اتنی ترقی کے باوجود کوئی ایسا اسلامی یا مغرب ایجاد نہیں ہوئی جو سو مربع میل کے علاقے کو روشن کر سکے۔

(یہ اقتباسات ضیاالامت "حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمتہ اللہ علیہ" کی ایک تقریر سے اخذ کیے گئے ہیں)

مرسلہ: ایس اختر ساگر، منڈی بہاؤالدین

جہاں اس دیوار کی تعمیر سے چینی حکومت اور چینی عوام دونوں کو بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے، مثلاً لوگوں کے جان و مال کا تحفظ یقینی ہوا اور چین کی شمالی سرحدوں پر حملہ آوروں کی یلغار میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی، وہاں اس کے ساتھ ساتھ دیوار کی تعمیر نے عوام کے مصائب میں اضافہ بھی کیا۔ اس عظیم تعمیراتی منصوبے میں آبادی کے ستر فیصد افراد یعنی تیس لاکھ لوگوں نے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، کمر توڑ اور سخت محنت طلب کام کیا۔ ہزاروں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں جنگی قیدی، غلام، مجرم اور عوام بھی شامل تھے۔ اس دیوار کی تعمیر کے پیچھے چن کی ایک یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ دیوار کا استحکام، چین کا استحکام ہے۔ اگر اعمال کی بنیاد نیک نیتی پر مبنی ہو تو ان اعمال کا پھل نسلیں کھاتی ہیں مگر جب اعمال کی روح میں بدنیتی کا عنصر شامل ہو تو اس کے ثمرات دیرپا نہیں ہوتے۔ چن کے ظالمانہ طرزِ حکومت اور معاشی بدحالی نے بغاوت کی آگ کو ہوا دی اور چن شی ہوانگ کی وفات کے ساتھ ہی چن خاندان کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔

دیوارِ چین کی تعمیر نے بہت سے قصے کہانیوں کو بھی جنم دیا جو آج چینی ادب، لوک داستانوں اور ڈراموں کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان میں سے ایک قصہ مینگ جیا گنو (MENG JIANGNU) سے وابستہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چن کے دور حکومت میں فان زیلیانگ (FAN XILIANG) نامی نوجوان کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی شادی کے دن بھی دیوار کی تعمیر کے لیے جائے۔ کام پر جانے سے پہلے اس لڑکے کی بیوی نے جس کا نام مینگ جیا گنو تھا اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اپنے شوہر کو اپنی سفید ہیر پن کا ایک ٹکڑا دیا جس میں نیلم جڑے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مینگ پانچ سال تک گھر بیٹھے اپنے محبوب شوہر کی راہ دیکھتی رہی

مگر وہ نہیں آیا۔ ایک رات ینگ نے ایک برا خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر مستقل ''سرد سردی'' چلا رہا ہے۔ ینگ کو یاد آیا کہ جاتے وقت اس کے شوہر نے بہت باریک کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے فوراً ہی گرم کپڑے تیار کیے اور اپنے شوہر کی تلاش میں اکیلی ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ پہاڑوں اور دریاؤں کو پیدل عبور کرتی آخر کار اس مقام پر پہنچ گئی جہاں دیوار کی تعمیر جاری تھی۔ یہاں اس کو مزدوروں نے بتایا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے اور اس کو دیوار میں ہی دفنا دیا گیا ہے۔ اپنے محبوب شوہر کی موت کی خبر سنتے ہی وہ صدمے سے نڈھال ہو گئی اور اس نے اسی مقام پر رونا شروع کر دیا۔ وہ دن رات روتی رہی یہاں تک کہ اس کی گریہ وزاری سے تقریباً دس کلومیٹر لمبی دیوار گر گئی اور آخر کار اس کو ملبے میں سے اپنے شوہر کی گلی ہوئی ہڈیاں نظر آ گئیں۔ جب بادشاہ کو اس واقعے کی خبر ملی تو اس کو بہت غصہ آیا۔ اس نے ینگ کو سزا دینے کا حکم صادر کیا مگر جب اس نے ینگ کا حسن دیکھا تو وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا اور اس سے شادی کی درخواست کر دی۔ ینگ کو بادل نخواستہ اس شادی پر آمادہ ہونا پڑا مگر اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے محبوب شوہر کی آخری رسومات بڑی دھوم دھام سے ادا کی جائیں۔ بادشاہ نے ینگ کی یہ درخواست قبول کر لی۔ آخری رسومات کے بعد ینگ اور بادشاہ سیر و تفریح کی غرض سے بحیرۂ پوہائی پہنچے۔ ینگ اس جابر شخص سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے محافظوں سے آنکھ بچا کر سمندر میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ آج بھی بحیرہ پوہائی میں درّہ شہنائی گوان کے پیچھے دو کالی چٹانیں پانی میں سر اٹھائے کھڑی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سے گول چٹان ینگ اور چوکور چٹان اس کے شوہر فان کا مزار ہے۔ ان دونوں مزاروں کے قریب ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک گرجا گھر تعمیر کیا گیا جہاں وفا اور پاکدامنی کی اس دیوی کی یاد میں ہر سال رسوم منعقد کی جاتی ہیں۔ درّہ شہنائی گوان جانے والے سیاح ان مقابر اور گرجے کی زیارت ضرور کرتے ہیں۔

دیوار چین کے حفاظتی میناروں سے متعلق بھی ایک کہانی چینی لوک روایات کا حصہ ہے۔ ان میناروں سے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کا کام لیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے دن کو دھوئیں اور رات کو آگ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کہانی زہاؤ (ZHAO) دور حکومت کی بیوی (BAOSI) نامی ایک ملکہ سے منسوب ہے۔ بادشاہ اپنی ملکہ سے بہت محبت کرتا تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ بادشاہ نے کبھی بھی ملکہ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ ملکہ کے چہرے پر ہر وقت اداسی اور سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ بادشاہ نے ملکہ کی ہنسی کے لیے لاکھوں جتن کر ڈالے مگر وہ ہر بار ناکام رہا۔ ایک مرتبہ اس نے درباری موسیقاروں کو بلوایا اور ان سے طرح طرح کی دھنیں بجوائیں لیکن ملکہ کو ہنسی نہیں آئی۔ بادشاہ نے دربار میں موجود رقاصاؤں کو بلوایا اور انہیں ناچنے، گانے اور پینے پلانے کا حکم دیا۔ ملکہ اس پر بھی خوش نہ ہوئی۔ بادشاہ نے حیران ہو کر ملکہ سے پوچھا کہ ''تم کو موسیقی پسند نہیں۔ رقص کی بھی تم دلدادہ نہیں۔ اس روئے زمین پر ایسی کیا چیز ہے جو تمہارے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے؟''

ملکہ نے جواباً کہا ''مجھے کسی خاص چیز کا شوق نہیں۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو میں ریشم کے کپڑے کے پھٹنے کی آواز بڑے شوق سے سنتی تھی۔ وہ بہت واضح اور مترنم ہوتی تھی۔''

بادشاہ نے کہا ''یہ تو بہت آسان ہے۔ یہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' بادشاہ نے اپنے وزیر خاص کو رنگین ریشم کی تیاری کا حکم دیا۔ جب ریشم تیار ہو گیا تو حسین و جمیل کنیزوں کو ریشم کے پھاڑنے کا حکم دیا گیا مگر ملکہ پھر بھی ہنس نہ سکی۔ بادشاہ نے حیرت زدہ ہو کر ملکہ سے استفسار کیا ''تم آخر کبھی مسکرائیں؟''

ملکہ نے جواباً کہا ''مجھے ہنسی نہیں آئی تو کیا کروں۔''

بادشاہ مستقل ملکہ کو ہنسانے کی کوشش میں لگا رہا۔ آخر اس نے ینگ آ کر اعلان کرایا کہ دربار کے اندر یا دربار سے باہر جو کوئی بھی ملکہ کو خوش کر دے اس کو ایک ہزار اشرفیوں کا انعام دیا جائے گا۔ بادشاہ کے ایک دغاباز درباری نے مشورہ دیا کہ ''دیوار کی حفاظتی میناروں میں رات کو مشعلیں روشن کی جائیں اور اس طرح ریاست کے حاکموں کو بے وقوف بنایا جائے۔'' بادشاہ اور اس کی ملکہ اسی رات لیشان پہاڑ (LISHAN MOUNTAIN) پر پہنچے۔ یہاں پہنچتے ہی بادشاہ نے حکم دیا کہ حفاظتی میناروں میں مشعلیں روشن کی جائیں۔ یہ کہا گیا اس بات کا اعلان تھا کہ لیشان پہاڑ کی جانب سے دشمن کی فوجیں حملہ آور ہونے جا رہی ہیں۔ روشن مشعلیں دیکھتے ہی قرب و جوار کے علاقے کے فوجی جوان بھاگے بھاگے چلے آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے بہت متوقع طور پر دیکھا کہ بادشاہ اور اس کی ملکہ اطمینان سے بیٹھے شراب نوشی کر رہے ہیں۔ بادشاہ نے اپنے محافظوں کی جھرمٹ اور پریشانی دور کرنے کے لیے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم صرف مذاق کر رہے تھے۔ بادشاہ کی یہ بات سن

کر ان کے چہروں پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ دیکھ کر کہ کس طرح ساری فوج ایک اشارے پر بھاگی بھاگی چلی آئی اور واپسی کے عالم میں واپس جا رہی ہے، ملکہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ملکہ کو ہنستا دیکھ کر بادشاہ نے بھی سکون کا سانس لیا اور وعدہ اپنے اس درباری کو ایک ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔ بادشاہ کے ہاتھ اب ایک نیا کھیل لگ گیا۔ وہ اپنی ملکہ کو خوش کرنے کے لیے جگہیں بدل بدل کر اپنے اس مذاق کو دہراتا رہا۔ 771 ق م میں ایک قبیلے نے زہاؤ کے خلاف بغاوت کر دی۔ بادشاہ نے فوج کو طلب کرنے کی غرض سے حکم دیا کہ ''تمام میناروں میں مشعلیں روشن کی جائیں۔'' جس بار بھی کسی حاکم نے اپنی فوجیں بادشاہ کی مدد کے لیے بھیجیں۔ نتیجتاً بادشاہ کو قتل کر دیا گیا اور ملکہ کو قید کر دیا گیا۔ یوں زہاؤ خاندان سے تخت و تاج چھن گیا۔ اس واقعے کے مشہور چینی محاوروں کو جنم دیا کہ ''ایک مسکراہٹ کی قیمت [illegible] ہو سکتی ہے۔'' اور ''خود مختار حکمرانوں کو [illegible] سے بھی باز آ جانا چاہیے۔''

ہان کی وفات کے ایک قلیل عرصہ بعد 209 ق م میں لاکھوں کسانوں نے چھوٹے کاشت کار حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف چن خاندان کی حکومت کا تختہ الٹا بلکہ کو بھی نقصان پہنچایا۔ جو ان کے نزدیک جبر کی علامت تھی۔ اس سال کے عرصے میں دیوار ایک کھنڈر کی شکل اختیار کر گئی۔ ہان میں ایک مرتبہ پھر شمالی حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دینے لگیں۔ تین سال کی خانہ جنگی کے بعد ہان خاندان کے بانی لیو بینگ (LIU BANG) نے ہان (HAN) خاندان کے سلسلۂ حکومت کی بنیاد ڈالی اور وہ اس سلسلے کا پہلا شہنشاہ کہلایا۔ ہان خاندان حکومت نے کئی برسوں تک معیشت کے لیے لگاتار کوششیں جاری رکھیں۔ ہونے (WU) (140 ق م۔ 87 ق م) یا لنگو (XIONGHU) قبائل کو شمال میں صحرائے گوبی تک دھکیل دیا۔ تجارت کے سلسلے کو دوام بخشنے کی خاطر یونے دوبارہ دیوار کی تعمیر شروع کرا دی۔ کیونکہ ہنز کی طرف سے حملے کا خطرہ موجود تھا۔ ایک مرتبہ پھر چینی معیشت کی کمر دیوار کے نیچے دبنے کو تیار تھی۔ اس بار دیوار کے متاثرہ حصوں کی مرمت کی گئی اور چونکہ اب چینی سلطنت کی حدود مغرب کی طرف صحرائے گوبی کو چھو رہی تھیں اس لیے دیوار کی توسیع کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس مرتبہ دیوار کی تعمیر کا ایک بنیادی مقصد قدیم شاہراہ ریشم کی حفاظت بھی تھا، کیونکہ پورا وسطی ایشیا اب ہان سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔

اس مرتبہ دیوار کی تعمیر پتھر ملے علاقے میں ہو رہی تھی چنانچہ دیوار کی تیاری میں بجری، بید کی لکڑی اور مٹی کی تہوں کا استعمال کیا گیا۔ ان سب کے اشتراک سے ایک ایسی دیوار تعمیر ہوئی جو آج دو ہزار سال گزرنے کے باوجود بھی محفوظ ہے۔ نیم دروازہ (JADE GATE) جس کو انتہائی خوب صورتی سے محفوظ کیا گیا ہے اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ 101 ق م میں تعمیر کیا جانے والا یہ دروازہ 28 فٹ اونچا اور 66 فٹ چوڑا ہے۔ قریب ہی دیوار کی حفاظت پر معمور سپاہیوں کے لیے ایک قلعہ ہے۔ دیوار کا یہ حصہ 453 فٹ لمبا، 115 فٹ چوڑا اور 23 فٹ اونچا ہے۔ اب یہ دیوار دشمن کو دور رکھنے کے لیے پیغام رسانی کا ذریعہ ثابت ہو رہی تھی۔ دیوار کی فصیلوں کے ذریعے پیغام انتہائی برق رفتاری کے ساتھ سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ شمالی سرحدوں کے ساتھ پندرہ سے تیس میل پر روشنی کے مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ پیغام رسانی کے لیے یہ مینار دن کے وقت دھوئیں کے بادل اور رات کو مشعلیں استعمال کرتے۔ بھیڑیے کے گوبر اور گھاس پھونس کو ملا جلا کر ایندھن تیار کیا جاتا جس کو جلانے پر گہرا سیاہی مائل دھواں اٹھتا۔ دھوئیں کا ایک مخروطہ اس بات کی علامت ہوتا کہ 500 سے کم حملہ آوروں پر مشتمل دستہ آگے بڑھ رہا ہے۔

دھوئیں کے دو مخروطے تین ہزار سے کم اور چار مخروطے دس ہزار تک کی فوج کے حملے کی نشاندہی کرتے تھے۔ دیوار کی تعمیر نے نہ صرف اس راستے پر صدیوں سے موجود تجارتی مراکز کو پنپنے کا موقع فراہم کیا اور محفوظ راہداری کے قیام نے مغرب اور چین کے درمیان نہ صرف فاصلوں کو کم کیا بلکہ یہ دونوں ثقافتی اور معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آنا شروع ہو گئے۔ روم، انطاکیہ، بغداد اور اسکندریہ سے آنے والے تجارتی قافلے زیادہ تر ریشم، مسالہ جات، قیمتی پتھروں، سونے اور گھوڑوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جلد ہی اس محفوظ راستے کے ساتھ نئی بستیاں اور تجارتی مراکز قائم ہوتے چلے گئے۔ دور دراز سے آنے والے قافلے یہاں کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں نہ صرف اشیائے صرف کا تبادلہ کرتے بلکہ ایک دوسرے کی معلومات اور تجربے سے بھی مستفید ہوتے۔ دنیا سمٹتی جا رہی تھی اور دیوارِ چین اس سلسلے میں ایک مؤثر کردار ادا کر رہی تھی۔

ہان کے شاہی خاندان نے 202 ق م سے 220ء تک چار سو بائیس سال تک حکومت کی۔ 220 میں ہان خاندان کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد چین طوائف الملوکی کی لپیٹ میں

آ گیا اور ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ 581ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران میں ہر ریاست میں دیوار میں ترمیم اور مرمت کا سلسلہ جاری رہا۔ سُوئے کے شاہی خاندان نے 589ء میں چین کو دوبارہ متحد کیا اور اس زمانے میں دیوار کے مختلف نئے حصے بھی تعمیر کیے گئے اور پرانے حصوں کی مرمت کی گئی۔ 617ء تک اقتدار اسی خاندان کے پاس رہا۔ 618ء سے لے کر 907ء تک چین پر تنگ (TANG) خاندان نے حکومت کی۔ اس دور میں چین معاشی خوش حالی کی راہ پر گامزن ہوا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف صحت مند منصوبے شروع کیے گئے۔ تنگ خاندان نے شمال مغربی علاقوں میں کچھ قلعے بنائے۔ اس کے علاوہ دیوار میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ ان کی توجہ کا مرکز عوام تھے جو ہر دور میں دیوار کی تعمیر کی وجہ سے مصائب میں گھرتے چلے گئے تھے مگر ایک بار پھر بغاوتوں کے سلسلے نے تنگ خاندان کو تختِ شاہی سے اترنے پر مجبور کر دیا اور پھر 53 سال تک چین انارکی کا شکار رہا۔ سونگ خاندان نے 960ء میں اقتدار میں آ کر حالات کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے معاملہ فہمی کے ساتھ چین میں امن قائم کرنے کی کوشش کی اور وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ اسی دوران دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹتی جا رہی تھی مگر سونگ خاندان نے اس جانب توجہ نہیں دی، جس کے نتیجے میں بیرونی حملہ آور ایک بار پھر چینی خزانوں پر ہاتھ صاف کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

ادھر خانہ بدوش قبائل انتشار کا شکار تھے اس لیے اپنی بھرپور بربریت اور غضب ناکی کے باوجود بھی متحد نہ ہونے کے سبب ان کی اجتماعی کوئی طاقت نہیں تھی۔ یہ بہادر اور باہمت جنگجو چنگیز خان تھا جس نے چینی خزانوں کو لوٹنے کے لیے تمام قبائل کو متحد کیا۔ چین پر مکمل قبضے کے لیے یہ خوف ناک لڑائی برسوں جاری رہی۔ تاریخ کی اس بدترین لڑائی میں بے شمار شہر اجڑے اور لاکھوں لوگ مارے گئے۔ 1279ء میں چنگیز خان کے پوتے قبلائی خان نے سونگ خاندان کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اپنی سلطنت کو یان (YUAN) کے نام سے موسوم کر دیا۔ قبلائی خان کا دارالحکومت آج کا بیجنگ شہر تھا۔ یہ قبلائی خان ہی کا دورِ حکومت تھا جب عظیم اطالوی سیاح مارکو پولو نے چین کا دورہ کیا۔ مارکو پولو 17 برس تک چین میں سکونت پذیر رہا۔ مارکو پولو جب اپنے وطن واپس لوٹا تو اس نے وہاں پہنچ کر اپنے دورۂ چین کے بارے میں ایک سفرنامہ تحریر کیا۔ یہ اس کا سفرنامہ ہی تھا جس نے مغربی ممالک کو چین میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔

دوسری طرف قبلائی خان اپنے مخصوص انداز میں حکومت کرتا رہا۔ اس نے عوام پر بے تحاشا ٹیکسوں کا بوجھ ڈال دیا، ان کی قوت خرید بری طرح متاثر ہوئی۔ قبلائی کے ان اقدامات نے عوام کو بے چین کر دیا۔ عوام کو اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ منگولوں نے ملک کی سرحدوں کو جاپان تک وسعت دے دی ہے۔ ان کو تو دلچسپی ملک کی معیشت سے تھی جو روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔

منگولوں کے جنگی جنون نے سوائے غربت کے چین کو کچھ نہیں دیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو قدرت ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کر دیتی ہے۔ سو تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا۔ ایک دیہاتی کسان ژو یان جونگ جو منگولوں کے عتاب کا شکار تھا، اس نے عہد کیا کہ اس کی زندگی کا واحد مقصد منگولوں کو تختۂ اقتدار سے تختۂ دار تک پہنچانا ہے۔ اس نے سرخ ٹوپی نامی ایک گروپ میں شمولیت اختیار کی اور رفتہ رفتہ ان کا قائد بن گیا۔ اس باغی گروپ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی گئی اور بہت جلد کارکنوں کی ایک بڑی فوج تیار ہو گئی جس نے ایک طویل معرکے کے بعد منگولوں کو واپس ان کے علاقے میں دھکیل دیا۔ ژو یان جونگ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور یوں منگ شاہی خاندان کے دورِ حکومت کا آغاز ہوا۔ ژو یان کی خواہش تھی کہ منگول دوبارہ چین پر کبھی حکومت نہ کر سکیں۔ اس لیے حکومتی سطح پر غیر ملکیوں سے روابط کے سلسلے میں کافی تحفظات پائے جاتے تھے۔ بداعتمادی کا عالم یہ تھا کہ سولھویں صدی میں کسی بھی غیر ملکی سے تجارت تو درکنار تعلق رکھنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ منگ خاندان نے 1368ء سے لے کر 1644ء تک دو سو چھتر سال حکومت کی۔

منگ خاندان نے بلاشبہ دیوار کی تعمیر مکمل سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آج ہم جو دیوارِ چین دیکھتے ہیں، وہ زیادہ تر اسی دور کی باقیات ہیں۔ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ دیوارِ چین کی تکمیل منگ دورِ حکومت میں ہوئی۔ منگ خاندان نے چن اور ہان کی بنائی ہوئی دیواروں کی نہ صرف مرمت کی بلکہ ان کی توسیع بھی کی۔ منگ کی بنائی ہوئی دیوار کوریا کی سرحدوں سے لے کر چین کے مغربی صحرا ژانگیان تک چار ہزار پانچ سو میل پر محیط تھی۔ یہ دیوار دو سو سال کے عرصے میں تعمیر ہوئی۔ منگ حکمرانوں نے دیوار کی تعمیر کی نگرانی کے لیے اپنے قابل اعتماد وزیروں کا انتخاب کیا۔ مثال کے طور پر مشہور جرنیل زو دُا (XUDA) کو درّہ یانگ اور درّہ گوبیکو کی تعمیر کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا۔ یہ علاقے دفاعی لحاظ سے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ دریائے یالو سے لے کر درہ ژیاؤ (JIAYU PASS) تک ایک ہزار کلومیٹر کا حصہ زمینی حصوں اور پتھروں سے ملا کر بنایا گیا ہے جو کہ دیوار کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں نہیں بنایا جا سکا۔ اس کی بڑی وجہ خام مال کی عدم دستیابی تھی۔ آج اس حصے کے آثار بھی ناپید ہو چکے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشرق میں یہ دیوار دردِ شہنائی پر جا کر ختم ہو گئی جو کہ درست نہیں۔ منگ کے زمانے میں دیواروں کی تعمیر میں جو اینٹیں استعمال ہوئی تھیں وہ انجینئرنگ کا شاہکار تھیں۔ یہ اینٹیں ایک ہزار پاؤنڈ بٹرفنی مربع انچ دباؤ برداشت کرنے کی قابل یقین صلاحیت رکھتی تھیں۔ اینٹوں کو باہم مربوط کرنے کے لیے جو گارا بنایا گیا تھا وہ بذاتِ خود ان اینٹوں سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ محققین نے اس فولادی قوت کا راز آخر کار پا لیا۔ ان اینٹوں اور گارے کا بنیادی جزو چاول کا آٹا تھا۔ اینٹوں کی سخت نے اور گارے کے خیالات کے استعمال سے منگ دور میں ایک عظیم اور لازوال دیوار تعمیر ہوئی جس کے بجٹ کا تخمینہ 360 بلین ڈالر لگایا گیا ہے جو کہ پورے امریکا کی سڑکوں کی ہائی ویز کے چالیس سالہ تعمیراتی بجٹ کے مساوی ہے۔

منگ دور میں بننے والی دیوار کی کل لمبائی مشرقی اور جنوب شمالی کے درمیانی فاصلے کے مساوی ہے۔ تعمیراتی نقطہ نظر سے ان دیواروں کی ایک اہم خصوصیت نکاسی آب کا انتظام تھا۔ نکاسی آب کا انتظام کچھ ایسا رکھا گیا تھا کہ دریاؤں کا سارا پانی بہہ کر چین کی طرف پہنچ جاتا تھا۔ دشمن کے علاقے میں پانی کی کمیابی کے سبب جھاڑیوں اور درختوں کی افزائش نہیں ہو پاتی تھی۔ دشمن پر حملہ کرنے میں درختوں کی بہتات ایک قدرتی کیموفلاج کا کام کرتی ہے مگر دیوارِ چین کے اس تعمیراتی پہلو کے سبب دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ شمالی سرحدوں کی حفاظت کے لیے منگ کے منصوبہ سازوں نے پوری دیوار کو نو حصوں میں بانٹ دیا اور ہر حصے کو ژن (ZHEN) کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے زیرِ انتظام کر دیا۔ بعد میں اس میں مزید دو ہیڈ کوارٹرز کا اضافہ کر دیا گیا۔ خطرے کی اطلاع دینے کے لیے دشمنوں کے علاقے کے قریب بلند و بالا مینار تعمیر کیے گئے۔ دو میناروں کا درمیانی فاصلہ دو سو گز رکھا گیا تھا۔ یہاں سے فوج کو روایتی طریقے سے احکامات دیے جاتے تھے۔ بعد ازاں توپوں کا استعمال شروع ہوا۔

بارود کی ایجاد کے بعد منگ نے سب سے پہلے انہیں دستی بموں اور بارودی سرنگوں کی تیاری میں استعمال کیا۔ یوں اسلحہ سازی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے دیوار میں خصوصی انداز کے سوراخ کیے گئے۔ جسے دہرے دفاعی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔ اولاً یہاں سے بھاری بھرکم پتھروں کو حملہ آوروں کی طرف لڑھکایا جاتا تھا۔ ثانیاً دشمنوں پر تیر اندازی کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی کیے گئے۔ سامانِ حرب کو ذخیرہ کرنے کے لیے دیوار میں پشتے بنا دیے گئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اپنے دورِ عروج میں منگ کی بنائی ہوئی اس دیوار میں ہزاروں کی تعداد میں قلعے تھے جس کی حفاظت پر دس لاکھ سے زائد کی فوج تعینات تھی۔

دیوار کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ زمین کی طبعی ساخت اس کے لیے کہیں بھی پریشانی کا باعث نہ بنے۔ پہاڑی علاقوں میں یہ اژدھے کی مانند گھومتی اور بل کھاتی دکھائی دیتی ہے، صحراؤں اور میدانی علاقوں میں یہ سیدھی چلتی چلی جاتی ہے جبکہ مشرق میں یہ دیوار سمندر میں جا کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ دیوار کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو 70 درجے کے زاویے سے پہاڑی چوٹی کو چھو رہا ہے۔ یہ جگہ سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ دیوار کی اوسط بلندی 15 سے 30 فٹ، چوڑائی 15 سے 25 فٹ جبکہ سڑک 13 فٹ تک چوڑی ہے۔

جس وقت چین میں یہ عظیم الشان تعمیرات ہو رہی تھیں چین کے باہر دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ 1644ء میں ایک خانہ بدوش قبیلے مانچوز (MANCHUS) نے جو کہ شمال میں منچوریا (MANCHURIA) کے علاقے میں رہتا تھا، نہ صرف دیوار کو سر کر لیا بلکہ دارالحکومت بیجنگ کا بھی محاصرہ کر لیا اور یوں منگ خاندان کے تین سو سالہ دورِ اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ اب چین چنگ (CHING) خاندان شاہی کے زیرِ نگیں تھا۔ اگرچہ مانچو زمانچی قبائل میں سے ایک تھا جن کی جارحیت سے بچنے کی خاطر یہ دیوار تعمیر کی گئی تھی مگر مانچوز نے چینی رسوم و رواج، تہذیب و ثقافت اور معاشرت کی قدر کی اور اس تہذیب کے بہت سے رواجوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا اور یوں حملہ آور ہونے کے باوجود بھی چینی عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ چین پر حملے کے دوران ہی چنگ نے بہت سے چینی فوجی قائدین کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سقوطِ چین کے بعد چنگ نے انہی فوجیوں کے ساتھ مل کر اپنے سب سے طاقت ور حریف منگولوں سے پنجہ آزمائی کی اور ایک خونریز معرکے کے بعد انہوں نے منگولوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ ایک

ایسا احسان تھا جس کے بوجھ تلے آ کے چینی عوام نے ان کو دل سے اپنا حکمران تسلیم کرلیا۔ یوں دیوار کے دونوں طرف چنگ کا قبضہ ہوگیا۔ چنگ 1911ء تک چین پر برسر اقتدار رہے۔

پوئی (PUYI) نامی دو سالہ بچہ چنگ خاندان کا آخری چشم و چراغ تھا جس کو چائنیز نیشنلسٹ پارٹی کے سن یات سن (SUN YAT SEN) کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ چین کو پہلی بار جمہوریہ قرار دیا گیا اور سن کو اس جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب کرلیا گیا۔ یوں چین سے بادشاہت کے طویل دور کا خاتمہ ہوگیا۔

1937ء سے 1945ء تک چین اور جاپان کی جنگ جاری رہی۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر جاپان کو آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے مگر اس کے ساتھ ہی نیشنلسٹ اور کمیونسٹ گروپوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ چینی کمیونسٹوں نے قوم پرستوں کو شکست دی اور عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا۔ ماؤزے تنگ چین کے صدر بن گئے۔ 1966ء میں ماؤ نے ثقافتی انقلاب کا نعرہ بلند کیا جس کا مقصد حکومت کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو کچلنا تھا۔ تعمیراتی منصوبوں کا آغاز کیا گیا اور پتھروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیوار کو جگہ جگہ سے منہدم کردیا گیا۔ 1976ء میں ماؤزے تنگ کا انتقال ہوگیا۔ اس دور میں دیوار چین چینی قوم کی نئی شناخت کے طور پر ابھری۔ 1979ء میں ڈینگ ژیاؤ پنگ (DENGXIAOPING) نے چین کا انتظام حکومت سنبھالا۔ اس نے چینی قوم کو یہ نعرہ دیا کہ ''آؤ اپنے وطن سے محبت کریں اور دیوار چین کی بحالی کا کام سرانجام دیں۔'' اس اپیل پر رضا کاروں کے کئی گروپوں نے لبیک کہتے ہوئے دیوار کی بحالی کا فریضہ سرانجام دیا اور چین کی صدیوں پرانی تاریخی دیوار کو مکمل تباہی سے بچالیا۔

ایک طویل عرصے تک لوگ اس مغالطے میں رہے کہ مشرق میں یہ دیوار ریبی صوبے میں واقع درۂ شہنائی پر جا کر ختم ہوجاتی ہے۔ مگر تاریخی حوالوں کی چھان بین کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے اس بات کا سراغ لگایا ہے کہ اصل میں اس دیوار کا مشرقی کونا صوبہ لیونگ (LIAONING) میں واقع ہے۔ یہیں صوبے سے نکل کر یہ دیوار آہنگلی سے دریائے یالو (YALU RIVER) کے کنارے پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے۔ اپنے سادہ طرز تعمیر کی وجہ سے یہ دیوار زیادہ عرصے تک اپنی بقا کی جنگ نہ لڑ سکی۔ اور تباہ ہوگئی۔ اسی وجہ سے دیوار کا یہ حصہ دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ لیونگ صوبے سے نکل کر اس دیوار کا سفر مغرب کی طرف جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دیہی صوبے میں داخل ہوجاتی ہے۔ دیوار کا یہ حصہ اچھی حالت میں آج بھی محفوظ ہے۔ اس حصے میں مشہور درۂ شہنائی گوان، لاؤلونگٹو (LAOLONGTOU) دیوار، جیوہان دیوار (JIAOSHAN WALL) یا نجیا کو گیٹ ..... درۂ زنگوان اور وہ لنگو دیوار موجود ہیں۔ درۂ شہنائی گوان سے چار کلومیٹر دور مشرق میں قدیم اژدر کا منہ ہے جہاں دیوار اور سمندر آپس میں ملتے ہیں۔ درۂ شہنائی سے 3 کلومیٹر شمال میں جیوہان دیوار 519 میٹر کی بلندی پر جا پہنچتی ہے۔ اس کو دیوار چین کا پہلا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ صوبہ تیانجن (TIANJAN) سے 170 کلومیٹر شمال میں ہوان یا یوان (HUANGYAGUAN) واقع ہے۔ اس صوبے کے دس مشہور تفریحی مقامات میں پہلے نمبر پر ہے۔ بیجنگ شہر میں یہ دیوار سب سے بہترین حالت میں ہے اور سیاحوں کے لیے سب سے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ یہاں دیوار کی منگ دور کی باقیات ہیں جو دیوار کی تعمیر کا ایک اہم دور تھا۔ بیجنگ کے شمالی حصے میں دیوار چھ سو کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ دیوار کے اہم حصوں میں بادلنگ، سماتائی، شان لنگ، تیانو، گبکو، ہانگ چوچنگ اور جیاگو کی دیوار شامل ہے۔ شانزی صوبے میں دو تاریخی درے نیانگزی گوان (NIANGZIGUAN PASS) اور درۂ ویز (WAZE PASS) بھی اور شانزی صوبے کا ملا دین بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ اندرون منگولیا میں دیوار کے حصے جنگبو (یا برسر پیکار) ریاستوں کے زمانے چن اور ہان کی بنائی ہوئی دیوار بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ین شان پہاڑ (YINSHAN) کی ڈھلانوں سے زہاؤ (ZHAO) دور کی تعمیر کردہ تین سو میل لمبی مسیح کی دیوار کو دیکھنا تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک یادگار منظر ہوتا ہے کیونکہ دیوار کے قدیم ترین حصوں میں سے ایک ہے۔ یہاں دیوار زمینی مٹی کو دبا کر تعمیر کی گئی ہے اور یہاں اس کی اونچائی مشکل دو میٹر ہے۔

چنگ دور حکومت میں بنائی ہوئی دو ہزار سال پرانی ایک دیوار یانگ (GUYANG) قصبے میں بہترین حالت میں محفوظ ہے۔ 90 کلومیٹر طویل اوسطاً چار سے پانچ میٹر اونچی دیوار زیادہ تر چٹانوں سے مل کر بنائی گئی ہے۔ اندرون منگولیا کے شمال مشرقی علاقے مورن داوا (MORIN DAWA) میں ارچن (JURCHEN 13 ق م 12 ق م) دور کی یادگاریں موجود ہیں۔ یہاں دیوار کی تعمیر کے منفرد طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے دیوار کی تعمیر کے

لیے پہلے خندقیں کھودی تھیں۔ یہ ایک دوہرا دفاعی نظام تھا اس میں خندقیں اور دیوار دونوں مل کر دشمن کے خلاف مزاحمت فراہم کرتیں۔ یہاں دیوار کے کئی حصے ایسے ہیں جن کو دو سال کی گردش نے کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ ہر ڈیڑھ سے دو اعشاری کلومیٹر کے فاصلے پر واقع حفاظتی مینار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ماضی میں یہاں لڑائیاں کس قدر کثرت اور کس قدر شدت سے ہوا کرتی تھیں۔ مگر ماضی سے حال کا سفر کرتے ہوئے بہت کچھ تبدیل ہوچکا ہے۔ جنگ کے بادل چھٹ چکے ہیں مگر ماضی کا یہ دفاعی حصار آج بھی ہرے بھرے کھلیانوں، ریت اڑاتے صحراؤں اور بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان خاموشی سے ایک ایسے عہد میں زندہ ہے جہاں مختلف قبائل لسانی فرقے آپس میں امن، محبت اور بھائی چارے کی فضا میں مل کر بہتر زندگی کے حصول کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور عہد رفتہ کی یہ یادگاریں چین کے قدرتی مناظر میں ایک خوشنما رنگ بھر رہی ہے۔

☆☆☆

نگ زیا (NINGXIA) چین کا شمال مغربی حصہ ہے جس کو ''دیوار کا عجائب گھر'' بھی کہا جاتا ہے۔ نگ زیا کی سرحدیں منگولوں کے اندرونی علاقے اندرون منگولیا سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تعمیرات 700 ق م کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دفاعی نقطۂ نگاہ سے اہم ہونے کے سبب چنگ، ہان، تانگ، منگ اور دیگر بادشاہ وقت اس کی تعمیر و توسیع کرتے رہے۔ اس حصے میں دیوار بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک منگ دیوار دوسری چنگ دیوار۔ منگ دیوار شمالی سرحدوں کے ساتھ مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتی ہے۔ نگ زیا صوبے کا شمالی علاقہ پہاڑی ہے۔ چنگ دیوار جنوبی چین میں شرقاً غرباً تعمیر کی گئی ہے۔ دیوار کو عمودی پہاڑوں اور دریائی علاقوں سے گزار کر ان قدرتی رکاوٹوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیوار کی بنیادیں رکھنے سے پہلے زمین کو اس قدر قوت کے ساتھ دبایا گیا ہے کہ وہاں سے آج تک کوئی پودا اگ کر زمین کی سطح سے اوپر نہیں آیا۔ چنگ دور کی دیوار کی باقیات آج بھی زی (Xiii) اور یوان (GUYUAN) نامی قصبوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

دیوار چین کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا وہ واحد شاہکار ہے جو بغیر کسی دوربین کی مدد سے چاند اور خلا سے نظر آتا ہے۔ مگر خلا نوردوں کے بیانات اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خلا کے نچلے مدار میں رہتے ہوئے زمین کی بہت سی مصنوعی چیزیں نظر آتی ہیں جیسے سڑکیں، سمندری جہاز، شہر، کھیت اور یہاں تک کہ کچھ عمارتیں بھی۔ اتنی ہی بلندی پر رہتے ہوئے دیوار چین کا نظر آنا کوئی منفرد نظارہ نہیں۔ ناسا (NASA) کا کہنا ہے کہ ''دیوار چین بہ مشکل ہی شمل سے نظر آتی ہے۔'' چاند سے اس کا بغیر کسی دوربین کی مدد کے ..... نظر آنا بعید از قیاس ہے۔ خلا نورد مائیکل کولن، نیل آرام اسٹرانگ، جنہوں نے 1969ء میں پہلی بار چاند پر قدم رکھا، ان کا کہنا ہے کہ ''چاند سے دیوار کے نظر آنے کے بارے میں لوگوں کے تمام خیالات صرف من گھڑت ہیں۔'' خلائی شٹل کی ایک اور خلا نورد جے ایبٹ اس سلسلے میں اپنے تجربات کا احاطہ ان الفاظ میں کرتا ہے ''ہم نے خلا سے دیوار چین تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ہم وہاں سے ائرپورٹ کے رن وے جیسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی دیکھ پائے تھے مگر دیوار چین ہمیں اردگرد کی مٹی کے رنگوں میں ہم آہنگ ہوتی دکھائی دی۔'' چاند سے دیوار چین کے نظر آنے کی خبریں تواتر سے ملتی رہتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ خلا میں 180 میل سے اوپر جا کر یہ دیوار اپنا نظارہ کھو دیتی ہے۔ نیل آرم اسٹرانگ اور مائیکل کولن کے مذکورہ بالا بیان کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ایک اور امریکی خلا نورد ولیم پو (WILLIAM POGUE) جو 1973ء سے 1974ء تک خلا میں موجود اسکائی لیب کی نیم کا حصہ تھا، کہتا ہے ''300 میل کی دوری پہ دوربین کی مدد سے میں دیوار چین کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ ننگی آنکھ سے نظر نہیں آرہی تھی۔'' ٹام برنام نے اپنی کتاب ''مس انفارمیشن'' میں ناسا کے ایک خلا نورد ایلن بین کے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''چاند سے جو آپ واحد چیز دیکھ سکتے ہیں، وہ ایک خوب صورت دائرہ ہے جو زیادہ تر سفید (بادل) کچھ نیلا (سمندر)، زرد مائل ٹکڑے (صحرا) اور کہیں کہیں سے سبز (ہریالی) ہے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی کوئی بھی شے وہاں سے نظر نہیں آتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زمین کے مدار کو چھوڑتے ہی چند ہزار میل کے فاصلے سے ہی دنیا کی ہر

چھلاوا
تیسری صدی کی ایک نہایت پُراسرار خاتون
سیمیہ بانو کی آپ بیتی
صفحات 1120 قیمت 400 روپے ڈاک خرچ 30 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 ریلوے روڈ لاہور
ٹیلی فون 5802551 5802552-5895313
E-mail: kitabiyat@yahoo.com
74200

چیز آپ کی بصارت سے اوجھل ہو جاتی ہے۔'' خلا نوردوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض اوقات آپ کرۂ ارض پر موجود براعظموں کو بھی شناخت نہیں کر پاتے ہیں اس لیے دیوارِ چین کا چاند سے طرآنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

ڈھائی ہزار سال قدیم اس دیوار کو 1987ء میں یونیسکو کی عالمی تہذیبی ورثے کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ چین کی مختلف حکومتیں اس دیوار کے تحفظ کے لیے مختلف منصوبوں پر کام کرتی رہی ہیں۔ ڈنگ زاؤپنگ DANG XIAOPING نے 1984ء میں چین کی صدارت سنبھالنے کے بعد اپنی قوم کو دیوار کی بحالی کے کام میں لگایا۔ تین سال قبل دیوار کے قدیم ترین حصوں کی مرمت کے کام کا اعلان کیا گیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کی مدت کا اندازہ پانچ سال لگایا گیا ہے۔ صدیوں سے بارش، ہواؤں اور ریت کے طوفان اس دیوار کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں اور دیوار کے بہت سے حصوں کو فوری مرمت کی ضرورت ہے۔ اس منصوبے کے تحت اندرون منگولیا کے علاقے میں دیوار کے پانچ کلومیٹر طویل حصے کی بحالی کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس منصوبے کے کل اخراجات کا تخمینہ چھ لاکھ بیس 72,290 امریکی ڈالر) لگایا گیا ہے۔ دیوار کو ایک کلومیٹر سالانہ کی رفتار سے بحال کیا جائے گا۔ بحالی کے اس کام میں اس بات کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے کہ دیوار کے اصل طرز تعمیر کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پہاڑوں سے چٹانیں کاٹ کر استعمال کی جا رہی ہیں مگر خدشہ ہے کہ محدود وسائل اور فنڈز کی کمی اس منصوبے کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں۔

دیوار کی بحالی کے لیے قائم کردہ ایک اور اکیڈمی نے 45 دن کے طویل سروے میں دیوار کے 101 حصوں کا جائزہ لیا اور 12 دسمبر 2002ء کو ایک رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا ہے کہ دیوار کے 70 فیصد سے زائد حصے کو صحرائی ریت نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے دیوار کے اردگرد کے علاقوں کی صحرائی کیفیت کو بدلنے کے لیے شجر کاری کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اگرچہ قدرتی قوتوں کی طرف سے تباہی کا عمل کچھ سست رفتاری سے ہو رہا ہے مگر انسانی قوتیں اس دیوار کو انتہائی تیز رفتاری سے نقصان پہنچا رہی ہیں۔ حکومت کی کچھ پالیسیاں بھی دیوار کی تخریب کی ذمے دار ہیں۔ مثلاً یولن (YULIN) دیوار کے ساتھ ہی صوبے کی مرکزی شاہراہ گزر رہی ہے۔

مقامی لوگوں کے مطابق سڑک کی تعمیر کے وقت دیوار کی حفاظت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا اور اس دوران میں دیوار کو دانستہ طور پر نقصان پہنچایا گیا۔ سڑک پر جا بجا حفاظتی میناروں کی موجودگی اس بات کی شاہد ہے کہ سڑک کو عین انہی مقامات سے گزارا گیا ہے جہاں سے کسی زمانے میں دیوار گزری تھی۔ حالیہ تحقیقات نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا واحد کیس نہیں۔ ننگ زی (NINGXIA) شانزی اور گانسو صوبے اور اندرون منگولیا میں بھی دیوار کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا ہے۔ دیوار کی زرخیز مٹی کو کھاد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں دیوار کو ڈائنامائٹ سے اڑایا گیا ہے اور کہیں اس کے پتھر بیچ دیے گئے۔ کئی جگہوں پر دیوار کی اینٹوں سڑک، گھروں اور آبی ذخائر کی تعمیر کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک تحقیقاتی گروپ نے اپنے مطالعاتی دورے کے دوران بتایا کہ تنہا صوبے میں دیوار کے ایک حصے کی مرمت پر سفید چونا پھیر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس عالمی ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے اس کو اصل حال میں ہی محفوظ کیا جائے۔

یہ دیوار صدیوں سے چین کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتی چلی آئی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف ادوار میں دیوار کو مختلف انداز سے دیکھا گیا ہے۔ چنگیز خان اور اس کے خالق تھے وہ اس کو اپنی سرحدوں کے تحفظ کے لیے کارآمد رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ عوام نے اس منصوبے کو ہمیشہ اپنی ذات اور ملکی معیشت دونوں پر بوجھ سمجھا۔ خانہ بدوش قبائل کے لیے یہ دیوار ان کی بقا کے لیے خطرے کی علامت تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہان (HAN) حکومت میں اس دیوار نے ہنزا (HUNZA) قبائل کو مغرب کی طرف دھکیل دیا جس نے واقعات کے اس سلسلے کو جنم دیا جو سترھویں صدی کے آخر کار روم کی عظیم الشان سلطنت کے خاتمہ کا باعث بنا۔ 17 صدی تک مغربی ممالک دیوار کو ایک بھولے بسرے خطے کی طرف سمجھتے تھے جس نے چین کو باقی دنیا سے علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ مغربی ممالک اس منصوبے کو سراہ رہے تھے جبکہ دوسری طرف چینی عوام اس کو منگ دور سے پہلے کنجر یئز کے ہاتھوں کھائی جانے والی شکست کی یادگار سے تعبیر کرتے تھے۔ دیوار چین کی تشہیر چین کی غیر سرکاری قومی یادگار کے طور پر کی جاتی ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے۔ آج چینی عوام اس کو اپنے آباؤ اجداد کا قابل فخر ورثہ گردانتے ہیں جس کو ایک چینی کہاوت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''وہ آدمی پیدا ہی نہیں ہوا جس نے دیوار چین نہ دیکھا۔''

سرِراہ

تحریر : غلام قادر

دنیا عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین واقعات سے بھری پڑی ہے۔ زیرِ نظر تحریر بھی ایسی ہی حیرت انگیز سرِ راہ ملنے والی ایک حسینہ کی کہانی ہے جس نے ایک آوارہ منش اور بکھرے ہوئے شخص کی زندگی کو نہ صرف منظم کر دیا بلکہ اسے ترقی اور سکون کی راہ پر بھی ڈال دیا۔ ایک ایسی بھٹکی ہوئی روح کا قصہ جو سالہا سال سے سکون کی تلاش میں بے سکون راہوں پر انسانی روپ دھارتی رہی ہے۔

جذبات کے بپھرے ہوئے سمندر میں ایک بے چین لہر کی کارفرمائیاں

[illegible] کی جانب متوجہ نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو [illegible] نہ روکتا۔ لیکن ایک تو اکتیس دسمبر کی رات [illegible] سال کی آمد میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے، اور [illegible] گی کہ میری جیب گرم تھی۔ مجھے اس ٹیوشن کے [illegible] نے دو تاریخ سے شروع کی تھی اور جو میری [illegible] تھے۔

[illegible] سڑک پر اسٹاپ سے کچھ دور اس انداز میں [illegible] اس طرح کی خواتین کا خاص اسٹائل ہوتا ہے، [illegible] اس میں جو مختلف بات تھی وہ یہ تھی کہ وہ برقع میں تھی اور چہرے کے نام پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

میں عموماً موٹر سائیکل بہت تیز چلاتا تھا لیکن اس وقت میری رفتار خاصی کم تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور میں کسی ہوٹل کی تلاش میں تھا۔ میں نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا تھا لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اس نے بائیں ہاتھ سے بہت ہلکے سے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

''چلیے اسد صاحب اس سال آپ بھی نئے سال کی آمد کا جشن بڑے لوگوں کے انداز سے منالیں۔'' میں نے موٹر

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سائیکل روکتے ہوئے خود کو مخاطب کیا تھا لیکن رکتے رکتے بھی موٹر سائیکل کچھ دور چلی گئی تھی۔

مجھے رکتا دیکھ کر اس نے میری جانب چلنا شروع کر دیا تھا اور پھر بغیر کچھ کہے وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ بھی گئی تھی۔

''کہاں چلیں؟'' میں نے کچھ دور جانے کے بعد سوال کیا اور وہ ہنس دی۔

''اب یہ بھی میں بتاؤں گی کہ کہاں جانا ہے؟'' اس نے جواب دیا تھا۔

اس کی نہ صرف آواز بہت اچھی تھی بلکہ جس انداز میں اس نے بات کی تھی اس میں وہ عامیانہ پن نہیں تھا جو سڑک کے کنارے سے ملنے والی لڑکیوں میں ہوتا ہے۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم کہیں رک کر کچھ کھا پی لیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ ہو تو سکتا ہے لیکن زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ راستے سے کچھ خرید لیا جائے اور پھر جہاں جانا ہے وہاں پہنچ کر اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔'' اس کے جواب نے نہ صرف اس تاثر کو مزید گہرا کیا تھا جو اس کے پہلے فقرے سے پیدا ہوا تھا، بلکہ یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی حس مزاح بھی تیز ہے۔

میں نے راستے میں رکنے کی بات اس لیے کی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ معاملات پہلے ہی طے ہو جائیں، لیکن اس کے جواب نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ میں نے امیرانہ انداز سے نئے سال کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن اس پر بہت زیادہ خرچ کرنے کا میرا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا۔ اس کے جواب سے شاید مجھے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن جب میں کھانا لینے رکا تو میرے ذہن نے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اور اس کے ساتھ ہی میری خوشی ادھوری رہ گئی۔

''اگر یہ اکتیس دسمبر کی رات میں بھی گاہک کی تلاش میں ہے تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ محترمہ خاصی بدشکل واقع ہوئی ہیں۔'' میرے ذہن نے مجھے سمجھایا تھا۔

یہ بات قرین قیاس یوں بھی نظر آتی تھی کہ نئے سال کی آمد کا جشن منانے والے کافی دن پہلے سے اوسط سے کم تر لڑکیوں تک کو بک کر لیتے ہیں۔ ایسے میں اس کا یوں سڑک کے کنارے کسی کو تلاش کرنا ایک ہی بات ظاہر کر رہا تھا۔ پھر اس کا مسلسل نقاب سے چہرہ ڈھانپے رکھنا بھی اسی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔

کھانا لے کر واپس آتے ہوئے میں نے یہ طے کیا تھا کہ دوبارہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں اس سے چہرہ دکھانے کی بات کروں گا اور اگر اس نے انکار کیا میں اس سے کہہ دوں گا کہ ''دیکھے بغیر تو کوئی بھی گاہک کچھ نہیں خریدتا'' ۔لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے یوں لپک کر مجھ سے چیزیں لیں جیسے مجھے وزن اٹھانے میں تکلیف ہو رہی ہو۔

''اس خوشبو نے تو بھوک اور تیز کر دی۔'' اس نے میرے ہاتھ سے تھیلیاں لیتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا چہرہ وہ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا رہی ہوگی۔

میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر میں نے کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کے اس فقرے نے میرے ذہن میں یہ سوال ابھارا تھا کہ ''پتا نہیں یہ کب سے بھوکی ہے!''

اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا تو میں نے باقی راستہ خاموشی سے طے کرتے ہوئے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کم تر شکل کی ہوئی تب بھی میں اسے اس بات کا احساس نہ دلاؤں گا۔

''ایک رات کی ہی تو بات ہے۔'' میں نے خود کو سمجھایا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے تالا کھولا تو وہ اس وقت بھی میرے ساتھ کھڑی تھی۔ کھانے کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی، میں گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلی بار خود ہی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''کچن کس جانب ہے؟'' اس نے چہرے سے نقاب ہٹائے بغیر کہا تھا۔

میں نے کچن کی جانب اشارہ تو کر دیا لیکن میرا اپنے اندازے پر یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا کہ وہ واقعی بدشکل کی خاتون ہے، ورنہ گھر میں آ جانے کے بعد بھی وہ چہرے سے نہ ہٹانے کا اور کوئی جواز نہیں تھا۔

وہ کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی تو میرے اندازوں کی عمارت زمیں بوس ہو چکی تھی۔ کچن میں ہی چھوڑ آئی تھی لیکن جو کچھ برتن کے اندر سے جھانک رہا تھا وہ حیرت انگیز طور پر خوب صورت ہی نہیں بلکہ پرکشش ماڈرن بھی تھا۔

''یہ کہاں رکھنا ہے۔'' اس نے مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھتے پا کر مخاطب کیا تھا۔

''میں نے صوفوں کے درمیان موجود میز پر کچھ کتابیں ہٹائیں تو اس نے پہلے ٹرے میز پر رکھی، پھر کمرے کی ٹیبل پر منتقل کیں اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''آپ اکیلے رہتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اکیلے رہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان چیزوں کو سمیٹنے تک نہیں۔'' اس نے میری نگاہوں کی پروا کیے بغیر کہا تھا۔

''فی الحال کھانے کے علاوہ جو بات میں سن سکتا ہوں وہ تمہارا نام ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

''نام میں کیا رکھا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گلاب کو آپ جس نام سے بھی پکاریں وہ گلاب ہی رہے گا۔'' اس نے اپنا فقرہ مکمل کر کے مجھے مسکرا کر دیکھا تھا لیکن اس کے خوب صورت چہرے پر نظر ڈالتے ہی میری حس ایک بار پھر بیدار ہو چکی تھی۔

''جس شخص کا قول تم دہرا رہی ہو اس کی مادری زبان انگریزی تھی اور انگریزی میں گلاب مونث ہے جبکہ اردو والے گلاب کے ساتھ ہی مجھے گلاب خان کی بڑی بڑی مونچھوں کا شور ذہن میں آتا ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی۔

''اس طرح تو میرا نام چنبیلی ہونا چاہیے؟'' اس نے اپنی مسکراہٹ کو وسعت دیتے ہوئے کہا تھا۔

''چنبیلی اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ سانپ کا بسیرا چنبیلی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلیں پھر چنبیلی ہی ٹھیک ہے جو گلاب کے سانپ اپنے گلے لیے گھومتی ہے۔'' اس نے کہا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔

''یہ بحث ہم کھانے کے بعد بھی جاری رکھ سکتے ہیں اگر کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو پرابلم ہو جائے گی۔'' اس نے کہا اور میں بھی اس سے متفق ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

وہ کچھ دیر تک تو انتہائی تندہی سے کھانے میں جتی رہی پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک لقمہ حلق سے آگے بڑھانے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔ ''آپ کو لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟''

''کون لوگ؟'' اس کی طویل ہوتی ہوئی خاموشی سے مجھے بھی الجھن ہو رہی تھی اس لیے جب اس نے سوال کیا تو میں نے سلسلہ وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''ظاہر ہے میں ان لوگوں کی ہی بات کر رہی ہوں جو آپ کو جانتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

''چھوٹی جب تک زندہ رہیں وہ مجھے شیرو پکارتی رہیں۔'' میں نے لقمے کو منہ میں ڈالنے سے قبل کہا اور پھر لقمہ چبانے لگا۔

''دونوں بہنیں بھائی کہتی ہیں۔'' میں نے اگلے لقمے کی جانب ہاتھ بڑھانے سے قبل کہا تھا۔

''اور دوست؟'' اس بار میں خاموش ہوا تو اس نے سوال کیا۔

''دوست جو کچھ پیٹھ پیچھے کہتے ہیں وہ میں یہاں دہرا نہیں سکتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اور سامنے آ کر کیا کہتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''سامنے آ کر جو کچھ کہتے ہیں اس پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے اس انداز میں گھورنے لگی جیسے اسے مجھ پر غصہ آ رہا ہو۔

''میٹرک کے ایڈمٹ کارڈ پر نام کے خانے کے آگے کیا درج تھا؟'' اس نے اس بار سوال گھما کر کیا تھا۔

''ایڈمٹ کارڈ پر نام سے زیادہ رول نمبر کی حیثیت ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سمجھ گئی۔'' اس نے کھانے پر سے اپنا ہاتھ روکتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ مجھ سے بدلا لے رہے ہیں۔'' اس نے کہا لیکن میں نے نظریں اٹھا کر بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔

''میں تابندہ ہوں۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔

ضروری گزارش

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط، کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ فرانس سٹمپ اور اسکے تنگ (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کریں تاکہ یہ ضائع نہ ہوں۔ ای میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔

نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہٰذا غیر ممالک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)

''اور میں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

''مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ آج کی رات میں کسی عام آدمی سے نہیں ملی ہوں۔'' اس نے کہا اور اس بار سوال کرنے کی میری باری تھی۔

''میں کس طرح سے عام آدمی نہیں ہوں؟'' میں نے سوال کیا اور وہ ہنس دی۔

''جو شخص گھر لانے تک چہرے سے نقاب ہٹانے کی بات تک نہ کرے اسے عام آدمی تو نہیں کہا جاسکتا۔'' اس نے کہا اور میں اس کی اس دلیل پر ہنس دیا تھا، لیکن وہ میرے ہنسنے کو کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں کیونکہ آپ سے پہلے جتنے افراد بھی میری زندگی میں آئے ان میں سے ہر ایک نے اس پر ضرور اصرار کیا کہ میں پہلے اپنے چہرے سے نقاب ہٹاؤں۔'' اس نے کہا تھا۔

''میں جوا نہیں کھیلتا ہوں۔'' میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

''لیکن جب بھی میرے پاس اتنی رقم ہوئی کہ میں جوا کھیل سکوں تو میں بہت دیر تک بلائنڈ کھیلوں گا۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''بہت دلچسپ شخص ہیں آپ!'' اس نے کہا۔

''جو کچھ میں تھا وہ اب نہیں ہوں۔'' میں نے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے سخ انداز میں کہا تھا۔ ''لیکن جو کچھ اب ہوں وہ شاید پوری زندگی رہوں۔'' میں نے کہا اور وہ میرے بدلتے ہوئے موڈ پر حیرت زدہ سی ہو کر مجھے دیکھتی رہی۔

''پہلے کیا تھے؟'' اس نے سوال کیا لیکن میں اپنے ماضی کو دہرانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تم بہت تھوڑی سی دیر میرے ساتھ ہو۔'' میں نے کسی بحث میں الجھے بغیر کہا تھا۔

''صبح چھ بجے اللہ داد صاحب اپنا اسٹور کھولنے آجاتے ہیں اس لیے تمہیں زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک یہاں سے روانہ ہو جانا ہے ورنہ تمہیں اگلا دن بھی یہیں گزارنا ہوگا؟'' میں نے کہا اور اس نے اس انداز میں سر ہلایا تھا جیسے سب کچھ سمجھ چکی ہو۔

''یہ عمارت آپ کی ملکیت ہے؟'' اس نے اچانک سوال کیا تھا۔

''یہ مکان جس میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں اور اس کے نیچے کی آٹھ دکانیں پھوپی مرحومہ کی جانب سے مجھے اور میری دو بہنوں کو ورثے میں ملی ہیں۔'' میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

''اور آپ کی بہنیں؟'' اس نے میرا جواب مکمل ہونے ہی اگلا سوال کیا۔

''ایک اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ دبئی میں ہے۔ دوسری میڈیکل کی طالبہ ہے اور لاہور میں ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ خاموش ہوگئی۔

''یہ انٹرویو شائع کب ہوگا؟'' اس بار میں نے سوال کیا تھا۔

''کون سا انٹرویو؟'' اس نے چونک کر کہا تھا۔

''یہ انٹرویو جو ابھی آپ نے لیا ہے۔'' میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

''آپ بھی نا بس.....'' اس نے کہا لیکن اس کے لہجے میں جھینپنے کا تاثر تھا۔

''اگر یہ انٹرویو نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''آپ کو برا لگا ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''اب اگر کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔'' میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''چائے کا سامان تو گھر میں ہوگا؟'' میں بھی اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''جو کچھ ہے وہ کچن میں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ کچن میں جاتے رک گئی۔

''باتھ روم میں چینی اور پتی رکھنے کا تصور نیا تو ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ اس آئیڈیا کو زیادہ پذیرائی مل نہیں سکی۔'' اس نے کہا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چل دی۔ اس کی واپسی میں دو منٹ لگی اور اس نے آتے ہی سیٹنے شروع کر دیے، لیکن اس سے پہلے اس نے ''چولہے پر ہے'' کی اطلاع دی تھی۔

''یہ دائیں جانب والا بیڈ روم شاید آپ کے زیر استعمال میں ہے؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا تھا۔

''جب تک میں آواز نہ دوں آپ اس جانب نہیں آئیں گے۔'' اس نے حکم دینے والے انداز میں کہا تھا اور میں نے اس کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

میں جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہا اور وہ میری نظروں کے سامنے کچن سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے کچن میں ہوتی رہی پھر اس کا اختتام اس پر ہوا کہ وہ ٹرے ہاتھ میں لیے ہوئی۔

''چائے بیڈ روم میں پی جائے تو کوئی اتنی غلط بات نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا اور میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اتنے مختصر سے وقت میں وہ جتنی تبدیلی لا سکتی تھی لے آئی تھی اور اس کی توجہ کا مرکز بیڈ تھا۔ جس پر چادر سے لے کر تکیے کے غلاف تک تبدیل ہو چکے تھے۔

''چادر شاید آپ نے بدلنے کے لیے ہی نکالی تھی لیکن آپ کو یاد نہیں رہا۔'' اس نے کہا اور میں نے اسے سچ بتا دیا۔

''دراصل میری بہن کا پروگرام تھا کہ وہ چوبیس کو پہنچے گی اور پھر ایک ہفتہ رکنے کے بعد واپس چلی جائے گی۔ لیکن اپنی آمد سے ایک دن پہلے اس نے بتایا کہ ان کی چھٹیاں منسوخ ہو گئی ہیں اور اس سمیت تمام ڈاکٹروں کو ایمرجنسی ڈیوٹی دینی پڑ رہی ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''میں تو اسے ایک دو روز کی بات سمجھ رہی تھی لیکن یہ تو ایک ہفتے سے بھی زیادہ پر انی بات ہے۔'' اس نے کہا اور اس بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

چائے کا مگ ہم دونوں نے اٹھایا تو وہ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ چلی گئی۔

''رات میں جس وقت میں واپس آتا ہوں تو اتنا تھک ہوا ہوتا ہوں کہ بستر دیکھتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہوں۔'' میں نے اپنی کاہلی کا ایک جواز پیدا کیا تھا۔

''اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آٹھ نو روز سے اس گھر میں کوئی خاتون نہیں آئی۔'' اس نے ٹرے سائیڈ پر رکھ کر بستر کی جانب بڑھنے سے پہلے کہا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ تم اس بیڈ روم میں میرے حوالے سے آنے والی پہلی خاتون ہو تو تم یقین کر لو گی؟'' میں نے سوالیہ انداز میں سچ بول دیا تھا۔

''نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔'' اس نے مجھ سے زیادہ بیڈ پر خود کو اس طرح ٹکایا تھا کہ ہم دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

''اس کی ایک سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ صرف ایک دن رات کو اتنی دیر سے آتا ہوں ورنہ تو جب میں آتا ہوں دکانیں کھلی ہوتی تھیں اور ان کے سامنے خاتون گاہک کا مطلب اپنی برسوں کی محنت اکارت کر دینا ہوتا۔'' اس نے کہا اور وہ کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھنے لگی۔

''ایک ماہ سے یہ دیر کیوں ہو رہی ہے؟'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''میری آمدنی ٹیوشن کے ذریعے ہے اور ایک ماہ سے مجھے جو ٹیوشن ملی ہے اس سے میں دیر سے فارغ ہوتا ہوں۔''

میں نے جواب میں کہا اور فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ مجھے بات اور آگے بڑھانی چاہیے۔

''آج اگر اس ٹیوشن کے پیسے نہ ملے ہوتے تو تم یہاں نہ ہوتیں۔'' میں نے کہا اور وہ بہت دھیمے سے انداز میں مسکرائی تھی۔

''جو رقم مجھے ملی تھی وہ میری توقع سے زیادہ تھی اس لیے میں نے سوچا کہ آج یوں کرتے ہیں کہ نئے سال کی ابتدا بڑے لوگوں کی طرح کرتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس پر صورت حال واضح کی اور وہ ہنس دی تھی۔

''لیکن تمہاری وہ رقم تو پھر بھی محفوظ ہی رہی۔'' اس نے کہا اور میں اس انداز میں اسے دیکھنے لگا جیسے کچھ نہ سمجھ سکا ہوں۔

''میں نے اپنے طور پر یہ طے کیا ہوا تھا کہ جب کبھی کوئی ایسا شخص ملا جس نے میرا چہرہ دیکھنے پر اصرار نہیں کیا تو میں اس سے کم از کم پہلی بار کچھ نہیں لوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''یعنی کہ چڑیل ہوئی بھی اور دودو بھی۔'' میں نے کہا اور وہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔

''آپ بھی.....'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''آپ بھی بس چپ رہیں۔'' اپنی ہنسی روک کر اس نے فقرہ مکمل کیا اور اس بار میں ہنس دیا تھا۔

''میں چپ کہاں ہوں۔'' میں نے کہا تھا۔

''میں تو دراصل ناچ رہی ہوں۔'' میں نے کہا اور اس کی رکی ہوئی ہنسی پھر سے شروع ہوگئی۔

''چپ تو تم ہو۔'' میں نے کہا اور وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی۔

''یہ گھنے سیاہ بال، یہ بڑی بڑی آنکھیں۔'' میں نے اس کی جانب پیش قدمی کی ابتدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ اس طرح کی باتیں بھی کر لیتے ہیں۔'' میری پیش قدمی کے جواب میں اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی تھی۔

''کرتا نہیں ہوں آج پہلی بار ہو رہی ہیں۔'' میں نے پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اور مجھ سے ہی کیا۔'' میں نے اسے اپنے مزید قریب کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

''سنگ مرمر سے تراشا ہوا یہ شفاف بدن جس کسی کے

سامنے ہوگا وہ اسی طرح کی باتیں کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' میں نے کہا اور اس نے جو پہلے ہی مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی بالکل ہی ہتھیار ڈال دیئے۔

طوفان اپنی منزل پر پہنچا تو اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اگرچہ ہڈحال ہم دونوں ہی تھے۔

''نیا سال مبارک ہو۔'' اس نے گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

''تمہیں..... بھی.....'' میں نے جواب دیا لیکن اس سے پہلے میری نظر دیوار پر لگی گھڑی کی جانب اٹھی تھی جہاں نیا سال اپنے ابتدائی سانس لے رہا تھا۔

''خدا کرے کہ یہ سال تمہارے لیے نئی خوشیوں کے پیغام لے کر آئے۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور میں ہنس دیا۔

''ہم جیسوں کی زندگی ایک دائرے میں سفر کرتی ہے کہ جہاں سے شروع کرتے ہیں اختتام بھی وہیں ہوتا ہے۔'' میں اپنی بات مکمل کر چکا اور وہ مجھے اس انداز میں دیکھنے لگی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں اس طرح کی باتیں بھی کر سکتا ہوں۔

''آپ کچھ قنوطی نہیں ہو رہے؟'' اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا اور میں ایک طنزیہ ہنسی ہنس دیا۔

''جس کی ماں بچپن میں مر گئی ہو اور باپ نے دوسری شادی کے بعد بچوں کو یوں فراموش کر دیا ہو کہ جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔'' میرا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جا رہا تھا۔

''پھوپی نے بن ماں باپ کے بچوں پر ترس کھا کر ان کے لیے اپنی زندگی برباد کر دی۔ خود شادی نہیں کی تاکہ ہماری زندگیاں تباہ نہ ہوں لیکن ہوا یہ کہ بھتیجے کو بر سر روزگار دیکھنے کی حسرت لیے وہ بھی دنیا سے چلی گئیں۔ ایک اسکول میں پڑھانے والی کی اوقات ہی کتنی ہوتی ہے۔'' میں کہتے کہتے رکا تو وہ پوری طرح سے میری جانب متوجہ تھی۔

''آئی ایم سوری اسد۔'' اس نے میری گفتگو میں وقفہ آتے ہی کہا تھا۔

''میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔'' اس نے معذرت کرنی چاہی اور میں ہنس دیا۔

''تم تکلیف کی بات کرتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تو اس روز بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی جب ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھانے والی نے یہ کہا تھا کہ، میں مجبور ہوں اسد۔ میری تمام تر کوشش کے باوجود بھائی نہیں مان رہے ہیں۔'' میں اپنی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوا تو اس کے چہرے پر واضح طور پر اس طرح کا تاثر تھا جیسے اسے یہ سن کر افسوس ہوا ہو۔

''وہ معذرت دراصل ابتدا تھی اس بات کی کہ وہ ڈاکٹر عامر سے شادی کے لیے تیار ہو گئی ہے، کیونکہ ڈاکٹر عامر اسے لے کر لندن جا رہا تھا اور میں بے روزگار۔ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ اسے کسی معقول ریسٹورنٹ میں کھانا کھلا دوں۔'' میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا لیکن بہت دیر تک وہ بھی کچھ نہیں بول سکی تھی۔

''تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟'' اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

''پڑھا کہاں ہے وقت ضائع کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ایم، اے انگلش کروانے کے بجائے پھوپی اگر مجھے کسی گیراج میں استاد کے حوالے کر دیتیں تو آج اس قابل تو ہوتا کہ چند ٹکے کما لاتا۔'' میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''یہ بات تو بہر حال طے ہے کہ اگر تم موٹر مکینک بن بھی جاتے تب بھی میں تمہیں نہ ملتی۔'' اس نے خود کو مجھ سے قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم تو کل بھی نہیں ہو گی۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا لیکن اس سے میں نے کچھ اور پوچھا تھا۔

''وہ کیوں.....؟'' میں نے سوال کیا۔

''مجھے اس بو سے الرجی ہے جو موٹر مکینک کے کپڑوں سے آتی ہے۔'' اس نے مجھ پر تقریباً سوار ہو جاتے ہوئے کہا تھا۔

''تب تو اچھا ہی ہوا کہ میں مکینک نہیں بنا۔'' میں نے حالات کے مطابق کہا اور ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں کھو سے گئے تھے۔

ایک بہاؤ تھا جس میں وہ بہہ رہی تھی اور میں اس کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ وقت کا احساس نہ اسے تھا نہ مجھے کہ اچانک اس نے کہا۔ ''اب ایسا کرتے ہیں کہ کچھ دیر سو جاتے ہیں۔''

میں نے گھڑی کی جانب دیکھا جو تین بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر الارم لگانے کے لیے اٹھ گیا لیکن جب الارم لگا کر پلٹا تو وہ آنکھیں بند کر چکی تھی۔

''یہ کام تم نے بہت اچھا کیا ورنہ تو ہم دونوں ہی سوتے رہ جاتے۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔

''کیا فرق پڑتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''صبح آنکھ کھلتی تو تم ناشتا بناتیں پھر میں اپنے کام پر نکل

اور تم دن بھر قید رہتیں لیکن گھر کی صفائی کرتیں، کھانا بناتیں اور جب میں واپس آتا تو تاریخ خود کو دہراتی۔'' میں ہنس دیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''وہ خواب جن کی تعبیر نہ ہوا نہیں نہ خود دیکھو نہ کسی کو دیکھنے دو۔'' اس نے سخت لہجہ اپناتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

بات نہ بڑھانے کی غرض سے میں خاموش رہا تھا۔ ویسے بھی کچھ اس طرح کی تھی جیسے میں میلوں پیدل چل کر آیا ہوں۔

وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی لیکن میری آنکھ خود بخود بند ہو گئی تھی پھر دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو وہ مجھے اٹھا رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔ اس کے گیلے بال بتا رہے تھے کہ وہ نہا بھی چکی ہے۔

''تم کب جاگیں؟'' میں نے آنکھ کھولتے ہی پہلا سوال کیا۔

''میں سوئی کب تھی جو جاگتی۔'' اس نے چائے کا مگ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا اور آئینے کے سامنے پہنچ کر بال سنوارنے لگی۔

کمرے کے حالات یکسر بدل چکے تھے ہر چیز قرینے سے تھی اور یہ تبدیلی پتا دے رہی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

''لیکن میرے سامنے تو تم۔'' میں نے اس سے کہنا چاہا لیکن سامنے تو وہ سو چکی تھی لیکن اس نے درمیان سے ہی بات لپک لی۔

''وہ تو تمہیں سلانے کا بہانا تھا۔'' اس نے بدستور اپنا رخ آئینے کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔

میرے چائے ختم کرنے تک وہ روانگی کے لیے تیار ہو چکی تھی اور جب تک میں باتھ روم سے آتا اس نے چائے کے برتن بھی دھو ڈالے تھے۔

کچن اور ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر حیران ہو ہی رہا تھا کہ اس نے مجھے وقت کا احساس دلایا۔

''پہنچنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔'' اس نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بھی آگے بڑھ گیا۔

میں نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ واپس جائے لیکن اس سے کہنے کی ہمت بھی مجھ میں نہیں تھی۔

میں اور وہ آگے پیچھے اترے تھے۔ میرے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی آواز کے ساتھ وہ سیڑھیوں سے باہر نکلی تھی اور ایک آگے بڑھ گئی تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے کچھ دور جانے کے بعد کہا تھا۔

''کسی بھی ایسی جگہ جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے۔'' اس نے جواب دیا۔

''گویا یہ مجھے اپنا گھر نہیں دکھانا چاہتی۔'' میں نے سوچا لیکن کہا کچھ نہیں۔

''ایسا کرو کہ اس جانب چلو جہاں پر میں تم سے ملی تھی۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔'' اس نے کہا اور میں نے بغیر کچھ کہے موٹر سائیکل کا رخ اس جانب کر دیا جہاں وہ رات کو مجھے نظر آئی تھی۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر اسی نے خاموشی کے اس وقفے کو ختم کیا تھا۔

''آپ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''کبھی ارادہ تھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا تھا۔

''ارادہ ملتوی ہونے کی وجہ؟'' اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔

''کوئی فائدہ نظر نہیں آیا تھا۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''کیوں.....؟'' اس نے یک لفظی سوال کیا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یوں ٹالے جانے سے ٹلنے والی نہیں ہے۔

''امتحان پاس کر لیتا تب بھی انٹرویو میں فیل کر دیا جاتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر کوئی انٹرویو میں فیل نہ ہونے کی ضمانت دے تو.....؟'' اس نے سوال کیا اور میں ہنس دیا۔

''اگر اس کوئی سے مراد آپ خود ہیں تو مجھے اس یقین دہانی پر یقین نہیں ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''آج تو یہ غلطی کر لی ہے لیکن آج کے بعد اس طرح کی غلطی مت کرنا کہ ہم جیسوں کی پہنچ کو چیلنج کرو۔'' اس نے میرے توہین آمیز فقرے کا برا مانے بغیر کہا تھا۔

''میں آپ کے اس چیلنج کا کیوں برا مانوں گی کیونکہ آپ میرے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں؟'' میری جانب سے کوئی جواب نہیں گیا تو اس نے سوالیہ انداز میں جوابی چیلنج کیا۔

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ''وہ جن کی پہنچ بہت اوپر کی حلقوں تک ہوتی ہے وہ یوں سڑک کے کنارے نہیں پائی جاتی ہیں۔'' لیکن پھر میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ کیونکہ اسی وقت ذہن کے ایک حصے میں یہ سوال ابھرا تھا کہ ''ہو سکتا ہے

کہ یہ صحیح کہہ رہی ہو۔"

"میں سوچوں گا؟" میں نے اس بار براہِ راست کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

"اگلی بار جب میں آؤں گی تو آپ فارم بھر چکے ہوں گے کیونکہ آخری تاریخ میں صرف چار دن رہ گئے ہیں۔"

اس نے کہا اور پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ صرف ہوا میں بات نہیں کر رہی ہے۔

"ویسے آپس کی بات ہے، نیلم کچھ اتنی اچھی بھی نہیں تھی کہ آپ اس کی بے وفائی کے بعد زندگی سے منہ ہی موڑ لیں۔"

اس نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا تھا اور میں موٹر سائیکل روکنے پر مجبور ہو گیا۔

"تم کیسے جانتی ہو نیلم کو.....؟" میں نے اس کی جانب رخ کر کے کہا تھا۔

"آپ کی ایک کتاب میں سے اس کی وہ تصویر نکلی تھی جس کے پیچھے آپ نے اس کی تاریخِ وفات 20 جون لکھی ہے۔"

اس نے میرے انداز کی پروا نہ کرنے والے انداز میں کہا اور میں صرف اسے گھور کر رہ گیا۔

"پھر آپ کے کاغذات میں وہ خط بھی ملے جو آپ کبھی پوسٹ نہ کر سکے۔" اس نے ایک اور چوٹ کی۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ میری چیزوں کو چھیڑو۔" میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا تو میں نے سوال کیا اور وہ ہنس دی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"اس کا جواب اگلی ملاقات پر دوں گی لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نیلم مجھ سے اچھی نہیں ہے۔" اس نے مجھے مزید تاؤ دلانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ہم آج کے بعد نہیں مل رہے ہیں۔" میں نے موٹر سائیکل دوبارہ آگے بڑھاتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"اچھا تو یہ تھا کہ آپ مجھے اپنے رابطے کا کوئی فون نمبر دے دیتے۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ میں بغیر اطلاع کے پہنچوں اور آپ کی بہن بھی گھر پر موجود ہو اور ہم دونوں ہی کوئی جواب نہ دے سکیں۔" اس نے کہا اور میں نے سوچا کہ وہ بات تو صحیح کر رہی تھی لیکن صحیح ماننے کے بعد بھی میں نے اسے نمبر نہیں دیا تھا۔

ہم وہاں پہنچ گئے۔ جہاں وہ ملی تھی تو اس نے کچھ آگے کھڑی ہوئی ٹیکسیوں کی جانب اشارہ کیا لیکن پھر ٹیکسیوں سے سوگز دور ہی رکنے کے لیے کہا تھا۔

"فون نمبر دے دو اسی میں ہماری بھلائی ہے۔" اس نے اترتے ہی فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

میں نے اسے نمبر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ چوہدری صاحب ہر پیغام مجھ تک پہنچا دیتے ہیں اس لیے مجھے ہوا کے بجائے وہ پیغام یا نمبر دے تو میں اس پر بات کر لوں گا۔

"اور وہ امتحان کی تیاری؟" اس نے کہا۔

"فارم تو میں بھر ہی دوں گا۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"اگلی بار اگر آپ نے صرف رسید دکھا دی تو میں اس سے اگلی بار کی بھی کوئی قیمت نہیں لوں گی۔" اس نے لاڈ اور میں ہنس دیا تھا۔

"میرے خیال سے یہ تم نقصان کے سودے کر رہی ہو۔" میں نے کہا اور وہ مسکرا دی تھی۔

"یہ بازی عشق کی بازی نہیں ہے لیکن پھر بھی....." اس نے کہا اور پھر ٹیکسی کی جانب چل دی۔ میں نے اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

"وہ انداز اختیار کرو جو گلی میں کتاب کے سلسلے میں تھا۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی اور میں اپنی موٹر سائیکل دور ہوتا دیکھتا رہا پھر کچھ دور جا کر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور میں وہ غائب ہو چکی تھی۔ جب وہ ملی تھی تو بالکل عام سی گرل" دکھائی دی تھی۔ اس قدر عام کہ کھانے کے بعد کر کے اس نے اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ گھر پہنچنے کے ساتھ ہی اس نے راستے کا تمام تاثر ختم دیا تھا سوائے صرف ایک تاثر کے کہ وہ ایک خاتون ہے۔ لیکن پھر صبح سویرے اس نے اپنی جس پرت کو واضح کیا تھا وہ پہلے تاثر کو بالکل ہی اس نے جس حلقے میں اپنی پہنچ کا دعویٰ کیا تھا وہاں والوں کی پہنچ بھی نہیں ہوتی ہے۔

گھر تک واپسی کا سفر میں نے بہت سست رفتاری تھا، بلکہ اگر یہ کہوں کہ میرا واپس جانے کو دل ہی نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اور شاید اسی لیے میں نے بھوک باوجود راستے میں رک کر ناشتا بھی کیا اور پھر بجائے چوہدری صاحب کے اسٹور پر کچھ دیر رکا اتنی صبح باہر سے آتا دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ان سے بہانہ بنایا کہ اپنی نوکری کے سلسلے میں صبح سویرے اپنے کاغذات پہنچانے گیا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق چوہدری صاحب موضوع کو گھما کر میری شادی کی جانب لے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آج کل کے مہنگائی کے دور میں میاں بیوی دونوں کو نوکری کرنے کی گاڑی کھینچنی چاہیے۔

ان کی بات صحیح بھی تھی لیکن چوہدری صاحب اپنی بات پر اس لیے زور دے رہے تھے کہ وہ تین بیٹیوں کے باپ تھے اور ان کی تینوں بیٹیاں برسرِ روزگار تھیں۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر تھی لیکن اس کی زندگی کا المیہ یہ تھا کہ جس ڈاکٹر سے اس نے شادی کی تھی وہ شادی کی پیدائش کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے نام پر گیا اور پھر وہاں سے ڈالر بھیجنے کے بجائے اس نے طلاق بھیج دیا۔ دونوں چھوٹی بیٹیوں میں سے ایک کالج میں پڑھاتی تھی تو دوسری کسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں خاصی اچھی جاب کر رہی تھی۔

میں نے ان کے ارشادات کے جواب میں وہی کہا تھا جس میں خود نوکری سے نہیں لگ جاتا اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا" اور پھر وہاں سے اٹھ آیا۔

میں نے جتنے سویرے اٹھا دیا تھا اتنے سویرے اٹھنے کا عادی نہیں رہا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد بستر پر جا کر لیٹنا تو اس کا تصور اور بھی شدت سے یاد آیا تھا۔

"اب کی بار جب وہ آئے گی تو میں اس کے بارے میں پتا لگانے کی کوشش کروں گا۔" میں نے سوچا لیکن یہ سوچ کچھ بے چین ہونے سے نہ روک سکی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا میری نگاہ کتابوں کی جانب اٹھی تھی۔ جو میز کے اوپر سجی ہوئی تھیں۔

کتابیں اور نوٹس گرد سے پاک تھے اور ہر شے ترتیب سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے اور میں اٹھ گیا اور پہلے صرف ورق گردانی کرتا رہا اور اس کے بعد باقاعدہ طور پر پڑھنے لگا۔

کچھ عرصے بعد پڑھنے میں مزہ آنے لگا تو میں پڑھتا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اپنی اطلاع دی میں اٹھ کر گیا تو دروازے پر میری چھوٹی بہن تھی۔

اس نے تو بھائی اس لیے آپ کو ائرپورٹ آنے کی زحمت نہیں دی کہ آپ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔" اس نے سامنے دیکھ کر کہا تھا اور میں مسکرا اٹھا تھا۔

سرپرائز صرف بہن کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے تھا اس لیے بھی تھی کہ میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے سے بال بال بچا تھا۔

"یہ سب کیا ہے بھائی؟" انجم گھر میں داخل ہوئی تو اس نے صاف ستھرے گھر کو دیکھ کر حیرت سے تقریباً چیخنے والے انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں اچھا نہیں لگ رہا تو میں پھر پہلے کی طرح کر دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

گھر کو دیکھ کر انجم نے حیرت کا اظہار تو کیا ہی تھا لیکن میری کھلی ہوئی کتابیں دیکھ کر وہ اور زیادہ خوش ہوئی تھی۔

دوپہر کا کھانا میں اس کے اصرار کے باوجود بازار سے لایا تھا اور پھر رات میں اس کے لیے اسے سودا لا کر دینے کے ساتھ ہی میں اپنی ٹیوشنز پر نکل گیا تھا۔ لیکن ایک ٹیوشن سے دوسری کی جانب جاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں انجم کو اپنی اس نئی ٹیوشن کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔ راستے کے ایک پی سی او سے میں نے فون کر کے چوہدری صاحب کو پیغام دے دیا اور کسی حد تک مطمئن بھی ہو گیا لیکن میری ایک اور پریشانی یہ بھی تھی کہ دکانیں بند ہونے کے بعد وہ علاقہ سنسان ہو جاتا تھا۔

ہر ٹیوشن میں کچھ تھوڑی تھوڑی کٹوتی کر کے میں اپنے وقت سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے گھر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر مزید اطمینان ہوا کہ چوہدری صاحب دکان کھولے بیٹھے ہیں۔

"اسد..... چترا پر کوئی مہمان آئے ہیں۔" چوہدری صاحب نے مجھے آتا دیکھ کر اطلاع دی تھی۔ ان کی اطلاع کے ساتھ ہی میرا ذہن تابندہ کی جانب گیا تھا لیکن پھر میں نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا تھا "وہ ایسا نہیں کر سکتی۔" میں نے خود کو مطمئن کیا اور فوراً ہی چوہدری صاحب نے جو فقرہ کہا اس سے یہ بات مزید کنفرم ہو گئی۔

"تین بندے ہیں اور تین عورتیں ہیں۔" چوہدری صاحب نے کہا اور میں یہ سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں۔ پھوپی کے انتقال تک پھر بھی کچھ رشتے دار ہم سے ملتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے ہمیں اپنی تقریبات تک میں بلانا چھوڑ دیا تھا۔

"کون ہو سکتے ہیں؟" کا سوال لیے میں اوپر پہنچا تو انجم کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا لیکن پھر فوراً ہی وہ کچھ نروس سی نظر آئی تھی۔

"بھائی..... وہ ظفر اور ان کے گھر والے آئے ہوئے ہیں۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"کون ظفر؟" میں نے سوال کیا اور وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"نادیہ ہاسٹل میں میری روم میٹ ہوتی تھی۔" اس نے

کچھ دیر میں خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھی۔ ظفر اسی کے بھائی ہیں۔'' اس نے کہا اور میں بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بہت کچھ نہ سمجھ سکا لیکن وہ موقع سمجھنے اور سمجھانے کا نہیں تھا۔

چوہدری صاحب کی اطلاع صحیح نکلی تھی۔ وہ واقعی چھ افراد تھے۔ ظفر اس کے والد اور بھائی کے علاوہ اس کی والدہ اور بہنیں نادیہ اور سعدیہ۔

میں نے اپنی تاخیر سے آمد پر معذرت کرنی چاہی تو انہوں نے مجھے فوراً ہی اس الزام سے بری کردیا۔

''انجم نے نادیہ کو بتایا کہ وہ صبح اپنی آمد کے بعد آپ سے ذکر کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر وہ اس کی ہمت نہ کرسکی اور اسی ایک بات نے مجھے اس بات پر مجبور کردیا کہ میں مزید انتظار کروں۔'' ظفر کے والد نے مزید بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ ادب اور وہ لحاظ جو ہمارے معاشرے کی پہچان ہوتا تھا اب آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتا جارہا ہے لیکن اب بھی اگر کہیں وہ کسی حد تک باقی ہے تو ان لوگوں سے تو ملنا چاہیے جو اسے باقی رکھے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے تعریفی انداز میں کہا تھا۔

ظفر اور اس کے گھر والے اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹا رہے لیکن اس ایک گھنٹے میں گفتگو زیادہ تر ظفر کے والد اور والدہ نے ہی کی تھی۔ انہیں جواب کی جلدی اس لیے تھی کہ ظفر ایک ماہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جارہا تھا۔ میں نے بڑی بہن اور بہنوئی کے حوالے سے کچھ مہلت مانگی اور انہوں نے ایک ہفتے بعد آنے کی بات کی۔

کھانے کے دوران انجم سے مزید تفصیل معلوم کی اور اس بات کا اندازہ لگانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کہ خود انجم کی مرضی بھی اس میں شامل ہے۔

رات زیادہ ہوگئی تھی اس لیے میں نے دبی فون کرنے کا ارادہ ملتوی کیا۔ انجم نیند کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں گئی تو میں نے بھی پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن سوچ کے دھاروں نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔

معاشی طور پر انجم کی شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ بھوپی اس کے نام پر اپنی رقم چھوڑ گئی تھیں کہ سب کچھ آرام سے ہوجاتا لیکن پریشانی کا اصل سبب ظفر کی بیرون ملک روانگی تھا۔

رات دیر سے سونے کے باوجود صبح تقریباً اسی وقت آنکھ کھل گئی تھی جب تابندہ نے دھیرے اٹھایا تھا۔ انجم اپنے وقت پر اٹھی تھی اور مجھے صبح سویرے کتابوں میں گھسا دیکھ کر اس کی خوشی کا عالم دیکھنے والا تھا۔

''اس بار تو یوں محسوس ہورہا ہے بھائی کہ آپ ٹاپ کریں گے۔'' اس نے کہا تھا اور میں مسکرا دیا تھا۔

میری چند گھنٹوں کی محنت کو وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں مستقل اسی کام میں جتا ہوا ہوں۔

''بھائی جلدی ہی کچھ کرلیں ورنہ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

''ورنہ کیا؟'' میں نے پوچھا اور وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''بھائی..... نادیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے اپنی بات کی تھی۔

''اسے فارسی میں کہتے ہیں کہ من ترا حاجی بگو ہم تورا حاجی بگو۔'' میں نے کہا اور وہ جھینپ گئی۔

''یہ بات نہیں ہے بھائی۔'' اس نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''وہ واقعی بہت اچھی ہے۔'' انجم نے کہا تھا۔

''اگر وہ واقعی بہت اچھی ہے تو تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے۔'' میں نے اس کی بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن انجم کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''اپنی زندگی کی اتنی بڑی ٹریجڈی کو اس نے اتنی خوبصورتی سے برداشت کیا ہے کہ میں حیران ہوں کہ کوئی لڑکی اتنی بہادر بھی ہوسکتی ہے۔'' اس نے کہا تھا اور میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

''ظفر کے والد کے ایک بڑے بھائی تھے جن کے انتقال کے بعد ظفر کے والد انہیں اور بھتیجے کو گھر لے آئے اور ان کے بیٹے کو انہوں نے ظفر سے زیادہ اہمیت دی پھر اس کے اصرار پر ہی اس کے امریکا روانہ ہونے سے قبل نادیہ سے اس کا نکاح کردیا لیکن ان صاحب زادے نے امریکا پہنچنے کے دو ماہ بعد طلاق نامہ بھجوا کر اپنا ہر تعلق ختم کردیا۔'' انجم کی آواز میں نادیہ کے لیے دکھ تھا۔

انجم اپنی دوست کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں اس کی اس حماقت پر افسوس کررہا تھا کہ اتنی واضح کہانی موجود ہونے کے بعد بھی وہ امریکا جانے والے ایک شخص سے شادی پر تیار ہے۔

''اس نے اپنے غم کو اپنی تصویروں کی شکل دے دی ہے۔'' انجم نے دوبارہ سے اپنی بات شروع کی تو میں نے ایک بار پھر اس کا مذاق اڑانا چاہا۔

''وہ مصورہ ہے یا ڈاکٹر؟'' میں نے سوال کیا اور اس

الیاس سیتاپوری

برصغیر کے جادو اثر تاریخی کہانیوں کے مصنف

کی تمام کہانیوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوگئے ہیں

انسانوں کی اثر انگیز کہانیوں کے مجموعے

انسان جو کبھی نہیں بدلے گا اور کبھی پرانا نہیں ہوگا، اسی طرح یہ کہانیاں بھی کبھی پرانی نہیں ہوں گی کیونکہ یہ کہانیاں انسانوں کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں وہ سب کچھ ہے جو انسان میں ہے۔

قیمت فی کتاب 40 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 23 روپے

10 کتابوں کے سیٹ کی رعایتی قیمت 350 روپے مع ڈاک خرچ ہوگی

رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں

کتابیات پبلی کیشنز

رمضان چیمبرز ظہور پلازہ سٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

Email : kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لیے C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

پوسٹ بکس 23

کراچی 74200

ہنس دی تھی۔

''وہ جتنی اچھی ڈاکٹر ہے اس سے زیادہ اچھی مصورہ ہے۔'' انجم نے جواب دیا تھا۔

وہ اپنی دوست کی تعریفوں کے پل باندھنے میں مصروف تھی کہ میں نے دبئی فون کرنے کے بہانے اس سے رخصت چاہی۔ ''تم ناشتا تیار کرو میں فون کر کے آتا ہوں۔''

''بہن اور بہنوئی کو تفصیل بتائی تو بہنوئی نے فوراً ہی بہن کو بھیجنے کی بات کر دی۔'' اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا آدھا بوجھ کم ہو گیا۔

شہزاد بھائی سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ ان کی بہن پھوپی کے ساتھ پڑھاتی تھیں لیکن جب سے وہ ہمارے خاندان میں شامل ہوئے تھے انہوں نے میرے ساتھ ایک بڑے بھائی کا کردار نبھایا تھا۔

گھر واپس آ کر میں نے انجم کو یہ خبر سنائی تو اس کی حالت بھی دیکھنے والی تھی۔ ہم دونوں ناشتا کرنے بیٹھے ہی تھے کہ نادیہ پہنچ گئی۔ انجم نے اسے ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دی تو وہ بغیر تکلف کے شریک ہو گئی۔

''معاف کیجئے گا اسد صاحب۔'' اس نے ناشتے کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''چار برس تک ایک ساتھ ایک کمرے میں گزارہ کرنے کے بعد میں انجم سے تکلف نہیں کر سکتی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ویسے میں اس وقت ملنے آپ سے آئی تھی لیکن ناشتا سامنے دیکھ کر مجھے وہ ضروری بات بھی پس پشت ڈالنی پڑی جس کے لیے یہاں تک آئی تھی۔'' اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھ سے ملنے.....؟'' میں نے حیرت سے کہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

''کیوں آپ سے ملنے کوئی لڑکی نہیں آ سکتی؟'' اس نے میری حیرت کا لطف اٹھانے والے انداز میں کہا تھا۔

''آج تک ایسا اتفاق ہوا تو نہیں ہے۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

''یوں سمجھ لیجئے کہ آج سے اس کی ابتدا ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا اور ہم تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

انجم نے برتن سمیٹنے شروع کیے تو نادیہ نے اس سے کچھ دیر تنہائی میں بات کرنے کی اجازت مانگی اور میں یہ سوچتا رہا کہ گھٹتی ہوئی رنگت والی نادیہ جو بھائی اور والدین کی موجودگی میں خاموش رہی تھی کیا بات کرنے آئی ہے۔

''آپ کی کل کی گفتگو میں غور سے سنتی رہی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ آپ کو ظفر بھائی کے امریکا جانے والی بات پر کوئی اعتراض ہے۔'' اس نے انجم کے جاتے ہی براہِ راست بات شروع کی تھی۔

''جو اعتراض ہے وہ مجھ سے بہتر آپ سمجھ سکتی ہیں۔'' میں نے کہا اور اس نے یوں سر ہلایا جیسے میری بات سمجھ گئی ہو۔

''میں یہی کہنے آئی تھی کہ کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ خاندان اپنی بیٹی کا دکھ اٹھا رہا ہو وہ کسی اور کی بیٹی کو وہی دکھ پہنچائے گا؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات میں وزن ہے۔

''یہ پیغام آپ کو دے کر ظفر نے بھیجا ہے؟'' میں نے کہا اور اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''ہم دونوں رات گئے تک اس پر بات کرتے رہے تھے اور وہ مجھے یہاں ڈراپ کر کے گئے ہیں۔'' اس نے کوئی بات بھی چھپانی ضروری نہیں سمجھی تھی۔

میں نے اسے بہن اور بہنوئی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا پھر جیسے ہی میری گفتگو ختم ہوئی اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

''آ جاؤ۔'' اس نے انجم کی جانب سے جواب کی بلند آواز میں کہا تھا۔

''تمہارے برعکس تمہارے بھائی تو بہت معقول شخص ثابت ہوئے ہیں۔'' انجم دروازے پر نمودار ہوئی تو اس نے کہا تھا۔

آپا چار دن بعد پہنچی تھیں اور اس دوران آئی تھیں اسی روز ظفر کے گھر والوں سے بھی ملی تھیں۔ ان کی دونوں میں ظفر اور اس کے خاندان کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آپا نے ان سے وہ تمام باتیں کی تھیں انہوں نے ضروری سمجھی تھیں۔

ظفر کا خاندان ظفر کے امریکا روانگی سے پہلے نکاح کا خواہشمند تھا لیکن آپا منگنی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھیں اور بالآخر ظفر کے خاندان نے ان کی بات مان لی۔

آپا ایک ہفتے کے لیے آئی تھیں اور ان کے آنے تک میرا کام اتنی تیزی سے ہوا کہ ایک ہفتہ بھی بہت دکھائی دیتا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ہی انہوں نے مجھے یہ خبر بھی دی کہ انجم کی تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ مجھے اور انجم کو بھی دبئی بلوا لیں گی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کافی لوگوں سے بات کر رکھی ہے کہیں انتظام نہ ہوا تو شہزاد بھائی مجھے اپنی کمپنی میں ہی لگوا لیں

گے کیونکہ اب ان کی ترقی ہو گئی ہے اور افراد کی تقرری اب ان کے ہاتھ میں ہے۔

دونوں بہنوں میں آپس میں کچھ گفتگو ہوئی جس کے بعد آپا نے مجھ سے نادیہ کے سلسلے میں بات کی جسے میں نے ٹال دیا۔ لیکن آپا نے کچھ اس طرح کی بات وہاں بھی کی جس کے بعد انجم کی منگنی والے دن نادیہ نے مجھ سے کہا کہ ''میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے اس کی اس خواہش کو سرسری انداز میں لیا تھا لیکن انجم کے جانے کے اگلے روز جب نادیہ سویرے سویرے گھر پہنچی تو میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

وہ دن کی روشنی میں آئی تھی اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے اس کے اور اپنے لیے چائے بنائی اور اس کے تکلف آمیز تفکر کو جب میں نے ''یہ تو میری بیٹی ہے'' کہہ کر ہوا میں اڑانا چاہا تو وہ اور سنجیدہ ہو گئی۔

''انجم بتا رہی تھی کہ آپ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں، اور اسے یقین بھی تھا کہ آپ یہ امتحان پاس بھی کر لیں گے۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا تھا۔

''بہنیں بھائیوں کے معاملے میں ہمیشہ خوش فہمی کا شکار رہتی ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ اسی طرح سنجیدہ رہی تھی۔

''آپ کی آپا نے آپ کے اور میرے رشتے کے سلسلے میں سرسری انداز میں سہی لیکن بات کی ہے اور میرے گھر والے اس پر ابھی سے تیار بھی ہیں۔ لیکن میں آپ کے علم میں چند حقائق لانا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے سنجیدہ انداز کو برقرار رکھا تھا۔

''انجم مجھے بہت کچھ بتا چکی ہے۔'' میں نے اس کے آگے بڑھنے سے پہلے کہا تھا۔

''انجم یہ بات نہیں جانتی ہے کہ..... ہمارے نکاح کو بائیس روز ہو گئے تھے اور نکاح کے اگلے ہی روز ہمارے درمیان میاں اور بیوی کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔'' نادیہ نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا تھا۔

''شاید مجھے اس کے ساتھ نکاح کے اگلے ہی روز چھپ کر اس کے دوست کے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔'' اس نے کہا اور اس کے کچھ نہ کہنے کے باوجود سمجھ گیا کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ پہلے دن سے کچھ اور منصوبہ بندی کیے ہوئے تھا۔'' میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روکنے کی غرض سے کہا تھا۔

''ان بائیس دنوں میں سے تیرہ دن ایسے گزرے ہیں جب میں اس کی منکوحہ تھی تو اپنے فرائض انجام دیتی رہی تھی کبھی کالج کے بعد ایک دو گھنٹوں کے لیے اور کبھی کالج کا ناغہ کر کے صبح سے شام تک۔'' میری کوشش کو اس نے ناکام بنا دیا تھا اور وہ بات کہہ دی جو کہنے وہ یہاں تک آئی تھی۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے یہ بات کر دی لیکن.....'' میں نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''میرے ساتھ تو ضرور دھوکا ہوا ہے لیکن میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی اٹھ گیا تھا۔

''آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہو گا لیکن اس درخواست کے ساتھ کہ یہ ''گڈ وائچ'' آپ خود تک محفوظ رکھیں گے۔'' اس نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

میں اسے رخصت کرنے آگے بڑھا تو اس نے مجھے روک دیا اور پھر تیزی سے نکلتی چلی گئی تھی لیکن جاتے ہوئے وہ میری نیند بھی ساتھ لے گئی تھی۔

آپا اور انجم کی آمد اور منگنی کے ہنگاموں کے باوجود میری تیاریاں عروج پر تھیں۔ امتحان کا فارم میں بھر چکا تھا لیکن وہ غائب تھی جس کی وجہ سے یہ سب شروع ہوا تھا۔

میں نادیہ کی ٹریجڈی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کیسے میرا ذہن تابندہ کی طرف چلا گیا تھا۔

''اگر اس نے رابطہ کیا ہوتا تو چوہدری صاحب ضرور بتا دیتے اور انہوں نے نہیں بتایا تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔''

تابندہ کے رابطہ نہ کرنے کا افسوس ہونے کے ساتھ مجھے اپنی محنت بھی اکارت ہوتی دکھائی دے رہی تھی کیونکہ انٹرویو کی ذمے داری اسی نے لی تھی لیکن پھر میں نے یہ کہہ کر اس سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا کہ ''ایک ''کال گرل'' کا کیا اعتبار۔''

میں نے کتاب کھولی لیکن نادیہ کا چہرہ سامنے آ گیا اور میں کچھ دیر اس میں کھو گیا لیکن پھر یہ سوچ کر کتابوں میں خود کو الجھا لیا کہ نادیہ تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔

میں کتابوں میں اس حد تک الجھ گیا تھا کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب چوہدری کے ملازم نے گھنٹی بجائی۔

''چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس نے میرے دروازہ کھولتے ہی کہا تھا۔

اس وقت جب میں چوہدری صاحب کے پاس جا رہا تھا میرا خیال تھا کہ یا تو آپا کا فون آیا ہوگا یا پھر چوہدری صاحب نے یہ معلوم کرنے بلایا ہوگا کہ یہ آنے والی لڑکی کون تھی؟

''پتر اس بچے کی ماں کا فون تھا جو چار پانچ دن سے چھٹی پر تھا۔'' چوہدری صاحب نے کہا اور میں حیرت زدہ سا ان کی صورت دیکھتا رہا کیونکہ ان دنوں ایسا کوئی بھی طالب علم نہیں تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں نے کچھ کہا نہیں۔

''پانچ دن پہلے بھی اس کا فون آیا تھا کہ اسد صاحب کو بتا دیجئے گا کہ وہ نہ آئیں کیونکہ وہ لوگ گھر پر نہیں ہوں گے۔'' چوہدری صاحب نے کہا اور میرا ذہن تابندہ کی جانب چلا گیا تھا۔

''اس نے کہا تھا کہ ابھی پانچ منٹ میں دوبارہ فون کرے گی۔'' چوہدری صاحب نے کہا اور میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے کوئی احمقانہ سوال نہیں کیا تھا۔

''یہ ابھی جو لڑکی آئی تھی؟'' چوہدری صاحب کا مروڑ آخر کار ان کی زبان پر آ گیا تھا۔

''ظفر کی بہن ہے یعنی انجم کی نند۔'' میں نے انہیں نرم لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اپنی سسرال کے ایک بچے کی ٹیوشن کے لیے بات کرنے آئی تھی۔'' چوہدری صاحب کے چہرے پر چھانے والی تشویش کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا تھا اور چوہدری صاحب فیض کا مصرعہ بن گئے کہ جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔ ''چائے منگواؤں'' چوہدری صاحب نے ہمیشہ پوچھے جانے والا سوال کیا۔ لیکن اس بار میں نے وہ جواب نہیں دیا جو ہمیشہ دیتا تھا اور چوہدری صاحب کو مجبوراً ملازم لڑکے کو چائے کے لیے بھجوانا پڑا تھا۔

تابندہ کا فون اس وقت آیا جب میں چائے پی رہا تھا۔ فون چوہدری صاحب نے اٹینڈ کیا اور پھر ریسیور میری جانب بڑھا دیا لیکن خود بھی وہیں پاس موجود رہے۔

''تابندہ بول رہی ہوں۔'' اس نے میرے ہیلو کے ساتھ ہی کہا تھا۔

''جی تابندہ صاحبہ کیسی ہیں آپ؟'' میں نے چوہدری صاحب کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''گھوسٹ آس پاس موجود ہے کیا؟'' اس نے معاملے کی تہ تک پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔

''جی..... بہتر ہوں آپ بتائیں کب پہنچے آپ لوگ؟'' میں نے کہا اور چوہدری صاحب کچھ مطمئن سے دکھائی دیئے۔

''رات پہنچ رہی ہوں ہو سکے تو کچھ جلدی آ جانا۔'' اس نے کہا اور میں نے ایک بار پھر ''جی..... بہتر'' کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

تابندہ کا فون آنے کے بعد میرا جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ٹیوشنز پر جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگلے دن بھی چھٹی ہے۔ میں پڑھانے چلا گیا لیکن پھر وعدے کے مطابق اپنے وقت سے پہلے آ بھی گیا۔

مجھے آئے ہوئے ابھی دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس طرح سے پہنچی کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھیلیاں تھیں جنہیں آتے ہی اس نے صوفے پر پریوں پھینکا تھا جیسے وہ سب چیزیں لوٹ کر لا رہی ہو۔

''کیا کوئی موٹا مرغا مل گیا تھا جس نے اتنی شاپنگ کروا ڈالی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ شاپنگ آپ کے لیے کی گئی ہے۔'' اس نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے چند چیزیں دیکھنے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

''ایک ناچیز کے لیے کچھ چیزیں ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

''لیکن کیوں ہیں۔'' میں نے سوال کیا اور وہ اس انداز میں سر ہلانے لگی جیسے اسے سوال پسند آیا ہو۔

''سوال اچھا ہے لیکن اس کا جواب میں کھانے کے بعد دوں گی۔'' اس نے ایک تھیلی اٹھانے کے بعد کہا تھا۔

اس نے یہ کہا اور کچن کی جانب چل دی اور میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ آپا اور انجم اگلے پندرہ دن کا کھانا پکا کر گئی ہیں۔

اپنا لایا ہوا کھانا وہ ٹرے میں سجا کر لائی اور ٹرے رکھتے ..... ہی شروع ہو گئی ''میرا اندازہ صحیح تھا کہ فریج خالی کر گئی ہوں گی۔''

''تمہیں چوہدری صاحب نے بتایا ہوگا؟'' میں نے پوچھا اور وہ ہنس دی تھی۔

''بڑے میاں کو نہ جانے کیا تشویش تھی کہ انہوں نے میرا انٹرویو لے ڈالا اور آپ کے بارے میں تفصیلات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیں۔'' اس نے کہا اور میں نے اس کے جواب میں ہنستے ہوئے سب بتا دیا۔

میں ہنستے ہوئے اسے چوہدری صاحب کے بارے میں تفصیل بتا رہا تھا لیکن وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی پھر جیسے ہی میری بات مکمل ہوئی اس نے کہا۔ ''یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا مقام ہے۔''

اس کا یہ موڈ چائے کے آنے تک رہا لیکن بیڈ روم میں آتے ہی وہ پھر سے اسی موڈ میں آ گئی تھی جس میں وہ آئی تھی۔ میز پر موجود کتابوں کو وہ دیر تک الٹتی پلٹتی رہی اور شوخ تبصرے کرتی رہی۔

''تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''میں تابندہ ہوں۔'' اس نے ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''ہمیشہ چمکتی رہنے والی شے جو کبھی۔ اس بیڈ روم میں چمکتی ہے کبھی اس بیڈ روم میں چمکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ نہیں بتاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی۔'' اس نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے انگڑائی لی

''اور وہ وقت کب آئے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''جب میں پاگل ہو جاؤں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میرے چہرے پر بکھرتی ہوئی حیرت کو دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

''تمہارا پاس ہونا بھی تو میرا پاس ہونا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اتنی دور ہو گی تو میں امتحان پاس کیسے کر سکوں گا۔'' میں نے لفظوں سے کھیل کی ابتدا کی اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔

پہلا پانچ ختم ہوا ہی تھا کہ اس نے ایک ایسا سوال کیا جس کی توقع میں اس سے بالکل بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے میری جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا ''انجم کی سسرال میں کتنے لوگ ہیں؟''

میں نے مختصر سے تعارف کے بعد اسے نادیہ کے بارے میں بتانا شروع کیا جسے اس نے پوری سنجیدگی سے سنا تھا۔

''اس لڑکی کو اگر تم نے کھویا تو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔'' مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''اور تمہارا کیا ہوگا؟'' میں نے اس کی سنجیدگی کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا اور وہ ہنس دی۔

''ہم پہلی بار بے وقوف بن کر لٹنے تھے اب صدیوں تک لٹتے رہیں گے۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس موضوع سے بچنے کے لیے کوئی اور بات کرنی چاہی لیکن وہ اس بات پر جمی رہی کہ مجھے مزید انتظار کیے بغیر نادیہ کو یقین دلانا چاہیے کہ اس بار اس کے خواب نہیں بکھریں گے۔

''اب رات کے اس پہر تو میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے تنگ آ کر کہا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔

''اس وقت نہ سہی صبح تو کہہ سکتے ہو۔'' اس نے کہا اور میں ہنس دیا۔

''صبح تو تم جا چکی ہو گی۔'' میں نے کہا لیکن اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''میں چھٹی کا..... دن تمہارے ساتھ گزارنے آئی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے خوشی میں جھوم کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

صبح جب اس نے مجھے بیدار کیا تو سورج کی کرنیں اندھیرے کو پوری شکست دینے کے بعد اپنی فتح کا جشن منانے میں مصروف تھیں جبکہ اندھیرا کونے کھدروں میں منہ چھپائے پتا پھر رہا تھا۔

''چائے پیو، کپڑے پہنو اور جا کر اپنے موبائل میں لائن ڈلواؤ اور پھر اس موبائل سے پہلی کال اپنی شریکِ حیات کو کرو۔'' اس نے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''کس کا موبائل.....؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا موبائل اور کس کا موبائل!'' اس نے اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک موبائل خریدا تھا تاکہ آئندہ مجھے یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے جو اس بار اٹھائی تھی۔'' اس نے کہا۔

میں نے انکار کرنا چاہا لیکن پھر اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن پھر میں نے ایک اور بہانہ سوچا ''وہ میری بہن کی سسرال ہے میں وہاں فون.....''

''وہ ڈاکٹر ہے اور تم کہہ سکتے ہو کہ اس کے اسپتال میں تمہارا کوئی دوست داخل ہے۔'' اس نے میرا بہانہ بھی پورا نہیں ہونے دیا اور مجھے جواز فراہم کر دیا۔

چائے پینے کے بعد میں نے وہی کیا جو اس نے چاہا پھر دو گھنٹے بعد جب نادیہ کے یہاں رنگ کیا تو فون اسی نے اٹھایا۔

''جی..... اسد صاحب فرمایئے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اس کی یہ حالت شاید اس لیے ہوئی تھی کہ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھ سکے۔

''کیا ہم مل سکتے ہیں؟'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اس وقت تو میں اسپتال جارہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اسپتال آجاؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسپتال میں صرف مریض آتے ہیں یا ڈاکٹر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر کوئی نہ مریض ہو نہ ڈاکٹر بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہو کہ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں تو کیا اسے آنے کی اجازت ہے؟'' میں نے سوال کیا اور نادیہ کی جانب سے صرف خاموشی رہی۔

''تم سن رہی ہو نا؟'' اس کی خاموشی جب طویل ہونے لگی تو میں نے سوال کیا۔

''آپ سے میں نے.....'' وہ ایک بار پھر اسی موضوع پر آرہی تھی جو میں نہیں چاہتا تھا۔

''میں فیصلہ کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اب جو فیصلہ کرنا ہے وہ تمہیں کرنا ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی جانب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''کل میرا آف ہے۔'' اس بار اس کی خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔

''آپ کو بھی چوبیس گھنٹے نظر ثانی کے لیے مل جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ پھر بھی یہی ہو تو آپ اسی وقت فون کر لیجئے گا۔ ہم مل لیں گے۔'' گفتگو کے اختتام تک وہ خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

''اب کل آپ اسے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلائیں گے اور ساتھ ہی کوئی اچھا سا تحفہ دیں گے۔'' تابندہ نے رابطہ ختم ہوتے ہی کہا تھا اور میں ہنس دیا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد اس نے مجھے کتابوں کی جانب دھکیل دیا اور خود گھر کے کاموں میں جت گئی۔ دیر سے ناشتا کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا بھی دیر سے کھایا گیا اور پھر یہی سلسلہ رات کے کھانے کے ساتھ بھی ہوا لیکن صبح اس نے مجھے اسی وقت اٹھا دیا جب پہلے دن اٹھایا تھا۔

''دروازہ بند کرلو۔ میں جارہی ہوں۔'' اس نے میری جانب چائے بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم وعدہ خلافی کرو اور گلیوں میں مجھے تلاش کرو۔'' اس نے کہا اور میں شرمندہ ہو گیا۔

وہ چلی گئی لیکن اس کے جانے کے پندرہ منٹ بعد الارم بجا۔ میں الارم بند کرنے گیا تو وہاں ایک پرچا اور پانچ ہزار روپے رکھے تھے۔

''ایک انگوٹھی اور دو افراد کے کھانے کے لیے یہ رقم کافی ہونی چاہیے۔'' اس نے پرچے پر لکھا تھا۔

نادیہ سے طے شدہ وقت کے مطابق میں نے فون کیا تو اسے اپنا منتظر پایا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے وہیں پہنچنے کا وعدہ کر لیا جہاں میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔

وہ آئی تو گھبرائی گھبرائی سی تھی لیکن واپس ہوئی تو اپنے ساتھ اپنا کھویا ہوا اعتماد بھی لے گئی تھی اور پھر اسی رات تابندہ کا فون آیا تو اس نے پوری روداد دن کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

میں نے اس سے ان تمام چیزوں کی بارے میں شکایت کی جو وہ میرے لیے لائی تھی لیکن جنہیں میں نے اس کے جانے کے بعد تفصیل سے دیکھا تھا۔

''جو ہو گیا اسے بھول جا، جو ہونے والا ہے اس کے بارے میں سوچ.....!'' اس نے قلندرانہ انداز میں ایک قہقہے کے ساتھ کہا اور پھر لائن کاٹ دی۔

ہتھانوں تک یہی ہوتا رہا۔ وہ چھٹی والی رات آجاتی اور پھر چھٹی کے اگلے روز سویرے چلی جاتی۔ امتحانوں سے کچھ عرصے پہلے اس نے مجھے ''یہ میں ایک ماہر سے اہم سوالات لائی ہوں'' کہہ کر کچھ ممکنہ سوالات دیئے تھے اور میں نے اپنی تیاریوں میں انہیں بھی شامل کر لیا تھا، اور پھر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پہلا پرچا بالکل وہی تھا جو تابندہ نے مجھے دیا تھا۔

دوسرے پرچے سے میں اس کے پرچوں کی بطور خاص تیاری کرتا تھا اور ہر بار اسی کا پرچا موجود ہوتا تھا۔ شان دار پرچے ختم ہوئے تو نتیجے کا انتظار شروع ہوا اور نتیجہ یہ رہا کہ میری پورے ملک میں دوسری پوزیشن تھی۔ اس کے بعد تو سارے مسائل جیسے ختم ہو گئے۔

تابندہ اس رات آئی تھی جس صبح میرا انٹرویو تھا اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ میرا انٹرویو بھی پرچوں کی طرح اچھا ہو گا اور یہ کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس رات تابندہ مجھے کچھ بجھی بجھی سی محسوس ہوئی تھی۔ حالانکہ اس رات میں نے اس سے بہت واضح طور پر کہہ دیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے میں اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں۔

''یوں کر لیتے ہیں کہ تم اس سے دوسری شادی کر لینا۔'' اس نے مسئلے کا حل بتایا۔

''نادیہ بھی تو دوسری بیوی بن سکتی ہے۔'' میں نے کہا تھا۔

''اس کے ساتھ دوسری بار دھوکا ہو یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

اس صبح جو وہ گئی ہے تو یوں غائب ہوئی جیسے کبھی ملی ہی نہ تھی۔ میں نے اس کا انتظار کیا لیکن وہ نتیجہ آنے کے بعد آئی نہ ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد اس نے رابطہ کیا۔

نادیہ سے شادی بھی میں نے اس امید پر کر لی کہ شاید اس کے بعد ہی وہ رابطہ کرلے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کس طرح رابطہ کروں کہ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ پہلی بار جب اس نے مجھے کال کیا تھا تو میں نے اس کا نمبر محفوظ کر لیا تھا۔

میں نے فون کرنے کے بجائے اس نمبر کا ایڈریس معلوم کیا اور اس گھر پر پہنچ گیا۔ یہ وہی گلی تھی جس میں جا کر وہ غائب ہوئی تھی۔

میں نے گھنٹی بجائی تو ایک بوڑھا سا شخص گیٹ پر آیا۔ میں نے اس سے تابندہ سے ملنے کی بات کی تو وہ مجھے اندر لے گیا لیکن اس کا انداز کچھ غیر حقیقی سا تھا۔ لیکن میں نے اسے اس کے لہجے سے مسلک کر دیا جو اس کے پیر میں تھا۔

''کب ملے تھے تم اس سے؟'' بڑے میاں نے سوال کیا۔ ''غالباً نئے سال کی آمد والی رات کو سڑک پر۔'' بڑے میاں نے کہا اور میں نے یہ سمجھ کر گردن ہلا دی کہ تابندہ نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو گا۔

''تم نے یقیناً اسے ناراض نہیں کیا ہو گا جو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی زندہ ہو ورنہ اس کے ساتھ غلط رویہ اپنانے والے تو اگلے دن ہی ختم ہو جاتے ہیں۔'' بڑے میاں نے کہا اور میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تابندہ کو خودکشی کیے آج چالیس سال ہو گئے ہیں۔'' بڑے میاں نے کہا اور میں کانپ اٹھا۔

''میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی تھی۔'' بڑے میاں بولتے چلے جارہے تھے۔

''وہ میرے چچا کی بیٹی تھی۔'' بڑے میاں نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

''چچا اور چچی ایک حادثے میں مارے گئے تو والد صاحب اسے اپنے گھر لے آئے پھر جب وہ انٹر میں تھی تو میں نے امریکا جانے کی ضد کی جس کی اجازت والد صاحب نے اس طرح دی کہ مجھے تابندہ سے شادی کرنی ہو گی۔'' بڑے میاں یہ کہہ کر رکے تھے۔

''میں نے ان کی شرط مان کر تابندہ سے نکاح تو کر لیا لیکن پھر اگلے ہی روز اسے کالج سے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا اور اسے بہلا پھسلا کر اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا اور پھر یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میری امریکا روانگی کا دن نہیں آ گیا۔'' بڑے میاں نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل رہی ہو۔

''وہ ائرپورٹ مجھے چھوڑنے گئی تھی اور وہیں میں نے طلاق کا لفافہ اس تاکید کے ساتھ اسے دیا کہ وہ گھر جا کر اسے کھولے لیکن اس نے شاید لفافہ واپسی کے سفر میں ہی کھول لیا تھا اور گھر آنے کے بجائے اس نے وہیں سڑک پر ایک بس کے نیچے آ کر اپنی جان دے دی۔'' بڑے میاں نے کہا اور خاموش ہو گئے۔

''آپ امریکا سے کب واپس آئے؟'' ان کی خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا چلا گیا تو میں نے سوال کیا۔

''میں کبھی امریکا پہنچا ہی نہیں۔'' انہوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''لندن ائرپورٹ پر میرا پیر اس طرح پھسلا کہ مجھے لندن سے ہی واپس آنا پڑا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''چھ ماہ بستر پر رہنے کے بعد بھی میری ٹانگ پوری طرح صحیح نہیں ہو سکی لیکن جانتے ہو کہ اس کے بعد سے آج تک میں کسی عورت کے قریب بھی نہیں جا سکا ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔

''جہاں میری شادی کی بات کی جاتی وہ لڑکی کسی حادثے کا شکار ہو جاتی یہاں تک کہ جب میں کسی بازاری عورت کے قریب بھی جاتا ہوں تو وہ چیخنے لگتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میری شکل اچانک ڈراؤنی ہو جاتی ہے۔'' بڑے میاں نے کہا اور پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھنے لگے۔

میں وہاں سے تابندہ کی قبر کا پتا لے کر چلا تھا اور سیدھا اس کی قبر پر گیا تھا۔ جو کچھ میرے دل میں تھا وہ میں نے اس کی قبر پر کہہ دیا لیکن نادیہ سے آج تک اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ ہاں اب ہر برس یکم جنوری کو ہمارے گھر میں تابندہ کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی ضرور ہوتی ہے۔

نادیہ نے اس بارے میں معلوم کیا بھی تو میں نے کہہ دیا کہ ''یہ میری بہت اچھی دوست تھی جو ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔''

ایک بات ضرور ہے..... ہر سال کی آخری رات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر اس جگہ ضرور جاؤں جہاں وہ مجھے ملی تھی لیکن پھر اس کی تاکید اور اپنا وعدہ یاد آجاتا ہے اور میں سورۂ فاتحہ کا ورد کرنے لگتا ہوں..... آپ بھی میری محسن..... میری دوست یا پھر صرف ایک کال گرل کی مغفرت کی دعا کرنے کی زحمت کریں گے.....؟

*

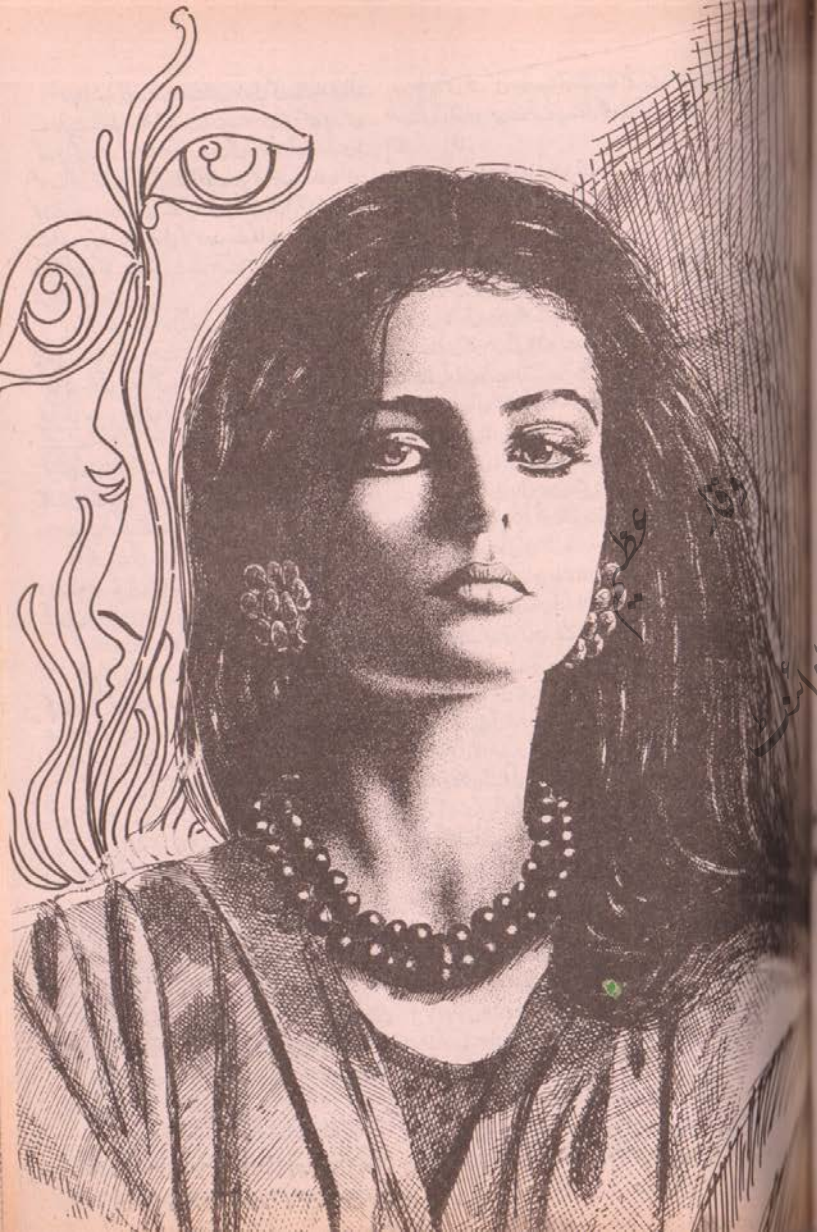

مقدر

محی الدین نواب

نواب صاحب کے نام سے کون واقف نہیں، ان کا شمار ملک کے صف اوّل کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ انسانی معاشرت کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں پر نواب کی گہری نظر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انسانی نفسیات کی بوالعجبی سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔ لہٰذا جب اپنے فطری جرأت اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی کہانی بنتے ہیں تو پڑھنے والوں کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ چہروں سے نقابیں اتر جاتی ہیں۔ ہماری معاشرتی منافقتوں کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ اپنی انہی تحریری صفات کے سبب وہ "معاشرے کے جراح" کے طور پر مشہور ہوئے۔

سرگزشت کے لیے نواب صاحب نے معاشرے کی زہریلی کہانیوں کو بیان کرنے کے لیے ایک نیا اسلوب، نیا ڈھنگ اپنایا ہے کہ یہ کہانیاں کسی انسان کی زبانی بیان نہ کی جائیں بلکہ ان کا راوی اس بازی گر کو بنایا جائے جسے مقدر کہا جاتا ہے جو انسان کی توقع کے خلاف، اس کی سوچ کے برعکس بازی پلٹنے کا ماہر ہے۔ زیر نظر کہانی کے کردار بہ ظاہر افسانوی ہیں لیکن درحقیقت ان کا تعلق ہمارے اسی معاشرے سے ہے اور یہ اسی معاشرے کی کہانی ہے۔

انسان کے روز و شب پر مقدر کی آہنی گرفت کا دلچسپ تماشا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دردانہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ شہباز درانی کے سامنے کیسٹ ریکارڈر کو آن کر کے موسیقی کی دھن پر رقص کر رہی تھی۔ اور جھوم جھوم کر کہہ رہی تھی: "شہباز تمہارے جیسا محبوب کوئی نہیں ہوگا۔ تم نے تو مجھے دنیا کی سب سے طاقتور عورت بنا دیا ہے۔ میں نے تمہاری آغوش میں آ کر انڈر ورلڈ کے ایک ستون داؤد بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں بڑے بڑے شہ زوروں کو ٹھوکروں میں اڑا سکتی ہوں۔"

وہ مستی میں رقص کرتی ہوئی آ کر اس پر گری تھی۔ اسے چومتی تھی۔ پھر ایک ادائے نازک سے الگ ہو کر رقص کرنے لگتی تھی۔ خوشی سے چہکتی جاتی تھی "تمہارا یہ اسد عزیزی کمال کا آدمی ہے۔ دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیسے کیسے خطرناک منصوبے بناتا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس حسین لڑکی کے بدن پر زہریلا لوشن لگائے گا۔ اس کے پاس موت کا کوئی ہتھیار دکھائی نہیں دے گا لیکن وہ موت بن کر جائے گی۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اور کہنے لگی: "یہ مرد بھی عورت کے کیسے دیوانے ہوتے ہیں کہ اسے کھانے کی ڈش سمجھ کر منہ مارنے لگتے ہیں۔ وہ لڑکی اس کی زندگی کی آخری ڈش بن کر گئی تھی۔"

شہباز درانی اسے خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے کہا "تم نے اس سے بھی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے پاشا کو بیٹا بنا کر اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ جو سوتیلی بیٹی تمہارے قابو میں نہیں آ رہی تھی، اب پاشا کی خاطر تمہارے پیچھے پیچھے آئے گی۔"

وہ بولی "اس کی بھی عروج میرے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ میں اس سے بھی نمٹ لوں گی۔ وہ بھی پاشا کی دیوانی ہے میں اس کی ساری دیوانگی نکال دوں گی۔ پاشا کے ہاتھوں اسے بازاری لڑکی بنا دوں گی۔ میں حکم دوں گی تو وہ ان دونوں سے محبت کرے گا میں حکم دوں گی تو وہ ان دونوں کو خاک میں ملا دے گا۔"

"میری جان! کب تک جھوٹی ناچتی رہو گی؟ تھک جاؤ گی۔ میرے پاس آ جاؤ۔"

وہ اس کی آغوش میں آ کر گر پڑی۔ اتنی قربت کے باوجود دوری تھی۔ مقتول بیٹے کا سوگ منانا بھی ضروری تھا اس لیے وہ چالیس دنوں کے بعد اپنے بدن کی جاگیر اس کے نام کرنے والی تھی۔

وہ بھی عجیب دیوانہ تھا۔ اس کی خاطر اس نے آج تک شادی نہیں کی تھی۔ اور اب اس کی عمر کا حساب نہیں کر رہا تھا۔ وہ سچا عاشق تھا۔ کسی حساب کتاب کے بغیر اپنے مطلوب کو طلب کر رہا تھا اور اس کے قریب رہ کر بھی بڑے صبر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ دردانہ نے فون اٹھا کر اس کی اسکرین پر نمبر پڑھا پھر مسکرا کر کہا: "مقدر حیات کال کر رہا ہے۔"

شہباز نے کہا "میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ یہ بھی تمہارا ایک زبردست مہرہ بنے گا۔ تمہارے بہت کام آئے گا تم بات کرو میں خاموش رہوں گا۔"

وہ فون آن کر کے کان سے لگا کر بولی: "ہیلو بیٹے مقدر حیات! یہ تم بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "یس ممی! میں ہی بول رہا ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں ناں؟"

"بیٹے! میں بالکل خریت سے ہوں۔ تمہاری سلامتی کے لیے خدا سے دعا کرتی رہتی ہوں، میں نے ایک آدھ بار تم سے رابطہ کرنا چاہا لیکن تمہارا فون بند رہتا ہے یا شاید تمہارے فون میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی؟"

"جب ملک سے باہر جاتا ہوں تو میں یہ فون بند کر کے یہیں چھوڑ جاتا ہوں۔ واپس آ کر استعمال کرتا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ دو ہفتے کے اندر یہاں آؤ گے، تم کب آ رہے ہو؟"

"میں نے یہی بتانے کے لیے ابھی فون کیا ہے۔ میں کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچ رہا ہوں۔"

وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی "سچ.....؟ اب تو مجھے رات کو نیند نہیں آئے گی، میں صبح کا انتظار کرتی رہوں گی۔"

"رات کو جاگنا نہیں چاہیے۔ آپ وعدہ کریں سو جائیں گی اور صبح فریش ہو کر مجھے لینے ایئر پورٹ آئیں گی۔"

"وہاں تو عینی اور اس کا پورا خاندان ہوگا، مجھے برداشت نہیں کریں گے۔"

"میں اپنے آنے کی اطلاع کسی کو نہیں دے رہا ہوں۔ ایئر پورٹ پر کوئی نہیں آئے گا۔ صرف ہم ماں اور بیٹے ہی ہوں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولی: "بیٹے! اب تم تمام رشتے داروں کو نظر انداز کر کے صرف مجھے اہمیت دے رہے ہو۔ تم ایسا کر کے مجھے ہمیشہ کے لیے خرید رہے ہو۔"

میں ہنس کر بولا "میں بارہ سال کی عمر سے ڈیڈی کے ساتھ کاروباری معاملات میں شریک رہا ہوں۔ مجھے خرید و فروخت میں مہارت حاصل ہے آپ کو تو ایسا خریدوں گا کہ

آپ پھر کہیں بکنے کے قابل نہیں رہیں گی۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ الجھ کر بولی "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں کوئی بکنے والی چیز ہوں؟"

"جی ہاں..... ایسی بکنے والی ہیں کہ صرف محبت سے خریدی جا سکتی ہیں اور آپ کو محبت کی کیسی کرنسی سے خریدنا چاہیے یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی "تم بہت الجھی ہوئی باتیں کرتے ہو۔ مگر تمہاری باتیں محبت سے لبریز ہوتی ہیں۔ میں ابھی ملازموں سے کہہ کر تمہارے لیے ایک کمرا ٹھیک کرواتی ہوں۔"

"اوہ نو ممی! میں آپ کے ساتھ نہیں ٹھہروں گا آپ میری مصلحت اندیشی کو سمجھیں۔ مجھے عینی کے گھر جا کر رہنا چاہیے۔ میں ان رشتے داروں کے ساتھ رہوں گا لیکن آپ سے ملتا رہوں گا۔"

"وہ رشتے دار ہم ماں بیٹے کا پیار برداشت نہیں کریں گے۔"

"جو برداشت نہیں کرے گا وہ اپنے گھر میں خوش رہے گا۔ میں کسی کے دباؤ میں آنے والا نہیں ہوں۔ آپ ہی بتائیں کیا میں کسی کا محتاج ہوں؟"

"ہرگز نہیں..... خدا نہ کرے تم کسی کے محتاج رہو۔ ایک بات پوچھوں؟"

"آپ ہزار باتیں پوچھیں میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"تم نے اپنے ڈیڈی کا تمام کاروبار سنبھالا ہوا ہے یہ بتاؤ کہ اس میں عینی کا کتنا حصہ ہے؟"

"وہ چالیس فیصد کی حصہ دار ہے۔ پہلے وکیل اخلاق احمد اس کے سیٹرز کا حساب کتاب رکھتے تھے بعد میں اتنا بھروسا ہو گیا ہے کہ اب وہ کوئی حساب نہیں کرتے۔ میں عینی کا جتنا شیئر دیتا ہوں اسے قبول کر لیتے ہیں۔ میرا عینی کے قریب رہنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں اسے پوری طرح اپنی مٹھی میں رکھوں گا، اور اسے بھی حساب کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"شاباش بیٹے! تم تو بالکل اپنے ہم مزاج ہو۔"

میں نے مسکرا کر کہا "آپ کا بیٹا ہوں اس لیے آپ کا ہم مزاج ہوں۔"

وہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی بولی "آئی لو یو..... مائی چائلڈ!"

میں نے بھی کہا "آئی لو یو ٹو ممی! اب کل آٹھ بجے ایئر پورٹ پر ہی ملاقات ہوگی..... سی یو..... گڈ نائٹ۔"

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے فون بند کر کے شہباز سے کہا "وہ کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے آ رہا ہے ایسا لگتا ہے اس نے اپنی محبت سے سچ مچ مجھے خرید لیا ہے بالکل میرے مزاج کے مطابق باتیں کرتا ہے۔"

شہباز نے کہا "اس کی باتوں میں نہ آؤ، یہ نہ دیکھو کہ وہ صرف باتیں کرتا ہے بلکہ یہ دیکھو جو کہتا ہے وہ کرتا ہے یا نہیں؟"

"بالکل وہی کر رہا ہے۔ اپنے باپ کے کاروبار پر پوری طرح مسلط رہنے کے لیے یہاں عینی کو اپنی مٹھی میں جکڑنے آ رہا ہے۔ وہ وہی کر رہا ہے جو میں چاہتی ہوں۔"

"پھر تو اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔"

"صرف یہی نہیں..... اس نے اپنے آنے کی اطلاع کسی بھی رشتے دار کو نہیں دی ہے۔ اسی سے اندازہ کر لو کہ وہ مجھے اپنے تمام رشتے داروں پر کس طرح فوقیت دے رہا ہے۔"

"تم واقعی بہت خوش نصیب ہو۔ ادھر پاشا کو اپنا تابعدار بنا کر عینی کو اپنے پیچھے دوڑا دو گی، ادھر وہ کاروبار میں عینی کا کباڑا کر تا رہے گا۔ ویسے ہونا یہ چاہیے کہ عینی کی تمام دولت اور جائیداد تمہاری طرف چلی آئے۔"

"تم دیکھنا یہی ہوگا۔ مقدر حیات میرے دماغ سے سوچتا ہے میری زبان سے بولتا ہے میں اسے اپنے رنگ میں رنگ لوں گی۔"

وہ خوش ہو رہی تھی۔ خدا خوش رکھے میں سب ہی کو خوش کرتا آ رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھ سے ملنے والی خوشیاں بہت مہنگی پڑتی ہیں۔

دوسری صبح ایئر پورٹ پر پہلی بار دردانہ سے سامنا ہوا۔ وہ مجھے چہرے سے پہچان نہیں سکتی تھی۔ اس لیے ہاتھ میں پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھی، میں نے وہ کارڈ پڑھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "ممی! میں ہی آپ کا بیٹا مقدر حیات ہوں۔"

اس نے مجھے گلے لگایا۔ پھر پیشانی کو چوم کر کہا "تم تو بہت ہی قد آور اور وجیہہ ہو، کسی پہلو سے بزنس مین نہیں لگتے۔ مارشل آرٹ کے ماہر دکھائی دے رہے ہو۔"

میں نے مسکرا کر کہا "میں بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فائٹر بھی ہوں۔ نجومی بھی ہوں یہ سمجھئے کہ ہر فن مولا ہوں۔ آپ کو رفتہ رفتہ میرے گرز معلوم ہوتے رہیں گے۔"

میں اس کے ساتھ ایئر پورٹ کی عمارت کے باہر آیا۔ پھر اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا کر بولی "ابھی میں تمہیں عینی کی کوٹھی میں پہنچا دوں گی، تم مجھ سے

دیا۔ میں نے اسما کو دیکھ کر کہا ''آداب بھابی جان! آپ اتنی پیچھے کھڑی ہوئی ہیں کہ میں نے آپ کو ڈھونڈ کر نکالا ہے۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ اسما نے کہا ''میں ہمیشہ پیچھے ہی رہتی ہوں۔ صرف محبت کرنے والوں کو دکھائی دیتی ہوں تم نے محبت سے دیکھا تو میں نظر آ گئی۔''

بیگم آفتاب اور فلک ناز ڈرائنگ روم میں آئیں۔ بیگم آفتاب نے کہا ''یہ کیا' کوئی مقدر کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہے، میرا بیٹا کب سے کھڑا ہوا ہے۔''

فلک ناز نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ کو تھام کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا ''یہاں صوفے پر بیٹھو۔''

بیگم آفتاب نے گھور کر ناز کو دیکھا۔ وہ صرف بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔ ناز نے مجھے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

بیگم آفتاب میرے برابر صوفے پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ فلک آفتاب نے کہا ''بیگم..... یہ کیا تم یہاں بیٹھنے جا رہی ہو؟ کیا اپنے مقدر بیٹے کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی نہیں؟ انہیں بھوکا رکھو گی؟''

وہ وہاں سے تیزی سے جاتے ہوئے بولی ''میں نے کھانے کے لیے سارا انتظام کر دیا ہے۔ بس کیا کروں اپنے مقدر بیٹے کو دیکھ کر سب کچھ ہی بھول گئی۔ ابھی لاتی ہوں بس اپنے ہاتھوں سے منہ میٹھا کراؤں گی۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر آئی۔ وہ مٹھائی سے پہلے اپنی بیٹی نمرہ کی مٹھاس پیش کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ملازم سے کہا ''جاؤ ٹرالی لے کر یہاں آؤ۔ جلدی میں ابھی آرہی ہوں۔ خبردار وہ ٹرالی ڈرائنگ روم میں نہ لے جانا۔''

پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی نمرہ کے بیڈ روم کی طرف گئی۔ وہاں جا کر دروازے پر دستک دی اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا ''نمرہ کہاں ہو تم؟''

نمرہ کے اندر تو بے چینی بھری ہوئی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مقدر حیات کون ہے؟ کیا یہ وہی ہے جس سے پہاڑی علاقے میں سامنا ہوا تھا؟

وہ مجھے چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ ڈرائنگ روم کی طرف آرہی تھی کہ گھبرا گئی میں اسے روبرو دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ نظریں چرانے لگی۔ میں نے پوچھا ''کہاں جا رہی ہو؟ مجھے دیکھنے کے لیے اتنی دور ڈرائنگ روم میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ذرا سر جھکا کر تم اپنے دل میں جھانکو وہاں میں دکھائی دوں گا۔''

وہ بولی ''تمہیں اپنے بارے میں بڑی خوش فہمی ہے۔ میرے دل میں نہ کوئی تھا، نہ ہے اور نہ ہی ہوگا۔''

''بڑا بول نہ بولو۔ جب عشق ہوتا ہے تو اندھے لنگڑے اور لولے سے بھی ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے تو تمہاری جگی نے اندھا کیا ہے۔ بس تمہاری ایک جھلک دیکھی تھی۔ پھر اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکا۔ اور نہ ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بعد ان آنکھوں میں اب تک دوسری نہیں سمائی۔''

''اچھا..... زیادہ نہ بولو راستے سے ہٹو مجھے جانے دو۔''

بیگم آفتاب اس کی طرف آرہی تھی اور حیرانی سے دیکھ رہی تھی اسے اپنی بیٹی کے سامنے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے شانے جھنجھوڑ کر پوچھا ''یہ تم کس سے بات کر رہی ہو؟''

نمرہ نے چونک کر ماں کو دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نہیں تھا اس کے اندر کا چھپا ہوا خیال تھا دھیما دھیما سا پیار تھا جو اس کے سامنے چلا آیا تھا۔ ماں کی مداخلت سے پھر اس کے اندر آ کر چھپ گیا تھا۔

ماں نے پوچھا ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

نمرہ کو یوں لگا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے فوراً ہی بات بنائی ''وہ..... وہ کیمسٹری کا ایک سوال ہے جس اسے چلتے پھرتے یاد کرتی ہوں۔''

''تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چلتے پھرتے پڑھو۔ اور یہ کوئی پڑھنے کا وقت ہے؟ مقدر حیات آیا ہوا ہے چلو میرے ساتھ۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی اس کو ریڈور میں آئی جہاں ملازم کھانے پینے کے سامان کی ٹرالی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے نمرہ سے کہا ''چلو یہ ٹرالی تم لے جاؤ اس کے سامنے پہنچتے ہی سر جھکا کر سلام کرنا، کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا۔''

نمرہ کے اندر تجسس بھرا ہوا تھا۔ اس نے ماں کی طرف جھک کر آہستگی سے پوچھا ''آپ مجھے سچ سچ بتائیں وہ اندھا ہے ناں؟''

اس نے چونک کر بیٹی کو دیکھا پھر کہا ''کیوں اس بے چارے کو اندھا بنا رہی ہو؟ وہ اچھا خاصا آنکھوں والا ہے تم ملو تو سہی۔''

وہ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ میں فلک ناز کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اسے میری پشت دکھائی دے رہی تھی، وہ میری صورت دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک طرف ٹرالی گھما کر لا رہی تھی۔ میں ڈیشان سے بات کرنے کے بہانے اس

کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

''بھائی جان! ہمارے باپ دادا تاجر تھے ہم بھی بزنس کر رہے ہیں۔ آپ کیوں ملازمت کی طرف چلے گئے؟ اور وہ بھی پولیس کی ملازمت' دن رات خطرات سے کھیلتے ہوں گے؟''

نمرہ نے ٹرالی کو ایک جگہ روک دیا تھا۔ میری باتیں سن رہی تھی۔ پھر میرے پیچھے آ کر بولی ''خطرات سے تو تم بھی کھیلو گے مجھ سے منہ چھپا رہے ہو۔ میں نے آواز سے تمہیں پہچان لیا ہے۔''

میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ پھر حیرانی سے کہا ''ارے تم.....؟ یہ تم ہو.....؟''

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی ''ہاں..... میں ہوں۔ زیادہ بھولے نہ بنو تم ایک نمبر کے مکار ہو۔''

فلک آفتاب نے ایک دم سے اٹھ کر کہا ''نمرہ..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم مقدر میاں کو کیا کہہ رہی ہو؟''

میں نے فلک آفتاب کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا ''تایا ابو! ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ آرام سے بیٹھیں میں آپ کی اس کالی بلی کو پہلے سے جانتا ہوں۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولی ''میں تمہیں کالی دکھائی دے رہی ہوں؟ مجھ کو نے بہروپیے۔ اندھے بن کر مجھے دھوکا دے رہے تھے۔''

بیگم آفتاب نے تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''نمرہ! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں شرم نہیں آتی مقدر میاں کو جھوٹا اور بہروپیا کہہ رہی ہو۔ فوراً ان سے معافی مانگو۔''

وہ بولی ''ممی! آپ کے مقدر میاں نے درجنوں اسٹوڈنٹس کے سامنے مجھے اُلو بنایا ہے۔ معافی میں نہیں مانگوں گی۔ یہ مجھ سے معافی مانگیں گے۔''

میں نے کہا ''ارے واہ..... میں کیوں معافی مانگوں؟ تم اُلو بن رہی تھیں۔ اس لیے میں بنا رہا تھا۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ نمرہ نے ٹرالی سے ایک کانٹا اور ایک چھری اٹھا کر کہا ''تمہیں اندھا بننے کا بہت شوق ہے ناں.....؟ میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔ اگر شریعت چاہتے ہو تو مجھ سے معافی مانگو۔''

وہ اس انداز میں حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھی جیسے میری آنکھیں پھوڑ ہی ڈالے گی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ادھر ادھر جاتے ہوئے کہا ''تایا ابو! آپ نے یہ کیا چیز پیدا کی ہے؟ سنا تھا کہ چڑیلیں کلیجہ نوچ کر لے جاتی ہیں۔ یہ چڑیل تو میری آنکھیں نکالنا چاہتی ہے!''

میں اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا' کبھی صوفے کے درمیان اور کبھی پیچھے اور وہ میرے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے۔ فلک ناز کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ دیکھ کر مایوس ہو رہی تھی کہ میرے اور نمرہ کے درمیان پہلے سے بے تکلفی ہے۔

میں اِدھر سے اُدھر بھاگتا ہوا آ کر بیگم آفتاب کے پیچھے آیا پھر اسے پکڑ کر کھڑا ہو گیا ''بڑی امی! اب آپ ہی مجھے اس سے بچا سکتی ہیں۔''

بیگم آفتاب نے اپنی بیٹی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر کہا ''نمرہ! اب رہنے بھی دو تمہاری ان حرکتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں پہلے سے مل چکے ہو۔''

وہ ایسا کہتے ہوئے طنزیہ انداز میں چور نظروں سے فلک ناز کو دیکھ رہی تھی۔ نمرہ نے کانٹا اور چھری کو ٹرالی پر پھینکتے ہوئے ادھر سے جاتے ہوئے کہا ''یہ حضرت جب تک مجھے سوری نہیں کہیں گے میں یہاں نہیں آؤں گی۔''

وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ بیگم آفتاب آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا ''آپ رہنے دیں میں اسے منا کر لے آتا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی ''ہاں بیٹا اب تو تم اسے مناتے رہو گے۔''

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک کوریڈور میں آیا۔ وہ دروازے کے باہر دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے قریب آ کر سرگوشی میں کہا ''تم دوسری طرف دیکھ رہی ہو۔ وہاں بھی میں ہی دکھائی دے رہا ہوں۔''

وہ ایک ادائے ناز سے بولی ''جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے تم ایسے نہیں ہو کہ تم پر کوئی لڑکی بھروسا کر سکے۔''

''میں نے ایسا کیا کیا ہے جو بھروسے کے قابل نہیں رہا؟''

''فریب دینے والے کبھی نہیں مانتے کہ وہ فریبی ہیں۔''

''میں نے کس سے فریب کیا ہے؟ کیا تم سے؟''

''اور نہیں تو کیا..... اندھے بن کر مجھے دھوکا نہیں دے رہے تھے؟''

''میں تمہاری شرم رکھنے کے لیے اندھا بن گیا تھا۔ اس وقت اگر اچانک اندھے کی ایکٹنگ نہ کرتا تو تم شرم سے زمین میں گڑ جاتیں۔ میری اس حرکت سے تمہیں اطمینان ہوا کہ ایک اندھے نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔''

اس نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ میں نے کہا ''چلو دوسری باتیں کرتے ہیں۔ وہ تصویریں کیسی تھیں؟ تم

نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ کیا ہوگا کہ میں کس طرح تمہارے پیچھے رہا کرتا تھا؟ جب بھی موقع ملتا تھا تصویر اتار لیتا تھا۔ کیا وہ تصویریں تم سے یہ نہیں کہتیں کہ تم میرے دل میں آکر بیٹھ گئی ہو؟''

وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولی ''تم دھوکے باز بھی ہو اور پکے بے شرم بھی، نہ جانے کس رات میرے بیڈ روم میں گھس آئے تھے۔ وہاں تم نے کیسی کیسی تصویریں اتاری ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی؟''

''شرم آتی تو میں نہ آتا، میں نے تمہارے بیڈ روم کے خوبصورت لمحات کی تصویریں اتاری ہیں۔ تم گہری نیند میں تھیں، تمہارے سونے کے انداز میں بھی حسن اور ادائیں ہیں۔ تمہاری تصویریں کہتی ہیں کہ خوابیدہ حسن میں بڑی دلکشی ہوتی ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔''

''چلو..... ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ اب ڈرائنگ روم میں چلو۔ وہاں سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی خاموشی دیکھ کر بابر نے کہا ''تالیاں۔''

سب ہی تالیاں بجانے لگے۔ بابر نے کہا ''نمرہ کا جھکا ہوا سر بتا رہا ہے کہ دونوں میں صلح ہو چکی ہے۔ ہم سب ایک شکستِ عظیم سے بچ گئے ہیں۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بیگم آفتاب سے تو خوشی کے مارے صوفے پر ٹکا نہیں جا رہا تھا۔ عروج نے کہا ''نمرہ! یہ تو اچھی بات نہ ہوئی۔ تم نے اتنی جلدی ہار کیوں مانی؟''

میں نے کہا ''اس لیے ہار مان لی کہ یہ مقدر حیات کسی سے ہار ماننے والا نہیں ہے۔''

نمرہ نے مجھے بڑے پیار سے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''عروج! یہ حضرت بڑی ہی اکڑ دکھا رہے ہیں۔ وہاں تنہائی میں آکر کہہ رہے تھے کہ سب کے سامنے سوری کہتے ہوئے شرم آرہی ہے مجھ سے غلطی ہو گئی پلیز! مجھے معاف کر دو۔ اب تم ہی بتاؤ ہم لڑکیوں کے دل کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ آخر معاف کرنا ہی پڑا۔''

ذیشان نے کہا ''مقدر میاں! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نے اس چھپکلی سے معافی مانگی ہے؟''

''بھائی جان! یہ بات جھوٹی ہے یہاں آکر خوامخواہ کیوں کی برتری ثابت کر رہی ہے۔''

بیگم آفتاب نے کہا ''بھئی..... مجھے تو اس نوک جھونک

میں بڑا مزہ آرہا ہے۔''

فلک آفتاب نے کہا ''مقدر میاں نے آتے ہی یہاں کے ماحول کو قہقہوں سے بھر دیا ہے۔ ورنہ یہاں تو اداسی اور خاموشی رہتی ہے۔''

اس نے ان الفاظ کے دوران عینی اور عروج کو دیکھا۔ عینی نے کہا ''کل سے ماتمی خاموشی تھی۔ آج قہقہے گونج رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ کل یہ قہقہے نہ رہیں۔''

اسی وقت فلک ناز اپنی بیٹی آسرا کے ساتھ وہاں آئی۔ اسے دیکھ کر فلک آفتاب اور بیگم آفتاب ذرا بجھ سے گئے۔ عروج نے کہا ''آنے والا کوئی بھی لمحہ قہقہے چرا کر لے جاتا ہے۔''

فلک ناز نے کہا ''بیٹے مقدر! یہ میری بیٹی آسرا ہے۔''

آسرا نے چونک کر پوچھا ''تم.....؟ تم مقدر حیات ہو؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر آگے بڑھی میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ''دیکھو آسرا! ابھی ایک زبردست حملے سے بال بال بچا ہوں۔ پہلے میری بات سن لو۔''

میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی ''کیا سنوں.....؟ تم تو بڑے جھوٹے اور فریبی ہو۔''

فلک ناز نے کہا ''ارے تم بھی اسے وہی کہہ رہی ہو۔ جو نمرہ کہہ رہی تھی؟''

وہ بولی ''نمرہ تو کیا ساری دنیا یہی کہے گی۔ میری سالگرہ کی پارٹی میں کتنے ہی مہمان آئے تھے۔ ان صاحب نے ان سب کو بے وقوف بنایا تھا۔''

پھر اس نے مجھ سے پوچھا ''ان سب کو رہنے دو۔ تم نے مجھے بے وقوف کیوں بنایا؟ مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟''

اس نے چونک کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا پھر کہا ''اوہ گاڈ! تم تو بہت بڑے نجومی بن کر آئے تھے۔ خوامخواہ سب کے ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ اور بے وقوف بنا رہے تھے تم نے مجھے بھی بے وقوف بنایا۔''

اس نے ایک اسٹینڈ پر رکھے گلدان کو اٹھا لیا۔ پھر کہا ''میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ تم پھر نجومی بننے کے قابل نہیں رہو گے۔''

میں ایک بار پھر اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اور وہ میرے پیچھے دوڑنے لگی۔ وہاں سب ہنس رہے تھے صرف آفتاب اور بیگم آفتاب مایوس تھے اور ناگواری سے آسرا کو دیکھ رہے تھے۔ نمرہ کے ساتھ ہونے والی شوخیاں انہیں اچھی لگ رہی تھیں۔ لیکن اب آسرا کے ساتھ ہونے والی شوخیاں انہیں اندیشوں میں مبتلا کر رہی تھیں۔ یہ سمجھ رہی تھیں کہ مجھے داماد بنانے کے سلسلے میں نمرہ اور آسرا کے درمیان زبردست مقابلہ رہے گا۔

میں فلک ناز کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ''پھوپی جان! اس گھر میں تو بلیاں ہی بلیاں ہیں۔ ایک سے نجات ملی تو دوسری پنجے مار رہی ہے پلیز مجھے بچا لیں۔''

فلک ناز خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ اس نے بیٹی کے ہاتھ سے گلدان چھین کر کہا ''بس کرو آسرا! مقدر میاں نے ہمیں بے وقوف نہیں بنایا ہے تم ان کی زندہ دلی کو سمجھو۔ ان کی قدر کرو۔''

آسرا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے سر گھما کر نمرہ کی طرف دیکھا۔ نمرہ اسے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔ نمرہ نے کہا تھا کہ مقدر حیات سے کہیں بلکہ ایک اندھے سے محبت ہو گئی ہے اب بھید کھلا تو پتا چلا کہ وہ اندھا یہ ہی مقدر حیات ہے۔

آسرا نے کہا تھا کہ اسے مقدر حیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس کا دل تو ایک نجومی پر آگیا ہے۔ اب پتا چل رہا تھا کہ وہ نجومی مقدر حیات ہے۔

دونوں الگ الگ راستوں پر بھٹک رہی تھیں۔ لیکن منزل کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

آسرا نے نمرہ کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں کہا ''کیا تم واقعی اندھا کہہ رہی تھیں؟''

وہ بولی ''ہاں..... یہ اپنی زندہ دلی سے مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔''

''پھر تو تمہیں محبت کا یہ اندھا مبارک ہو۔''

''پھر تو میں بھی تمہیں مبارک باد دوں گی۔ تمہارا نجومی بھی اندھا ہی ہے۔''

یہ کہتے ہی آسرا نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ پھر ہتھیلی کو پھیلا کر کہا ''میرے ہاتھ میں دولت، عزت، شہرت اور ساری کی ساری لکیریں ہیں لیکن۔''

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولی ''لیکن ہاتھ میں شادی کی لکیر کہیں ہے مقدر حیات! تم نجومی ہو، تم بتا سکتے ہو کیا ہے کہ سچی پیش گوئیاں کرتے ہو۔ یہاں سب کو پتا ہے کہ میں کتنی بدنصیب لڑکی ہوں۔ میری زندگی میں مجھے کوئی چاہنے والا نہیں آئے گا۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا ''اور اگر آئے گا تو زندگی مجھ سے روٹھ جائے گی۔ اس خاندان میں ایک دلہن عینی ہے۔ جس کی زندگی میں دولہا آتے آتے واپس چلا گیا۔ دوسری دلہن میں ہوں میری زندگی میں جب بھی کوئی دولہا آئے گا تو میں موت کو گلے لگا لوں گی۔ یہی میرا مقدر ہے۔''

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک ہی گہری ماتمی خاموشی چھا گئی۔ میرا سر جھک گیا میں نے آسرا سے جھوٹ نہیں کہا تھا، دھوکا نہیں دیا تھا۔ جو اس کی تقدیر میں لکھا ہے وہ بھی اس کے سامنے آئے گا۔ ابھی یہ دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ میں اسے چاہوں گا۔ تب بھی میری چاہت نہیں ملے گی۔ اسے تو موت ہی ملے گی۔

بیٹی کے آنسوؤں نے ماں کو پریشان کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے بیٹی بازی جیتنے سے پہلے ہار کر چلی گئی ہے۔ وہ اس کے پیچھے تیزی سے جا رہی تھی۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ کچھ سوچ کر پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی ''یہ کیا بکواس کر رہی تھی؟ اپنے ہاتھ کی لکیریں دکھا رہی تھی۔ اس نے تمہیں نجومی کہا ہے۔ کیا تم نے ہی اسے کہا تھا کہ اس کی شادی کبھی نہیں ہو سکے گی؟''

میں نے فلک ناز کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔ وہ میرے قریب آکر بولی ''بیٹے! تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''پھوپی جان! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں، آسرا بہت اچھی ہے میں اسے بہت چاہتا ہوں لیکن جسے چاہتا ہوں اسے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میرے علم نجوم کے مطابق مجھے جو حقائق معلوم ہوئے وہ میں نے اس کے سامنے رکھ دیئے۔''

''بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر نہیں کیے جاتے، کیونکہ سننے والوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر تمہارا علم یہ کہتا ہے کہ میری بیٹی کی شادی نہیں ہو سکے گی تو اسے یہ بتانا ضروری نہیں تھا۔ وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتی اور اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارتی۔''

''یہی تو بات ہے پھوپی جان! وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی نہیں گزارتی، اگر کوئی گڑھے کی طرف گرنے جا رہا ہو تو میرا فرض ہے کہ میں اسے گرنے سے روکوں۔ اگر میں اسے حقیقت نہ بتاتا تو وہ کسی سے شادی کر لیتی اور پھر اسے ایک سہاگن کی خوشیاں کبھی نصیب نہ ہوتیں۔ زندگی بالکل ہی مختصر ہو جاتی۔ آپ ایک ماں ہیں چاہیں گی کہ اس کو ایک لمبی اور خوش

نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ کیا ہوگا کہ میں کس طرح تمہارے پیچھے رہا کرتا تھا؟ جب بھی موقع ملتا تھا تصویر اتار لیتا تھا۔ کیا وہ تصویریں تم سے یہ نہیں کہتیں کہ تم میرے دل میں آکر بیٹھ گئی ہو؟''

وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولی ''تم دھوکے باز بھی ہو اور بے شرم بھی، نہ جانے کس رات میرے بیڈ روم میں گھس آئے تھے۔ وہاں تم نے کیسی کیسی تصویریں اتاری ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی؟''

''شرم آتی تو میں نہ آتا، میں نے تمہارے بیڈ روم کے خوبصورت لمحات کی تصویریں اتاری ہیں۔ تم گہری نیند میں تھیں، تمہارے سونے کے انداز میں بھی حسن اور ادائیں ہیں۔ تمہاری تصویریں کہتی ہیں کہ خوابیدہ حسن میں بڑی دلکشی ہوتی ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔''

''چلو..... ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ اب ڈرائنگ روم میں چلو۔ وہاں سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی خاموشی دیکھ کر بابر نے کہا ''تالیاں۔''

سب ہی تالیاں بجانے لگے۔ بابر نے کہا ''نمرہ کا جھکا ہوا سر بتا رہا ہے کہ دونوں میں صلح ہو چکی ہے۔ ہم سب ایک جنگِ عظیم سے بچ گئے ہیں۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بیگم آفتاب سے تو خوشی کے مارے صوفے پر ٹکا نہیں جا رہا تھا۔ عروج نے کہا ''نمرہ! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم نے اتنی جلدی ہار کیوں مانی؟''

میں نے کہا ''اس لیے ہار مان لی کہ یہ مقدر حیات کسی سے ہار ماننے والا نہیں ہے۔''

نمرہ نے مجھے بڑے پیار سے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''عروج! یہ حضرت بڑی ہی اکڑ دکھا رہے ہیں۔ وہاں تنہائی میں جا کر کہہ رہے تھے کہ سب کے سامنے سوری کہتے ہوئے شرم آرہی ہے مجھ سے غلطی ہوگئی پلیز! مجھے معاف کر دو۔ اب تم ہی بتاؤ ہم لڑکیوں کے دل کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ آخر معاف کرنا ہی پڑا۔''

ذیشان نے کہا ''مقدر میاں! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نے اس چھپکلی سے معافی مانگی ہے؟''

''بھائی جان! یہ بات جھوٹی ہے یہاں آکر خواہ مخواہ لڑکیوں کی برتری ثابت کر رہی ہے۔''

بیگم آفتاب نے کہا ''بھئی..... مجھے تو اس نوک جھونک میں بڑا مزہ آرہا ہے۔''

فلک آفتاب نے کہا ''مقدر میاں نے آتے ہی یہاں کے ماحول کو قہقہوں سے بھر دیا ہے۔ ورنہ یہاں تو اداسی اور خاموشی رہتی ہے۔''

اس نے ان الفاظ کے دوران عینی اور عروج کو دیکھا۔ عینی نے کہا ''کل سے ماتمی خاموشی تھی۔ آج قہقہے گونج رہے ہیں ہوسکتا ہے کہ کل یہ قہقہے نہ رہیں۔''

اسی وقت فلک ناز اپنی بیٹی آسرا کے ساتھ وہاں آئی۔ اسے دیکھ کر فلک آفتاب اور بیگم آفتاب ذرا بجھ سے گئے۔ عروج نے کہا ''آنے والا کوئی بھی لمحہ قہقہے چرا کر لے جاتا ہے۔''

فلک ناز نے کہا ''بیٹے مقدر! یہ میری بیٹی آسرا ہے۔''

آسرا نے چونک کر پوچھا ''تم.....؟ تم مقدر حیات ہو؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر آگے بڑھی میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ''دیکھو آسرا! ابھی ایک زبردست حملے سے بال بال بچا ہوں۔ پہلے میری بات سن لو۔''

میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی ''کیا سنوں.....؟ تم تو کیے جھوٹے اور فریبی ہو۔''

فلک ناز نے کہا ''ارے تم بھی اسے وہی کہہ رہی ہو۔ جو نمرہ کہہ رہی تھی؟''

وہ بولی ''نمرہ تو کیا ساری دنیا یہی کہے گی۔ میری سالگرہ کی پارٹی میں کتنے ہی مہمان آئے تھے۔ ان صاحب نے ان سب کو بے وقوف بنایا تھا۔''

پھر اس نے مجھ سے پوچھا ''ان سب کو تو رہنے دو۔ تم نے مجھے بے وقوف کیوں بنایا؟ مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟''

اس نے چونک کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا پھر کہا ''اوہ گاڈ! تو بہت بڑے نجومی بن کر آئے تھے۔ خوامخواہ سب کے ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ اور بے وقوف بنا رہے تھے تم نے مجھے بھی بے وقوف بنایا۔''

اس نے ایک اسٹینڈ پر رکھے گلدان کو اٹھالیا۔ پھر کہا ''میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ تم پھر نجومی بننے کے قابل نہیں رہو گے۔''

میں ایک بار پھر اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اور وہ میرے پیچھے دوڑنے لگی۔ وہاں سب ہنس رہے تھے صرف آفتاب اور بیگم آفتاب مایوس تھے اور ناگواری سے آسرا کو دیکھ رہے تھے۔ نمرہ کے ساتھ ہونے والی شوخیاں انہیں اچھی لگ رہی تھیں۔ لیکن اب آسرا کے ساتھ ہونے والی

شوخیاں انہیں اندیشوں میں مبتلا کر رہی تھیں۔ یہ سمجھ رہی تھیں کہ مجھے داماد بنانے کے سلسلے میں نمرہ اور آسرا کے درمیان زبردست مقابلہ رہے گا۔

میں فلک ناز کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ''پھوپی جان! اس گھر میں تو بلیاں ہی بلیاں ہیں۔ ایک سے نجات ملی تو دوسری پنجے مار رہی ہے پلیز مجھے بچائیں۔''

فلک ناز خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ اس نے بیٹی کے ہاتھ سے گلدان چھین کر کہا ''بس کرو آسرا! مقدر میاں نے تمہیں بے وقوف نہیں بنایا ہے تم ان کی زندہ دلی کو سمجھو۔ ان کی قدر کرو۔''

آسرا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے سر گھما کر نمرہ کی طرف دیکھا۔ نمرہ اسے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔ نمرہ نے کہا ''غلط ہے مقدر حیات سے کہیں بلکہ ایک اندھے سے محبت ہو گئی ہے اب بھید کھلا کہ وہ اندھا ہی مقدر حیات ہے۔''

آسرا نے کہا تھا کہ اسے مقدر حیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس کا دل تو ایک نجومی پر آگیا ہے اور اب پتا چل رہا تھا کہ وہی نجومی مقدر حیات ہے۔

وہ دونوں الگ الگ راستوں پر بھٹک رہی تھیں۔ لیکن بگولے مخل کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

آسرا نے نمرہ کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں کہا ''کیا تم ہی کو اندھا کہہ رہی تھیں؟''

وہ بولی ''ہاں..... یہ اپنی زندہ دلی سے مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔''

''پھر تو تمہیں محبت کا یہ اندھا مبارک ہو۔''

''پھر تو میں بھی تمہیں مبارک باد دوں گی۔ تمہارا نجومی بھی یہی ہے۔''

''یہ کہتے ہی آسرا نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ پھر ہتھیلی کو پھیلا کر کہا ''میرے ہاتھ میں دولت، عزت، شہرت اور زندگی کی تمام لکیریں ہیں لیکن.....''

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولی ''لیکن اس ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں ہے مقدر حیات! تم نجومی ہو تم نے ثابت کیا ہے کہ سچی پیش گوئیاں کرتے ہو۔ یہاں سب کو بتاؤ کہ میں کتنی بدنصیب لڑکی ہوں۔ میری زندگی میں مجھے کوئی چاہنے والا نہیں آئے گا۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا ''اور اگر آئے گا تو زندگی مجھ سے روٹھ جائے گی۔ اس خاندان میں ایک دلہن عینی ہے۔ جس کی زندگی میں دولہا آتے آتے واپس چلا گیا۔ دوسری دلہن میں ہوں میری زندگی میں جب بھی کوئی دولہا آئے گا تو میں موت کو گلے لگا لوں گی۔ یہی میرا مقدر ہے۔''

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک ہی گہری ماتمی خاموشی چھا گئی۔ میرا سر جھک گیا میں نے آسرا سے جھوٹ نہیں کہا تھا، دھوکا نہیں دیا تھا۔ جو اس کی تقدیر میں لکھا ہے وہ کبھی اس کے سامنے آئے گا۔ ابھی یہ دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ میں اسے چاہوں گا۔ تب بھی میری چاہت نہیں ملے گی۔ اسے تو موت ہی ملے گی۔

بیٹی کے آنسوؤں نے ماں کو پریشان کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے بیٹی بازی جیتنے سے پہلے ہار کر چلی گئی ہے۔ وہ اس کے پیچھے تیزی سے جا رہی تھی۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ کچھ سوچ کر پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی ''یہ کیا بکواس کر رہی تھی؟ اپنے ہاتھ کی لکیریں دکھا رہی تھی۔ اس نے تمہیں نجومی کہا ہے۔ کیا تم نے ہی اسے کہا تھا کہ اس کی شادی کبھی نہیں ہو سکے گی؟''

میں نے فلک ناز کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔ وہ میرے قریب آکر بولی ''بیٹے! تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''پھوپی جان! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں، آسرا بہت اچھی ہے میں اسے بہت چاہتا ہوں لیکن جسے چاہتا ہوں اسے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میرے علم نجوم کے مطابق مجھے جو حقائق معلوم ہوئے وہ میں نے اس کے سامنے رکھ دیئے۔''

''بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر نہیں کیے جاتے، کیونکہ سننے والوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر تمہارا علم یہ کہتا ہے کہ میری بیٹی کی شادی نہیں ہو سکے گی تو اسے یہ بتانا ضروری نہیں تھا۔ وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتی اور اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارتی۔''

''یہی تو بات ہے پھوپی جان! وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی نہیں گزارتی، اگر کوئی لڑھکے کی طرف گرنے جا رہا ہو تو میرا فرض ہے کہ میں اسے گرنے سے روکوں۔ اگر میں اسے حقیقت نہ بتاتا تو وہ کسی سے شادی کر لیتی اور پھر اسے ایک سہاگن کی خوشیاں کبھی نصیب نہ ہوتیں۔ زندگی بالکل ہی مختصر ہو جاتی۔ آپ ایک ماں ہیں چاہیں گی کہ اس کو ایک لمبی اور خوش

حال زندگی ملے۔ اور وہ لمبی زندگی اسی طرح جی سکتی ہے کہ کبھی شادی نہ کرے۔''

بیگم آفتاب اور فلک آفتاب نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ دونوں اندر ہی اندر خوش ہو رہے تھے۔ ان کی بیٹی نمرہ کے مقابلے پر آنے والی کو مقدر خود ہی اپنے سے دور کر رہا تھا۔ فلک ناز نے کہا ''میں نہیں مانتی ایسے علم نجوم کو۔ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ ہاتھ کی لکیریں بالکل سچ بولتی ہوں۔''

میں نے کہا ''نہ ماننے والوں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ ہاتھ کی لکیریں پتھر کی لکیر ہوتی ہیں جو کہہ دیتی ہیں وہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نجومی ان لکیروں کو صحیح طرح سے پڑھنا نہیں جانتے۔ اور الٹی سیدھی پیش گوئی کرتے ہیں۔ مجھے اس علم میں دس برس کی مہارت حاصل ہے۔ اور میں جو کہتا ہوں وہ ہو کر رہتا ہے' یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہونے والی بات نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہی کاتبِ تقدیر ہے' وہی لکھتا ہے اور اس کا لکھا ہوا اٹل ہوتا ہے۔ صرف وہ چاہے تو اپنے لکھے کو مٹا سکتا ہے یا بدل سکتا ہے۔''

وہ بولی ''تم میرا ہاتھ دیکھ کر میرے ماضی کی کوئی بات بتا سکتے ہو؟ اور مستقبل کی کوئی پیش گوئی کر سکتے ہو؟''

''میں سچ بولتا ہوں' لیکن میرا سچ سننے والے کے لیے اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ وہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور مجھے جھوٹا کہہ دیتا ہے۔''

وہ اپنا بایاں ہاتھ میری طرف بڑھا کر بولی ''میں سب کے سامنے سچ کو تسلیم کروں گی۔''

میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لکیریں دیکھنے لگا۔ ان لکیروں کو پڑھنا ضروری نہیں تھا۔ مقدر تو پہلے ہی بہت کچھ پڑھ چکا ہوتا ہے۔ میں بظاہر لکیروں کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا ''آپ کو کون سی بات بتاؤں؟ آپ کی شادی یا آپ کی اولاد کی؟''

''دونوں باتیں بتاؤ۔''

''آپ کے ساس سسر آپ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہو بنانا نہیں چاہتے تھے لیکن پھوپا جان آپ کو بہت چاہتے تھے۔ انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف آپ سے شادی کی تب انہوں نے بیٹے کی خاطر آپ کو برداشت کرلیا۔''

''یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں۔ تمہیں بھی کسی کے ذریعے معلوم ہوگئی ہوگی۔''

''لیکن یہ تو نہیں جانتے کہ پھوپا جان کی موت آپ کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

اس نے ایک دم سے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ناگواری سے کہا ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

پھر اسے احساس ہوا کہ میں کسی حکمت عملی سے اس کا داماد بن سکتا ہوں۔ اس نے فوراً ہی سنبھل کر کہا ''بیٹے! میرا مطلب یہ ہے کہ تم یہ کیسی بات کر رہے ہو بھلا تمہارے پھوپا جان کی موت میری وجہ سے کیوں ہوگی؟''

''آپ چاہتی تھیں کہ پھوپا جان اپنے نام کی جائیداد آپ کے نام کردیں۔ اور آپ ان سے ضد کرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے آپ کی محبت سے مجبور ہو کر اپنا سب کچھ آپ کے نام اس شرط پر لکھا کہ آپ جائیداد کے وہ کاغذات کسی کو نہیں دکھائیں گی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے والدین کو یہ بات معلوم ہو کہ بیٹے کا سب کچھ بہو کے نام ہو چکا ہے۔''

''تم غلط کہہ رہے ہو۔ تمہارے پھوپا نے اپنی مرضی سے میرے نام سب کچھ لکھا تھا۔ اور میرے ساس سسر اس پر اعتراض نہیں کرسکتے تھے۔''

''آپ مجھے غلط تو کہہ رہی ہیں' لیکن یہ خوب سمجھ رہی ہیں کہ میں ایک ایک بات سچ کہہ رہا ہوں۔ پھوپا جان ایک زبردست ایکسیڈنٹ سے دوچار ہوئے تھے۔ اس حادثے میں ان کے پھیپھڑے متاثر ہوئے تھے۔ انہیں سانس لینے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ انہیلر لیتے رہتے تھے تاکہ سانس بحال رہے۔ آپ یہ تسلیم نہیں کریں گی کہ آپ ان سے بے زار ہوگئی تھیں۔ ایک رات ان سے لڑ جھگڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔ انہیلر اپنے ساتھ لے گئی تھیں اور دروازہ کو باہر سے بند کردیا تھا۔ وہ آپ کے بغیر تنہا سو سکتے تھے۔ لیکن انہیلر کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی جب سانس رکنے لگیں تو انہوں نے وہ انہیلر تلاش کیا۔ بیٹے کے پیار اور اُدھار کی دراڑوں میں، لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ اور ادھر ہانپتے کانپتے لڑکھڑاتے گرتے رہے دروازے آئے تو پتا چلا کہ وہ باہر سے بند ہے۔ انہوں نے دروازہ پیٹنا چاہا لیکن اس وقت ان میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ دروازے کو پیٹ کو آواز دیتے۔ وہ وہیں گر پڑے جب صبح دروازہ کھولا گیا تو وہ ہیں ان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔''

فلک ناز نے چیخ کر کہا ''تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو مجھے اپنے شوہر کی قاتلہ کہہ رہے ہو؟ میں تمہاری سگی پھوپی ہوں؟ تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ نے جان بوجھ کر انہیں کیا تھا۔ آپ تو غصے میں انہیلر لے کر چلی گئی تھیں۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھیں کہ اس کے بغیر ان کی موت واقع ہو جائے گی۔ آپ یہی سمجھ رہی تھیں کہ صبح تک ان کی سانس بحال رہے گی۔''

وہ ذرا دھیمی پڑ گئی۔ میں نے اسے نرم کرنے کے لیے ذرا جھوٹ بولا ورنہ حقیقت تو یہی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر انہیلر چھپایا تھا۔ گویا ان کی زندگی اپنی مٹھی میں بند کرلی تھی۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی ''تمہارے پھوپا کا انہیلر میرے پرس میں ہی رہا کرتا تھا جب میں کمرے سے گئی تو وہ اسی پرس میں رہ گیا۔ انہیں کمرے میں آکر مردہ حالت میں دیکھا تو انہیلر کو تلاش کرنے لگی۔ تب یاد آیا کہ وہ تو میرے پاس میں تھا۔''

میں نے تائید کے انداز میں سر ہلا کر کہا ''بے شک یہی ہوا تھا میں بھی اپنی پھوپی جان پر خوا مخواہ بے جا الزام کیوں لگاؤں گا؟''

وہ مطمئن ہو کر بولی ''خدا کا شکر ہے کہ تم نے سچ کو مان لیا ورنہ اب تک ہی مجھے اپنے شوہر کی قاتلہ سمجھنے لگتے۔''

میں نے کہا ''آپ یہ تسلیم کر ہی لیں کہ پھوپا جان کے آخری لمحات میں جو کچھ ہوا اسے میں نے آپ کی ہتھیلی پر دیکھا ہے۔''

وہ پھر اپنی ہتھیلی بڑھا کر بولی ''میری بات چھوڑو، میرے عدنان کے بارے میں بتاؤ۔ میں اس کے لیے بہت ہی فکرمند رہتی ہوں۔ کیا یہ میرا بیٹا ہمیشہ ابنارمل رہے گا؟''

میں نے اس کی ہتھیلی پر نظر ڈال کر کہا ''شادی کے چھ ماہ بعد ہی آپ کے پاؤں بھاری ہوئے۔ آپ پریشان ہوگئیں پھوپا سے کہا کہ آپ اتنی جلدی ماں بننا نہیں چاہتیں۔ دنیا گھومنا چاہتی ہیں آپ کے شوہر اور ساس سسر نے اعتراض کیا کہ نہیں، اولاد ہونی چاہیے۔ ہمیں اپنے خاندان کا وارث چاہیے۔ اس بات پر بڑے جھگڑے ہوئے آپ نے بظاہر خاموشی اختیار کرلی۔ لیکن درپردہ دواؤں سے بچے کو ضائع کرنا چاہا، لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی ''دیکھو بیٹے! تم بے تکی باتیں

ٹھہریئے اپنی ناک کا آپریشن کرانے سے پہلے

ہومیو پیتھک سائنسی تحقیق اور تجربہ سے تیار کردہ انتہائی زود اثر دوا

Naricol Tablet

ہفتہ ضرور استعمال کر کے دیکھیں انشاء اللہ ضرور شفا ہوگی

نزلہ دائمی ہو یا الرجک یا موسمی تبدیلیوں سے ناک کی ہڈی یا گوشت کے بڑھنے سے ہونے والا سر درد مستقل ہونا یا سانس لینے میں دشواری کیلئے مجرب دوا ہے۔

ایسوسی ایٹ

- ڈاکٹر ہومیو اسٹور اعظم آباد بورڈ آفس فون نمبر: 6614030
- ڈاکٹر ہومیو اسٹور گلشن اقبال بالمقابل اردو سائنس کالج، کراچی
- ڈاکٹر ہومیو ڈرگ بنک سکندر پور پٹھان ورسٹی 2571776
- ڈاکٹر ہومیو اسٹور اعظم آباد بورڈ آفس فون نمبر 6613022
- ڈاکٹر ہومیو اسٹور، فرنٹیئر مارکیٹ، سائیوال
- ڈاکٹر میڈیکل اسٹور انصیر اسکوائر ایف بی ایریا
- ڈاکٹر میڈیکل اسٹور بالمقابل عباسی شہید ہسپتال اعظم آباد، کراچی 2628814
- ڈاکٹر ہومیو اسٹور اقبال پلازہ ناگن چورنگی کراچی فون: 6946508
- ڈاکٹر شیراز ہومیو پیتھک اسٹور اینڈ کلینک 34 نکلسن روڈ لاہور فون: 042-6369691-93
- ڈاکٹر ہومیو ریز 8۔ ہسپتال بازار اکاؤنٹ فون: 0442-514686
- ڈاکٹر عمران ہومیو اسٹور النور فون: 6801924
- ڈاکٹر لطیف ہومیو کلینک اینڈ اسٹور 5 عبداللطیف خان پلازہ منڈیاں، ایبٹ آباد
- ڈاکٹر لائف ہومیو اسٹور آرام باغ روڈ، کراچی
- ڈاکٹر خواجہ میڈیکل اسٹور بالمقابل امپریس مارکیٹ، صدر کراچی
- ڈاکٹر باب الشفاء واحد خانہ اندرون بنگالی مارکیٹ گھنٹہ گھر، ملتان 574058
- ڈاکٹر بادشاہ دی جنتی۔ نزد کیلی چوک ڈھوک کھبہ راولپنڈی فون: 5505519

ایک ماہ کا کورس 180 روپے۔ گھر بیٹھے V.P پارسل منگوانے کیلئے خط لکھیں

مرض کی تشخیص وعلاج ریڈیونک کمپیوٹر کی مدد سے (خون یا تھوک کے نمونے سے ٹیسٹ)
دیگر امراض کے لئے خط وکتابت بالمشافہ ملاقات کے لئے کلینک پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

ہومیو ڈاکٹر شوکت علی (پینل۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان)

کلینک شاپ نمبر 2 SC-19 بلاک N نارتھ ناظم آباد کراچی ٹیلی فون نمبر: 6647312 موبائل 0300-9229413
کلینک کے اوقات (صبح 11 سے 1 شام 6 سے 10)
E-mail: hdr_shoukatali@hotmail.com

کر رہے ہو۔ میں بھلا اپنے بچے کو ضائع کیوں کروں گی؟''

''ان دنوں آپ کے اندر ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ شادی کے بعد بھی آپ کو کنواری دوشیزہ نظر آنا چاہئے، بچہ ابھی نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ضرر رساں دواؤں نے کچھ اثر کیا کچھ نہیں کیا۔ اور آپ نے عدنان کو جنم دے دیا۔''

''تم بے تکی باتیں کر رہے ہو۔ اگر میں بچے کو جنم دینا نہیں چاہتی تو میرا یہ بیٹا کیسے پیدا ہوتا؟''

''جی ہاں..... اپنے مقدر سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ضرر رساں دواؤں کے باعث ابنارمل ہو گیا۔''

وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی ''پہلے تو تم نے الزام لگایا کہ میں نے تمہارے پھوپا کو قتل کیا ہے پھر فوراً ہی بات بدل دی کہ جو کچھ ہوا تھا، محض دھوکے سے ہوا تھا اب یہ الزام دے رہے ہو کہ میں اپنے بیٹے کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی اور جب جنم دیا ہے تو اسے ضرر رساں دواؤں کے ذریعے ابنارمل بنا دیا ہے۔ ادھر میری آسرا کا دل یہ کہہ کر توڑ دیا ہے کہ اس کی شادی کبھی نہیں ہو سکے گی۔ آخر تم کیا چاہتے ہو کیوں میرے بیٹے اور بیٹی کے خلاف ایسی باتیں کر رہے ہو؟''

''پھوپی جان! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نجومی کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی اس کے منہ سے ہاتھ کی لکیریں بولتی ہیں۔ ویسے جو کچھ میں نے کہا ہے اسے سن کر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ جو غلطیاں آپ سے ہوئی ہیں وہ غلطیاں دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ دوسرے اپنی کمزوریاں چھپا لیتے ہیں۔ اگر آپ اپنا ہاتھ نہ دکھاتیں تو آپ کی غلطیاں اور کمزوریاں بھی چھپی رہتیں۔''

وہ بولی ''نہ میں اپنے شوہر کی دشمن تھی نہ اپنے بیٹے کی دشمن ہوں۔ یہ تو کوئی ماننے والی بات نہیں ہے کہ میں اپنے ہی شوہر سے اور اپنی اولاد سے دشمنی کروں گی۔''

''میں ماضی کی جو بھی باتیں بتاؤں گا اسے فوراً ہی جھٹلا دیا جائے گا اور ایسا میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ کبھی مجھے جھٹلا دیتے ہیں لیکن جب مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہوں اور وہی بات سامنے آتی ہے تو مجھے جھوٹا کہنے والوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔''

''کیا اب میرے مستقبل کے بارے میں بھی پیش گوئی کرو گے؟''

''جی ہاں! صرف دو اہم باتیں بتاؤں گا تاکہ جب یہ باتیں سچ ثابت ہوں تو یہاں تمام سننے والوں کو یقین ہو جائے کہ میں سچ کہتا ہوں۔''

گھر کے تمام افراد بڑی توجہ اور دلچسپی سے میری با سن رہے تھے۔ میں نے کہا ''میری پہلی پیش گوئی تو یہ آپ عنقریب اپنے ایک بدترین دشمن کو دوست گی۔ دوسری پیش گوئی یہ ہے کہ آپ اپنی بیٹی آسرا کو موت کے قریب لے جانا چاہیں گی۔''

وہ پریشان ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی پھر بڑے دکھ بولی ''تم سب کے سامنے ایسی باتیں کر رہے ہو جن سے میر توہین ہو رہی ہے۔''

''کیا کروں پھوپی جان! میں دوسروں کے آگے کی راز ظاہر نہیں کرتا لیکن جب کوئی میرے آگے اپنی ہتھیلی ہے تو اس کے ہاتھ کی لکیریں میری زبان سے بولنے ہیں۔''

میں نے فلک ناز کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''آ میری پھوپی ہیں میں خوامخواہ آپ کی مخالفت نہیں کروں میں جانتا ہوں کہ قسمت کی لکیریں بدلتی رہتی ہیں ہو سکتا آسرا کے ہاتھ میں شادی کی لکیر اتنی گہری ہو جائے کہ تعلق میرے ہاتھ کی لکیر سے ہو جائے اور وہ میری بن جا

وہ ایک دم سے چونک کر خوش ہو کر مجھے دیکھنے گی نے کہا ''کاتب تقدیر کے کھیل بڑے انوکھے اور نا قابل ہوتے ہیں۔ کبھی ہونی انہونی ہو جاتی ہے اور کبھی انہونی ہو جایا کرتی ہے۔''

میں نے ایسا کہتے ہوئے اس کے شانے پر اپنے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا جیسے اشارتاً کہہ رہا ہوں کہ ''میں آپ کا ہوں آپ ہی کا داماد بننے والا ہوں۔''

وہ اندر سے مرجھا گئی تھی ایک دم سے کھل اٹھی، میرے گال پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے بولی ''تم نے تو نجومی مجھے الجھا ہی دیا تھا۔ ٹھیک ہے بیٹا! ہوا آسرا کے جا رہی ہوں۔ اسے تسلی دوں گی پھر تم سے نہائی میں کروں گی۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی تو بیگم آفتاب نے طرف بڑھتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا بیٹا! جو تم نے سامنے اس کی حقیقت بتا دی۔ مگر ہے بڑی ڈھیٹ عورت کر رہی تھی۔''

فلک آفتاب نے کہا ''تم بہت چالاک ہو بیٹے نے اس کے سامنے کڑوا سچ کہا۔ پھر اپنی باتوں سے گھول دی۔ آسرا کے بارے میں یہ آسرا دیا کہ اس کی لکیر بدل سکتی ہے اس کی شادی ہو سکتی ہے یہ سن کر تو

بے گھر

میرا باپ اور دادا بھی یکتائے روزگار کردار تھے۔ لیکن میں نے اپنے دادا کے بھائی کے متعلق ایک بات سنی تھی جو کبھی نہیں بھول پایا۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھا۔ ہر رات وہ مٹاتی مٹی کے ساتھ نیچو کے پتے بھگو کر رکھتا تھا اور منہ اندھیرے دو میل پیدل چلتے ہوئے شکار پور کی حویلی کے قریب ایک کنوئیں پر جا کر نہاتا تھا۔ چاہے کتنی بھی شدید سردی ہو وہ نہانے ضرور جاتا تھا۔

ایک بار وہ جاڑے میں نہا کر گھر لوٹا تو اسے فیض پر ایک چیونٹی کو احتیاط سے پکڑ کر ایک شیشی میں رکھا اور میری دادی سے کہا ''میں کنوئیں پر جا رہا ہوں۔''

''کیوں، ابھی تو آئے ہو؟'' میری دادی نے حیرت سے پوچھا ''یہ چیونٹی میرے کپڑوں پر اسی کنوئیں کے قریب سے چڑھی ہے۔ اس کا گھر وندا اس کنوئیں کے آس پاس ہوگا۔ میں اسے اس کے گھر پہنچانے جا رہا ہوں۔'' میرے دادا کے بھائی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو اس کے گھر سے بے گھر کرنے جیسا بڑا گناہ دنیا میں کوئی بھی نہیں۔''

(شیخ ایاز کی ڈائری سے)

مرسلہ: ایس اختر ساگر، منڈی بہاؤالدین

ہو گئی کہ آسرا تمہاری دلہن بن سکتی ہے۔''

میں نے کہا ''بڑے لوگ میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے یہ سچ ہو سکتا ہے۔''

نمرہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ''ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن یہ مان لو کہ اکثر جو ہم نہیں سوچتے وہی سامنے آ جاتا ہے۔''

نمرہ مجھے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنی ہتھیلی میری طرف پھیلا دی ''مجھے بتاؤ میری لکیریں کیا کہتی ہیں۔''

میں نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اس بہانے اسے چھونے کا موقع مل گیا اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو رہی تھیں کیونکہ پہلی بار کسی چاہنے والے کے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ آیا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کھلتا ہوا گلاب میرے ہاتھوں میں آ گیا ہے پھر میں نے کہا ''میں تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں بتا سکتا ہوں کہ تم پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔''

لوگ توجہ سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نمرہ کے ساتھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا، پھر بولا ''تم میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہو ایک ماہ پہلے تم نے ایک پریکٹیکل کلاس اٹینڈ کی اپنے پروفیسر اور طلبہ و طالبات کے ساتھ ایک مردہ گھر میں گئیں تم ذرا ڈرپوک ہو اندر سے سہمی ہوئی تھیں اور اس مردہ خانے میں جا کر مردوں سے نظریں چرا رہی تھیں جو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ بیچارے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری جیسی خوبصورت لڑکی وہاں آئی ہوئی ہے۔ لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی ایک نوجوان لاش کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تمہیں یوں لگا جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

نمرہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی میں نے پوچھا ''کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا میں نے کہا ''اب میں تم سے پوچھتا ہوں تمہیں ایسا کیوں لگا کہ وہ مردہ تمہیں دیکھ رہا تھا؟''

اس نے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا پھر کہا ''اس مردہ خانے میں جب پروفیسر مختصر سا لیکچر دے رہا تھا تب میں نے دیکھا تھا اس مرد نے پلک جھپکائی تھی پھر دوسرے ہی لمحے میں اسی طرح اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ وہاں سے باہر آ کر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ یہ میرا وہم تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اس مردہ گھر میں جگہ جگہ ٹھنڈک کی وجہ سے برف جمی ہوئی تھی مردے جمی ہوئی برف کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔ کوئی زندہ شخص دن رات وہاں نہیں رہ سکتا تھا اگر وہ مردہ نہیں تھا، زندہ تھا تو اتنی ٹھنڈک میں نہیں رہ سکتا تھا۔''

''میں نے کہا'' آگے تم نہ بولو میں بولتا ہوں تم پچھلے ایک ماہ سے آسیب زدہ ہو تمہیں ایسا لگ رہا ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ اسکی کھلی ہوئی آنکھیں چھپ چھپ کر کہیں نہ کہیں سے تمہیں دیکھتی رہتی ہیں۔''

اسما، عینی، عروج سبھی دم سادھے یہ باتیں سن رہی تھیں۔

بیگم آفتاب نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''ہائے میں مرجاؤں یہ میری بچی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

فلک آفتاب نے کہا ''بیٹی تم آسیب زدہ ہو کر کسی سے خوف زدہ ہو اور ہم سے یہ بات چھپاتی رہتی ہو؟''

ماں نے کہا ''کوئی بدروح اس کے پیچھے لگی ہے۔''

ذیشان نے کہا ''ممی آج کے ترقی یافتہ دور میں آپ بدروحوں کی باتیں کر رہی ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' ذرا مقدر میاں کی باتیں تو سن لیتے دیں۔''

اسانے کہا ''مقدر میاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ تم نے علم نجوم میں بڑی مہارت حاصل کی ہے۔''

میں ان کی باتوں کے دوران میں نمرہ کی نرم و نازک ہتھیلی کو سہلا رہا تھا اسے ایک طرح سے یہ سہارا مل رہا تھا کہ آسیب ہو' جن ہو' یا کوئی بلائے ناگہانی ہو اس کا ہاتھ ایک محافظ کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ وہ بولی ''تم ایسی باتیں بتا رہے ہو جنہیں کوئی نہیں جانتا صرف میں محسوس کرتی رہتی ہوں۔ کیا یہ بتا سکتے ہو کہ واقعی وہ آنکھیں مجھے دیکھتی رہتی ہیں؟''

''اگر دیکھتی رہتی ہیں تو کیسے؟ کیا وہ مردہ نہیں ہے؟''

''جب اس مردے کے ہاتھ کی لکیریں پڑھوں گا تو بتا سکوں گا۔ ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تم بتا سکتے ہو؟''

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر کہا ''فرسٹ ایئر میں ڈائی سیکشن کی کلاس ہوتی ہے اس کلاس میں مردے کو ایک بڑی سی میز پر ڈالا جاتا ہے۔ وہاں آپریشن کے تمام آلات رکھے جاتے ہیں۔ طلبا و طالبات کو بتایا جاتا ہے کس طرح انسانی جسم کو چیر کر آپریشن کیا جاتا ہے اور پھر کس طرح ٹانکے لگائے جاتے ہیں لیکن اس روز ڈائی سیکشن کی کلاس نہ ہو سکی' کیونکہ اسپتال کے دو بھنگیوں نے آکر اطلاع دی کہ مردہ گھر سے جس نمبر کے مردے کو لانے کے لیے کہا گیا تھا اس نمبر کا مردہ وہاں نہیں ہے' غائب ہو گیا ہے۔''

''کیا.....؟'' سب حیرانی سے کبھی مجھے اور کبھی نمرہ کو دیکھنے لگے بیگم آفتاب نے گھبرا کر پوچھا ''نمرہ کیا یہ سچ ہے وہ مردہ غائب ہو گیا تھا؟''

نمرہ نے کہا ''جی ہاں! یہ درست کہہ رہے ہیں۔ اسپتال میں اس بات پر ہنگامہ برپا ہو گیا تھا یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ مردہ خود ہی اٹھ کر اپنے پیروں سے چلتا ہوا اس مردہ گھر سے باہر کہیں چلا گیا ہو گا۔''

عینی نے پوچھا ''اگر وہ خود کہیں نہیں گیا تھا تو پھر غائب کیسے ہو گیا تھا؟''

نمرہ نے کہا ''پولیس والے اس اسپتال کے وارڈ بوائز کی اور بھنگیوں کی پٹائی کرنے لگے پوچھنے لگے کہ وہ مردہ کہاں ہے۔ چند سال پہلے ایسے دو مجرم پکڑے گئے تھے جو مردہ گھر سے مردے چرا کر دوسرے اسپتالوں میں لے جا کر فروخت کرتے تھے۔ کتنے ہی اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں لاوارث مردوں کی سخت ضرورت پڑتی رہتی ہے ان مردوں کے ذریعے طلبا و طالبات کو انسانی اعضا کے بارے میں تفصیل سے بتایا جاتا ہے پولیس والوں کا اور اسپتال کے منتظمین کا خیال تھا کہ وارڈ بوائز یا بھنگیوں نے اس مردے کو لے جا کر کہیں فروخت کر دیا ہے۔''

میں نے کہا ''اگر ایسا ہوا تھا تو کوئی مجرم پکڑا نہیں گیا۔ ثابت نہیں ہو سکا کہ مردہ چوراسے چرا کر لے گئے ہیں۔''

بیگم آفتاب نے سہم کر کہا ''پھر تو وہ مردہ نہیں ہو گا کوئی بدروح ہو گی جو میری بیٹی کا پیچھا کر رہی ہے۔''

بابر نے کہا ''ممی آپ خوامخواہ نمرہ کو خوف زدہ کرنے والی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ کوئی نیک روح یا بدروح ہوا کرتی ہے۔ کیوں مقدر بھائی؟ جب آپ اتنی باتیں جانتے ہیں تو اس روح کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے ہوں گے۔''

''میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کچھ بتا سکتا ہوں اور میں نے اس مردے کا ہاتھ نہیں دیکھا میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں..... جتنا کہ نمرہ کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں۔''

اسانے کہا ''مقدر میاں! تم نے تشویش میں مبتلا کرنے والا تجسس پیدا کر دیا ہے۔ آگے کچھ بتاؤ؟''

میں نے نمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ''میں آگے بتاؤں؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنے ہاتھ میں کو اور اپنے بھائی جان کو دیکھا پھر التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے کہا ''چلو ہم دوسری باتیں کرتے ہیں۔''

عینی نے کہا ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ ہمیں تجسس میں مبتلا کر کے بات بدل رہے ہیں۔''

میں نے کہا ''میری بہنا! میں کسی کی مرضی سے اس کا ہاتھ دیکھتا ہوں جب وہ مجھے کچھ کہنے سے منع کر دے تو میری زبان بند ہو جاتی ہے۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے تھا کہ میں اس خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس وقت سب کے سامنے نمرہ کا ہاتھ میرے ہاتھ

میں آگیا تو میں نے اس کا ہاتھ دیکھ لیا۔ اس کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گی جو اس کے لیے بہت اچھا ثابت ہو گا۔ اس کی زندگی میں بہت سی خوشیاں آئیں گی۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہو گی۔ اس کے ہاں اولاد نرینہ ہو گی۔ اس کی عمر لمبی ہو گی۔ اس کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی۔ اس کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک طویل سفر پر جائ

عینی اور عروج پریشان ہو کر بیگم آفتاب، فلک آفتاب اور ذیشان وغیرہ کو دیکھنے لگیں۔ یہ بھید کھل رہا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی شخص کو چاہتی ہیں، انہیں ایک ہی شخص کے نکاح میں آ کر سوکن بن کر رہنا گوارہ تھا۔

عروج نے جلدی سے کہا ''بھائی جان! آپ یہ بات رہنے دیں صرف اتنا بتا دیں کہ پاشا عینی کی زندگی میں آئے گا یا نہیں؟''

میں نے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''صرف..... ایک ہی کی نہیں دونوں کی زندگی میں آئے گا۔''

وہ دونوں خوش ہو گئیں عروج نے کہا ''اس کا مطلب ہے پاشا زندہ ہے اور وہ ضرور واپس آئے گا۔''

ذیشان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے کہا۔ ''مقدر میاں یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو کہ ان دونوں کا جیون ساتھی ایک ہی ہوگا اور دونوں کے ہاتھ دیکھ کر کہہ رہے ہو کہ وہ ایک کی نہیں دونوں کی زندگی میں آئے گا؟''

میں نے ذیشان سے کہا ''بھائی جان میں کچھ نہیں کہتا یہ جو ہاتھ کی لکیریں ہوتی ہیں یہ میرے منہ سے زبان بن کر بولنے لگتی ہیں اور یہ سچ ہے کہ یہ ایک دوسرے کی سوکن بن کر رہنا چاہتی ہیں'' ذیشان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے عروج کو دیکھتے ہوئے کہا ''مقدر میاں نے اب تک جتنی باتیں بتائی ہیں سب ہی سچ ہو رہی ہیں کیا تم تسلیم کرتی ہو کہ عینی کی سوکن بن کر رہنے کا ارادہ ہے؟''

عروج نے سر جھکا لیا۔ عینی نے کہا ''بھائی جان پلیز ناراض نہ ہوں ہم دونوں بچپن سے ساتھ رہتی آئی ہیں اور آخر وقت تک ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں گی ایک ہی چھت کے نیچے اور ایک ہی مجازی خدا کے سائے میں۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے کوئی جرم نہیں ہے۔''

اسما نے کہا ''عینی کیوں بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟ سہیلیاں بن کر رہنا بہت آسان ہے لیکن سوکن بن کر رہنا ممکن نہیں ہے۔''

بیگم آفتاب نے کہا ''عروج ہم تمہیں عینی سے زیادہ سمجھدار مانتے ہیں۔ تم ایسی غلطی کیوں کرنا چاہتی ہو جو دنیا کی کوئی عورت جان بوجھ کر نہیں کرتی۔''

عروج نے کہا ''ہماری دنیا کی کتنی ہی عورتیں ایسی غلطی کرتی ہیں۔ کبھی تو ایک عورت دوسری عورت پر سوکن بن کر آتی ہے پھر دونوں ہی حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔''

ذیشان نے ناگواری سے کہا ''ایسے احمقانہ دلائل نہ دو دو عورتیں مجبوراً ایک دوسرے کی سوکن بنتی ہیں اور ہماری عینی کے لیے کوئی مجبوری نہیں ہے یہ تمہاری محبت میں اندھی ہو کر ایسی بات مان رہی ہے جسے عقل تسلیم نہیں کرتی۔ مقدر میاں! تم عینی کو سمجھاؤ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ عقل آنی چاہیے مگر یہ پچی بنتی جا رہی ہے۔''

میں نے کہا ''میں ان دونوں کو نہیں سمجھا سکتا آپ بھی نہیں سمجھا سکتے۔ کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا ان کے مقدر میں جو لکھا ہے وہی ہونے والا ہے۔''

فلک آفتاب نے کہا ''ہم ایسے مقدر کو نہیں مانتے اگر یہ غلطیاں کر رہے ہیں تو انہیں روکنا ہمارا فرض ہے۔''

''ہماری گھریلو کہانیاں، سماجی اور معاشرتی کہانیاں اسی طرح بنتی ہیں کہ ہم مقدر کو نہیں مانتے اس کے خلاف لڑتے ہیں۔''

عروج نے میرا ایک ہاتھ تھام لیا عینی نے دوسرا ہاتھ تھام لیا دونوں نے مجھے التجا آمیز نظروں سے دیکھا پھر بیک وقت دونوں کی زبان سے نکلا ''پاشا.....؟''

''پلیز! اتنا بتا دیں پاشا زندہ سلامت ہے نا؟''

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا عروج نے تڑپ کر پوچھا ''وہ واپس آئے گا نا؟''

میں نے ایک گہری سانس لی پھر کہا ''[illegible] کے برابر آئے گا۔ وہ ملے گا لیکن ملتے ہوئے بھی نہیں ملے گا۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''پاشا تم دونوں کے لیے ایک خوشبو کی طرح ہے کیا کوئی خوشبو کو مٹھی میں بند کر سکتا ہے؟''

دونوں نے انکار میں سر ہلا دیا ''کیا خوشبو کو کوئی چھو سکتا ہے؟''

دونوں نے بیک وقت کہا ''نہیں..... لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟''

''یہی کہ وہ تمہاری زندگی میں ایک خوشبو کی طرح آئے گا تمہاری سانسوں میں بستا رہے گا لیکن ہاتھ نہیں آئے گا اس سے آگے نہ کچھ پوچھو نہ میں کچھ بولوں گا۔'' یہ کہہ کر میں ان کے پاس سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

پاشا بیڈ کے سرہانے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا وہ اسی بارے میں تجسس تھا یہ معلوم کرنے کی بے چینی تھی کہ وہ کون ہے؟ اور اب سے پہلے کیسی زندگی گزار رہا ہے؟

کچھ تو ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا اور کچھ دردانہ بیگم اور شہباز درانی نے سمجھایا تھا انہوں نے اس کا شناختی کارڈ اسے دکھایا تھا جس پر لکھا تھا سلامت پاشا جانی ولد شہباز درانی۔ اس شناختی کارڈ کے ذریعے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ شہباز درانی اس کا باپ ہے اور دردانہ بیگم نے ایک البم اسے دی تھی ..... ان تمام تصویروں کو دیکھنے سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ دردانہ بیگم کا بیٹا ہے اور بچپن سے اس کی گود میں پرورش پاتا رہا ہے۔ جوانی میں بھی اس کی تصویر دردانہ بیگم کے ساتھ تھی اور ہر تصویر میں دردانہ اپنی ممتا اس پر نچھاور کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

دردانہ نے اسے دو ڈائریاں دیتے ہوئے کہا تھا ''یہ تم نے لکھی ہیں انہیں پڑھو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ اب تک تم کن حالات سے گزرتے آئے ہو۔''

دوسری ڈائری سالِ رواں کی تھی۔ اس کے آخری چند ماہ کے صفحات سادے تھے اس نے نرس سے کہا ''مجھے ایک قلم لا کر دو میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔''

نرس وہاں سے گئی پھر ایک قلم لا کر اسے دیا اس نے پوچھا ''یہ کون سا مہینہ ہے آج کون سا دن اور کون سی تاریخ ہے؟''

نرس نے اسے مہینا دن اور تاریخ بتائی۔ وہ اسی تاریخ کے صفحے پر لکھنے لگا ''یہ میری زندگی میں کیسا موڑ آیا ہے کہ میں خود کو بھول چکا ہوں؟ میری ممی اور ڈیڈی نے بتایا ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں، انہوں نے بہت سی تصاویر بھی دکھائی ہیں۔ شناختی کارڈ بھی دیا ہے یہ ڈائریاں بھی دی ہیں تاکہ میں اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ جان سکوں اور پچھلی زندگی کو یاد کر سکوں۔

میں اپنے شناختی کارڈ کو جھٹلا نہیں سکتا۔ البم میں جو تصویریں ہیں وہ بالکل میری اور میری ممی کی ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ڈائریاں میں نے لکھی ہیں یا نہیں؟ لہٰذا انہیں پڑھنے سے پہلے میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں پھر اس تحریر سے اس ڈائری کی تحریر کا موازنہ کروں گا۔ میں پوری طرح یقین کرنا چاہتا ہوں کہ جو زندگی میرے سامنے ہے وہی میری ہے اور ایسی ہی زندگی میں گزارتا آیا ہوں۔''

اس نے اتنا لکھنے کے بعد قلم بند کر دیا پھر اوراق الٹ کر اس ڈائری میں لکھی ہوئی تحریر کو دیکھنے لگا۔ کبھی اسے دیکھ رہا تھا کبھی اپنی لکھی ہوئی تحریر کو دیکھ رہا تھا دونوں ہی ایک جیسی تھیں، اگر ان میں کوئی بال برابر فرق ہوگا تو وہ اس فرق کو نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ وہ کوئی ماہر تحریر شناس نہیں تھا۔

فی الحال تصدیق ہو گئی کہ وہ اسی کی لکھی ہوئی ڈائریاں ہیں پھر وہ اس ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کبھی اِدھر سے تو کبھی اُدھر سے پڑھنے لگا جہاں اسے دلچسپی ہوتی تھی وہ اس صفحے کو پڑھنے لگتا تھا۔

ایک صفحے پر لکھا تھا ''شاید میں اسی لیے بیمار ہوا تھا کہ عروج میری زندگی میں مسیحا بن کر آئے گی میں اسپیشل وارڈ کے ایک کمرے میں ہوں۔ اور عروج صبح و شام میرا معائنہ کرنے کے لیے آتی ہے۔ کیا حسن ہے کیا شباب ہے میں تو اسے دیکھتے ہی اپنی بیماری بھول کر اس کا بیمار ہو گیا ہوں سوچتا ہوں اسے کس طرح اپنی طرف مائل کروں؟

میری زندگی میں اب تک کئی لڑکیاں آ چکی ہیں لیکن عروج ان سے مختلف ہے اور سنجیدہ مزاج کی حامل ہے ایسی لڑکیوں کو اپنی طرف فوراً مائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔''

دوسرے صفحے پر لکھا تھا آج اس نے اسٹیتھسکوپ کو دونوں کانوں سے لگا کر اسے میرے سینے پر رکھا تو میں نے کہا ''میرے دل کی دھڑکن یوں تو نارمل رہتی ہے لیکن تم قریب ہوتی ہو تو نہ جانے یہ دھڑکنیں کیوں پاگل ہونے لگتی ہیں۔''

وہ سنجیدہ رہنے والی ڈاکٹر پہلی بار مسکرائی پھر بولی۔ ''مریضوں کو زیادہ بولنا نہیں چاہیے۔''

میں نے کہا ''بیمار اپنے مسیحا سے بولے گا۔ تبھی اس کا خاطر خواہ علاج ہو سکے گا۔''

اس نے مسکرا کر کہا ''لگتا ہے تم عاشق مزاج ہو۔''

میں نے جھوٹ کہا ''میری زندگی میں کوئی لڑکی آج تک نہیں آئی میں نے کل پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ تب سے نہ جانے کیوں تمہارے ہی بارے میں سوچتا چلا جا رہا ہوں۔''

وہ بولی ''میں تم سے صاف کہہ دوں کہ میں ایک معزز لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ عشق کے چکر میں پڑ کر تماشا بننا نہیں چاہتی۔''

''میں بھی تماشا بننا نہیں چاہتا۔ اگر مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو لو میں تمہارے بارے میں بہت ہی سنجیدہ ہوں۔''

اس نے ڈائری کے دوسرے اوراق الٹے پھر ایک صفحے کو پڑھا اس میں لکھا تھا میں پچھلے دو دنوں سے باتوں میں اسے الجھا رہا ہوں اور یہ سمجھ رہا ہوں کہ وہ میری طرف مائل ہو رہی ہے۔ آج اس نے میری نبض ٹٹولنے کے لیے کلائی پکڑی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا پھر بازوؤں میں دبوچ لیا وہ ذرا کسمسائی اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ بڑی بے جان کوششیں تھیں یوں لگ رہا تھا کہ خود کو میرے حوالے کرتی جا رہی ہے اور شرما نے لجانے کا رسمی تکلف کر رہی ہے۔

ایک اور صفحہ پر لکھا تھا ''اسپتال سے چھٹی مل چکی ہے، اس کے ساتھ ہی ہمارے درمیان بے تکلفی بڑھ چکی ہے اب وہ ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد مجھ سے دفتر میں آکر ملتی ہے۔ اسپتال کے پیچھے وہ ایک کوارٹر میں رہتی ہے۔ ایک رات میں اس کے کوارٹر میں پہنچ گیا اس نے کہا ''یہاں کیوں آئے ہو میں بدنام ہو جاؤں گی۔''

اس کا وہ اعتراض بھی برائے نام تھا۔ میں نے پہلی بار اس کے ساتھ ایک رات وہاں گزاری جب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ رہا تو اس نے کہا ''میری ایک بچپن کی کمی ہے اس کا نام عینی ہے۔ بے انتہا دولت مند ہے میں اس کی دولت پر قبضہ جمانا چاہتی ہوں کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟''

میں نے پوچھا ''تم کیا چاہتی ہو؟''

اس نے کہا ''میں نے تمہاری تصویر اسے دکھائی تھی وہ تمہیں دیکھتے ہی تمہاری دیوانی ہو گئی ہے۔ میں اس پر ظاہر نہیں کروں گی کہ ہمارے درمیان ایسے تعلقات قائم ہو چکے ہیں میں چاہتی ہوں تم اس سے محبت کرو اور اس سے شادی کرو پھر ہم دونوں اس کی دولت پر عیش کریں گے۔''

میں نے کہا ''میں اس قدر دولت مند ہوں کہ اس کی دولت کا لالچ نہیں کر سکتا۔''

''تم دولت مند ہو میں تو نہیں ہوں، میں تمہارے ذریعے رفتہ رفتہ اس کی ساری دولت اور جائیداد حاصل کر سکتی ہوں کیا تم میری خاطر ایسا نہیں کرو گے؟''

میں تو حسن پرست ہوں اور یہی چاہتا ہوں کہ نت نئی لڑکیاں میری زندگی میں آتی جاتی رہیں۔ میں عروج کے ذریعے عینی کو حاصل کر سکتا تھا اس لیے راضی ہو گیا۔

ڈائری میں جا بجا یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے باپ شہباز درانی کا کاروبار کیا ہے اور وہ کس طرح اپنے باپ کے کاروبار میں اس کا ساتھ دیتا رہتا ہے۔ ایک صفحے پر لکھا ہوا تھا کہ شہباز درانی سیاست کا بہت بڑا کھلاڑی ہے اس کی پہنچ یہاں سے واشنگٹن تک ہے۔

پاشا اپنے باپ کے ساتھ خطرناک سیاسی کھیل کھیلتا ہے۔ مقامی سیاستدانوں سے اور انڈر ورلڈ کے بڑے بڑے مجرموں سے ان کے اختلافات بڑھتے رہتے ہیں اور خون خرابہ ہوتا رہتا ہے۔ پاشا نے اب تک اپنے باپ کے دو مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

پاشا اپنی ڈائری میں اپنی ہی یہ تحریر پڑھ کر پریشان ہو گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے قتل بھی کئے ہیں اور ایک سپر پاور کا آلۂ کار بن کر ملکی مفادات کے خلاف بھی کام کرتا رہا ہے۔

وہ ڈائری پاشا کی زندگی کے کتنے ہی پہلوؤں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ ایک پہلو تو یہی تھا کہ وہ عروج اور عینی سے ملوث ہو رہا تھا' دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے باپ شہباز درانی کے ساتھ خطرناک سیاسی کھیل کھیلتا رہا تھا۔

ایک صفحے پر پاشا کی تحریر میں لکھا ہوا تھا کہ آج عروج نے عینی سے ملاقات کروائی، میں اسے دیکھتے ہی حیران رہ گیا ایک تو اس لیے کہ وہ بہت ہی خوبصورت اور پرکشش تھی۔ دوسری بات یہ کہ وہ میری ممی کی سوتیلی بیٹی تھی۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ شادی سے محض اس لیے انکار کرتی رہتی تھی کہ میں اس کی سوتیلی ماں کا بیٹا ہوں اور وہ کسی سوتیلے سے رشتہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر یہ کہ وہ بہت مغرور تھی۔ میری ممی سے اس کی نہیں بنتی تھی، اور میری ممی اتنی نرم دل خاتون ہیں کہ ہزار اختلافات کے باوجود انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں عینی کو چاہتا ہوں تو وہ اسے بہو بنانے کے لیے راضی ہو گئی تھیں۔

لیکن عینی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے تھے جب عروج نے اس سے ملاقات کرائی تو ہم نے بتایا کہ ہم دونوں تو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے سے سوتیلا رشتہ ہے۔ میں نے عروج کے سامنے شادی کی پیش کش کی۔ عینی نے کہا۔ ''میں اس شرط پر شادی کروں گی کہ تم ماں باپ کے ساتھ نہیں، میرے ساتھ رہو گے۔''

میں نے یہ بات اپنی ممی کو بتائی، ممی نے کہا ''بیٹا! ہم تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ اگر تم اسے دل و جان سے چاہتے ہو اور اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

میرے ڈیڈی نے کہا ''تم ہمارے ایک ہی بیٹے ہو جہاں بھی رہو گے' ہمارے ہی بیٹے کہلاؤ گے۔ ہماری تمام تر دولت و جائیداد تمہاری ہی رہے گی اور پھر تم عینی کے ساتھ رہ کر بھی در پردہ میرے سیاسی کھیلوں میں میرا ساتھ دیتے رہو گے۔''

دوسرے صفحے پر لکھا تھا ''میں نے عینی کو اپنے ماں باپ کا فیصلہ سنا دیا ہے اور یہ کہ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ رہوں گا اور اپنے ماں باپ سے ہفتے میں ایک آدھ بار ملاقات کرتا رہوں گا۔''

عینی نے اپنے وکیل اخلاق احمد سے بات کی اور فیصلہ سنایا ''وکیل اخلاق احمد کو ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا

لیکن اس کے تایا ابو کے بیٹے ایس پی ذیشان نے مخالفت کی۔ اِدھر میں نے عروج سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں عینی کو شادی کے بعد دھوکا نہیں دوں گا اور اس کی دولت اور جائیداد پر عروج کو قبضہ جمانے کا موقع نہیں دوں گا۔ اس بات پر عروج مجھ سے ناراض ہو گئی مجھے پتہ چلا کہ اسے دشمنی مہنگی پڑے گی۔ میں نے ہنس کر اسے ٹال دیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں سیاست کا کتنا خطرناک کھلاڑی ہوں۔ زندگی اور موت کا کھیل کھیلتا رہتا ہوں۔''

اس نے ڈائری کا ایک اور ورق الٹ کر پڑھا وہاں لکھا تھا۔ ''آج عروج کی اصلیت اور اس کی کمینگی کا پتا چل گیا۔ یہ معلوم ہوا کہ اس کے اور ایس پی ذیشان کے ناجائز تعلقات ہیں اور وہ دونوں عینی اور میرے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔

میں نے عینی کو تنہائی میں سمجھایا کہ عروج کو تم جان سے زیادہ عزیز کہتی ہو اور اپنے ایس پی بھائی جان پر بہت بھروسا کرتی ہو۔ لیکن وہ دونوں ہی تمہاری خوشیاں نہیں چاہتے۔ ہماری شادی کی مخالفت کر رہے ہیں۔''

عینی نے کہا ''تم میری کمزوری کو بہت غلط سمجھ رہے ہو وہ تو میری شادی کے اس فیصلے سے بہت خوش ہے البتہ بھائی جان ناراض ہیں۔ وہ صرف اس لیے کہ تم لوگوں سے سوتیلا رشتہ ہے۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ میں بہو بن کر سوتیلی ماں کے گھر جاؤں۔''

''کیا تم نے یہ نہیں بتایا کہ شادی کے بعد میں تمہارے پاس آکر رہوں گا؟''

''میں نے بتایا ہے لیکن انہیں یقین نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کچھ دنوں تک میرے ساتھ رہو گے پھر مجھے اپنی ماں کے پاس چلنے پر مجبور کر دو گے اور میں ایک بیوی کی حیثیت سے مجبور ہو جاؤں گی۔

افسوس میں عینی کو نہیں سمجھا سکتا وہ عروج اور ذیشان پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔''

اگلے صفحے پر لکھا ہوا تھا ''آج اچانک ہی مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ میں اپنی کار ڈرائیو کرتا جا رہا تھا کہ میرے دائیں بائیں سے گزرتی ہوئی گاڑیوں نے مجھ پر فائرنگ کی۔ میں بال بال بچا ہوں جب میں گھر آیا تو ایس پی ذیشان کی آواز فون پر سنائی دی۔ اگرچہ وہ آواز بدل کر بول رہا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا وہ کہہ رہا تھا ''پولیس والوں نے دشمنی مول لو گے تو موت ہر دم تمہارے آگے پیچھے رہے گی۔ آج تم بچ گئے۔ کل نہیں بچو گے۔''

میں نے عینی کو فون پر بتایا کہ مجھ پر جان لیوا حملہ ہوا ہے اور مجھے پولیس والوں کی طرف سے دھمکیاں ملی ہیں کہ میں تم سے شادی نہ کروں۔

عینی نے پہلی بار اپنے ایس پی بھائی ذیشان کو باتیں سنائیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ شادی ہو کر رہے گی۔ اس نے اس وقت یہ فیصلہ سنایا کہ آج ہی شام کو پاشا سے اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے کہا ''میں ایک جگہ چھپا ہوا ہوں ابھی، میرے لیے خطرہ ہے، نکاح پڑھوانے کے لیے نہیں آسکوں گا۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ ٹیلی فون کے ذریعے ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔

میں ایک جگہ چھپا ہوا ہوں اور وہیں یہ ڈائری لکھ رہا ہوں' ابھی پتا چلا ہے کہ دشمنوں کو میری اس پناہ گاہ کا علم ہو چکا ہے۔ لہٰذا..... اب یہ جگہ بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں، میں نے اپنے دوست سے کہہ دیا ہے کہ یہ سیری ڈائری اور دوسرا سامان میری ممی اور ڈیڈی تک پہنچا دے۔ زندگی رہی تو میں بعد میں آکر ان سے ملاقات کروں گا۔''

اس کے بعد ڈائری کے صفحات خالی تھے۔ آگے کیا ہوا یہ کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ پاشا بے چینی سے سوچنے لگا۔ اس کے بعد میں نے ڈائری کیوں نہیں لکھی؟

پھر خیال آیا کہ وہ ڈائری تو اپنی اس پناہ گاہ میں دوست کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا یہ تو اب اس کی ممی دردانہ اور اس کے ڈیڈی شہباز درانی ہی بتا سکتے تھے۔

اس نے بیڈ کے سرہانے ایک بٹن کو دبایا اس کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ دوسری نرس تیزی سے چلتی ہوئی آئی پھر کہا ''یس سر.....؟''

''میں اپنی ممی اور ڈیڈی سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی ملنا چاہتا ہوں۔''

''یس سر! میں ابھی انہیں اطلاع دیتی ہوں۔''

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ پاشا نے کہا ''ٹیلی فون میرے پاس لا کر رکھا جائے تاکہ میں وقتِ ضرورت ان سے رابطہ کر سکوں۔''

''یس سر! میں ابھی یہاں ٹیلی فون کا انتظام کرتی ہوں۔''

وہ چلی گئی' دس منٹ کے اندر ہی دردانہ اور شہباز تیزی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے پھر دردانہ نے کہا ''کیا بات ہے بیٹے زخم تو ٹھیک ہیں؟ تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟''

''نہیں ممی! میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں بیڈ کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شہباز نے

کہا۔"ہاں بیٹے بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟ پھر وہ اس کے پاس ڈائریوں کو دیکھ کر بولا۔"معلوم ہوتا ہے تم نے ڈائریاں پڑھ لی ہیں۔"

پاشا نے اس کھلی ہوئی ڈائری کو دکھاتے ہوئے کہا۔"یہ پندرہ دن پہلے کی تحریر ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ دشمن میری پناہ گاہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے میں وہ پناہ گاہ چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہوں۔ اس کے بعد ڈائری کے اوراق خالی ہیں۔ میں نے کچھ نہیں لکھا۔"

دردانہ نے کہا۔"کیسے لکھتے؟ حساب کرلو پندرہ دن سے یہاں زخمی حالت میں پڑے ہو تمہارا علاج ہو رہا ہے۔ دشمنوں نے تم پر حملے کیے تھے یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو تمہیں تین گولیاں لگی تھیں خدا کا شکر ہے کہ زخم بھرتے جا رہے ہیں۔"

وہ شہباز سے بولا۔"ڈیڈی! میں نے ڈائری میں پڑھا ہے کہ میں سیاسی کھیلوں میں آپ کے ساتھ خطرناک کھیل کھیلتا رہتا ہوں کیا انہی سیاست کے کھلاڑیوں میں سے کسی دشمن نے مجھ پر حملہ کرایا تھا؟"

"نہیں بیٹے! اگر وہ دشمن ایسا کرتے تو میں اب تک انہیں جہنم میں پہنچا چکا ہوتا، یہ ایس پی ذیشان نے تم پر حملہ کرایا تھا، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے، چونکہ وہ بہت بڑا پولیس افسر ہے اس لیے میں انتقام لینے کے سلسلے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا۔"

دردانہ نے کہا۔"ہمارے آدمیوں نے اطلاع دی تھی کہ جس رات تم پر قاتلانہ حملہ ہوا اس رات عروج ذیشان کے ساتھ اس ویرانے علاقے میں تھی جہاں تم نیم مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں فون پر کسی نے اطلاع دی کہ تمہاری لاش وہاں پڑی ہوئی ہے ہم وہاں جا کر اسے اٹھالیں۔ جب ہم اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں گئے تو خدا کا شکر ہے تمہاری سانس چل رہی تھی ہم فوراً ہی تمہیں یہاں لے آئے۔ ہمارا یہ فیملی ڈاکٹر بہت تجربہ کار ہے۔ وہ تمہیں زندگی کی طرف واپس لے آیا ہے۔"

دردانہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پاشا کے پاس آئی پھر بستر کے سرے پر بیٹھ کر اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔"دشمن جائیں جہنم میں۔ وہ جیئں یا مریں، میرے بیٹے کو نئی زندگی مل گئی ہے۔ مجھے اب کچھ نہیں چاہئے۔"

شہباز درانی نے کہا۔"ہم اپنے بیٹے کی صحت یابی کا جشن منائیں گے لیکن ایس پی ذیشان اور عروج کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میں نے اعلیٰ حکام سے شکایتیں کی ہیں۔ ایس پی ذیشان کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ میں اسے قانونی شکنجے میں لانے کی کوششیں کرتا رہوں گا۔ اگر وہ اس طرح شکنجے میں نہ آیا تو اسے جہنم میں پہنچانے کے لیے چور راستے اختیار کرنے پڑیں گے۔"

دردانہ نے شہباز سے کہا۔"آپ میری بات اچھی طرح سن لیں۔ میں عینی کو اپنی بہو ضرور بناؤں گی۔ میرے بیٹے نے اس کی خاطر گولیاں کھائی ہیں۔ موت سے لڑتا رہا ہے۔"

پھر وہ اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولی۔"تم تو عینی کو دل وجان سے چاہتے ہو ڈائری پڑھنے کے بعد کچھ یاد آیا کہ عینی کیسی ہے اور تم سے کتنا پیار کرتی تھی اور تم بھی اسے کتنا چاہتے تھے؟"

وہ پیشانی پر شکنیں ڈال کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔"میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی عینی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے نہیں آرہا ہے۔ میں بھول گیا ہوں کہ وہ کیسی تھی؟ اس کی محبت کا کوئی لمحہ مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔"

دردانہ اس کا ہاتھ تھپکنے لگی۔ شہباز بھی اس کے شانے کو تھپکنے لگا۔ ان کی تھپکیاں کہہ رہی تھیں۔ بیٹے! تمہیں تو وہی یاد آئے گا جو ہم چاہیں گے اور ہم تدبیر سے جو چاہتے ہیں اسے تقدیر بھی نہیں بدل سکتی۔

میں ان کی باتیں سن رہا تھا اس وقت وہ درست کہہ رہے تھے۔ فی الوقت ان کے راستے میں دور تک کامیابی ہی کامیابی تھی۔ آگے جا کر وہ کامیابی دھندلانے والی تھی۔ فی الحال تو وہ دونوں مقدر کے سکندر تھے۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو میں آئی تھی میں نے انجان بن کر پوچھا۔"کون.....؟"

اس نے کہا۔"میں ہوں۔"

میں نے دروازے کو کھولا۔ وہ سر جھکائے کھڑی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آئی میں نے دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔"بیٹھو!"

وہ بیٹھ گئی، میں نے اس کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھنے کے بعد بتایا تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے۔ اور اس نے یہ بات تسلیم کی تھی۔ مردہ خانے کا ایک مردہ اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا بعد میں معلوم ہوا تھا کہ مردہ خانے سے وہ لاش غائب ہوگئی تھی۔ مگر پولیس اس لاش تک اور اسے چرانے والے تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔

نمرہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔"اس لاش نے تمہیں الجھا دیا ہے تمہیں یقین ہے کہ اسے کسی نے چرایا نہیں تھا بلکہ وہ مردہ خود اٹھ کر وہاں سے گیا

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے

طالوت

③ حصّوں میں (مکمل)

قیمت فی حصّہ 50 روپے ● ڈاک خرچ فی حصّہ 23 روپے

- پراسرار کہانیوں کے شائقین کے لئے
- طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لئے
- جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لئے

ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال روانہ کریں

تینوں حصّے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ 25 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

تھا؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر کہا "تم بہت کچھ جانتے ہو میں حیران ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں اتنی تفصیل سے ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں بتا دیتی ہیں۔"

میں نے کہا "میں دوسرے نجومیوں سے بہت مختلف ہوں، نجومی حضرات ہتھیلی کی سطح پر لکیروں کو پڑھتے ہیں۔ میں ان لکیروں پر چلتا ہوا معلومات کی وسیع دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ جس رات وہ مردہ غائب ہوا اسی رات تمہیں ایک فون موصول ہوا تھا۔"

وہ بولی "ہاں کسی اجنبی کا فون تھا۔"

میں نے پوچھا "وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ کہہ رہا تھا، حرارت ختم ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے مگر تمہیں دیکھتے ہی میرے اندر حرارت پیدا ہو گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے تمہیں وہاں دیکھا ہے جہاں برف ہی برف ... ہوتی ہے۔ جہاں زندہ انسان کو نہیں رکھا جاتا۔ وہاں جو بھی ہو وہ موت کی گہری نیند سویا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی ہی گہری نیند سے تمہاری حرارت نے مجھے جگا دیا تھا۔"

میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "مبارک ہو ایک مردہ تم پر عاشق ہو گیا ہے۔"

وہ پیار بھری ناراضگی سے دیکھتے ہوئے بولی "میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"یہ روحیں ہیں؟"

پھر بولی "کیا تمہیں ایسی باتوں پر اعتقاد ہے؟"

"میرے عقیدے کی بات نہ کرو اپنی بات بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

وہ بولی "اس کی ایسی باتیں سن کر میں سمجھ گئی کہ یہ وہی اسپتال کا مردہ ہے میں نے کہا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے اس مردہ گھر میں ایک لاش دیکھی تھی اور اس لاش نے ایک بار پلک بھی جھپکائی تھی۔"

وہ بولا "ان آنکھوں سے گستاخی ہو گئی۔ تمہیں دیکھنے کے بعد تو پلک جھپکانا بھول جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "ارے واہ! وہ مردہ تو کوئی شاعر معلوم ہوتا ہے کیسی شاعرانہ بات کی" دیکھو تم میرا مذاق اڑاؤ گے تو میں کچھ نہیں بولوں گی۔"

"اچھا اب کچھ نہیں بولوں گا تم آگے بتاؤ۔"

وہ بولی "میں نے اس سے کہا۔ میں یہ نہیں مان سکتی کہ تم مردہ تھے اور مجھے دیکھ کر زندہ ہو گئے اور جب تم مردہ تھے تو تم نے مجھے کیسے دیکھا؟"

وہ بولا "تم میری بات نہیں سمجھ رہی ہو مجھے تمہاری حرارت اپنے اندر محسوس ہوئی تھی اور مجھے زندگی مل گئی تھی دراصل پہلے میں پیٹرول سے چلتا تھا، جب سے پیٹرول ہوا ہوا ہے میں گیس استعمال کرنے لگا ہوں۔ مجھے دشمنوں سے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ اس لیے میں مردہ گھر میں گھس گیا تھا اور وہیں ایک مردے کو برف کے نیچے دبا کر اس کے اوپر لیٹ گیا تھا۔ ایسے ہی وقت میری گیس ختم ہو گئی اور میں مر گیا۔"

میں نے جھنجلا کر کہا "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"پلیز غصہ نہ کرو یقین کرو جس طرح پیٹرول یا گیس کے بغیر گاڑی کھڑی ہو جاتی ہے، بے جان ہو جاتی ہے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اسی طرح میں بھی پیٹرول یا گیس کے بغیر زندگی سے خالی ہو جاتا ہوں۔ جب تم وہاں آئیں تو ایسا لگا کہ جیسے حرارت میرے اندر پہنچ گئی ہے۔"

میں نے کہا "وہاٹ نان سینس، یا تو کوئی پاگل ہو یا جان بوجھ کر مجھ سے اپنی اصلیت چھپانے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم کچھ بھی سمجھ لو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو کسی ایسے میں مجھے کسی پٹرول پمپ سے یا گیس اسٹیشن سے گیس میں دوڑتا ہوا تمہارے پاس آؤں گا تاکہ تمہاری حرارت مجھے پھر زندگی دے جائے۔"

میں نے گھبرا کر کہا "خبردار! کبھی میری طرف نہ آنا میں تمہیں دیکھتے ہی خوف سے مر جاؤں گی۔"

"ارے واہ! مجھے زندگی دینے والی خود مر سکتی ہے تم تو ایمرجنسی میں کام آنے والی ہستی ہو۔ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔"

"شٹ اپ! کبھی تم میرے سامنے آؤ گے تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔"

"میں تمہارے ہاتھوں مر جاؤں گا اب تو ہمارا مرنا مرانا ایک ساتھ ہے ذرا عقل سے سوچو تم مجھے گولی مارو گی تو میں کیا مردوں گا؟ تمہاری حرارت مجھے ملتی رہے گی۔ گولی کھانے کے بعد پھر اسی طرح زندہ ہو جاؤں گا جس طرح مردہ خانے میں زندہ ہو کر آیا ہوں۔"

"میں بری طرح الجھ گئی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چیز ہے عقل نہیں مانتی تھی کہ ایک مردہ زندہ ہو کر مردہ خانے سے آ گیا ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور وہ مجھ سے فون

پر باتیں کر رہا ہے۔"

اچانک فون پر اس کے کراہنے کی آواز آئی پھر وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا "جب گیس ختم ہونے لگتی ہے تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے ابھی میرے اندر پندرہ منٹ کی گیس ہے پھر نہ آ جانا ہے اور کہیں سے گیس فل کرانا ہے میں کل کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا یا تم سے روبرو ملاقات کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مقدر..... اب تم ہی بتاؤ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا عقل تسلیم کرتی ہے کہ پہلے وہ مردہ رہا ہوگا؟"

میں نے کہا "میں کیا بتا سکتا ہوں کبھی اس کے ہاتھ کی لکیر پڑھنے کا موقع ملے گا تبھی بتا سکوں گا۔ یہ بتاؤ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پلیز اسے کوئی دلچسپ کہانی سمجھ کر مت سنو۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"دوسری رات پھر اس نے فون کیا اور پوچھا "تم کہاں ہو میں تمہارے کالج کی طرف گیا تھا پھر گھر کی طرف گیا تھا میں تھک کر ہار چکا ہوں گھر کے سامنے نہیں آ سکتا تمہاری حرارت سے جی رہا ہوں اس لیے تمہارے سامنے آ سکتا ہوں لیکن تم میرے خوف سے کہیں چلی گئی ہو پلیز بتاؤ اس وقت کہاں ہو؟"

"تم ایسی بے تکی بات کرو گے تو میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، بھلا یہ ماننے کی بات ہے کہ تم مر چکے ہو کسی کے سامنے نہیں آ سکتے صرف میرے سامنے آ سکتے ہو؟ تمہاری باتوں سے صاف پتا چل رہا ہے کہ تم پاگل ہو۔"

"تم مجھے پاگل ہی سمجھ لو۔ مگر یہ بتاؤ کہاں ہو؟"

"میں بھی نہیں بتاؤں گی۔ تم جہنم میں جاؤ۔"

میں نے فون بند کر کے اسے آف کر دیا تاکہ وہ دوبارہ رابطہ نہ کر سکے۔ دو ہفتے بعد لاہور سے سہیلیوں نے فون کیا کہ ہمارے کالج کے طلبا و طالبات پہاڑی علاقوں کی سیر کے لیے جا رہے ہیں اس لیے میں بھی فوراً آ جاؤں۔

میں نے کہا "اس طرح تم ان طلبا و طالبات کے ساتھ پہاڑی علاقے میں چلی گئیں جہاں مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں! تمہارے جیسے بہروپئے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تمہارے بارے میں سچ ہوں کہ آخر تم ہو کیا؟"

وہ میرے بارے میں بہت کچھ بولنا چاہتی تھی میں نے کہا "پلیز ابھی میری بات چھوڑو صرف اس مردہ عاشق کی بات کرو۔"

"میں ہمیشہ اپنا فون بند نہیں رکھ سکتی تھی، اسے ایک آدھ بار کھولا تو اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "میں دن رات تمہارے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ کبھی اِس پی سی او میں جاتا، کبھی اُس پی سی او میں جاتا ہوں۔ میرے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں لیکن جلد ہی امیر کبیر شخص بن جاؤں گا۔ دشمنوں پر غالب آنے کے بعد پھر کوئی تمہاری طرح مجھے مردہ یا پاگل نہیں کہے گا، پلیز مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟"

میں اس وقت اسلام آباد میں تھی اور ٹورنگ پارٹی کے ساتھ پہاڑی علاقے کی طرف جا رہی تھی میں نے کہا "میں جہاں بھی ہوں تم مجھ تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔"

"مجھے پٹرول یا گیس ملتی رہے اس کے بعد بھی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اس لیے تمہیں تلاش کرتا رہوں گا۔"

میں نے کہا "میں فون بند کر رہی ہوں۔"

اس نے التجا کی "پلیز ابھی فون بند نہ کرنا۔ تم میرے پیار کی سچائی اور لگن دیکھ لو کہ میں تمہارے بارے میں تمام معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ تم فیصل آباد گئی ہو تو میں وہاں پہنچ گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ میرے وہاں پہنچنے تک تم واپس لاہور آ گئی ہو میں واپس لاہور آیا تو اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تم یہاں سے کہاں چلی گئی ہو لیکن میں جلد ہی معلوم کر لوں گا۔"

میں نے پھر فون آف کر دیا۔

اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا پھر کہا "پہاڑی علاقے میں پہنچ کر تم نے اپنے معاملات میں مجھے الجھا دیا۔ تم کسی جادوگر سے کم نہیں ہو میں سحر زدہ ہو کر تمہارے بارے میں سوچتی رہی اور اس مردے کو کسی حد تک بھول گئی۔"

"تم بار بار اسے مردہ کہہ رہی ہو، پتا نہیں اس کی حقیقت

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے
مقرور طالوت
صدیوں کا بیٹا
کتابی شکل میں تیار ہیں
آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں
کتابیات پبلی کیشنز ۵ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

کیا ہے تمہیں اس کا نام تو پوچھنا چاہئے تھا۔''

''جب میں فون پر اس کی آواز سنتی ہوں تو سہم جاتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نام پوچھ کر کیا کروں گی؟''

''تمہیں اس کی قدر کرنی چاہئے تم پہلی لڑکی ہو جس سے محبت کرنے کے لیے کوئی موت کے گھر سے پلٹ کر آیا ہے۔''

''تم نے جس طرح اندھا بن کر مجھ سے ملاقات کی تھی اسی طرح وہ مردہ بھی کوئی بہروپیا ہے، اپنی اصلیت مجھ سے چھپا رہا ہے یا پھر سچ مچ پاگل ہے۔''

''وہ نارمل ہے یا ایب نارمل' مردہ ہے یا عارضی طور پر تمہارے لیے زندہ ہو گیا ہے' یہ بھید کسی دن تو کھلے گا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ جب تم پہاڑی علاقے سے لاہور واپس آئی تھیں تو کیا ہوا؟''

''میں نے سوچ لیا تھا کہ لاہور میں چھپ کر رہوں گی اور یہ معلوم کروں گی کہ وہ کون ہے لاہور پہنچتے ہی دادی اور دادا جان نے بتایا کہ تم مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہو مجھ سے ملنا چاہتے ہو ممی مجھے یہاں کراچی آنے کو کہہ رہی تھیں۔ میں نے سوچا'' یہ میرے لیے بہتر ہوگا۔ اس طرح میں اس پاگل مردے سے دور رہوں گی۔''

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی'' دوسری صبح کی فلائٹ سے مجھے یہاں آنا تھا میں اپنی سہیلی کے ساتھ ایک شاپنگ سینٹر میں گئی۔ وہاں ایک خوبرو جوان کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا' آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ ایک دکان کے کاؤنٹر پر کھڑا اپنے لیے ٹائی پسند کر رہا تھا۔ میں دکان کے باہر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سہیلی نے پوچھا'' ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟''

میں نے کہا اس جوان کو دیکھ رہی ہوں جس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے مجھے ایسا لگتا ہے' جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔''

میری سہیلی نے ہنستے ہوئے کہا'' ایسے خوبصورت جوان خوابوں میں آتے ہیں' تم نے بھی خواب میں ہی اسے دیکھا ہوگا۔''

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اگر اس جوان کی داڑھی بڑھی ہوئی ہو اور چہرے پر مردنی چھائی ہو تو وہ بالکل اسی مردے کی طرح دکھائی دے گا جو میرے حواس پر چھایا ہوا ہے اور میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔

اسی وقت اس جوان نے اپنا موبائل فون نکال کر اس کے نمبر پنچ کیے دوسرے ہی لمحے میں میرے فون کا بزر بولنے لگا میں نے چونک کر اپنے فون کو دیکھا پھر اس کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا، میری نظریں اس جوان پر تھیں وہ اُدھر سے بول رہا تھا۔ اِدھر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی'' ہیلو آم رہ رہ کر کہاں گم ہو جاتی ہو؟''

اس بار میں نے ذرا لگاوٹ سے کہا'' اب مجھے تم سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے مجھے بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں اس وقت ایک شاپنگ سینٹر میں ہوں اور اپنے لیے ٹائی پسند کر رہا ہوں تمہیں کس طرح کی ٹائی پسند ہے۔ ہلکے رنگوں کی یا چیختے ہوئے رنگوں کی؟''

میں ایک دم سے گھبرا گئی وہ مردہ جو میرے حواس پر چھایا رہتا تھا میرا پیچھا کرتا رہتا تھا۔ عین میری آنکھوں کے سامنے تھا اور مجھ سے باتیں کر رہا تھا میں نے فوراً ہی فون بند کیا پھر سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے جانے لگی وہ بولی'' ارے اس طرح کھینچ رہی ہو' مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟''

میں نے کہا'' بس ہم واپس جائیں گے۔''

''کیا کہہ رہی ہو ابھی تو شاپنگ کرنی ہے۔''

''نہیں میں کراچی جا کر شاپنگ کر لوں گی۔''

''کس کا فون تھا جسے تم سنتے ہی پریشان ہو گئی ہو؟''

''رانگ کال تھی۔ کوئی بھی اجنبی فون کرتا ہے تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔''

میں نے باتیں بنا کر سہیلی کو ٹال دیا۔ پھر دوسرے دن کی فلائٹ سے یہاں آ گئی۔ میں نے اس مردے کے بارے میں اب تک کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے تمہیں بھی نہ بتاتی لیکن تم تو بہت ہی خطرناک ہو۔ ہاتھ کی لکیریں دیکھتے دیکھتے کسی کی بھی پوری ہسٹری معلوم کر لیتے ہو۔''

''تعجب ہے تم اس تنہائی میں مجھے جیسے خطرناک آدمی سے ملنے آئی ہو۔''

''میں دوسروں کے سامنے یہ چوٹیں نہیں کھلتی تھی اب پوچھ رہی ہوں مجھے بتاؤ' میرے ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ اس اجنبی سے پیچھا چھوٹے گا یا نہیں؟''

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا'' نہیں..... وہ تمہاری زندگی میں بہت دور تک دکھائی دے رہا ہے اور ہمارے درمیان دیوار بننے والا ہے۔''

وہ جھنجلا کر بولی'' آخر وہ ہے کون؟ کیا تم معلوم نہیں کر سکتے؟''

''معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے تم اس سے ملاقات کرو اور اس سے میری ملاقات کراؤ میں اس مردہ ہاتھ کی مردہ لکیریں دیکھوں گا جو زندگی کو چیلنج کر رہی ہیں۔''

نمرہ نے ذرا چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا'' کیا صرف وہی ہمارے درمیان دیوار بننے والا ہے یا آسرا بھی بن رہی ہے؟''

میں نے مسکرا کر پوچھا'' جلن محسوس کر رہی ہو؟''

''تمیں میرے دشمن مجھے کیا پڑی ہے تم نے وہاں سب کے سامنے کہا تھا کہ ہاتھ کی لکیریں بدل سکتی ہیں اس کے ہاتھ میں شادی کی لکیر بن سکتی ہے اور وہ تمہاری دلہن بن سکتی ہے۔''

''میں نے امکانات بیان کیے ہیں کوئی بھی بات کسی بھی وقت ممکن ہو سکتی ہے۔''

وہ ذرا غصہ سے بولی'' اگر یہ ممکن ہوگا تو کیا تم اس سے شادی کر لو گے؟''

''مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اگر ابھی دعویٰ کروں کہ اس سے شادی نہیں کروں گا تو کل حالات مجھے کس سمت لے جائیں گے نہ تم یہ جانتی ہو نہ میں جان سکتا ہوں۔ وہ مردہ جو تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے' وہ زندگی کے کس موڑ پر تم سے کب ملے گا؟ کہاں ملے گا؟ کس طرح تمہیں متاثر کرے گا اور تم کس طرح حالات سے مجبور ہو جاؤ گی کیا تم یہ کہہ سکتی ہو؟''

وہ بڑے عزم سے بولی'' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہارے سوا کوئی میری زندگی میں نہیں آئے گا۔''

''بے شک تمہارے ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتاؤ' کیا آسرا کی طرف جاؤ گے؟''

''میرے ہاتھ کی لکیریں یہی کہتی ہیں اور تمہیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ کوئی مقدر سے لڑ نہیں سکتا اور میں بھی نہیں لڑ پاؤں گا۔''

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی'' صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہر جائی ہو بھنورے کی طرح پھولوں پر منڈلاتے رہو گے اور مقدر کو بدنام کرو گے۔''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو' ویسے تمہارے ناراض ہونے سے مجھے دکھ نہیں پہنچے گا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میں بار بار تمہیں مناتا رہوں گا اور تم مانتی رہو گی۔ مجھے بے وفا ہر جائی کہنے کے باوجود میری ہی طرف آتی رہو گی۔''

''اونہہ..... !تمہیں اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے جانے لگی میں نے اسے نہیں روکا وہ دروازہ کھول کر جانا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بیگم آفتاب دروازے پر کھڑی ہوئی مسکرا کر بولی'' بیٹی تم میری وجہ سے نہ جاؤ میں تم دونوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ اچھا ہے تمہاری میں خوب دل کھول کر باتیں کرو۔''

وہ بولی'' مجھے مزید کوئی بات نہیں کرنی ہے۔''

وہ ماں سے کتراتی ہوئی چلی گئی۔ بیگم آفتاب نے اندر آ کر مجھ سے کہا'' اسے کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں..... اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے ناراض ہوتے ہیں ایک دوسرے کو مناتے ہیں وہ ابھی ناراض ہو کر گئی ہے میں بعد میں اسے منالوں گا۔ آپ کچھ کہنے آئی ہیں؟''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی'' ہاں تم نے تو یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا ہے کہ یہ عروج اور عینی ایک ہی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور پاشا کے نکاح میں آ کر ایک دوسرے کی سوکن بن کر رہنا چاہتی ہیں۔ یہ تو بڑی عجیب اور ناقابل یقین بات تھی اگر تم نہ کہتے تو کوئی یقین نہ کرتا۔''

میں نے کہا'' جی ہاں' ان دونوں نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ پہلے عینی پاشا سے شادی کرے گی پھر اس کے کچھ عرصے بعد عروج پاشا کے نکاح میں آ جائے گی۔''

''یہ تو سراسر بے شرمی ہے میاں..... !ابھی ایک دلہن نہیں بنی دوسری بھی اس کی دلہن بننے کی بات کر رہی ہے وہ دونوں ہم سے یہ باتیں چھپا رہی تھیں۔ جب تم نے ظاہر کیا تو بڑی بے شرمی سے اقرار بھی کر لیا۔''

''آپ اسے بے شرمی کہہ سکتی ہیں لیکن دینی اور دنیاوی قوانین کے مطابق یہ بے شرمی نہیں ہے۔ وہ دونوں بیک وقت پاشا کے نکاح میں نہیں آ رہی ہیں پہلے ایک اس کے نکاح میں آئے گی۔ پھر وہ پہلی بیوی کی حیثیت سے دوسری شادی کی اجازت دے گی تو دوسری اس کے نکاح میں آ جائے گی۔''

''میں کہتی ہوں' پاشا میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ دونوں اس پر مرمٹی ہیں۔ اصل بات یہ ہے میاں کہ بچپن ہی سے دونوں ہم مزاج ہیں، ہم خیال ہیں، ایک ہی بات سوچتی ہیں اور ایک ہی کام کرتی ہیں' مجھے تو اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ وہ دونوں ہم بزرگوں کو کتنے ہی معاملات میں دھوکا دیتی رہتی ہیں۔ میں کیا بتاؤں کہ ہم کتنی مجبوری کی وجہ سے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ مجبوریاں نہ ہوتیں تو ہم اس گھر پر تھوکتے بھی نہیں۔''

میں نے پوچھا'' ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''تمہیں تو معلوم ہوگا تمہارے مرحوم ڈیڈی نے وصیت میں لکھا تھا کہ بڑے ابو عینی کے سرپرست بن کر یہاں رہیں گے۔''

''جی ہاں! لیکن وصیت میں سرپرست بننے کے لیے پابند نہیں کیا گیا تھا۔ آج بھی یہ پابندی توڑی جاسکتی ہے، سرپرستی سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ میری بات مانیں تو میں اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ بولی ''بیٹا تم تو میرے بیٹوں سے بھی بڑھ کر ہو، بہت سمجھدار ہو۔ جب بھی بولو گے تو ہمارے بھلے کے لیے ہی بولو گے۔''

میں نے کہا ''میں نے یہاں آتے ہی محسوس کیا ہے کہ عینی بہت مغرور ہوگئی ہے اور عروج اسے بہکاتی رہتی ہے۔''

وہ خوش ہوکر بولی ''کیا بات ہے بیٹا! تم واقعی تیز نظر رکھتے ہو۔ یہاں آتے ہی ان کی اصلیت کو جان رہے ہو۔''

''بڑی امی! میں عینی کو جتنا بھی پیار دوں گا پھر بھی وہ سوتیلی ہی رہے گی اور جب نمرہ سے شادی ہوجائے گی تو وہ میری اپنی ہوگی۔ میری زندگی کی ہمسفر ہوگی تو آپ ہی بتائیں مجھے نمرہ کو اہمیت دینی چاہیے یا عینی کو.....؟''

''بیٹے مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ تم تو خود بہت سمجھ دار ہو۔ تم نے تو یہاں آتے ہی میری نمرہ کو سر پر بٹھالیا ہے۔''

''تو پھر آپ میری ایک بات مانیں اس گھر میں نہ رہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ عینی کا احسان اٹھائیں سارے رشتے دار تو یہی کہتے ہوں گے کہ ماہانہ اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپے ملتے ہیں اس لیے آپ سب اس ایک لاکھ روپے کے لالچ میں یہاں رہنے لگے ہیں۔''

''تم درست کہتے ہو بیٹا! رشتے دار تو باتیں بناتے ہی ہوں گے اور اب ہمارا دل عینی سے کھٹا ہوگیا ہے پھر تم ہمیں عینی سے زیادہ تحفیں دے رہے ہو تو میں ابھی جاکر تمہارے بڑے ابو سے بات کروں گی اور ہم جلد سے جلد یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ آؤ اب اٹھو، لنچ کا وقت ہوگیا ہے ہمارے ساتھ کھانے پر چلو۔''

''میں آپ کے ساتھ کل دوپہر کا لنچ کروں گا۔ اس وقت میں نے آسرا کے ساتھ لنچ کرنے کا وعدہ کیا ہے رات کا کھانا اپنی سوتیلی امی دردانہ بیگم کے ساتھ کھاؤں گا۔ کل آپ کا ساتھ دوں گا میں چاہتا ہوں کہ سب کو خوش رکھوں اور نمرہ کو اس طرح اپنا بناؤں کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ رہے۔''

''ہاں بیٹے! تم واقعی بہت ہی سمجھدار ہو میں تمہاری مصلحت اندیشی کو سمجھ گئی ہوں۔ ٹھیک ہے میں جارہی ہوں کل ہمارے ساتھ لنچ کرنا۔''

وہ خوش ہوکر چلی گئیں۔ میں چاہتا تھا عینی کو خود غرض اور مطلب پرست رشتے داروں سے نجات مل جائے۔ میں نے بیگم آفتاب کو راضی کرلیا تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ اپنے میاں کو بھی راضی کرلیں گی۔ اب فلک ناز کی باری تھی، میں کمرے سے باہر آیا۔ وہ میری ہی طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہا ''بیٹے تم نے میرا اور آسرا کا ہاتھ دیکھ کر ایسی ایسی باتیں کی ہیں کہ ہمیں بھوک لگے گی نہ نیند آئے گی۔ کیا سب کے سامنے کہنا ضروری تھا کہ تمہارے پھوپا جان کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی کیا یہ کہنا ضروری تھا کہ میں شادی کے بعد بچے نہیں چاہتی تھی اسی وجہ سے عدنان پیدائش کے بعد ایب نارمل ہوگیا ہے؟''

''سوری پھوپی جان! میں پیٹھ پیچھے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بولتا منہ پر سچ کہتا ہوں۔ چاہے اچھا لگے یا برا لگے۔''

''بیٹے! تم میرے مرحوم بھائی کا خون ہو مجھے برا لگے گا تب بھی میں تمہیں کلیجے سے لگاؤں گی ابھی تو یہ کہنے آئی ہوں کہ آسرا کھانے سے انکار کررہی ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے اسے السر کی شکایت ہے بھوکا نہیں رہنا چاہیے دلیہ وغیرہ کھانا چاہیے۔''

''آپ فکر نہ کریں میں اسے کھلاؤں گا۔''

میں فلک ناز کے ساتھ کچن میں آیا۔ پھر ٹرالی میں کھانے کا سامان رکھ کر اسے دھکیلتے ہوئے آسرا کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ فلک ناز خوشی سے کھل رہی تھی۔ اگر ماں باپ کو معلوم ہوجائے کہ شادی سے پہلے ہی ہونے والا داماد ان کی بیٹی کا خدمت گار بن گیا ہے تو وہ ایک رشتہ دار کو سناتے پھرتے ہیں کہ داماد تو ان کی بیٹی کا غلام بن کر رہتا ہے' وہ بیگم آفتاب پر برتری جتانے کے لیے ڈائننگ روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اندر سے آسرا کی آواز آئی ''آجاؤ۔''

میں نے دروازہ کھولا اور ٹرالی کو دھکیلتا ہوا اندر آیا اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا پھر پوچھا ''کیا ملازم نہیں ہیں ہوم میرے لیے کھانا لائے ہو؟''

''ہاں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ سوچا تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔''

''میں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''میرے ہاتھ کی لکیر کہہ رہی ہے کہ تم اس وقت میرے ساتھ کھاؤ گی۔''

''تم پکے فراڈ ہو۔ کیا ہاتھ کی لکیریں یہ کھانے پینے کی

باتیں کرتی ہیں؟ تم نجومی نہیں ہو کوئی پراسرار علم جانتے ہو ہم سب کو بے وقوف بنارہے ہو۔''

''تم جو سمجھنا چاہو سمجھ لو لیکن یہ مان لو کہ میں سچ کہتا ہوں اور میرا سچ سن کر سب ہی بدحواس ہوجاتے ہیں تمہیں کیا خبر کہ تمہاری اپنی ممی کا کیا حال ہوا تھا؟''

''میں نے اپنی سالگرہ کی پارٹی میں بھی تمہارا سچ سنا ہے۔ اور میں مانتی ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولتے۔''

''تو پھر مان لو کہ اس وقت بھی میرے ہاتھ کی لکیر کہہ رہی ہے کہ تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی۔''

وہ دوسری طرف گھوم کر بولی ''میں نہیں کھاؤں گی۔''

میں نے اس کے گداز بازو کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ ایک جھٹکا کھا کر میرے سینے سے آلگی۔ میں نے اس کے دوسرے بازو کو بھی جکڑ لیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میری طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے آپ پر قابو پاتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ''مجھے چھوڑو۔''

''میرے ساتھ کھاؤ ورنہ یہ بانہیں کبھی نہ چھوٹیں گی۔''

یہ کہہ کر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی، میں نے کھانے کی ٹرالی کو کرسی کے پاس لاکر کہا ''چلو بیٹھ جاؤ۔''

اب وہ انکار نہیں کرسکتی تھی۔ میری بے باکی سے گھبرا گئی تھی فوراً ہی بیٹھ گئی میں نے ایک ڈش اٹھا کر اس کی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈالا وہ جھجکتے ہوئے کھانا شروع کرنا چاہتی تھی۔ میں نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر ایک لقمہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اندر ہی اندر میرے پیار کے اس انداز سے بے حال ہورہی تھی۔ میرا یہ انداز دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ میں واقعی ہر جائی ہوں بھنورے کی طرح کبھی اس پھول پر کبھی اس پھول پر منڈلا رہا ہوں۔

حقیقتاً یہ بات نہیں تھی۔ نمرہ محبت تھی' میری جان تھی، آسرا بھی اگرچہ محبت تھی لیکن اس محبت میں صرف ہمدردی تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے نہ بہکاؤں تب بھی وہ بچے گی بھٹکے گی محبت سے شادی سے انکار کرنے کے باوجود میری طرف کھنچتی رہے گی اور اس طرح موت کے قریب آتی رہے گی۔ میری معلومات کے مطابق اس کی زندگی مختصر تھی۔ اسی لیے میں اس سے پیار کررہا تھا اور جتنی خوشیاں اسے دے سکتا تھا دے رہا تھا۔ بعد میں کیا ہوگا؟ کیا کاتب تقدیر اپنی تحریر بدل دے گا؟ یہ تو میں نہیں جانتا تھا۔

فلک ناز دروازہ کھول کر اندر آئی پھر یہ دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئی کہ میں اپنے ہاتھ سے لقمہ بنا کر آسرا کو کھلا رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی مجھے دعائیں دیتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے میری بلائیں لینے لگی پھر بولی ''میں تم دونوں کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ ابھی چلی جاؤں گی بس ایسی بات سنی ہے کہ مجھ سے رہا نہیں گیا میں تم سے پوچھنے آئی ہوں۔''

میں نے انجان بن کر پوچھا ''کیا بات ہے؟''

''وہاں سب کہہ رہے ہیں کہ عروج اور عینی دونوں ہی پاشا سے شادی کرنا چاہتی ہیں' ایک دوسرے کی سوکن بن کر رہنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں!'' عینی اور عروج دونوں نے سب کے سامنے اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک ہی شخص کی بیویاں بن کر رہیں گی اور وہ شخص پاشا ہے۔''

''لیکن مقدر میاں' یہ تو سراسر بے حیائی ہے۔''

میں نے ہاں میں ہاں ملائی ''بے شک بے حیائی ہے۔ کھلی بے حیائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ آسرا کے ساتھ ایسے گھر میں رہیں میں نے عینی اور عروج دونوں کے ہاتھ کی لکیریں دیکھی ہیں اور وہ لکیریں کہہ رہی ہیں کہ وہ دونوں آپ لوگوں کی بڑی بے عزتی کریں گی اور یہاں سے نکلنے پر مجبور کردیں گی۔''

وہ بولی ''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے گھر پر..... جب تم چاہتے ہو کہ آسرا کے ساتھ یہاں نہ رہوں تو نہیں رہوں گی۔ میں تمہاری خوشی میں خوش رہوں گی۔ آج ہی یہ گھر چھوڑنے کی تیاری کررہی ہوں' بس۔''

پھر وہ آسرا کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی ''تم مقدر سے مایوس ہورہی تھیں۔ دیکھ لو میرا یہ بیٹا تمہیں کیسی خوشیاں دینے والا ہے۔''

وہ دعائیں دیتی ہوئی وہاں سے چلی گئی' میں نے آسرا کو دوسرا لقمہ کھلانا چاہا اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''بس کرو تم اتنی محبت دو گے تو میرا کیا بنے گا؟''

میں نے پوچھا ''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''تم نے میرے بارے میں جو پیش گوئی کی ہے اسے بھول رہے ہو۔''

''مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا کہ کبھی کسی سے محبت نہیں کرو گی، کبھی کسی سے شادی نہیں کرو گی۔ تب ایک طویل خوشحال زندگی گزارو گی ورنہ.....''

''ورنہ زندگی مختصر ہوجائے گی' کیا تم چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں؟''

تمہارے دشمن مریں' میں تمہاری محبت اور زندگی دونوں

ہی چاہتا ہوں۔"

"محبت نہ چاہو، محبت شادی کی طرف لے جائے گی اور شادی موت کی طرف....."

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا "فی الحال تمہارے نصیب میں یہی لکھا ہے لیکن میں نے یہ بھی کہا ہے کہ شادی کی جو لکیر ہے اس میں تبدیلی آسکتی ہے۔ نمازوں میں دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے تم نمازیں پڑھا کرو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگو پھر میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہاں اس شہر میں ایک بہت پہنچے ہوئے عالم دین ہیں انہیں سب بابا انعام الحق کہتے ہیں۔ میں ایک آدھ روز یہاں مصروف رہوں گا۔ اس کے بعد تمہیں ان کے پاس لے چلوں گا۔ میرے ساتھ چلو گی نا؟"

اس نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر آگے جھک کر اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ ان لمحات میں میرے دل سے دعائیں نکلنے لگیں "یا اللہ! اس لڑکی کو تکلیفیں بھی دے اور زندگی بھی..... آمین!"

☆☆☆

اسد عزیزی بندوق کی گولی کی طرح تھا۔ شہباز درانی کے ٹریگر دباتے ہی وہ ٹھائیں سے سیدھے نشانے پر جا کر لگتا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ حشمت کا سراغ لگایا جائے۔ وہ ایک بار لیڈی ڈاکٹر آرزو کے کلینک میں پہنچ کر حشمت کا سراغ لگا چکا تھا اس بار بھی وہ سیدھا اسی کے کلینک پر گیا تھا۔

وہ کلینک بند تھا۔ اس کے ساتھ دواؤں کی دکان تھی وہ کھلی ہوئی تھی اس نے دکاندار سے پوچھا "یہ لیڈی ڈاکٹر کہاں ہے؟"

اس نے کہا "ملک سے کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔ شاید ایک آدھ ماہ بعد آئیں گی۔"

اس نے پوچھا "یہ کس دن گئی ہیں؟"

"ابھی تین دن پہلے آٹھ تاریخ کی شام کو گئی ہیں۔"

اسد عزیزی وہاں سے سیدھا ایئر پورٹ پہنچا۔ وہاں کے ایک متعلقہ عہدے دار سے ملاقات کی پھر اسے اپنا ایک کارڈ دکھایا اس کارڈ پر لکھا ہوا تھا "اسپیشل آفیسر آن ڈیوٹی" نیچے لکھا ہوا تھا "سی آئی اے۔"

اس عہدے دار نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آیئے تشریف رکھئے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

اس نے کہا "آٹھ تاریخ کی شام کو جتنی بھی فلائٹس بیرونی ممالک کی طرف گئی ہیں مجھے ان کے مسافروں کی لسٹ چاہئے۔"

اس عہدے دار نے اپنے ماتحت افسر کو حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس روز کی فلائٹس کے مسافروں کے ناموں کی فہرست آنے لگی۔ اسد عزیزی ان تمام فہرستوں کو ایک ایک کر کے پڑھتا رہا۔ پھر بنکاک جانے والی فلائٹ میں اسے لیڈی ڈاکٹر آرزو اور حشمت علی شاہ کا نام دکھائی دیا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس عہدے دار سے بولا "آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

وہ وہاں سے سیدھا درانہ بیگم اور شہباز درانی کے پاس آیا اور بولا "حشمت کا سراغ مل گیا ہے وہ اس وقت بنکاک میں ہے اس سے پہلے کہ وہ بنکاک سے کسی دوسری جگہ چلا جائے اسے ٹھکانے لگا دینا چاہئے۔"

شہباز درانی نے کہا "ٹھیک ہے تم پہلی فلائٹ سے بنکاک چلے جاؤ۔"

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ لیڈی سیکریٹری نے انٹر کام کے ذریعے اطلاع دی "سر! مسٹر مقدر حیات آئے ہوئے ہیں۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔"

اس نے انٹر کام کو آف کرتے ہوئے کہا "درانہ تمہارا سوتیلا بیٹا آگیا ہے۔ آؤ ڈرائنگ روم میں چلیں۔"

میں اس کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ رہا تھا وہ کوئی معمولی نہیں تھی محل تھا۔ جسے بیش قیمت سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شہباز درانی بے انتہا دولت مند ہے۔

وہ دوسروں کے لیے پراسرار تھا لیکن مجھ سے کوئی چھپا نہیں رہتا، میں اس کی بھی پوری اصلیت جانتا تھا۔ اس نے درانہ کے ساتھ آکر مجھ سے مصافحہ کیا۔ درانہ نے آگے بڑھ کر میری پیشانی کو چوما مجھے دعائیں دیں پھر کہا "تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میرا بیٹا پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "میں مرا کب تھا جو آپ دوبارہ زندہ ہونے کی بات کر رہی ہیں میں اپنی محبت سے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دوں گا کہ میں واقعی آپ کا بیٹا جاوید ہوں۔"

"خوش رہو بیٹا! یہ بتاؤ عینی وغیرہ سے ملاقات کر چکے ہو۔ تمہارے تاثرات کیا ہے؟"

"ایک سوتیلی بہن سے مل کر کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟" وہ رسمی طور پر مسکرا کر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے دل میں کینہ بھرا ہوا ہے۔

"تم اس کے مجھن نہیں جانتے۔ وہ اور عروج اس قدر بے حیا ہیں کہ دونوں ہی ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بے حیائی کی حد تک تعلق رکھتی تھیں۔"

میں نے کہا "آپ میرے بارے میں ایک بات نہیں جانتیں کہ میں علم نجوم میں مہارت رکھتا ہوں۔ میں نے عینی اور عروج کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھتے ہی بتا دیا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور آئندہ ایک دوسرے کی سوکن بن کر رہنا پسند کرتی ہیں۔"

شہباز درانی نے کہا "تم نے ہاتھ کی لکیریں پڑھ کر یہ بات معلوم کر لی۔ پھر تو کمال کے نجومی ہو۔"

"میں نے عینی کے گھر میں ایک ایک رشتے دار کا ہاتھ دیکھا ہے اور ہر ایک کا کچا چٹھا بیان کر دیا ہے۔"

درانہ نے کہا "پھر تو ہم بھی اپنا ہاتھ دکھائیں گے، کیوں شہباز؟"

شہباز نے کہا "میں اپنا مقدر خود بناتا ہوں پھر بھی اپنا ہاتھ ضرور دکھاؤں گا، دیکھتا ہوں یہ جوان کس حد تک اپنے علم میں مہارت رکھتا ہے۔"

"ایک بات ہے۔ جب بھی میں کسی کا ہاتھ دیکھتا ہوں تو وہ میرے سچ بولنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔ میں نے عینی کے گھر میں کتنوں کو ناراض کیا ہے اگر میں کوئی معمولی حیثیت کا آدمی ہوتا تو وہ سب میرے دشمن بن جاتے۔ بہر حال کچھ میں نے انہیں سنا لیا اور کچھ وہ خود ہی مان گئے۔"

درانہ نے کہا "ہم برا نہیں مانیں گے لیکن کھانے کا وقت ہو گیا ہے آؤ پہلے کھا لیں پھر کھانا ہضم کرنے کے لیے مقدر کی لکیروں پر چہل قدمی کریں گے۔"

اس بات پر ہم تینوں نے قہقہہ لگایا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آکر کھانے کی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ میں نے کھانے کے دوران میں کہا "ممی! میں نے اس گھر میں پہنچتے ہی نفرتوں کے بیج بوئے ہیں۔ پھوپی جان اور بڑی امی وغیرہ سب ہی میری دشمن ہو گئی ہیں۔ وہ گھر چھوڑ کر چلے جانے والی ہیں۔"

درانہ نے خوش ہو کر کہا "تم کمال کر رہے ہو۔ ابھی انہیں آئے ہوئے پورے بارہ گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ کیا واقعی وہ سب عینی کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے؟"

"ضرور جائیں گے۔ میں یہی سوچ کر آیا تھا کہ عینی کو اس گھر میں بالکل تنہا کر دوں گا۔ اس کے وکیل اخلاق احمد کو تو میں نے پکڑ لیا ہے کہ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ میں عینی کے بزنس شیئر میں کیسی ہیرا پھیری کرتا رہتا ہوں۔"

وہ مجھے بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے بولی "بیٹے اتنی ترکیبیں نہ دو کہ برداشت نہ کر سکوں۔"

میں نے دل میں کہا "میری ممی جان! میں آگے جو دینے والا ہوں، اسے تو آپ کا یہ شہباز درانی بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔"

کھانے کے بعد ہم پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں قہوے کا دور چلنے لگا۔ درانہ نے کہا "بیٹے میرا ہاتھ دیکھو گے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں ضرور دیکھوں گا۔ اپنا بایاں ہاتھ لائیں۔"

اس نے بایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس ہاتھ کو اپنے ایک ہاتھ میں لیا پھر دوسرے ہاتھ سے پیالی اٹھا کر قہوہ کا ایک گھونٹ پیا۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں کو یوں دیکھنے لگا جیسے بہت توجہ سے پڑھ رہا ہوں پھر میں نے کہا "آج کل آپ کا ستارہ عروج پر ہے۔ جو قدم اٹھاتی ہیں، وہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔"

شہباز درانی نے مسکرا کر کہا "عام طور پر نجومی ایسی ہی زبان بولتے ہیں ان کے چند مقررہ فقرے ہوتے ہیں اور یہ کہ ماضی میں تم بہت بیمار پڑے تھے۔ اس کے بعد تمہیں ایک خوشی حاصل ہوئی اور اب تم پھر کامیابی کی طرف جانے والے ہو وغیرہ وغیرہ۔"

میں نے کہا "ابھی تو میں نے ابتدا کی ہے آگے آگے سنیے۔"

میں نے درانہ کی ہتھیلی کو دیکھا پھر کہا "آپ نے پچھلی رات اپنے کسی مخالف کو قتل کرایا ہے۔"

درانہ اور شہباز نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر شہباز نے پوچھا "کسے قتل کرایا ہے؟"

"میں پورا نام نہیں بتا سکتا اس کے نام کا پہلا حرف 'ڈی' ہے۔"

شہباز درانی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا "تم درست کہہ رہے ہو۔"

میں نے درانہ سے کہا "آپ نے جسے قتل کرایا ہے اس سے پہلے بہت دوستی تھی اور آپ اسے حسین لڑکیاں سپلائی کرتی تھیں۔"

درانہ نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شہباز نے سخت لہجے میں کہا "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جب میں سچ بولتا ہوں تو وہ کسی سے برداشت نہیں ہوتا ہیں ممی کا ہاتھ تو پڑھ چکا ہوں۔ آپ کے لیے بہتر ہو گا کہ اپنا ہاتھ نہ دکھائیں ورنہ سچ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

درانہ نے کہا "تم مجھے ماں بھی کہہ رہے ہو اور لڑکیوں

کی دلالہ بھی؟''

''یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں آپ کے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے کہ تمہاری بات درست ہو کتنے ہی نجومی الٹی سیدھی ہانکتے ہیں ان میں سے دو چار باتیں درست ہوتی ہیں، باقی باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا ''چلیں یہی سہی میں غلط کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ آپ ایک اور شخص کو قتل کرانے والی ہیں اور جسے قتل کیا جائے گا اس کے نام کا پہلا حرف ''ایچ'' ہے۔''

ان دونوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دردانہ نے پوچھا ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اسے کیوں قتل کرانا چاہتی ہوں؟''

میں نے کہا ''آپ کی اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے آپ اپنے ایک بدترین دشمن کو اس کے قتل کے الزام میں پھانسنا چاہتی ہیں اور اس بدترین دشمن کا نام حرف ''زیڈ'' سے شروع ہوتا ہے۔''

اس بار دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا پھر دردانہ نے کہا ''اوہ گاڈ! تم تو بہت ہی خطرناک نجومی ہو۔''

شہباز نے کہا ''دردانہ نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے اس کے بارے میں کچھ کہتے سکتے ہو؟''

میں نے پھر دردانہ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ قبوے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی کو رکھ دیا پھر کہا ''آپ نے اپنی سوتیلی بیٹی عینی کے خلاف بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے، اس کے ہونے والے شوہر کو اس سے دور کر دیا ہے۔ اسے اپنا قیدی بنا کر رکھا ہے اور اب وہ قیدی آپ کے ہاتھوں کے نیچے کٹھ پتلی بن کر ناچ رہے گا۔''

پہلی بار شہباز درانی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے کہا ''مقدر حیات! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اگرچہ میں نجومی نہیں ہوں لیکن مشہور زمانہ نجومیوں کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ اس علم کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ لکیریں صرف اس حد تک بتاتی ہیں کہ کسی نے کسی چیز پہ قبضہ جما رکھا ہے اتنی تفصیل سے نہیں بتاتیں کہ کسی کو قیدی بنا کر رکھا ہے۔ اور وہ کسی کے ہاتھوں کے نیچے رہ کر کٹھ پتلی بنا رہے گا اور لکیریں کبھی کسی کے نام کا پہلا یا آخری حرف نہیں بتاتیں۔ لکیریں یہ تو کہتی ہیں کہ کوئی غلط کام کر رہا ہے۔ لیکن اتنی تفصیل سے نہیں بتاتیں کہ کوئی لڑکیوں کی دلالی کر رہا ہے اور کس کو سپلائی کر رہا ہے۔ تم نے دردانہ کے بارے میں بتایا کہ یہ لڑکیاں سپلائی کرتی تھی اور داؤد سبحانی کو سپلائی کرتی تھی۔ تم ساری دنیا کو بے وقوف نہیں بنا سکتے' خاص طور پر مجھ سے فراڈ نہیں کر سکتے۔''

میں نے کہا ''بے شک آپ نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوگا، لیکن میرے گھاٹ میں پہلی بار آئے ہیں۔ میں ثابت کر دوں گا کہ ہاتھ کی لکیریں اپنی گہرائیوں تک لے جاتی ہیں۔ بشرطیکہ ان گہرائیوں تک پہنچنے والا کوئی مجھ جیسا ہو۔''

''تم بلاشبہ فراڈ ہو کوئی پراسرار علم جانتے ہو۔ جس کے ذریعے اتنی دور تک اتنی گہرائی تک کسی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیتے ہو۔''

میں نے دردانہ سے کہا ''ممی میں مسٹر شہباز کو یقین نہیں دلا سکوں گا کہ کس طرح ہاتھ کی لکیروں پر چلتا ہوں اور ان کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہوں۔''

میں نے اس کی مٹھی بند کر کے کہا ''آپ اپنا ہاتھ اپنے پاس رکھیں اب میں کسی کے ہاتھ کی لکیریں نہیں پڑھوں گا۔''

دردانہ نے کہا ''شہباز کیوں میرے بیٹے پر شبہ کر رہے ہو! اس کی اس غیر معمولی صلاحیت کو کیوں تسلیم نہیں کر رہے ہو؟''

''دردانہ! تم نہیں جانتیں یہ کوئی عمل جانتا ہے اس سے آنے سے پہلے اس نے میرے اور تمہارے بارے میں کسی پراسرار علم کے ذریعے ہم دونوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا ہوگا اب یہاں آ کر وہی باتیں بتا رہا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ کسی ایسے شخص کو میرے سامنے لائیں جسے میں نہیں جانتا پہلے میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔ میں اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا اور کھری کھری بتاؤں گا۔''

اس نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر اپنی لیدر سیکر بڑی تھیلی کو بلایا۔ اس نے آ کر پوچھا ''یس.....؟''

شہباز نے کہا ''ایک اسٹول لے کر مسٹر مقدر حیات کے سامنے بیٹھو یہ تمہارا ہاتھ دیکھیں گے۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لکیروں کو دیکھا، سوچا۔ پھر کہا ''میرے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ میں سچ بولتا ہوں اور جھوٹا سمجھا جاتا ہوں۔ کیونکہ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ مسٹر شہباز آپ ابھی تہمینہ سے یہ وعدہ کریں کہ یہ سچ بولے گی اور میری بات کو سچ تسلیم کرے گی تو آپ سچائی کے طور پر اسے انعام دیں گے اور جسے یہ چاہتی ہے اس کے پاس اسے تنہائی میں وقت گزارنے دیں گے۔''

شہباز نے کہا ''میں وعدہ کرتا ہوں تہمینہ! مسٹر مقدر حیات تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر جو کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہے تو اسے تسلیم کرو اگر وہ بات میرے خلاف ہوگی تب بھی میں تمہیں سزا نہیں دوں گا انعام دوں گا۔''

میں نے کہا ''ممی! آپ نے جسے قیدی بنا رکھا ہے اس پر تنہینہ کا دل آ گیا ہے یہ اس سے محبت کرنے لگی ہے اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنا چاہتی ہے۔''

شہباز درانی نے کہا ''تہمینہ! اگر یہ سچ ہے تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

اس نے سر جھکا کر کہا ''جی ہاں یہ سچ ہے میں اسے پسند کرتی ہوں۔''

میں نے کہا ''مسٹر شہباز آپ فرما رہے تھے کہ ہاتھ کی لکیریں کسی کا نام یا اس کے نام کا پہلا حرف نہیں بتاتیں لیکن مجھے بتا دیں کہ تہمینہ جسے چاہتی ہے اس کے اصل نام کا پہلا حرف ''ایس'' ہے اور جس نام سے وہ عام طور پر پکارا جاتا ہے اس نام کا پہلا حرف ''پی'' ہے۔''

شہباز نے مجھے حیرانی سے اور پریشانی سے دیکھا میں اس کے لیے معما بن گیا تھا میں نے کہا ''میں اپنی ممی کو اور آپ کو پہلے سے جانتا تھا لیکن آپ کی اس لیڈی سیکریٹری تہمینہ کو آج ہی دیکھا ہے اور ابھی اس کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھا ہے کیا اب بھی آپ یہی کہیں گے کہ میں کوئی پراسرار علم جانتا ہوں اور میں نجومی نہیں ہوں؟''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ''ذرا ٹھہرو میں ایک بار اور آزمانا چاہتا ہوں۔''

پھر وہ تہمینہ سے بولا ''تم جسے چاہتی ہو۔ اس کے پاس جا سکتی ہو۔ اس کا بھی دل بہلتا رہے گا۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولا ''مقدر حیات یہاں آؤ۔''

میں دروازے کے پاس آیا۔ اس نے کہا ''اس دروازے کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا ہے تمہیں صرف اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنی ہیں۔''

اس کے حکم سے دروازے کے پیچھے جو کھڑا ہوا تھا' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا مجھے صرف اس کی کلائی اور ہتھیلی نظر آ رہی تھی میں تھوڑی دیر تک اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا رہا پھر بولا ''آپ کوئی دوسرا ہاتھ دکھاتے تو بہتر ہوتا اس کا ہاتھ تو صاف چغلی کھا رہا ہے کہ یہ بار بار دبئی کھیلتا رہتا ہے پہلے یہ فوج میں تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد سیکورٹی افسر بن گیا ہے اس سیکورٹی افسر کے نام کا پہلا حرف ''ٹی'' ہے۔''

شہباز درانی سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ''میں اس کے بارے میں اور بہت کچھ بتا سکتا ہوں فی الحال سب سے اہم بات یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے دو بیٹے ہیں ایک سات برس کا ہے دوسرا پانچ برس کا اور ابھی ان دونوں کو خطرہ پیش آنے والا ہے۔''

سیکورٹی آفسر فوراً ہی دروازے کے پیچھے سے نکل آیا اس نے پوچھا ''کیسا خطرہ پیش آئے گا؟''

میں نے کہا ''تمہارے پاس دو ریوالور ہیں لوڈ کیا ہوا ریوالور تمہارے ہولسٹر میں رہتا ہے۔ اور اَن لوڈ کیا ہوا ریوالور تم اپنی الماری میں چھوڑ کر آتے ہو اس بار تم بھولے سے بھرا ہوا ریوالور الماری میں چھوڑ آئے ہو اور خالی ریوالور تمہارے ہولسٹر میں ہے۔ یقین نہ ہو تو دیکھ لو۔''

اس نے فوراً ہی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر چیک کیا تو واقعی اس کے چیمبرز خالی تھے۔ اس نے پریشان ہو کر شہباز درانی کو دیکھا۔ میں نے شہباز سے کہا ''پلیز اسے جانے دیں اس کے بچوں کو خطرہ ہے وہ ریوالور سے کھیل رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی وہ سیکورٹی افسر وہاں سے دوڑتا ہوا چلا گیا۔ شہباز درانی نے مجھے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا ''میں حیران ہوں کہ تم کیا چیز ہو؟ میں اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں اتنی تفصیل سے بتاتی ہیں تم نے تو یہ بھی بتا دیا کہ اس کے بچے بھرے ہوئے ریوالور سے کھیل رہے ہیں۔ میں کبھی نہیں مانوں گا کہ یہ علم نجوم ہے۔''

میں نے دردانہ کو دیکھتے ہوئے کہا ''ممی مجھے ہاتھ کی لکیریں سب کچھ بتا دیتی ہیں تو میں کیا کروں؟''

دردانہ نے کہا ''شہباز درانی کیوں میرے بیٹے پر شبہ کر رہے ہو؟ کیوں نہیں مان لیتے کہ اسے علم نجوم میں مہارت حاصل ہے؟''

''دردانہ تم نہیں جانتیں علم نجوم ایسا نہیں ہوتا کہ نجومی جادوگر بن جائے اور اندر کی چھپی ہوئی باتیں بیان کر دے۔ کسی کے ہاتھ کی لکیر کبھی یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ یہاں ہے تو اس کے بچے ریوالور سے کھیل رہے ہیں یہ سراسر ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا ''چلیں میں آپ کی بات مان لیتا ہوں' میں نجومی نہیں ہوں آپ کے خیال کے مطابق جادوگر ہوں۔ کیا میرے جادوگر ہونے سے آپ کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے؟ ویسے آپ کی معلومات کے لیے یہ عرض کر دوں کہ دنیا کا

کوئی جادوگر ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں اتنی سچی اور کھری باتیں نہیں بتا سکے گا' جیسا کہ میں بتا رہا ہوں۔''

پھر میں نے دردانہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا ہے اب مجھے جانا چاہئے۔''

شہباز درانی نے کہا ''نہیں ..... ابھی رک جاؤ میں پھر ایک بار تمہاری جادوگری دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا ''اب دیکھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟''

''آؤ آرام سے بیٹھو۔''

ہم پھر صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے اس نے کہا ''اب میرے بارے میں بتاؤ۔''

''میں ہاتھ دیکھے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔''

وہ سخت لہجے میں بڑبڑایا ''دیکھو مقدر! میرے سامنے پُراسرار نہ بنو کھل کر بات کرو' میں تمہیں بہت عزیز رکھوں گا تمہیں سر پر بٹھاؤں گا۔ اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ مجھ سے جھوٹ بول کر مجھے فریب دے کر یہاں سے جا سکو گے۔''

دردانہ نے پریشان ہو کر کہا ''یہ کیا شہباز؟ تم مقدر میاں کو چیلنج کر رہے ہو؟ یہ ہمارا اپنا ہے۔ ہمارا ہم مزاج ہے۔ مگر تمہارا رویہ اچانک ہی تبدیل کیوں ہو گیا ہے؟''

وہ بولا ''دردانہ تم نہیں جانتیں۔ میرے اندر ایسے ایسے راز چھپے ہوئے ہیں جنہیں صرف وہی چند لوگ جانتے ہیں جن کا تعلق ان رازوں سے ہے' ورنہ کوئی ایسا ویسا نجومی' کوئی جادوگر' کوئی پُراسرار علم جاننے والا بھی ان رازوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ وہاں تک پہنچتا ہے یا نہیں۔''

''اگر یہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر تمام راز بتا دے تو کیا تم اس کے دشمن بن جاؤ گے؟''

''پہلے اسے بتانے دو پھر میں بتاؤں گا کہ کیا چاہتا ہوں؟''

پھر اس نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا ''ہاں تو بولو میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں کسی کی دھمکیوں میں نہیں آتا۔ کسی کی دھونس میں آ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ جو سچ معلوم ہوتا ہے وہی اگل دیتا ہوں۔ اور سچ اسی وقت معلوم ہو گا جب میں ہاتھ کی لکیریں دیکھوں گا اور جب تک نہیں دیکھوں گا آپ مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکیں گے۔''

ایسا کہتے وقت اس کی اور میری نظریں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑ سے ٹکرا رہا ہے۔ اسے میری بات ماننی ہی ہو گی۔ جب تک وہ اپنا ہاتھ نہیں دکھائے گا میں کچھ نہیں بولوں گا اور نہ ہی وہ مجھے بولنے پر مجبور کر سکے گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے سامنے آیا پھر سینٹر ٹیبل پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''لو دیکھو۔''

میں اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد بولا ''آپ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ آپ کا قول ہے کہ بھیک مانگنے والے ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن آج زندگی میں پہلی بار آپ میرے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھے ہیں۔''

اس نے چونک کر غصے سے دیکھا۔ اس کے سامنے سر اٹھا کر اس سے آنکھیں ملا کر اونچی آواز میں بولنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کجا یہ کہ میں نے اسے طعنہ دیا تھا کہ وہ ضرورت مند بن کر اپنے حالات معلوم کرنے کے لیے میرے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے۔

کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو تو وہ مجھ جیسے طرم زور جوانوں کی بھی پٹائی کر دیتا تھا۔ اتنا زبردست فائٹر تھا کہ اپنے مقابل کو مارتے مارتے جان سے مار ڈالتا تھا۔ نہیں اس نے کتنے قتل کیے تھے۔ کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آتا تھا۔ بلکہ قانون کو کھلونا بنا کر کھیلتا تھا۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ ایک الٹا ہاتھ میرے منہ پر رسید کرے پھر مجھے مارتا چلا جائے مجھے ٹھوکروں میں رکھ کر لہولہان کر دے وہ جب تک مجھے جان سے نہ مار دیتا اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا۔

یہ مار پیٹ' یہ خون خرابہ یہ اذیت اس وقت ممکن تھا جب جسم میں توانائی ہو۔ مقدر اسے بھاری کمزور دکھائی دیتا تھا۔ بعض اوقات شہباز درانی جیسا شہ زور بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ اس وقت مجھے کاٹ کھانے کی دھمکی دے سکتا تھا۔ کیونکہ میرے مقدر میں یہ لکھا تھا کہ میں کسی کی گالیاں نہیں سنوں گا۔ اور ان لمحات میں کوئی مجھ پر حملہ کرے گا اور شہباز درانی کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ اپنی طاقت کا بے جا استعمال نہیں کرے گا۔ اس وقت یہ بات اس کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی کہ میں کوئی بہت ذہین چالباز ایجنٹ ہوں۔ اس کے خفیہ معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچا ہوا ہوں۔ اور مجھے مار ڈالے گا تو اس کو میری اصلیت معلوم نہیں ہو گی اور وہ میری تہہ تک پہنچنے کے لیے فی الحال مجھے نقصان نہ پہنچانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا ''تم اپنے دوستوں اور دشمنوں کے لیے بہت ہی پراسرار شخص ہو۔ کوئی تمہاری اصلیت نہیں جانتا۔ سب ہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ تمہارے بارے میں طرح طرح کے اندازے لگائے جاتے ہیں اور اب تک متفقہ طور پر یہی اندازہ قائم کیا گیا ہے کہ تم پاکستان میں رہ کر امریکی مفادات کے لیے کام کرتے رہتے ہو۔''

اس نے کہا ''دوسروں کو چھوڑو اپنی بات کرو' تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتا یہ لکیریں جانتی ہیں اور جو جانتی ہیں وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں ــــ واشنگٹن میں امریکی سی آئی اے کا جو مرکزی شعبہ ہے' تم اس شعبے کے فارن آفیسر ہو۔''

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ''سی آئی اے اپنے مطلوبہ ممالک میں جاسوسی کراتی ہے۔ وہاں کے حکومتی اور فوجی راز معلوم کرتی ہے۔ وہاں کے سیاستدانوں کی بڑی بڑی کمزوریاں معلوم کرتی ہے۔ پھر اپنے مفادات کے مطابق وہاں سیاسی تبدیلیاں لاتی ہے۔ ایسا کرنے کے لیے وہ تمہارے جیسے ذہین' تجربہ کار' معاملہ فہم' سیکریٹ ایجنٹ کی تلاش کرتی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی خفیہ ہاتھ ہے' جو یہاں سیاسی تبدیلیاں لے آتا ہے تم سپر پاور کا وہی خفیہ ہاتھ ہو۔''

وہ مجھے جھنجھوڑتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے دانت پیسنے لگا۔ پھر بولا ''کیا اب بھی تم سچ نہیں بولو گے کہ نجومی نہیں ہو۔ تم بھی ملک کے اہم سیاسی افراد کے اندر گھس کر اس کی ایسی ایسی باتیں معلوم کر لیتے ہو' جنہیں صرف ان کا مقدر جانتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا تم بھی ہماری طرح کوئی بہت ہی خطرناک سیکریٹ ایجنٹ ہو لیکن ہماری امریکی سی آئی اے کے خلاف ہو۔''

''تم مجھے نجومی تسلیم کرو یا نہ کرو میں ایف بی آئی' سی آئی اے' کے جی بی اور انٹرپول جیسی کسی بھی خفیہ تنظیم کا کارندہ نہیں ہوں میں تمہارے یا تمہاری امریکی سی آئی اے کے خلاف جاسوسی کرنے نہیں آیا ہوں۔''

اس نے غرا کر پوچھا ''میں کیسے مان لوں؟''

''تمہارے نہ ماننے سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''تم بہت خطرناک ہو یہاں میں کیسے سیاسی گیم کھیلتا رہتا ہوں اس کی تمام تفصیلات تم جانتے ہو گے۔''

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا ''بے شک تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد بہت کچھ جاننے لگا ہوں۔''

''جو میرے راز جاننے کی کوشش کرتا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑتا اور تم تو بہت کچھ معلوم کر چکے ہو میں تمہیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا یا تو حرام موت مرو گے یا پھر میرے قیدی بن کر رہو گے۔''

میں نے اس کی ہتھیلی پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا ''یہ لکیر کہہ رہی ہے کہ میں تمہارا مقدر ہوں میں نے تمہارے ساتھ جنم لیا ہے تمہارے ساتھ ہی مروں گا جب تک تم زندہ رہو گے' مجھے نہیں مار سکو گے مجھے مارنے کے لیے خود کو مارنا ہو گا۔''

وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بولا ''ایسی بکواس کر کے تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔''

''رہوں گا۔ تم اپنی زندگی کی خیر مناؤ یہ گزرتے ہوئے لمحات تم پر بھاری پڑ رہے ہیں۔ اگر تم چالیس منٹ کے بعد زندہ رہ گئے تو پھر سمجھو کہ تمہیں نئی زندگی مل گئی۔ ورنہ گھڑی دیکھو ٹھیک چالیسویں منٹ پر موت تمہارے سر پر کھڑی ہو گی۔''

وہ پریشانی سے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ دردانہ نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

''بیٹے! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں نے اب تک کون سی بات جھوٹ کہی ہے؟ تم دونوں گواہ ہو کہ اب تک جو کہتا رہا ہوں' وہ سچ ثابت ہوتا رہا ہے۔''

''بیٹے! تم ہماری عزت کر رہے تھے ہمیں آپ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اب تم کیوں کہہ رہے ہو؟''

''میں حالات کے مطابق بدلتا ہوں۔ مسٹر شہباز کے مزاج بدل گئے' رویہ بدل گیا اس لیے میں بھی بدل گیا ہوں۔ تم شہباز سے الگ نہیں رہ سکتیں۔ اس کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہو مجھے بھی چھوڑ سکتی ہو۔ اس سے پہلے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔''

شہباز درانی نے کہا ''بے شک تم نے اب تک تمام باتیں سچ بیان کی ہیں۔ یہ بتاؤ کس طرح مجھے چالیسویں منٹ پر موت آئے گی؟''

''تم مجھے مارنا چاہتے تھے میں نے تمہاری موت کی خبر سنا دی۔ یہ بھی سن لو کہ اس موت سے صرف میں ہی تمہیں بچا سکوں گا۔ تم اپنے سپر پاور کی پوری فوج' پوری طاقت' پورا سرمایہ اور پورے اختیارات استعمال کر لو پھر بھی نہیں بچ پاؤ گے۔''

میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا ''یہ سمجھ لو کہ میں یہاں آج رات کا کھانا کھانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ صرف تمہیں موت کے منہ سے بچانے آیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے میں تمہیں کیوں بچاؤں؟''

وہ غصہ سے دہاڑتے ہوئے بولا ''میں چالیس منٹ پورے ہونے سے پہلے تمہیں مار دوں گا۔ جہنم میں پہنچادوں گا میں موت سے نہیں ڈرتا موت آئے گی تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔''

دردانہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ''شہباز! فضول باتیں نہ کرو۔ اگر اسے مارنے کے بعد تم بھی زندہ نہ بچ سکے تو میرا کیا ہوگا۔ جب یہ دیکھ رہے ہو کہ اس کی تمام باتیں درست ہو رہی ہیں تو یہ بات بھی درست ہوگی کہ چالیس منٹ کے بعد تم موت سے بچ نہیں پاؤ گے اگر تمہیں کوئی بچائے گا تو صرف یہی ایک مقدر ہے۔''

شہباز درانی نے سوچتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا میں نے کہا ''دس منٹ گزر چکے ہیں تم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے یہاں سے امریکا تک سیاسی بازی گری دکھاتے آئے ہو اب اپنی پوری ذہانت سے سوچو کہ یہاں اس ڈرائنگ روم میں تمہیں کس طرح موت آسکتی ہے؟''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا ''کس طرح موت آسکتی ہے۔ اس کمبخت کا نام مقدر حیات ہے اور یہ میرے مقدر کی بات کر رہا ہے میری بدنصیبی مجھے بتا چکا ہے اور مجھے یقین کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کی ہر بات اب تک درست ثابت ہوئی ہے۔''

وہ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہاں اندر اور باہر سخت سیکورٹی کے انتظامات ہیں لیکن انتظامات ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ داؤد وسبحانی نے بھی تو جدید آلات کے ذریعے اپنی سیکورٹی کے انتظامات کئے تھے۔ وہ بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ ایک لڑکی اپنے بدن پر زہریلے لوشن کی مالش کر کے آئے گی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔

یہاں میرے پاس کوئی آنے والا نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کو آنے دوں گا صرف میرے وفادار سیکورٹی گارڈز ہی میرے سامنے آسکتے ہیں اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی میرے وفاداروں کو بڑی رقم دے کر خرید لے اور میری موت کا سامان کردے۔

بیس منٹ گزر چکے ہیں اور بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں اگلے آدھے گھنٹے تک کسی کھانے پینے کی چیز کو منہ نہیں لگاؤں گا پھر موت کیسے آسکے گی؟

میں بیمار نہیں ہوں، کمزور نہیں ہوں' مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جو اچانک ہی آکر دبوچ لے پھر میں کیسے مروں گا؟

آدمی نہیں سمجھتا۔ وہ بہت ذہین ہوتا ہے پھر بھی سمجھ نہیں پاتا کہ اگلے چند لمحوں کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ یہ معلوم ہو جائے کہ موت آنے والی ہے تو عقل کام نہیں کرتی کہ موت کس طرح آئے گی؟

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دردانہ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف سیکورٹی افسر کی آواز سنائی دی ''میڈم! میں آپ کا خادم بول رہا ہوں' آپ کے اس مہمان نے بالکل درست کہا تھا اگر میں اپنے گھر پہنچنے میں دیر کرتا تو کوئی نہ کوئی مارا جاتا۔ میرے دونوں بچے اس بھرے ہوئے ریوالور سے کھیل رہے تھے۔ میں آپ کے مہمان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میں ڈیوٹی پر واپس آرہا ہوں آپ کے مہمان کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔''

دردانہ نے کہا ''ٹھیک ہے یہاں فوراً پہنچو تمہارے باس کسی طرح کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ تم بھی کوٹھی کے باہر اپنے تمام مسلح گارڈز کے ساتھ محتاط اور مستعد رہنا۔''

''یس میڈم! میں راستے میں ہوں اگلے پانچ منٹ میں وہاں پہنچنے والا ہوں۔''

دردانہ نے ریسیور رکھ کر شہباز سے کہا ''ہمارے سیکورٹی افسر کا فون تھا دیکھو شہباز! مقدر میاں کتنی درست باتیں کر رہے آرہے ہیں۔ ابھی اس سیکورٹی افسر نے بتایا ہے کہ اس کے دونوں بچے بھرے ہوئے ریوالور سے کھیل رہے تھے۔ اگر وہ صحیح وقت پر نہ پہنچتا تو ان میں سے کوئی ایک مارا جاتا۔ یہاں بھی کہ یہ تمہاری طرح کوئی سیکریٹ ایجنٹ نہیں ہے۔ تجربے اپنے علم میں مہارت رکھتا ہے اگر تم کہتے ہو کہ یہ کوئی براسرار جانتا ہے تو چلو یہی سہی۔ جانتا ہے بھی تو تمہاری موت کی کوئی گواہی کر رہا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ یہی تمہیں بچا سکتا ہے۔''

شہباز نے جھنجلا کر مجھے دیکھا۔ پھر کہا ''تم نے مجھے الجھا دیا ہے میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے کہ یہاں کس طرح موت آسکتی ہے یہاں میرا ایک ایک سیکورٹی گارڈ اتنا وفادار ہے کہ میری خاطر اپنی جان پر کھیل سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''سوچتے سوچتے ذہن تھک جائے گا تو سمجھ نہیں پاؤ گے' مقدر کا کھیل اگر انسان کی سمجھ میں آجائے پھر وہ خود ہی اپنی تقدیر کا مالک بن جائے گا اور ایسا کبھی نہیں ہوتا۔''

آئن میکسویل (زیکوسلاواکیہ)

کمیونی کیشن کی دنیا میکسویل کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ چار سو سے زائد انٹرلائنگ کمپنیوں کا مالک تھا۔ برطانوی پرنٹنگ کارپوریشن بھی اسی کی ملکیت تھی' جس میں ریڈرز ڈائجسٹ جیسے پرچے چھپتے تھے۔ وہ امریکا اور برطانیہ دونوں جگہوں پر مشہور تھا۔ وہ ایک یہودی تھا اور اسرائیل کے لیے کام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بیٹوں تک کو اس کے کسی راز میں شریک نہیں کرتا تھا۔ اس کا زوال بھی بھاری قرضے لینے اور ادائی نہ کرنے سے ہوا۔ اس کی ذات کے گرد اسرار کا پردہ آج تک تنا ہوا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم وہ کس طرح مرا۔ بس 1991ء میں ایک روز پانچ بج کر پچپن منٹ پر میکسویل کا جسم جس کا وزن ایک سو تیس کلو گرام تھا۔ گرینڈ کینر یا آئی لینڈ کے ساحل پر برہنہ حالت میں تیرتا ملا تھا۔ یہ تیرتا ہوا کو مغرب میں تھا۔ ہسپانیہ کے ہوائی جہاز نے اسے پانی سے نکالا تھا۔ طبی معائنے سے یہ کیس ہارٹ فیلیئر (حرکت قلب بند ہونے) کا تھا۔ لاش اسرائیل لے جائی گئی' وہاں دوسرے طبی معائنے سے اندازہ ہوا کہ اسے شدید ضربات کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہوگا چونکہ وہ مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا' بہتوں کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس پر سات سو پچاس ملین ڈالر کا قرضہ چڑھا ہوا تھا۔

☆☆☆

دردانہ نے گھڑی دیکھی پھر کہا ''باتیں نہ بناؤ پندرہ منٹ والی بات ہے مجھے بتاؤ موت کس طرح آئے گی؟''

''میں نہیں بتاؤں گا۔ میری دو شرائط مان لو گے تو تم پر اپنی جان آنے دوں گا تمہیں یہاں میری موجودگی سے ایک نئی زندگی مل سکے گی۔''

دردانہ نے پریشان ہو کر کہا ''اس کی شرائط مان لو۔''

اس نے کہا ''ہوں ٹھیک ہے بولو کیا چاہتے ہو؟''

''پہلی شرط یہ ہے کہ ملک الموت تمہارے سامنے آئے اور اگر بچ جاؤ تو پھر اس ملک الموت کو کوئی سزا نہ دو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے' جو مجھے قتل کرنا چاہے گا میں اسے یونہی چھوڑ دوں؟''

''تب تو پھر زندہ نہ چھوڑنا۔ اسے آنے دو اس سے خود نمٹ لینا۔''

دردانہ نے کہا ''کیوں ضد کر رہے ہو شہباز؟ اس کی بات مان لو اپنی خیر مناؤ اپنی زندگی کو اہمیت دو تمہیں بہت طویل زندگی جینا ہے، کم از کم میری خاطر.....''

میں نے لقمہ دیا ''اور سپر پاور کی خاطر.....''

اس نے مجھے غرا کر دیکھا۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا ''ٹھیک ہے میں اسے معاف کر دوں گا۔ کوئی سزا نہیں دوں گا دوسری شرط بیان کرو۔''

''دوسری شرط یہ ہے کہ میں یہاں سے جاؤں گا تو میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنو گے اور اگر رکاوٹ بنو گے تو اس کے نتیجے میں کیا ہوگا یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔''

وہ غصے سے مٹھی بھینچ کر بولا ''دردانہ! دیکھو یہ مجھے غصے دلا رہا ہے۔ یہ دھمکیاں دے رہا ہے۔ اپنی پیش گوئیوں کے ذریعے مجھے کمزور بنا رہا ہے۔ میں آج تک اتنا بے بس نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا ہے ابھی ریوالور نکال کر تمام گولیاں اس کے جسم میں پیوست کر دوں۔''

دردانہ نے چیخ کر کہا ''شہباز! صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ غصہ نہ دکھاؤ ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ اس سے وعدہ کرو کہ اس کی دوسری شرط بھی پوری کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اس کی ہر شرط مان لوں گا۔ یہ مجھے بتائے تو سہی کہ اس وقت کون مجھ سے دشمنی کر رہا ہے؟''

میں نے گھڑی دیکھی پھر کہا ''تین منٹ رہ گئے ہیں اب بتا رہا ہوں القاعدہ کے مجاہد تمہیں کتے کی موت مارنا چاہتے ہیں کیونکہ تم ان کے بدترین دشمن امریکا کے ایجنٹ ہو۔ افغانستان میں سی آئی اے کی ٹیم کو اسامہ بن لادن تک پہنچنے کے سلسلے میں در پردہ ان کی مدد کر رہے ہو۔''

میں باتیں کرتے ہوئے دروازے کے قریب آیا پھر بولا ''تم پاکستانی ہو لیکن پاکستان کے خلاف سپر پاور کے چمچے ہو۔ تم مسلمان ہو لیکن مسلمان مجاہدین کے ہمنوا نہیں ہو۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہیں نہ بچاؤں مرنے کے لیے چھوڑ دوں لیکن میں کاتب تقدیر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔ تمہارے ہاتھ کی لکیر کہہ رہی ہے کہ تمہیں زندہ رہنا ہے اور القاعدہ کے مجاہدین کا مقدر کہہ رہا ہے کہ انہیں اپنے مقصد میں فی الحال ناکام رہنا ہے۔ اس لیے میں مجبور آتمہیں آنے والی موت سے بچا رہا ہوں۔ دیکھو گھڑی دیکھو یہ چالیسواں منٹ ہے۔''

میری بات ختم ہوتے ہی سیکورٹی افسر تیزی سے چلتا ہوا

دروازے پر آیا' پھر اس نے ریوالور نکالتے ہوئے اندر آتے ہوئے شہباز درانی کا نشانہ لیا۔ میں نے گھوم کر ایک کک ماری ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں اچھلتا ہوا دور جا کر فرش پر گرا وہ اس ریوالور کی طرف لپکنا چاہتا تھا میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ پھر اسے رگیدتا ہوا دیوار سے جا کر لگا دیا۔ اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے داؤ آزمانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کا ریوالور میرے ہاتھوں میں آ گیا میں نے کہا ''بس رک جاؤ دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھو اور فرش پر گھٹنے ٹیک دو۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی' میں نے اس کے پیچھے آ کر ریوالور کی نال اس کے سر سے لگا کر کہا ''اب بتاؤ تم اپنے باس کو قتل کیوں کرنا چاہتے تھے؟''

شہباز درانی تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا پھر ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولا ''نمک حرام کتے۔ تو میرا وفادار تھا۔ میں تجھ پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو مجھے قتل کرے گا بول! کیوں مجھے قتل کرنا چاہتا تھا؟''

وہ روتے ہوئے بولا ''باس! آپ جانتے ہیں میں پتھر ہوں کبھی میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا لیکن آج رو رہا ہوں۔ بری طرح پھنس گیا ہوں نہ گھر کا رہا ہوں' نہ گھاٹ کا.....''

جب میں یہاں سے گھر پہنچا تو وہاں چند مسلح افراد نے میرے گھر پر قبضہ جما رکھا تھا انہوں نے میرے دونوں بچوں اور بیوی کو یرغمال بنا لیا تھا ایک نے مجھ سے کہا کہ ان کی مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اگر میں یہاں آ کر آپ کو گولی مار دوں تو وہ میرے بیوی اور بچوں کو چھوڑ دیں گے۔ ورنہ ایک ایک کو وحشیانہ انداز میں قتل کر دیں گے۔''

''اور تو اپنے بیوی اور بچوں کو بچانے کے لیے مجھے مار ڈالنے آیا ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولا ''میں نے اور آپ نے بہت دنیا دیکھ لی باس! میرے بچوں کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے اس دنیا میں پیدا ہونے کے حقوق حاصل کرنے ہیں اور میں یہ حقوق ان بچوں سے چھین نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے بہت پیارے ہیں۔ لاڈلے ہیں میں ان کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں تو پھر ان کے لیے کسی کی جان کیوں نہیں لے سکتا۔''

''اب تیرے بچوں کو کون بچائے گا، تو یہاں کتے کی موت مارا جائے گا اور وہ شخص تیرے بچوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

میں نے کہا ''ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ القائدہ کے مجاہدین درندے نہیں ہیں کہ بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو قتل کریں۔ انہوں نے مجھے اسے دھمکی دی تھی اگر یہ آپ کو قتل کرنے میں ناکام رہے گا تب بھی اس کی بیوی اور بچوں پر آنچ نہیں آئے گی۔ وہ مجاہدین مسلمان ہیں۔ خدا سے ڈرتے ہیں۔ ان بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں چوم کر چلے جائیں گے..... مسٹر شہباز تم اپنا وعدہ پورا کرو اسے چھوڑ دو جانے دو۔''

''وہ بولا ''میں نے آج تک اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا پھر یہ تو جانی دشمن ہے؟ اسے کیسے معاف کر دوں؟''

دردانہ نے اس کے پاس آ کر اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ''تم تو زبان کے پکے ہو۔ اپنا وعدہ پورا کرتے ہو۔ اس کے ساتھ مقدر حیات کو بھی جانے دو۔ یہ کہہ چکا ہے اگر تم نے وعدہ پورا نہ کیا اور اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی تو پھر کوئی برا نتیجہ سامنے آئے گا۔''

میں اب تک جو کہتا آیا تھا وہ سچ ثابت ہوتا رہا تھا۔ شہباز درانی کسی کی دھونس میں آنے والا نہیں تھا۔ لیکن میری چال اور میری پیش گوئی نے اسے اندر سے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے وعدہ خلافی کر کے پھر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا ''ٹھیک ہے یہاں سے جاؤ۔ دونوں چلے جاؤ۔ میں وعدے کے مطابق آج جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ کل میں وعدے کا پابند نہیں رہوں گا۔ کل تمہارے خلاف کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

میں مسکراتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

میں کیا ہوں؟
اک بازی گر ہوں
ہاتھوں کی لکیروں پر

تمہارا ہمسفر ہوں
تمہارا دوست بھی ہوں
اور دشمن بھی ہوں
تمہارے ساتھ جنم لیتا ہوں
تمہارے ساتھ ہی مرجاتا ہوں
مقدر ہوں..... میں مقدر ہوں
ایک بازی گر ہوں۔

جاری ہے

سچ بیانیاں
آپ کی کہانی * آپ کی زبانی

لہو رنگ آزادی — احتشام کراچی
اللہ والے — خالد احمد گورچرانوالہ
کسک — گلفراز احمد حیدرآباد
زہر عشق — محمد سیف خان حیدرآباد
نشیب و فراز — عزالہ سنیئر کراچی
فیصلہ — اسلم لاہور
جھوٹا ہمدرد — انشال آفریدی کراچی
غلطی — عمار کراچی
لمحہ قاتل — روحیب انصاری کراچی
تحریک — طلحہ خان کراچی

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لئے آپ بیتی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

لہورنگِ آزادی

مکرمی معراج رسول صاحب، سلام عرض۔
اگرچہ سرگزشت میں ہر ماہ منفرد سچ بیانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن آج میں ایک انمول اور عظیم مقصد کی یاد دلاتے ہوئے ایک ایسی آپ بیتی لے کر حاضر ہورہا ہوں جسے پاکستان کی ابتدا سے آج تک بار بار دہرایا جاتا رہا ہے مگر ملّت کا احساس اب تک بیدار نہ کرسکے۔ جب بھی شہر میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہوتا ہے تب سید احمد جیسے لوگوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ہمارے دل بھی خون کے آنسو رو پڑتے ہیں۔ امید ہے کہ سرگزشت میں جگہ ملے گی۔ شکریہ۔

راوی : احتشام۔ کراچی

سسرال واپس آتے ہوئے میں شہر کے علاقے میں ایک کام سے رک گیا تھا۔ وہاں مجھے حالات کچھ کشیدہ محسوس ہوئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے ہی ایک مسجد میں بم دھماکا ہوا ہے۔ خاصے نمازی شہید اور زخمی ہوئے ہیں۔ کیونکہ واقعہ عقبی سڑک پر ہوا تھا۔ اسی لیے ابھی تک دوسری سڑک پر وہ آثار نہیں تھے جو عام طور سے اس قسم کے واقعات کے ردعمل کے طور پر شروع ہوجاتے ہیں۔ یعنی مشتعل افراد کی طرف سے جلاؤ گھیراؤ اور پتھراؤ وغیرہ۔ حالات کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میں جس کام کی خاطر رکا تھا اسے ملتوی کرکے میں نے فوری طور پر یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے ایک ٹیکسی سامنے سے گزر رہی تھی میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک معمر شخص تھا۔ اس کی گھنی اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ جسامت عام سی تھی اور عمر میرے اندازے کے مطابق کم سے کم بھی ستر برس تھی۔

''بابا..... ماڈل کالونی چلو گے؟''

''کیوں نہیں..... ٹیکسی کس لیے چلاتا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔''

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت وہاں کوئی اور ٹیکسی نظر بھی نہیں آرہی تھی اور کئی افراد اس اکلوتی ٹیکسی کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حالات کو محسوس کرکے سب ہی یہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی ٹیکسی حرکت میں آئی نزدیکی گلی سے مشتعل افراد نعرے لگاتے نکلے ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ انہوں نے آتے ہی دکانوں اور گاڑیوں کے شیشے توڑنا شروع کردیے۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں کین تھے اور ان میں پیٹرول یا مٹی کا تیل بھرا تھا جو انہوں نے گاڑیوں پر چھڑکنا شروع کردیا تھا۔ بعض افراد چلتے ٹریفک پر پتھر پھینک رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ صورتِ حال دیکھ کر معمر ٹیکسی ڈرائیور گھبرا جائے گا لیکن اس نے سکون سے ٹیکسی کو ان افراد کے درمیان سے نکال لیا۔ ایک پتھر آکر ٹیکسی کی چھت پر گرا تھا لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ جب ٹیکسی وہاں سے نکلی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جن گاڑیوں پر تیل یا پیٹرول چھڑکا گیا تھا ان سے اب شعلے اٹھ رہے تھے۔

''شکر ہے ہم خیریت سے نکل آئے۔'' میں نے بمشکل سانس لیا۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اب تو آئے دن ایسا ہی ہوتا ہے۔'' ڈرائیور نے بے پروائی لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی تعریف کی ''تمہارے اعصاب اس عمر میں بھی مضبوط ہیں ورنہ اچھے اچھے اس صورتِ حال پر گھبرا جاتے ہیں۔''

''صاحب..... بات یہ ہے کہ میں نے جوانی میں بہت خون دیکھ لیا ہے اسی لیے اب کسی شے سے ڈر نہیں لگتا۔''

حسبِ عادت میری مصنفوں والی رگ پھڑک اٹھی۔ کوئی بھی اس قسم کا شخص سامنے آئے جس کے پیچھے کوئی کہانی محسوس ہو تو تجسس پیدا ہوجاتا ہے۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا ''بابا ایسی کیا آفت آن پڑی تھی؟''

اس نے سرد آہ بھری ''جو آفت آئی تھی وہ سب کا مقدر تھی۔''

میں نے قیاس کیا ''شاید آپ کا اشارہ قیامِ پاکستان کے وقت ہونے والی خون ریزی کی طرف ہے۔''

''ماشاء اللہ آپ ذہین بھی ہیں۔'' اس نے تعریفی انداز

میں کہا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں صاحب؟''

''میں لکھاری ہوں لوگوں کی کہانیاں لکھتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا..... کیا جی کہانیاں.....؟''

''ہاں بابا آج کل جی کہانیاں اتنی زیادہ ہوگئی ہیں کہ اپنی طرف سے بنا کر کہانی لکھنے کا خیال کم ہی آتا ہے۔''

''آپ کی کہانیاں چھپتی ہیں؟'' اس بار اس کے انداز میں میرے لیے احترام بھی تھا۔

''ہاں اکثر چھپتی ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ وہ کچھ دیر میری کہانیوں کے بارے میں بات کرتا رہا اور پھر اس نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

''صاحب میری کہانی بھی لکھیں گے۔''

''کیوں نہیں۔ میں معاشرے کے عام لوگوں کی کہانیاں ہی تو لکھتا ہوں۔''

''صاحب میں بھی ایک عام آدمی ہوں لیکن میری کہانی خاص ہے۔'' وہ بولا ''اچھا یہ بتائیں کہ صورت سے میں کیسا آدمی لگتا ہوں۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ میں اگلی نشست پر اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا ''بابا صورت سے تو تم شریف اور نیک آدمی نظر آتے ہو۔''

''آدمی میں شریف ہی ہوں۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن ساتھ ہی میں تین انسانوں کا قاتل بھی ہوں۔ ایسے انسان جو انسان کہلانے کے لائق نہیں تھے۔''

ابھی ماڈل کالونی بہت دور تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی سرگزشت سنانے کے لیے کہا۔ مجھے ایک کہانی بھی مل جاتی۔ ڈرائیور شاید خود بھی اپنی کہانی کسی کو سنانے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے مجھے ایک گھنٹے کے سفر میں جو بتایا۔ وہ عبرت انگیز بھی ہے اور اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ وطن پاکستان ہمیں کس قدر قربانیوں کے بعد ملا ہے۔

☆☆☆

''میرا نام سید احمد ہے۔ جب میں دلی کے پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوا تو میرے دادا نے میرا یہ نام رکھا۔ وہ سید احمد شہید بریلوی صاحب سے متاثر تھے۔ ان کے دادا یعنی میرے لکڑ دادا اپنی کم سنی کے باوجود سید صاحب کی تحریک میں شریک ہوگئے تھے اور جب سید صاحب شہید ہوئے تو وہ وطن واپس آگئے تھے۔ میری پیدائش کے وقت برصغیر کے مسلمان ایک نازک دور سے گزر رہے تھے۔ تحریک پاکستان کا نام و نشان نہیں تھا۔ مسلم لیگ روبہ زوال تھی۔ مسلمان فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ اسی انتشار نے درد مند مسلمانوں کو زیادہ مایوس کر رکھا تھا۔

میرے دادا محمد احمد اپنے گاؤں کے سرکردہ افراد میں سے تھے۔ اگرچہ گاؤں میں آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی لیکن مسلمان صاحب حیثیت ہونے کی وجہ سے ممتاز تھے۔ خاص طور سے میرے دادا ایک طرح سے گاؤں کے سربراہ بھی تھے اور تنازعات میں ان سے ثالثی کرائی جاتی تھی۔ جس وقت میں پیدا ہوا والد صاحب دہلی میں سرکاری نوکری کر رہے تھے۔ ہفتے کے ہفتے گھر آتے تھے۔ انہوں نے والدہ اور میرے دوسرے بہن بھائیوں کو ساتھ نہیں رکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ والد صاحب پڑھے لکھے اور علمی ذوق رکھنے والے شخص تھے۔ جبکہ والدہ اپنا نام لکھنا بھی نہیں جانتی تھیں۔ علمی ذوق تو بہت دور کی بات تھی۔

دادا نے خاصی کم عمری میں والد صاحب کا رشتہ اپنی بھتیجی سے کر دیا تھا جب وہ علی گڑھ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ شادی بھی اس طرح ہوئی کہ امتحانات کے بعد والد صاحب چند دن کے لیے گھر آئے اور شادی کے بعد واپس دہلی چلے گئے۔ اگلی بار وہ میرے بڑے بھائی کی پیدائش پر آئے تھے اور ایک ہفتہ رہ کر چلے گئے۔ پھر بی اے کر کے انہوں نے براہ راست سرکاری نوکری کرنے آنے کے بجائے دہلی میں رہنے لگے۔ شہر ہمارے گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا لیکن آمد و رفت آسان نہیں تھی۔

بارہ سال کی عمر تک میرے بڑے بھائی ناصر احمد گھر پر پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیج دیے گئے۔ ان سے چھوٹی عذرا تھیں جنہیں دادا جان خود گھر میں پڑھاتے تھے اور خاندان میں لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے اسکول بھیجنے کا رواج نہیں تھا لیکن امی ابو کی آپس کی ناچاقی دیکھتے ہوئے دادا نے خاندان کی لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب میں ذرا چلنے پھرنے اور کھیلنے کی عمر تک پہنچا میرے ساتھ بے شمار ساتھی تھے۔ جن کے ساتھ میں کھیل سکتا تھا۔ ہمیں حویلی سے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حویلی کا عقبی حصہ ہمارے کھیل کا میدان تھا۔ جہاں دادا جان نے گھاس لگوائی تھی اور باغیچا بنوایا تھا۔ جہاں ہم بے فکری آزادی سے کھیل کود سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ ہا پسند تھا کہ میں اکثر وہیں رہتا تھا۔

چھ سال کی عمر تک میں قرآن ناظرہ مکمل کر چکا تھا۔

کے بعد مجھے بھی حویلی کے دوسرے لڑکوں کی طرح اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ والد صاحب امی کی طرف سے کتنے ہی بے پروا سہی لیکن ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ دادا جان صاحب حیثیت اور خوش حال زمیندار تھے لیکن والد صاحب اپنی تنخواہ کا ایک حصہ باقاعدگی سے گھر بھیجا کرتے تھے۔ جب خود آتے تو ہمارے لیے بے شمار چیزیں لے کر آتے تھے۔ ہم بھائیوں کی تعلیم پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ ناصر بھائی کے تعلیمی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہی انہیں علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔ منیر بھائی کو تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ ایک مقامی اسکول میں پڑھ رہے تھے اور مجھے تو خیر ذرا سی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ جانے کیسے مار پیٹ باندھے اگلی کلاس میں چلا جاتا تھا۔ تعلیم سے میری کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں تین تین چار چار دن طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسکول جاتا ہی نہیں تھا۔ امی کا لاڈ ڈلا تھا اس لیے بگڑے رہنے کی اجازت آسانی سے مل جاتی تھی۔ ان کو تعلیم کی اہمیت کا اتنا احساس ہی نہیں تھا کہ مجھ پر اسکول جانے کی سختی کرتیں۔ بہرصورت حال دیکھ کر دادا جان نے مجھے خود پڑھانا شروع کر دیا۔

ان دنوں میں چھٹی جماعت میں تھا، جب والد صاحب دو طویل چھٹیاں لے کر حویلی آئے۔ امی اور بہن بھائی کے ساتھ میں بھی ان کی آمد پر بے حد خوش تھا لیکن جب والد صاحب نے تعلیم کے معاملے میں میرے رنگ ڈھنگ دیکھے تو وہ بہت ناراض ہوئے کہ انہوں نے مجھے تعلیم کے معاملے میں اتنی ڈھیل کیوں دی ہے۔ میں اس وقت بارہ سال کا ہو رہا تھا اور اب تک میرا رویہ وہی تھا۔ صبح اسکول جانے کے وقت کبھی میرے سر میں درد ہو جاتا تھا اور مجھے چکر آنے لگتے تھے، کبھی میں پیٹ کی تکلیف سے بے حال ہو جاتا تھا اور نتیجے میں اسکول جانے سے بچ جاتا تھا۔

''نور النساء آپ نے بچے کو برباد کر دیا ہے۔'' والد صاحب نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''ارے تو کیا صرف میری ذمے داری ہے۔ خود تو دلی چلے گئے ہیں۔ سب میرے سر چھوڑ کر.....'' والدہ تنک کر بولیں۔

''کبھی خود بھی ذمے داری اٹھا کر دیکھیں۔ لڑکے تو ویسے بھی باپ کے ہاتھ کے ہوتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' والد صاحب نے جواب دیا ''میں اسے اپنے ساتھ دلی لے جاؤں گا اور اسے وہیں رکھوں گا۔ آپ کا بھی دور ہو جائے گا۔''

''شوق سے لے جائیے۔'' امی بے پروائی سے بولیں۔

شاید انہیں یقین تھا کہ میں والد صاحب کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔

مگر جب والد صاحب نے مجھے چلنے کے لیے کہا تو میں بخوشی تیار ہوگیا۔ بچپن سے میں دادا جان اور دوسرے لوگوں سے دلی کی باتیں سنتا آیا تھا۔ دلی سے اتنے نزدیک رہنے کے باوجود میں نے اب تک دلی دیکھا نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کی آرزو میں دل میں مچلتی تھیں لیکن امی کے ڈر سے نہیں کہتا تھا۔

میں خوشی خوشی والد صاحب کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ مجھے دلی دیکھنے کی آرزو تھی اور اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ والد صاحب مجھے کس مقصد کے لیے لے کر جا رہے تھے۔ جب والدہ نے دیکھا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوگیا ہوں تو انہوں نے مجھے روکنا چاہا مگر میں کہاں رکنے والا تھا پھر والد صاحب بھی فیصلہ کر کے اس پر قائم رہنے والے آدمی تھے۔ والدہ نے روکر کہا ''میں اس کے بغیر کیسے رہوں گی۔''

''جیسے ناصر کے بغیر رہ رہی ہو۔'' والد صاحب بولے ''یہ لڑکے ہیں۔ ساری عمر تمہارے گھٹنے سے تو لگے نہیں بیٹھے رہیں گے۔''

''پھر بھی احمد ابھی بچہ ہی تو ہے۔'' والدہ نے فریاد کی۔

''بارہ سال کا ہو چکا ہے۔ مرد اس عمر میں بالغ ہو جاتا ہے۔ اسے بچہ مت سمجھو۔''

ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ دادا ابو نے ہم دونوں بھائیوں کی بات ہمارے بچپن میں ہی پکی کر دی تھی اور میری منگنی میرے تایا ابو کی چھوٹی بیٹی ثمینہ سے ہوگئی تھی۔ ہم اگرچہ ساتھ کھیلا کرتے تھے مگر وہ زمانہ اتنا سادہ تھا کہ بڑے ہونے تک ہمیں اپنے اس رشتے کا احساس ہی نہیں تھا۔ بہرحال یہ بات حقیقت تھی کہ ثمینہ کے ساتھ مجھے کھیلنا نہ جانے کیوں اچھا لگتا تھا۔

پھر والدہ کی تمام تر کوشش کے باوجود آخر کار والد صاحب مجھے لے کر دلی روانہ ہوگئے۔ سارا راستہ کچا تھا۔ جو تانگے نے تقریباً تین گھنٹے میں طے کیا۔ یہ شہر اس وقت انگریزی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ اس کی شان و شوکت بھی اسی لحاظ سے ہونی چاہیے تھی۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ دلی کی عمارتیں، عالی شان جامع مسجد اور لال قلعہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ میرے لیے تو ایک ایک شے عجوبہ تھی۔ والد صاحب بار بار مجھے ٹوکتے کہ ایسے مت دیکھو۔ تم مجتبیٰ احمد کے بیٹے۔ میں مجبور تھا کہ میں نے ساری عمر دیہی ماحول کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

والد صاحب ایک وسیع اور آرام دہ گھر میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ تین نوکر بھی تھے جو ہمارے گاؤں سے ہی آئے تھے۔

اس دو منزلہ مکان میں کُل پانچ کمرے تھے۔ نیچے کے تینوں کمرے کتابوں سے بھرے تھے یا آنے والے مہمانوں کے لیے نشست گاہ تھی اور اوپر ایک کمرے میں والد صاحب رہتے تھے اور دوسرے میں تینوں نوکر، باورچی خانہ بھی اوپر ہی تھا۔ والد صاحب نے میرا بستر اپنے کمرے میں لگوایا تھا۔ میں نے کچھ عرصے پہلے ہی چھٹی کلاس کا امتحان دیا تھا اور بمشکل ہی پاس ہوا تھا۔ والد صاحب نے کہا ''اس نتیجے پر تو تمہیں شاید ہی کسی اچھے اسکول میں داخلہ ملے اس لیے ابھی آرام کرو۔ ایک سال میں تمہیں خود پڑھاؤں گا۔''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ مجھے اسکول سے نجات مل رہی تھی۔ میں بخوشی مان گیا لیکن جب والد صاحب نے پڑھانا شروع کیا تو میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ نہ جانے کس دفتر میں کام کرتے تھے۔ صبح سات بجے دفتر جاتے اور دوپہر تین بجے آ جاتے تھے۔ اس کے بعد مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور رات کے کھانے تک پڑھاتے ہی رہتے۔ کھانے کے وقفے کے بعد پڑھائی دوبارہ شروع ہو جاتی جو رات کے دس گیارہ بجے تک جاری رہتی۔ ایک ہفتے کے اندر میں نے پچھتانا شروع کر دیا۔ کہاں دلی دیکھنے کی خواہش میں بھاگا چلا آیا تھا اور کہاں اب سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا، بلکہ بیزاری سی رہنے لگی تھی۔ پڑھنے میں دل ویسے بھی نہیں لگتا تھا۔ جب والد صاحب نے از خود پڑھانا شروع کیا تو ری سہی دلچسپی بھی جاتی رہی اور اس کا اندازہ والد صاحب کو بھی ایک مہینے کے اندر ہی ہو گیا۔

''برخوردار اگر پڑھو لکھو گے نہیں تو کیا کرو گے؟'' ایک روز انہوں نے ٹوکا کر پوچھ لیا۔

''آپ مجھے کوئی ہنر سکھوا دیں۔'' میں نے سادگی سے تجویز پیش کی۔

والد صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہمارے خاندان میں اب تک کسی نے ہنر سے روزی نہیں کمائی تھی یا تعلیم حاصل کی تھی یا زمینداری سے منسلک رہے تھے۔ ممکن ہے میں یہ بات دادا جان کے سامنے کہتا تو وہ میری پٹائی کر دیتے مگر تعلیم نے والد صاحب کو روشن خیال بنا دیا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اب زمانہ بدل رہا ہے پہلے جیسی اقدار کی وقعت کم ہوتی جا رہی ہے اور ایک نیا معاشرہ سامنے آ رہا ہے۔ اس لیے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود انہوں نے ہامی بھر لی۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں کوئی نہ کوئی ہنر سکھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

جب پڑھائی سے جان چھوٹی تو میں نے دلی کے سیر سپاٹے شروع کر دیے۔ آغاز میں تو ایک نوکر میرے ساتھ ہوتا تھا۔ اس نے مجھے دلی شہر کے مختلف گوشوں سے روشناس کرایا اور جب میں کسی قدر واقف ہو گیا تو خود ہی گھر سے جانے لگا۔ عمر تیرہ سال ہی تھی لیکن قد کاٹھ سے بڑا لگتا تھا۔ صورت شکل کا بھی اچھا ہی تھا۔ گاؤں میں کیونکہ ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی جن کی عورتیں پردہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے عورتیں یا لڑکیاں میرے لیے کوئی عجوبہ نہیں تھیں مگر دلی آ کر میں نے پہلی بار انگریز عورتوں کو دیکھا تھا۔ کھلے گلے کے بلاؤز اور عریاں پنڈلیوں والے لباس میں وہ کسی اور جہان کی مخلوق نظر آتی تھیں۔ جس جگہ والد صاحب کا مکان تھا اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک سرکاری آٹو ورکشاپ تھی۔ جہاں دلی کے سرکاری افسران کی گاڑیاں ٹھیک ہونے کے لیے آتی تھیں۔ وہیں میں نے پہلی بار ایک ستر و اٹھارہ سالہ انگریز لڑکی کو گاڑی چلا کر لاتے دیکھا۔ وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ اسے دیکھنے کے لیے میں روز ہی ورکشاپ جانے لگا۔ پر اب کہاں نظر آتی۔ اس روز وہ شاید اپنی گاڑی کا ٹائل پر ٹھیک کرانے آئی تھی اور کام کرا کے چلی گئی۔ لڑکی نہیں آئی میری دلچسپی ورکشاپ میں آنے والی گاڑیوں کی طرف ہو گئی۔ میرے لیے یہ عجوبے سے کم نہیں تھا کہ ایک گاڑی کسی جانور کے مشین کی مدد سے چل رہی ہے۔ ورکشاپ صاف ستھری جگہ پر تھی۔ کام بھی خاصے سلیقے سے ہوتا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ اسی لیے روز جانے کے باوجود کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ وہاں لڑکوں کی نگرانی کرنے والا کالا اور دبلا سا لڑکا مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک روز میں ایک پرانی شان دار کار دیکھ رہا تھا جس کے آگے پروں والا مجسمہ لگا ہوا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رولز رائس کمپنی کی کار تھی اور شاہ حکومت کے کسی اعلیٰ افسر کی تھی۔ میں اس کے چمکتے سیاہ رنگ پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ بڈھے نے آ کر میری گردن پکڑ لی۔

''اے چھورا کیا کرتا ہے ادھر؟''

''کچھ نہیں۔'' میں گھبرا گیا ''میں یہ گاڑی دیکھ رہا تھا۔''

''کائے کو دیکھ رہا تھا؟'' اس نے چڑ چڑے پن سے پوچھا۔

''مجھے گاڑی اچھی لگ رہی ہے۔''

ایک دم بڈھے کا رویہ بدل گیا ''تیرے کو گاڑی اچھا لگتا ہے۔ تو یقیناً اچھا لڑکا ہے۔ ادھر کام کرے گا؟''

''کام.....'' میں گڑبڑا گیا ''مجھ کو اس کا کام نہیں آتا۔''

''ہم سکھائے گا۔'' بڈھے نے کہا ''تم کو گاڑی اچھا لگتا اور جس کو گاڑی اچھا لگتا وہ جلدی اس کا کام سیکھ جاتا ہے ہم تم کو سکھائے گا۔''

''سچ!'' میں تھوڑا سا خوش ہو گیا تھا کہ کام سیکھنے کے بہانے میں وہاں رہتا تو وہ لڑکی کبھی نہ کبھی تو دوبارہ آتی اور میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ واضح رہے کہ میں صرف اسے دیکھنا چاہتا تھا اس سے زیادہ کوئی خیال اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ ذہنی لحاظ سے میں سچ مچ بچہ ہی تھا۔ ویسے بھی وہ بہت معصومیت کا دور تھا۔ آج کل تو میڈیا اور ماحول نے بچوں کو ہوشیار سے پہلے ہی جنسِ مخالف کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔

اس وقت مجھے ثمینہ کی یاد پہلی بار کچھ اتنی شدت سے آئی کہ میرا دل بے اختیار اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کو چاہنے لگا مگر ممکن نہ تھا۔ والد صاحب کی مرضی کے بغیر واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آخر میں نے ان خیالات کو جھٹک کر بڈھے کی طرف توجہ دی جواب بھی میری صورت تک رہا تھا۔

''ہاں بچ..... کیا تمہارا باپ ہے؟'' وہ سر ہلا کر بولا۔

''کیوں نہیں..... پنجی احمد ہیں میرے ابا۔'' میں نے فخر سے کہا ''بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔''

''تم نے نہیں پڑھا؟''

''میں نے سات جماعتیں پڑھی ہیں۔'' میں نے ذرا شرمندگی کے ساتھ کہا۔

''گڈ یعنی تم کام جلدی سیکھ جائے گا۔''

''پہلے مجھے اپنے ابا سے اجازت لینی پڑے گی۔'' میں نے اسے بتایا۔

''تو لے لو، اور کام سیکھنا ہے تو کل ادھر آ جانا۔ ہم تم کو ہندوستان کا سب سے بڑا کار مکینک بنائے گا۔''

میں نے آ کر والد صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ افسردہ ہو گئے ''کیا وقت آ گیا ہے پنجی احمد کا بیٹا مکینک بنے گا لیکن ہماری یہ مرضی ہے تو میں روکوں گا نہیں مگر ایک وعدہ کرو اگر تمہیں بھی محسوس ہو کہ تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے تو ضرور تعلیم حاصل کرو گے؟''

''میں وعدہ کرتا ہوں ابا جان۔'' میں نے خلوصِ دل سے وعدہ کیا۔

یوں میں اگلے روز سے ورکشاپ جانے لگا۔ جہاں ڈیوڈ مجھ پر خاصی توجہ سے گاڑیوں کے بارے میں سکھانے لگا۔ ڈیوڈ برطانوی اینگلو انڈین تھا۔ وہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ جایا کرتا تھا۔ میں صبح سے شام تک ورکشاپ میں ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا ورکشاپ کی طرف سے دیا جاتا تھا اور میں حیران رہ گیا جب ایک مہینے بعد مجھے ورکشاپ کے منیجر ترپاٹھی ورمانے بلا کر بیس روپے دیئے۔ اس وقت یہ خاصی بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔

''یہ رقم کیوں دے رہے ہیں صاحب!'' میں نے ڈر کر کہا۔ ''کیا مجھے ورکشاپ سے نکال رہے ہیں؟''

ترپاٹھی ہنسا ''نہیں لڑکے..... یہ تمہاری محنت کی اجرت ہے۔ اب تم سرکار کے ملازم ہو اس لیے تنخواہ بھی ملے گی اور دوسری سہولتیں بھی۔''

رقم میں نے لا کر والد صاحب کو دے دی۔ ''ابا جان مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے۔''

وہ خوش ہو گئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ میں نے انہیں رقم دے دی تھی، بلکہ اس لیے کہ میں نے اپنی پہلی آمدنی ان کے حوالے کی تھی۔ جہاں تک جیب خرچ کی بات تھی ابا جان نے مجھے کبھی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ بغیر پوچھے وہ ہر ہفتے پانچ روپے میری جیب میں ڈال دیا کرتے تھے۔ یعنی اتنی ہی رقم جتنی مجھے ورکشاپ کی طرف سے ملتی تھی۔ میں باقاعدگی سے کام پر جاتا اور ڈیوڈ جو سکھاتا اسے سیکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ تکنیکی معاملات میں میرا دماغ خاصا تیز چلتا ہے۔ میں نے چند مہینوں میں اتنا سیکھ لیا تھا جتنا دوسرے لڑکے سال بھر میں نہیں سیکھ پاتے تھے۔ اسی لیے ڈیوڈ مجھ سے بے حد خوش تھا اور اپنے گروپ کے سارے لڑکوں پر مجھے ترجیح دیتا تھا۔

اس زمانے میں پورا برصغیر سیاسی اتھل پتھل سے گزر رہا تھا۔ یورپ میں دوسری جنگِ عظیم جاری تھی۔ لاہور میں قرار دادِ پاکستان منظور ہونے کے بعد مسلمانوں میں اپنے وطن کے لیے بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ابا جان اگرچہ سرکار کی نوکری کر رہے تھے اور اب مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ محکمۂ داخلہ میں ایک اچھے عہدے پر کام کر رہے تھے، مگر وہ بھی مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اکثر شام کو ان کے ملنے والے گھر پر آتے تو زور دار محفل جما کرتی تھی۔ ان کے چند دوست ہندو یا کانگریس نواز بھی تھے۔ ان سے والد صاحب کی بحث ہوتی رہتی تھی۔ ورکشاپ سے آنے کے بعد میں گھر پر ہی رہا کرتا تھا اور ابا جان کی ان گفتگوؤں میں خاموش سامع کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس زمانے میں بڑوں کی محفل میں بچوں کا بولنا بے ادبی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے ان بحثوں میں لطف آتا تھا۔ خود مجھے بھی پاکستان کا تصور اچھا لگتا تھا۔ ایک الگ ملک جہاں مسلمان

پوری آزادی سے رہ سکیں۔ اب تک میں ہندو مسلم سیاست اور باہمی عداوت سے ناواقف تھا۔ گاؤں میں ہندو مسلمانوں سے دبے ہوئے تھے اس لیے ان کے تعصب کا درست طور سے اندازہ نہیں ہو سکا تھا مگر دلی آنے کے بعد جب میں نے ورکشاپ میں کام کیا تو وہاں ساتھ کام کرنے والے ہندوؤں کے رویے میں پہلی بار مجھے تعصب اور نفرت کی جھلک محسوس ہوئی تھی اور اس چیز نے مجھے پاکستان کے مطالبے سے قریب کر دیا تھا۔

اگرچہ میں نے تعلیم ترک کر دی تھی لیکن ابا جان کی وجہ سے میں کتابوں سے نزدیک ہو گیا تھا۔ ورکشاپ سے آنے کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ گھر میں کئی اخبار بھی آتے تھے۔ میں انہیں بھی دیکھتا تھا۔ اس سے میرا سیاسی شعور پروان چڑھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ذہنی طور پر خاصا آگے بڑھ چکا تھا۔ میرے ذہن کو ابا جان کی شام کی محفلوں نے بھی خاصی جلا بخشی۔

ورکشاپ میں ڈیوڈ ایک غیر متعصب اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا لیکن اس کے اکثر ساتھی سپروائزر، جو ہندو تھے، ورکشاپ میں کام کرنے والے مسلمانوں سے تعصب برتتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ سخت کام مسلمان مکینک سے لیں اور اسے کم سے کم سہولتیں دیں۔ میرے سامنے کئی بار ایسا ہوا کسی مسلمان مکینک نے چھٹی مانگی تو اسے انکار کر دیا جبکہ ہندو مکینک کو چھٹی دے دی گئی۔ ورکشاپ کا نگران ایک انگریز تھا۔ جو زیادہ تر اپنے دفتر میں ہی رہا کرتا تھا اور ورکشاپ والے حصے میں شاذ ہی آتا تھا۔ اس کا زیادہ تر رابطہ اپنے سپروائزروں سے رہتا تھا جو سوائے ڈیوڈ کے سب ہندو تھے اور اسی وجہ سے مسلمان ملازموں کی شکایت اوپر تک نہیں جا پاتی تھی۔ میں خوش قسمتی سے ڈیوڈ کے گروپ میں تھا اور وہ مجھ پر مہربان بھی تھا۔ دو سالہ اپرنٹس شپ کے بعد مجھے باقاعدہ ملازموں میں شامل کر لیا گیا تھا اور اب میری تنخواہ بھی پچاس روپے ہو گئی تھی۔ جو میں حسب سابق والد صاحب کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس کا کیا کرتے تھے اپنے پاس رکھتے تھے یا گھر بھجوا دیا کرتے تھے۔ دلی آنے کے بعد میں خود چار پانچ بار حویلی ہو کر آیا تھا۔

اب میں جب بھی حویلی جاتا تو ایک بات خاص طور سے نوٹ کرتا کہ اب ثمینہ میرے سامنے آنے سے کترانے لگی تھی۔ وہ مجھ سے جتنا چھپتی تھی میرے اندر اسے دیکھنے کا اتنا ہی اشتیاق پیدا ہوتا اور میں اسے بہانے بہانے سے پریشان کرنے سے باز نہ آتا۔ وہ تنگ آ کر دادا سے میری شکایت کر دیا کرتی تھی اور دادا مجھے ڈانٹ کر ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کرتے۔ اس وقت ثمینہ کی عمر شاید 13 برس ہو گی۔ مجھے والد صاحب کے پاس واپس دلی آئے جب ڈیڑھ دن ہو جاتے تو مجھے اکثر ثمینہ کی یاد ستانے لگتی تھی۔ اب میں نوجوان تھا اور میرے دل کی دھڑکنوں میں ثمینہ کی محبت شامل ہو چکی تھی مگر مجھے اب گھریلو ماحول اور خاندانی وقار کی خاطر اپنے جذبوں کو اپنے دل میں چھپا کر رکھنا پڑتا تھا۔

اس وقت مجھے ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے چار سال ہو چکے تھے، جب 1947ء کا پرآشوب سال آیا۔ سال کے آغاز سے ہی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔ انگریز ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سمیٹ رہے تھے۔ ورکشاپ میں بھی اب زیادہ گاڑیاں نہیں آتی تھیں کیونکہ گاڑیاں استعمال کرنے والے زیادہ انگریز باقی نہیں رہے تھے۔ ابا جان ان دنوں بہت پریشان رہتے تھے۔ مئی تک واضح ہو چکا تھا کہ چند مہینوں کے اندر پاکستان کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ میں نے ابا جان سے پوچھا۔

''کیا آپ پاکستان جائیں گے؟''

''میرا تو یہی ارادہ ہے۔'' ابا جان بولے۔ ''میں ابو کی طرف سے فکرمند ہوں کیونکہ وہ زمین چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور مجھے اس علاقے کے حالات اچھے نہیں آ رہے ہیں۔''

''آپ دادا جان سے بات کریں وہ مان جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ کیونکہ میں نے گھر میں دیکھا تھا۔ دادا جان والد صاحب کی بات اپنے بڑے بیٹوں یعنی میرے تایاؤں کے مقابلے میں زیادہ مانتے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ والد صاحب پڑھے لکھے اور دنیا دیکھے ہوئے تھے۔

''میں نے ان سے بات کی تھی لیکن ان کا کہنا ہے اس جگہ انہیں یا دوسرے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ صاحب حیثیت ہیں ممکن ہے پاکستان جا کر اپنی یہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکیں۔'' ابا جان نے کہا۔

دلی نسبتاً محفوظ شہر تھا لیکن یہاں بھی خوف و ہراس کی لہر محسوس کی جا سکتی تھی۔ جس روز کلکتہ کے عظیم فسادات ہوئے اس میں ہزاروں ہندو مسلمان مارے گئے تھے۔ جب ان فسادات کی خبر دلی پہنچی تو یہاں بھی ہندو مسلمانوں میں کشیدگی نظر آنے لگی مگر کوئی بڑا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا مگر دونوں قوموں میں پہلے کی سی یگانگت بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں کم سن ہونے کے باوجود یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب جو مسلمان مسلم لیگ کے حامی تھے کم سے کم وہ ہندوستان میں نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ پاکستان کا مطالبہ منظور ہو جانے کے بعد ہندو کھلم کھلا کہنے لگے تھے کہ اب سارے مسلمانوں کو پاکستان چلے جانا چاہیے کیونکہ انہوں نے اس کا مطالبہ کیا تھا۔

جولائی کے آغاز سے ہی پنجاب سے خون ریز مسلم کش فسادات کی خبریں آنے لگی تھیں اور دہلی پنجاب سے متصل تھا۔ فسادات کی لہر یہاں تک آنے میں زیادہ دن نہیں لگتے۔ والد صاحب گھر والوں کے لیے بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر گھر والوں کو دلی لے آئیں کیونکہ مسلمانوں کے لیے دلی سے خصوصی مہاجر ٹرینیں چل رہی تھیں۔ جولائی کے آخر میں والد صاحب گاؤں چلے گئے۔ کیونکہ پنجاب سے شروع ہونے والے فسادات دہلی کا رخ کر رہے تھے اور ہمارا گاؤں پنجاب کی طرف ہی تھا پھر اس علاقے میں زیادہ تر غیر مسلم آباد تھے۔ مسلمان اقلیت میں تھے مسلمان جہاں بھی اقلیت میں تھے ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا تھا۔

والد صاحب مجھے گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ کیونکہ ہمارے تین میں سے دو ملازم جو ہندو تھے ملازمت چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس علاقے میں ملی جلی آبادی تھی یعنی ہندوؤں اور مسلمان کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ اب گھر میں صرف ایک ملازم تھا اس کا نام اشرف تھا۔ اس نے جاتے وقت والد صاحب کو تسلی دی کہ وہ ان کے جانے کے بعد میری اور گھر کی اچھی طرح حفاظت کرے گا مگر ابا جان کے جاتے ہی اس کے تیور بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ ابا جان کی تجوری کا نمبر اسے بتاؤں میں نے جواب دیا کہ مجھے اس کا نمبر نہیں معلوم۔ مجھے واقعی نہیں معلوم تھا۔

''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا ''صاحب گھر گئے ہیں۔ سنا ہے وہاں بھی فسادات ہو رہے ہیں۔ پتا نہیں صاحب واپس آتے بھی ہیں یا نہیں۔ اب کوئی برا وقت آیا تو رقم تو ہاں ہو۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' میں پریشان ہو گیا تھا۔ ''خدانہ کرے میرے گھر والوں کو کچھ ہو۔''

''صاحب آج کل تو زندگی سستی ہو گئی ہے۔'' وہ اسی انداز میں بولا ''بہتر ہو گا کہ آپ بھی جلدی سے تجوری کا نمبر یاد کر لیں ورنہ.....'' وہ عجیب دھمکی آمیز انداز میں بولا اور کمرے سے چلا گیا۔

اشرف کے اس انداز نے مجھے اور پریشان کر دیا تھا۔ ابا جان کو گئے کئی دن ہو گئے تھے اور اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ وہ اگلے ہی روز آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ مکان میں موجود تجوری دراصل مکان کے ساتھ ہی ملی تھی اور جہاں تک میرے علم میں تھا ابا جان اس میں کوئی رقم نہیں رکھتے تھے۔ بعض اہم کاغذات ضرور اس میں تھے ابا جان کے پاس رقم جمع ہی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ جو تنخواہ ملتی تھی اسے وہ گھر بھیج دیتے تھے اور پھر رقم سے اپنے اخراجات چلاتے تھے۔ گھر میں جو نوکر تھے ان کی تنخواہ دادا جان ان کے گھر والوں کو دے دیا کرتے تھے باقی رہائش، کھانا اور جیب خرچ ابا جان کے ذمے تھا۔ میں جتنی تنخواہ لا کر دیتا تھا۔ اس میں سے زیادہ تر ابا جان مجھے جیب خرچ دے دیا کرتے تھے۔ اس صورت میں ان کے پاس کچھ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اشرف کو شبہ تھا کہ ابا جان نے تجوری میں کافی ساری رقم رکھی ہے۔ اشرف کے رویے سے ڈر کر میں نے تجوری کے نمبر کی تلاش شروع کر دی۔ میں ابا جان کی کتابیں دیکھ رہا تھا کہ اس میں سے ان کی ڈائری نکل آئی۔ اس ڈائری کی ورق گردانی کی تو اس میں ایک جگہ ایک نمبر لکھا نظر آیا میں نے کمرا بند کر کے تجوری میں یہ نمبر ملایا تو وہ کھل گئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں نوٹوں کی ایک گڈی موجود پائی۔ یہ تین چار ہزار کی رقم تھی جو آج کے لحاظ سے شاید سو گنا زیادہ ہی ہو۔

میں نے جلدی سے نوٹوں کی یہ گڈی اپنے کپڑوں میں چھپالی۔ اندر کچھ دستاویزات بھی رکھی تھیں انہیں میں نے نہیں چھیڑا اور تجوری بند کر دی۔ میں باہر نکلا تو اشرف موجود تھا اس نے مشکوک انداز میں پوچھا کہ میں اندر کیا کر رہا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ نہیں میں آرام کر رہا تھا اسے شاید یقین نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے کہا ''صاحب جی..... جلدی سے تجوری کے نمبر یاد کر لیں۔ ایسا نہ ہو کسی دن بلوائی آ کر سب جلا دیں۔''

اس علاقے میں بھی اب فسادات شروع ہو گئے تھے۔ مسلمان یا تو پاکستان جا رہے تھے یا ان علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے تھے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور علاقے کے ہندو شہر چھوڑ رہے تھے۔ مسلمانوں کے گھر جلائے جانے کے کئی واقعات ہو چکے تھے۔ اشرف مجھے اس سے ڈرا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ابا جان کے کاغذات میں تجوری کے نمبر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں پھر میں نے ایسا تاثر دیا کہ تجوری کا نمبر ڈائری میں مل گیا ہے۔ میں نے اشرف کے سامنے یہ نمبر لگا کر تجوری کھولی۔ کوئی رقم نہ پا کر اس کے

چہرے پر مایوسی طاری ہوگئی تھی پھر اس نے اندر رکھی دستاویزات کا جائزہ لیا اور انہیں اپنے قبضے میں کرلیا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ یہ والد صاحب کے کاغذات ہیں انہیں واپس رکھ دے لیکن اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ بے پروائی سے بولا ''یہ میرے پاس زیادہ محفوظ ہیں۔ بلوائی آگئے تو سب سے پہلے تجوری کھولیں گے۔''

میں خون کے گھونٹ پی کر چپ ہوگیا۔ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے ان کاغذات کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا جو بلاشبہ کروڑوں کی جائداد کے تھے۔ نہ جانے دادا جان نے جاگیر کے کاغذات والد صاحب کے سپرد کیوں کیے تھے۔ کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کاغذات کتنی اہمیت کے ہیں رقم کے ساتھ میں انہیں بھی غائب کردیتا۔ فی الوقت تو میں رقم بچا کر ہی خوش ہو رہا تھا۔ مجھے شدت سے والد صاحب کی واپسی کا انتظار تھا۔ اگست کا پہلا ہفتہ گزرا اور دوسرا بھی نصف ہو چکا تھا۔ پاکستان جانے والے افراد کے لیے خصوصی ٹرینیں چلنے لگی تھیں۔

ورکشاپ بند ہو چکی تھی۔ اس لیے میں زیادہ تر گھر میں ہی رہتا تھا۔ ایک دن میں سو رہا تھا کہ اشرف خاموشی سے کچھ لوگوں کو لایا اور گھر کا سارا قیمتی سامان لے گیا۔ مجھے حیرت بھی کہ میری آنکھ ہی نہیں کھلی۔ شاید اشرف نے اس کھانے میں کچھ ملا دیا تھا جو میں نے رات کو کھایا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اشرف بمع سامان غائب تھا۔ صورتِ حال واضح تھی۔ میں نے سب سے پہلے رقم دیکھی جو میں نے اوپر پانی کی ٹنکی میں اس طرح چھپائی تھی کہ اسے نمی سے محفوظ رکھا جاسکے۔ رقم اپنی جگہ موجود تھی۔

میں نے سکون کا سانس لیا لیکن فوراً یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا کہ اب میں کیا کروں گا۔ کیا اکیلے رہوں گا ابا جان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ نہ آئیں۔ ممکن ہے کہ وہ گاؤں سے ہی کسی طریقے سے پاکستان روانہ ہوگئے ہوں۔ اس امید و یاس میں چودہ اگست کا دن آگیا۔ پنجاب میں لگی آگ دلی آن پہنچی تھی اور اس کے مختلف علاقوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ روز فسادات میں سیکڑوں لوگ مارے جا رہے تھے۔ خون ریزی اتنی زیادہ تھی کہ فضا سے بھی خون کی بو آتی تھی۔ ہر رات میں یہ سوچ کر سوتا تھا کہ اب بلوائی آئیں گے کئی بار محلے سے بھی شور کی آواز آئی لیکن شاید اس گھر کو خالی سمجھ کر انہوں نے اس کا رخ نہیں کیا تھا۔ دو دن سے میں کھانے کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا مگر تیسرے دن جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا تھا اور بھوک بھی ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی تو مجبوراً میں باہر نکلا تھا۔ میں نے حلیہ ایسا بنالیا تھا کہ مسلمان نہ لگوں کرتے پاجامے کے ساتھ سر پر دو پلی (نہرو طرز کی) ٹوپی پہن لی تھی۔

باہر ایک دہشت کا عالم تھا۔ ساری دکانیں بند پڑی تھیں۔ جابجا جلے مکان نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ ایک شیروانی پوش کی لاش پڑی تھی اسے چھرا مار کر ہلاک کیا تھا اور اس کی بے گور و کفن لاش ایسے ہی پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا خوف کے مارے برا حال ہوگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کوئی بلوائی آئے گا اور میرے پیٹ میں چھرا مار کر مجھے بھی مار ڈالے گا۔ میں سڑکوں پر بھاگا جا رہا تھا اچانک ایک جگہ حلوائی کی دکان کھلی نظر آئی میں اس طرف بڑھ گیا وہاں سے پوری بھاجی لے کر اپنی بھوک مٹائی اور پھر دلی کے ریلوے اسٹیشن پر آگیا۔ نہرو ٹوپی کی وجہ سے کسی نے مجھے روکا نہیں تھا۔

درحقیقت تو میں اپنے گھر والوں کے پاس گاؤں واپس جانا چاہتا تھا مگر حالات اتنے کشیدہ تھے کہ تنہا اتنی دور جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بلوائی خاندان کے خاندان خون میں نہلا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیسے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کروں۔ مجھے سب کی یاد بار بار ستا رہی تھی۔ غمینہ کی صورت تو ہر وقت نگاہوں میں رہتی تھی مگر حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ اس وقت عزت اور جان بچانا مسلمانوں کے لیے مشکل ترین ہوگیا تھا۔ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا تھا وہ بھاگ رہا تھا اور یہی خوف اور جذبات مجھے اپنے گھر اور گھر والوں سے دور لے جا رہے تھے۔

اتفاق سے جس وقت میں ریلوے اسٹیشن پہنچا ایک مہاجر ٹرین جانے کے لیے تیار تھی اور اس کے اردگرد پاکستان جانے کے خواہش مند مسلمان کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ ٹرین کے دروازے تک نظر نہیں آرہے تھے۔ اس ہجوم سے گزر کر ٹرین میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک میری نظر اس لائن پر، جس پر ٹرین کھڑی تھی، دور سے آتے ایک ڈبے پر پڑی۔ میرے دل نے کہا کہ یہ ڈبا بھی اس ٹرین سے لگایا جائے گا۔ میں تیزی سے اس طرف بھاگا۔ یہ ذرا چھوٹا ڈبا تھا۔ اس کے دروازے بند تھے۔ میں نے ایک دروازے پر لگ کر اسے بجایا۔ اندر سے ایک مرد نے جھانکا۔ میں نے گھگھیا کر کہا۔

''جناب مجھے بھی اندر آنے دیں۔''

''بھاگ جاؤ!'' اس شخص نے غرا کر کہا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

میں روہانسا ہوگیا ''خدا کے لیے مجھے لے چلیں میرا کوئی

ایچ اقبال کے قلم سے

گانا سیکھنے کے لئے نہایت موزوں کتابیں

ابجدِ موسیقی

یہ کتاب موسیقی کی کلید ہے، موسیقی کا قاعدہ ہے، یہ موسیقی کی تمہید بھی ہے، تعارف بھی۔ اس کی سادگی اسے موسیقی پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔

دیدہ زیب سرورق | معیاری طباعت | سفید کاغذ | مضبوط جلد

قیمت =/150 روپے + ڈاک خرچ =/25 روپے

برصغیر کے نامور گلوکاروں کے سدا بہار گیتوں کا

نوٹیشن

اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف ''دھن'' بھی ہر ساز پر بجائی جاسکتی ہے

قیمت 200 روپے | ڈاک خرچ 25 روپے

سُر سنگیت

سفید کاغذ، جلد اور دیدہ زیب سرورق

موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ! اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر/ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں

کتابیات پبلی کیشنز

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

Email: kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 نیو ایکس ٹینشن ڈی ایچ اے۔ مین کورنگی روڈ (غزالی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

نہیں ہے۔ کہیں بلوائی مجھے بھی نہ ماردیں۔''

''؟اسے آنے دیں۔'' ایک عورت کی نرم آواز آئی اس پر مرد نے برا سامنہ بنایا۔

''باہر اس طرح ہمدردی کے لائق ہزاروں جمع ہیں کیا سب کو اندر بلاؤ گی؟''

میرا رواں رواں دعا کررہا تھا کہ یہ شخص اس عورت کی بات مان لے جو شاید اس کی بیوی تھی۔ آخر میری دعا قبول ہوئی اس شخص نے بمشکل اتنا دروازہ کھولا کہ میں جھپاک سے اندر ہوگیا۔ لوگوں کے ہجوم سے کچھ اس طرف لپک رہے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے اس شخص نے دروازہ بند کردیا تھا اور پھر اسے اندر سے لاک کردیا۔ اب اسے باہر سے کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے دیکھا اندر خاصے افراد تھے۔ ان کے لباس اور چہروں سے لگ رہا تھا کہ کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر خوف نے ان کے چہروں کو بھی فق کررکھا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ پیسے والے تھے جو ہوائی جہاز سے بھی جاسکتے تھے اس طرح ٹرین میں پُرخطر سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سنا تھا کہ کم ہی ٹرینیں پاکستان کی سرزمین تک صحیح سلامت پہنچ رہی تھیں۔ زیادہ تر راستے میں ہی سکھ فسادیوں کا نشانہ بن رہی تھیں۔

''تم وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔'' اس مرد نے گیلری کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس ڈبے میں سفر کرنے والوں کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اس طرف بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کا یہی احسان کافی تھا کہ انہوں نے مجھے اس ڈبے میں جگہ دی تھی۔ ذرا دیر بعد ایک دھچکے سے ڈبا باقی ٹرین سے منسلک ہوگیا۔ اس پر باہر موجود لوگوں نے اس ڈبے پر بھی دھاوا بول دیا تھا لیکن دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کے باعث وہ اندر آنے سے قاصر تھے۔ کئی بار ایسا لگا کہ مشتعل لوگ دروازہ توڑ کر اندر آجائیں گے مگر خیریت رہی تھی پھر نہ جانے کتنی دیر بعد ٹرین ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگست کے مہینے میں دہلی میں حبس اور گرمی سے برا حال ہوتا ہے۔ ذرا تصور کریں کہ ایک مختصر سے ڈبے میں جہاں ساٹھ ستر افراد بند تھے، وہاں کیا حشر ہوگا۔ پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ پیاس سے گلا خشک ہورہا تھا۔ جن کے پاس پانی تھا وہ پی رہے تھے اور کچھ میرے جیسے بھی تھے جو ان کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اس عورت نے جس نے اپنے شوہر سے کہہ کر مجھے اندر آنے کی اجازت دلوائی تھی۔ مجھے تھوڑا سا پانی دیا تھا۔ اس سے میری تشنگی تو دور نہیں ہوئی تھی مگر کم سے کم حلق تر ہوگیا۔

جب ٹرین نے رفتار پکڑی تو ان لوگوں نے کھڑکیاں کھول دیں۔ تازہ ہوا کے جھونکے آئے تو ذرا جان میں جان آئی تھی مگر ٹرین جیسے ہی دلی سے باہر نکلی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ساری کھڑکیاں فوراً بند کردی گئی تھیں۔ کیونکہ پہلے بھی اس طرح چھوٹے اسٹیشنوں پر گاڑیاں رکوا کر مسافروں کا قتل عام کیا گیا تھا۔ جب گاڑی کو رکے کئی گھنٹے ہوگئے تو کچھ مرد ہمت کرکے اتر گئے۔ انہوں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ ابھی تک ڈاؤن سگنل نہیں ملا ہے۔ اس لائن پر آگے کوئی گاڑی آرہی تھی۔ پہلے وہ گزرے گی تب ہماری ٹرین چلے گی۔ اس ویران اسٹیشن پر کوئی بلوائی تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن دونوں جانب ویرانہ تھا اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں سے بلوائی نہ آجائیں۔

جس پہلے سے زیادہ شدید ہوگیا تھا۔ گرمی ایسی تھی کہ بچوں نے بلبلا کر رونا شروع کردیا تھا۔ دو گھنٹے بعد سورج غروب ہوگیا تھا اور تاریکی ہوتے ہی خوف و ہراس میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ ڈبے کے اندر جلنے والے پیلے بلبوں کی کمزور سی روشنی میں لوگوں کے چہرے بھی پیلے نظر آرہے تھے۔ خدا خدا کرکے گاڑی حرکت میں آئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ دم آیا تھا۔ کھڑکیاں دوبارہ کھل گئی تھیں اور جس کی جہاں آنکھ لگ گئی تھی، لوگوں کے پاس کھانے کی اشیا خاصی تعداد میں تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ خوف نے بھوک کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ البتہ پیاس کی شدت ایسی تھی کہ سب ہی اپنے اپنے ساتھ لایا پانی ختم کرچکے تھے۔ بعض نے ہمت کرکے اپنی بوتلیں اور ڈبے ریلوے اسٹیشن کے نل سے بھر لیے تھے۔ جس ان کے پاس ہی پانی تھا، اور وہ اس میں سے کسی کو دینے کے روادار نہیں تھے۔ جن کے پاس پانی نہیں تھا ان کے بچوں نے اب پیاس کے مارے رونا شروع کردیا تھا۔ پانی کی کمی سے آپس میں تو تکار شروع ہوگئی تھی اور ماحول کشیدہ نظر آنے لگا تھا۔ رات کو خلاف معمول گرمی اور حبس میں کمی آنے کے بجائے مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس گاڑی کے مسافروں کے لیے آج ہی یوم حشر آگیا تھا۔

ٹرین میں سوار ہونے کے بعد میں نے بمشکل ایک گلاس پانی پیا تھا میرا بھی پیاس سے برا حال تھا لیکن میں جوان تھا اس لیے پیاس کی اس خوفناک شدت کو برداشت کیے جارہا تھا۔ دوسری طرف مسافر جو بچے اور خاص طور سے جن کے بچے بلک رہے تھے وہ گاڑی رکوا کر پانی حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن جن کے پاس پانی نہیں تھا یا جن کے ساتھ بچے نہیں تھے وہ گاڑی رکوانے کی مخالفت کررہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ محض پانی کے لیے پوری ٹرین کو خطرے میں ڈالنا عقل مندی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف جو پیاسے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ پانی نہ ملا تو پیاس سے ہی مرجائیں گے اور جب مرنا ہی ہے تو کوشش کیوں نہ کریں۔ غرض کہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔

ٹرین تاریکی میں دوڑی جارہی تھی۔ رات تاریک ہی تھی۔ کیونکہ آسمان پر بادل تھے اور بادل نہ بھی ہوتے تو کوئی فرق پڑتا کیونکہ یہ چاند کی آخری یا ابتدائی راتیں تھیں۔ میں باہر دیکھ رہا تھا اچانک بارانِ رحمت پھوٹ پڑی۔ تیز موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ میں نے چیخ کر مسافروں کو اس کے بارے میں بتایا۔ سب اپنے برتن، گلاس اور ڈونگے وغیرہ لے کر دروازے اور کھڑکی سے باہر کرکے پانی جمع کرنے لگے۔ میٹھا اترتی پانی دیکھ کر لوگ آپس کے جھگڑے بھی بھول گئے تھے۔

اگرچہ اس طرح سے زیادہ پانی تو نہیں ملا لیکن پھر بھی عارضی طور پر لوگوں کی پیاس بجھ گئی تھی۔ جن کے پاس پانی جمع کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا انہوں نے اپنے پاس موجود صاف کپڑے بارش میں بھگو کے نچوڑ کر حلق تر کیے۔

ایک گھنٹے بعد بارش رک گئی تھی۔ میں نے بھی اپنے پاس موجود وہ مال تر کرکے خاصا پانی حلق میں نچوڑ لیا تھا۔ ایک شخص نے مجھے میٹھی روٹی کی ٹکیہ دے دی تھی۔ مجھے بھی سخت بھوک تھی اس لیے میں نے ٹکیہ کھالی پھر سامان سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو مجھے اونگھ آگئی تھی۔ نہ جانے کب آنکھ کھلی۔ ٹرین پھر کسی جگہ رک گئی تھی اور لوگ خجلت میں کھڑکیاں دروازے بند کررہے تھے اچانک باہر نعرے سنائی دیئے تھے ''ست سری اکال..... راج کرے گا خالصہ..... باقی رہے نہ کوئی.....'' ان وحشت ناک نعروں کو سن کر ہم لوگوں کا خون خشک ہونے لگا تھا۔ بچوں نے رونا شروع کردیا تھا اور مائیں خود بھی روتے ہوئے انہیں چپ کرانے کی کوشش کررہی تھیں۔ مردوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سکھوں کے نعروں کے ساتھ ہی گاڑی کے اگلے ڈبوں سے لوگوں کی چیخ و پکار شروع ہوگئی تھی پھر سکھ بلوائی گاڑی پر حملہ آور ہوا۔ ہم نے اپنے ڈبے کے سارے دروازے اندر سے مضبوطی سے بند کردیئے تھے۔ حملہ آور سکھ باہر سے دھکے دے کر انہیں کھولنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اندر سے مرد دروازوں کو کھولنے سے روکنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ اگلے ڈبوں سے آنے والی چیخ و پکار کی آوازیں اب اور بھی تیز ہوگئی تھیں۔ لگتا تھا کہ سکھ ڈبوں میں گھس کر لوگوں کا قتل عام کررہے تھے اور عورتوں و لڑکیوں کو زبردستی لے جارہے تھے۔ میں نے کئی فریاد کرتی آوازیں سنیں۔ عورتیں رو رو کر چھوڑ دینے کی فریاد کررہی تھیں۔ اللہ رسول کے واسطے دے رہی تھیں مگر طاقت کے نشے میں بدمست سکھ انہیں زبردستی لے جارہے تھے۔

باہر مکمل طور پر ویرانہ محسوس ہوتا تھا۔ گاڑی باقاعدہ سازش کے تحت اس جگہ روکی گئی تھی تاکہ پہلے سے گھات لگائے سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام کرایا جائے۔ ہمارے ڈبے کے لوگوں کو موت سامنے نظر آرہی تھی۔ انہوں نے دعائے قنوت اور آیت الکرسی کے ساتھ گلے بھی پڑھنا شروع کردیئے تھے۔ کچھ دیر کوشش کے بعد بھی جب سکھ حملہ آوروں سے ہمارے ڈبے کے دروازے نہیں کھلے تو وہ دوسرے ڈبوں کی طرف چلے گئے۔ دراصل یہ ڈبا خاص قسم کا تھا اور اس میں شاید بڑی شخصیات ہی سفر کرتی تھیں جو اسے اتنا مضبوط بنایا گیا تھا۔

ہم سب باہر سے آتی بھیانک آوازیں اور نعرے سنتے رہے اور خدا کے حضور اپنی حفاظت کی دعا کرتے رہے۔ شاید یہاں گاڑی دو گھنٹے رکی رہی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے گاڑی صدیوں رکی رہی ہو۔ جس وقت گاڑی دوبارہ چلی تو باہر صبح کی روشنی نمودار ہورہی تھی۔ سکھوں کے نعرے ابھی بھی سنائی دے رہے تھے مگر شاید وہ اپنا کام بھی کرچکے تھے۔ اب مسافروں کی چیخ و پکار نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اگرچہ یہ ریل گاڑی پاکستان کی جانب گامزن تھی مگر کسی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی اپنی منزل تک پہنچ پائیں گے۔ اندرونی طور پر میرے دل کا وہی عالم تھا کہ موجودہ حالات میں گھر والے کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے۔ معلوم نہیں اب ان سے اور بالخصوص ثمینہ سے ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ میں بے اختیار ان سب سے ملنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

جب گاڑی چلی اور اپنے زندہ ہونے کا یقین آیا تو سب کو شدت کی گرمی اور حبس کا احساس ہوا۔ اس وقت تو ہمیں محسوس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس بند ڈبے کے اندر کتنا حبس تھا۔ خوف نے الگ گلا خشک کردیا تھا۔ سب کو شدت کی پیاس لگنے لگی تھی اور پانی کسی کے پاس نہیں تھا۔ جن کے پاس تھوڑا بہت تھا وہ اسے کب کا ختم کرچکے تھے۔ ایسے میں پانی کی ضرورت تھی جب ہم نے ڈبے کی کھڑکیاں کھولیں تو صبح کی نمود ہورہی تھی روشنی میں باہر تاحد نگاہ پانی پھیلا تھا۔ حد سے زیادہ بارشوں کی وجہ سے ندی نالے ابل پڑے تھے۔ کھیتوں میں پانی بھرا تھا۔ ریل کی لائن کے ساتھ ساتھ پانی کھڑا تھا اور ہم پیاسے تھے۔ کیسی بے بسی تھی، ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور اس میں سے ایک گھونٹ بھی ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ کسی

نے تجویز دی کہ زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیں اور اس پانی سے پیاس بجھائیں لیکن سب ہی نے اس کی مخالفت کی تھی۔

''یہ پانی پینے کے قابل نہیں ہے۔ اسے پینے کا مطلب ہیضہ ہے۔'' ایک طبی قسم کی معلومات رکھنے والے شخص نے بتایا۔

''پیاس سے تو نہیں مریں گے ہیضے سے ضرور مر جائیں گے۔''

''پھر زنجیر کھینچ کر گاڑی روکنے سے گاڑی فوراً نہیں چلے گی بلکہ پہلے ہرڈبے کی بریک کھولنا پڑے گی۔'' میں نے بتایا۔

اتفاق سے مجھے اس بارے میں اتنا معلوم تھا'' اور اتنی دیر میں سکھ ادھر آنکلے تو باقی سب بھی مارے جائیں گے۔''

سب نے ڈر کے مارے اس تجویز سے انکار کر دیا مگر بچوں نے پیاس اور گرمی کی وجہ سے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

وہ ماں باپ سے پانی مانگ رہے تھے۔ خاص طور سے جس مرد نے اپنی بیوی کے کہنے پر مجھے اندر آنے دیا تھا اس کے دو چھوٹے بچے زیادہ ہی رو رہے تھے۔

ہم گزشتہ چودہ گھنٹے سے سفر کر رہے تھے بلکہ ٹرین نے صرف آٹھ گھنٹے سفر کیا تھا اور رفتار بھی زیادہ نہیں تھی میرا اندازہ تھا کہ ابھی ہم وسطی پنجاب سے گزر رہے تھے۔ راستے میں کئی چھوٹے بڑے اسٹیشن آ کر گزر چکے تھے۔ ان میں سے کئی نام جانے پہچانے تھے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ اسٹیشن کہاں تھے۔ ڈبے میں ایک شخص نے بتایا کہ ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو کل صبح سے پہلے پاکستان نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ بھی اگر کہیں رکے نہیں۔ یہ سن کر لوگوں کے چہروں پر مایوسی چھا گئی تھی۔ بعض تو ایسے بدحواس ہوئے کہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کو کوسنے لگے جن کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنسے تھے۔ ایک شخص نے انہیں ڈانٹا'' کیا اپنا وطن حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ اس کے لیے اس سے بھی زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔''

ان بحث مباحثوں میں کچھ اور سفر بیت گیا۔ دوپہر بارہ بجے ٹرین ایک بار پھر ایک معمولی سے اسٹیشن پر رک گئی۔ اس کے دونوں طرف کھیت تھے اور سامنے ہی ریٹ پر ایک بیل پانی کھینچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب اتنی بارش ہو رہی ہے تو کنویں سے کھیتوں کو پانی کیوں دیا جا رہا ہے مگر چمکیلا اور شیریں پانی دیکھ کر سب کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ایک دانا نے کہا بھی کہ یہ دھوکا ہے مگر مجھے پناہ دینے والے میاں بیوی اپنے بچوں کی پانی کی فریادیں سن کر خود پر قابو نہ پا سکے۔ شوہر نے جانا چاہا لیکن بیوی نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً وہ اسے بھی ساتھ لے گیا۔ ان کے پیچھے ان کا بڑا بیٹا جس کی عمر نو دس سال تھی وہ بھی اتر گیا۔ وہ ڈبا لے کر پانی لینے گئے تھے۔

یہ دھوکا تھا جیسے ہی وہ ریٹ کے پاس پہنچے قریب ہی کھیت میں چھپے سکھوں نے آناً فاناً تینوں کو گھیر لیا۔ ان کی تعداد نصف درجن کے قریب تھی اور وہ بلموں اور کرپالوں سے مسلح تھے ایک نے آتے ہی ہاتھ مارا اور کرپان نے معصوم بچے کا سر اس کی گردن سے الگ کر دیا دوسرے نے مرد کو پیٹ میں بلم گھونپ دیا۔ باقی عورت کی طرف جھپٹے جو شوہر اور بچے کا خون دیکھ کر بری طرح چیخ رہی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے انہوں نے باری باری اس عورت کی عصمت دری کی اور جاتے ہوئے اس کا پیٹ بھی چاک کر گئے۔ ہم سب پتھر کے ہو گئے تھے چپ چاپ سکھوں کی بربریت دیکھتے رہے اور کسی نے اتنی ہمت نہ کی کہ نیچے اتر کر انہیں للکار ہی دیتا۔ اس کے ذرا دیر بعد گاڑی حرکت میں آ گئی تھی۔ پہلے تو میں خاموشی سے اپنے ان محسنوں کی موت پر آنسو بہاتا رہا پھر رفتہ رفتہ میرا خون کھولنے لگا اور میں نے قسم کھائی کہ ان تینوں کے بدلے تین سکھ ضرور قتل کروں گا۔ اگر ابھی نہ کر سکا تو بعد میں کروں گا۔

اس کے بعد رات گئے پھر ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ کئی گھنٹے وہاں رکی رہی۔ پو پھٹے ٹرین دوبارہ چلی جب سورج کی روشنی طلوع ہو رہی تھی تو ہم پاکستان کی سرحد میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے اٹاری پر دوسرے لوگوں کی طرح الحمدللہ ادا کیا اور پھر اندوہناک مناظر دیکھے۔ کئی ڈبوں میں ایک متنفس بھی زندہ نہیں بچا تھا جب سکھوں کی بربریت کی نظر ہو گئے تھے۔ بلاشبہ سیکڑوں افراد کا قتل عام ہوا تھا۔ زخمیوں اور لاشوں سے بھری اس ٹرین کو فوری طور پر لاہور روانہ کر دیا گیا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر لگی تو لاشیں دیکھ کر کہرام برپا ہو گیا تھا۔ لوگ دہاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ میں گاڑی سے اترا تو ایک رضا کار نے مجھے پانی اور کھانے کے لیے روٹی اور فرائی دال پیش کی۔ پورے دو دن بعد میں نے کچھ کھایا تھا۔ کھا پی کر جان میں جان آئی تو مجھے پہلی بار فکر ہوئی کہ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں سے سنا کہ آنے والے مہاجر کیمپوں میں ٹھہرے تھے۔ میں ایک کیمپ گیا۔ حتیٰ کہ دوسرے شہروں میں قائم کیمپوں میں بھی گیا لیکن مجھے کہیں اپنے خاندان کا ایک فرد بھی نظر نہیں آیا۔

پاکستان آ کر ہر جگہ کی ناکامی نے مجھے بے انتہا توڑ پھوڑ دیا تھا۔ تمام مہاجروں کے کیمپ میں انہیں تلاش کر چکا تھا مگر مایوسی اور ناامیدی بے حد بڑھ گئی۔ اب مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے کسی بھی عزیز اور خاص طور سے ثمینہ سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔ اپنے ماں باپ اور دیگر عزیزوں سے زیادہ اب مجھے ثمینہ کا ہی خیال آتا تھا کیونکہ شاید نوجوانی میں انسان کو دیگر رشتوں کے مقابلے میں اپنی پہلی محبت کی یاد زیادہ کچوکے لگاتی ہے۔

میرے پاس رقم تھی جو میں نے ایک بینک میں جمع کرا دی۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ رقم کہاں سے آئی۔ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب پاکستان نے اپنی کرنسی جاری کی تو مجھے اسے بدلوانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی تھی۔ میں نے ایک چھوٹے سے مکان پر قبضہ کر لیا جو کسی سکھ کا تھا پھر ایک آٹو گیراج میں نوکری کر لی مگر ایک بار مالک سے جھگڑا ہوا تو میں نے بینک میں موجود رقم کی مدد سے ایک ٹیکسی خریدی اور اسے چلانے لگا۔ اس دوران میں اپنے ماں باپ اور گھر والوں کی تلاش بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کراچی جا کر آباد ہو گئے ہوں گے لیکن کراچی نہیں گیا۔

مجھے اپنی قسم یاد تھی اور پاکستان آنے کے پانچ سال بعد بھی مجھے ان تینوں، کملیں بیوی اور ان کے معصوم بچے، کی موت اب بھی یاد تھی مگر قسم پوری کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے سرحد پار کرنی تھی اور ابھی دیس جانا تھا۔ جہاں کے لوگ اب بھی مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ میں نے یہ وقت ایسے ہی نہیں گزارا تھا ہلکہ کچھ فن سیکھے تھے۔ ایک اکھاڑے بھی جاتا رہا تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ اب میں انتقام لینے کے قابل ہو گیا ہوں تو میں نے انڈیا جانے کی راہ تلاش کرنی شروع کر دی۔ یہ تلاش مجھے ایک اسمگلر تک لے گئی۔ میں نے اس سے بات کی اور وہ مجھے رقم کے عوض انڈیا لے جانے پر تیار ہو گیا۔ سال بھر پہلے میں نے داڑھی مونچھیں اور سر کے بال بنانا چھوڑ دیئے تھے۔ یہ سال بھر میں میری وضع قطع خاصی حد تک سکھوں والی ہو چلی تھی۔ میں نے ان کے انداز میں پگڑی باندھنا اور کیس بنانا سیکھ لیا تھا۔ لاہور میں پنجابی میں بات کرنے لگا تھا۔

1952ء کے ستمبر کی ایک خنک رات اس اسمگلر نے مجھے سرحد عبور کرا دی۔ اس نے مجھے چوبیس گھنٹے بعد اس مقام پر ملنے کو کہا تھا جہاں سے سرحد عبور کرائی تھی۔ اس نے مجھے اس علاقے کا ایک نقشہ بھی دیا تھا اور چلتے چلتے کام کی بات بھی بتا دی تھی کہ میں اس علاقے میں ہوشیار رہوں۔ سینتالیس میں اس جگہ رہنے والے سکھوں نے مسلمانوں کا بے پناہ قتل عام کیا تھا۔ مجھے ذرا تسلی ہوئی۔ میں جن تین افراد کو ختم کرتا وہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث ہی تھے۔ اگر

کیا

آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟

آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کیلئے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی طرح مشقیں نہیں کرنا پڑتیں:

جدید اور سائنٹیفک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب

مقناطیسیت

آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجئے
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجئے!

قیمت 50 روپے ڈاک خرچ 23 روپے

مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 کراچی 74200
فون: 5802561 فیکس: 5802552-5895313

انہوں نے ظالم ہاتھ کا کردار ادا نہیں کیا تھا تب بھی انہوں نے ظلم کرنے والے ہاتھ کو نہیں روکا تھا۔

میں نقشے کے مطابق ایک قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ رات ہی میں اپنا کام مکمل کر کے اس جگہ سے کوچ کر جاؤں گا جہاں سے اسنگر کو مجھے واپس لے جانا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں اس جگہ جا پہنچا۔ یہ مختصر سا گاؤں تھا مگر گاؤں سے پہلے ہی مجھے ایک کچا ڈیرہ نظر آ گیا۔ اس کے گرد کچی چار دیواری تھی۔ اندر بھی سی روشنی بتا رہی تھی کہ کچھ لوگ اندر تھے۔ احاطہ خالی تھا۔ خاصی گرمی تھی اس کے باوجود لوگ اندر سو رہے تھے یہ تعجب کی بات تھی۔

میں نے اپنے پاس موجود فٹ بھر لمبا چھرا نکالا اور خاموشی سے اندر آ گیا۔ دروازہ بھڑا تھا لیکن اندر سے بند نہیں تھا۔ نیچے کچی پیال پر چار افراد پڑے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی اس کا نقریباً عریاں بدن اور جسم پر نظر آنے والے زخم بتا رہے تھے کہ اس پر کیا بیتتی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈوری سے بندھے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔ اس پر ستم ڈھانے والے تین درندے بے سدھ پڑے تھے۔ میں احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر گیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ دیسی شراب کی چار خالی بوتلیں بتا رہی تھیں کہ انہیں صبح سے پہلے ہوش آنے والا نہیں تھا۔ ایسے ہی کچھ لوگوں نے چند سال پہلے میری آنکھوں کے سامنے میری محسنہ پر بھی ایسا ہی ستم ڈھایا تھا۔ شدید نفرت کے زیر اثر میں نے ان کے گلوں پر سوتے میں یوں خنجر پھیرا کہ میرے ہاتھ ذرا سے بھی نہیں کانپے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ تینوں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے ان کے کٹے گلوں سے نکلنے والی بھیانک آوازیں لڑکی کو ہوش میں لے آئی تھیں۔ اس نے مجھے خنجر بدست اور تینوں کو خون خون دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"ڈرو مت!" میں نے اس کی رسی کاٹ دی "میں نے ان تینوں درندوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔"

"توں کون اے؟" اس نے ڈرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل آیا۔ میرا رخ واپسی کے راستے کی طرف تھا۔ راستے میں ایک بہتے نالے پر میں نے خنجر دھویا، اپنے ہاتھوں پر آ جانے والے خون کے دھبے صاف کیے اور دل بھر کر پانی پینے کے بعد مقررہ جگہ پر چلا آیا۔

اگلا سارا دن میں نے وہیں گزارا۔ رات حسب وعدہ اسنگر آ کر مجھے سرحد پار لے آیا۔"

اس کی کہانی عبرت ناک تھی لیکن آزادی نے نہ جانے کتنی عبرت ناک کہانیوں کو جنم دیا تھا۔ یہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تمہارے والدین گئے تھے۔ باقی خاندان کے لوگ؟"

"ایک منٹ صاحب!" اس نے ٹیکسی ماڈل کالونی قبرستان کے سامنے روکتے ہوئے کہا "میں فاتحہ پڑھ کر آیا۔"

اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی "صاحب..... میرے والد ملے بھی اور نہیں بھی....."

"وہ کیسے؟" میں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کسی قبرستان کے پاس سے گزر ہوتا تو وہاں فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔ میں کئی سال پہلے کراچی آ گیا تھا اور تب سے یہیں ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ ایک دن میں ناظم آباد کے قبرستان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ حسب عادت گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے فاتحہ پڑھنے اندر چلا گیا۔ یہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کچھ ہی عرصے بعد کی بات ہے۔ اسی وقت ایک جنازہ بھی اندر لایا جا رہا تھا۔ میں نے جنازے کو کندھا دیا اور اس کے تدفین کے لیے رک گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میت کو قبر میں اتارنے سے پہلے ایک بار چہرہ دکھانے کے لیے کفن سرکایا گیا تو میں نے اپنا چہرے پر نظر ڈالی اور پھر میں سکتے میں آ گیا۔ یہ میرے والد صاحب کا چہرہ تھا۔ گو وقت اور حالات نے ان میں بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں مگر اتنی بھی نہیں کہ میں انہیں نہ پہچان سکتا۔

میں نے بمشکل خود کو سنبھالا پایا اور تب ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر میرے والد یہاں تھے تو میرے دیگر اہل خانہ بھی اسی شہر میں ہوں گے۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا یہ میت کن صاحب کی تھی اور ان کے کون سے عزیز جنازے کے ساتھ تھے۔ ایک صاحب نے سرسری انداز میں کہا "یہ مجتبیٰ احمد صاحب ہیں اور یہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔" میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "تو وہ کہاں ہیں؟" ان صاحب نے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا اور انہیں بھی پہچان لیا وہ میرے تایا تھے۔

ظاہر ہے ان میں بھی بے شمار تبدیلیاں آ گئی تھیں مگر مجھے انہیں پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے دھیرے سے ان کے قریب جا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور غمگین آواز میں انہیں سلام کیا تو وہ دھیرے سے پلٹے اور پھر غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ شاید مجھے بھی اپنا کوئی پڑوسی سمجھے۔

"تایا جان میں سید احمد ہوں۔" میں نے دھیرے سے کہا تو وہ بولے "کون سید احمد؟"

"آپ کا بھتیجا۔ آپ کے بھائی مجتبیٰ کا بیٹا۔" انہوں نے چند لمحے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مجھے خود سے لپٹا لیا۔ مدت کے بعد اپنے خون سے قربت تمام تر غموں کے باوجود مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رہی تھی۔ ہم دونوں ہی رو رہے تھے اور دیگر حاضرین ہمیں تسلیاں دے رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب بولے "مجتبیٰ صاحب کی تمنا ہی رہی کہ ان کے جنازے کو ان کا بیٹا بھی کندھا دیتا۔ بیچارے کا ایک بیٹا تو کھو گیا تھا دوسرا لاپتا تھا۔" ابھی انہوں نے یہ کہا ہی تھا کہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "مجتبیٰ نے کاش اپنے بیٹے سے ملاقات کی دعا مانگی ہوتی تو وہ اسے پہلے مل جاتا۔"

وہی صاحب حیرت سے بولے "کیا مطلب؟"

"یہ دیکھو۔ یہ ہے مجتبیٰ کا وہ بیٹا جو لاپتا ہو گیا تھا مگر اب اسے مٹی دینے آ گیا ہے۔" اور سب لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے اور مجھ سے آگے بڑھ کر میرے والد کی وفات پر اظہار غم کرنے لگے۔

والد صاحب کی تدفین کے بعد میں تایا ابو کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ برسوں کے بعد قطعی غیر متوقع طور پر یوں ملاقات ہم دونوں کے لیے انتہائی اچنبھے کے ساتھ خوشی کی بات بھی تھی مگر جس موقع پر یہ خوشی ملی تھی وہ میرے لیے ہر غم سے بڑا غم تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گئے۔

اس ملاقات نے ہمارے نہ جانے کتنے زخم ہرے کر دیے۔ مختصراً یہ معلوم ہوا کہ تایا ابو اور ابو اپنے اپنے اہل عیال کے ساتھ پاکستان آنے کے لیے روانہ ہوئے۔ خاندان کے دوسرے لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار

ہر دل عزیز شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے ایک سنسنی خیز سرگزشت

ڈاک خرچ 23 روپے

جال (مکمل)

قیمت 60 روپے

- ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔
- جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔
- دنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں۔

اس پر نہ کوئی گولی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802551 فیکس: 5802551-5895313

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

نہیں تھے۔ ابو نے دلّی میں میرے بارے میں معلومات کیں تو ہمارے غدار ملازم نے انہیں صحیح صورتِ حال کی خبر ہونے دی نہ مجھے بتایا کہ گاؤں سے کوئی میرا پوچھنے آیا تھا۔ وہ یہی سمجھے کہ میں آوارگی یا خوف کے باعث اس گھر سے ہمیشہ کے لیے کہیں بھاگ گیا ہوں۔

پاکستان کے لیے روانہ ہونے کے بعد پورے خاندان کو طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک جگہ بلوائیوں نے کئی نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر ان کے ساتھ بہیمانہ مظالم کیے۔ ان کی عزت لوٹی اور کئی کو اپنی ہوس پوری ہونے کے بعد مار ڈالا۔ ان میں ثمینہ اور اس کی بڑی بہن بھی تھیں۔ مگر ثمینہ کی زندگی تھی اس لیے وہ زندہ بچ گئی۔ اس کے جسم کے زخم تو آہستہ آہستہ بھر گئے مگر روح کے زخم کون بھرتا۔ کسی نہ کسی طرح جب یہ لوگ پاکستان پہنچے تو تایا ابو، تائی اماں ثمینہ اور ابو ہی باقی بچے تھے۔ میری امی اور میرے بڑے بھائی بھی بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

میں تایا ابو کی زبانی تمام حالات سن کر انتہائی غم زدہ تھا مگر جب ثمینہ کی زندگی کی نوید سنی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''ثمینہ اب کہاں ہے۔'' تایا ابو نے بہت دھیمی غم زدہ آواز میں کہا۔

''یہیں..... اسی گھر میں.....'' پھر ذرا رک کر بولے ''تمہاری تائی کا چند سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ مجتبیٰ نے یہاں آکر کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کی مگر پھر رفتہ رفتہ حالات سے بددل ہوگئے اور ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب گھر میں وہ بھی نہیں رہے بس میں ہوں اور ثمینہ۔'' میں حیران بیٹھا تھا کہ آخر اتنی دیر تک ثمینہ سامنے کیوں نہیں آئی۔

تایا ابو نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''تم نے شادی وغیرہ کی؟''

''جی نہیں۔ مگر میں نے پاکستان آنے کے بعد مدتوں آپ سب کو جگہ جگہ تلاش کیا تھا۔''

''بیٹا بہت دکھ سہے ہیں ہم نے۔ بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر سب سے زیادہ اذیت اس وقت ہوئی جب معلوم ہوا کہ بلوائیوں کی بربریت کی نشانی ثمینہ کے پیٹ میں پرورش پا رہی ہے۔ ہم سب ہی لوگ اس انکشاف پر سکتے میں آگئے تھے مگر ثمینہ کسی طور اس سنپولے کو اپنے اندر مزید پرورش دینے پر تیار نہیں تھی۔ اس بیچاری نے تو پاکستان کی خاطر اپنی عزیز ترین شے لٹا دی تھی اور اس کی بہن نے عزت کے ساتھ ساتھ جان بھی دے دی تھی۔ تمہاری تائی نے ثمینہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ کم عمر تھی اور اس کی ضد کی صورت میں کچھ بھی ہوسکتا تھا مگر وہ اپنی جان دینے کو تیار تھی غلاظت اور ناکردہ گناہ کا مزید بوجھ ہرگز نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ آخر کو کسی نہ کسی طرح تمہاری تائی نے اس کی یہ تمنا پوری کروا ہی دیں۔ وہ موت کے منہ میں چلی گئی تھی مگر پھر اللہ نے اسے دوسری زندگی عطا کی۔ بظاہر وہ صحت مند ہوگئی مگر اس کی زندگی اب تک سوائے غم کے کچھ نہیں ہے۔ اس کی زندہ دلی تو مر ہی گئی ہے۔''

میرے ذہن میں ثمینہ کا جو پیکر بسا ہوا تھا اسے میں اب تک بھلا نہ پایا تھا۔ پھر تایا ابو اٹھ کر اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو ثمینہ ان کے ساتھ تھی۔ مگر میرے تصوراتی پیکر سے خاصی مختلف۔ وہ جوان تھی مگر لگتا تھا کوئی عمر رسیدہ عورت ہو۔ چہرے پر غم اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ یہ وہ ثمینہ ہی تھی، میری ثمینہ۔ وہ خاموش تھی میری باتوں پر ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ سے کم میرے اپنے کوئی تو ملے۔

اب میں اکثر تایا ابو سے ملنے جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ثمینہ کچھ زندگی کی طرف لوٹنے لگی اور آخر ایک دن میں نے تایا سے اس کا ہاتھ مانگ لیا۔ انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''میں نے جو تفصیل بتائی اس کے بعد بھی تم ثمینہ چاہتے ہو؟''

''کیوں اس میں کیا حرج ہے؟'' میں نے کہا ''جو ہوا اس میں اس کا کیا قصور ہے۔''

اور یوں میری سالہا سال پرانی ''مانگ'' میری آگئی۔ اب ہم اگر چہ اپنی زندگی سے تو مطمئن ہیں مگر جب شہر میں ہنگامے پھوٹتے ہیں یا ثمینہ کو دنگوں کی خبر سنتی اپنے دونوں بیٹوں کو کئی کئی روز گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ لاشعوری طور پر اب بھی اتنی خوف زدہ رہتی ہے۔''

پھر سید احمد نے چلتے چلتے جو کچھ کہا میں دکھ سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کہا ''اصل میں جو چیز ہم خود بناتے ہیں اسے نقصان پہنچے تو ہمیں دکھ ہوتا ہے مگر جب کوئی چیز مفت میں ملتی ہے تو ہم وہی کرتے ہیں جو ظالم ''مالِ مفت دلِ بے رحم'' کے ساتھ کرتے ہیں۔ گویا پاکستان آج کی نسل کے لیے ''مالِ مفت'' کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''

کسک

تحریر : ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مکرمی ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم۔

میری زندگی کس قدر عجیب ہے اور کتنے نشیب و فراز سے گزری ہے یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہوا؟ یہ نہیں جان سکا۔ شاید بزرگوں کا یہ قول یہاں سچا لگتا ہے کہ ''عورت کو سمجھنا آسان نہیں۔'' میں تو کہتا ہوں ''ممکن ہی نہیں۔'' میری یہ دکھ بھری داستان اگر قابلِ اشاعت سمجھیں تو اپنے پرچے میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔

خیر طلب

کامران احمد۔ حیدرآباد

ایک انجانی سی فکر پر خواب ناک سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سپنوں کی قندیلیں روشن تھیں۔ میں خوش تھا تاہم مجھے حیرت بھی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے تو جب بھی ہماری ملاقات ہوتی اور میں اسے اپنے دل کی بات کہنے کی کوشش کرتا تو وہ پُرشوخ انداز میں طرح دے جاتی اور میں ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتا مگر آج تو نغمہ نے خود ہی پہل کرتے ہوئے مجھ سے ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی کہ گویا میری مراد بر آئی تھی لیکن یہ میری خوش فہمی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''کامران.....! تم نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی سوچ ہے مگر میں اس وقت

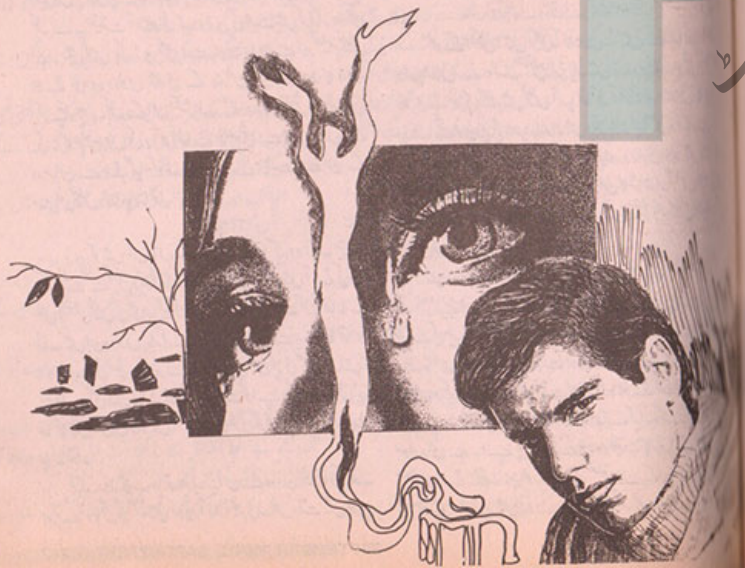

نہیں سمجھی تھی لیکن اب کامران! میں اس بات کا مطلب اچھی طرح جان چکی ہوں۔ انسان لاشعوری طور پر کسی کی محبت کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ اس کی تمنا اپنے اندر پالتا رہتا ہے۔ بالآخر اسے کسی کی محبت مل جاتی ہے۔''

نغمہ کی بات جاری تھی اور میں محویت اور محبت سے دیکھ رہا تھا اور اپنی قسمت پر بھی نازاں تھا کہ آخر آج نغمہ نے بہت عرصے بعد سہی میرے دل کی بات کا مفہوم سمجھ ہی لیا تھا۔

اس وقت ہم دونوں یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ نغمہ میری کلاس فیلو تھی اور ہم بی ایس پی کے دوسرے سال میں تھے۔ میں اور نغمہ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ نغمہ کے والد ایک بڑے صنعت کار تھے تو میں بھی ایک بڑے سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ نغمہ کو میں نے دیکھتے ہی اپنی لائف پارٹنر کے طور پر چن لیا تھا۔ حسن و ملاحت' معصومیت اور نزاکت' اس کی شخصیت کو سحر انگیز بنائے ہوئے تھے۔

آج ایسے ہی معنی خیز انداز میں جب نغمہ نے اشاروں کنایوں میں اپنے دل کے چور خیالات کا اظہار میرے سامنے کیا جو اس سے قبل میں نے اپنے دل میں نغمہ کے لیے محسوس کیے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگی ہے مگر دوسرے ہی لمحے میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ جب آخر میں میرے ''خوش فہم'' اصرار پر نغمہ نے یہ حقیقت آشکار کی کہ وہ زبیر کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زبیر بھی اسے بہت چاہتا ہے اور تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ نغمہ کے اس انکشاف کے بعد میں خوش فہم خوابوں کی ناکام تعبیروں کی راکھ اٹھائے خاموشی سے ان دونوں کے درمیان سے ہٹ گیا کیونکہ میں رقیب کی حیثیت سے ان کے درمیان نہیں رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

زبیر کو میں بس اس قدر ہی جانتا تھا کہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے اس کی راہ میں آنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ میں نغمہ سے سچی محبت کرتا تھا۔ بے شک میں ان دونوں پیار کرنے والوں کے بیچ سے ہٹ چکا تھا اور ناکام محبت کی صلیب میرے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں نغمہ کی محبت کو اپنے دل سے نکال چکا تھا مگر میں اس کی راہ میں آ کر نغمہ کی خوشی کو ناخوشی میں نہیں بدلنا چاہتا تھا۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ یہ اس سے دو دن بعد کا ذکر تھا۔ میرے موبائل کی گنگناتی ہوئی آواز ابھری۔ اس وقت میں گھر پر ہی تھا۔

''ہیلو..... کامران بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنا موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا کامران! میں سیٹھ اشفاق بات کر رہا ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کیسے ہیں؟'' دوسری طرف سے سیٹھ اشفاق کی آواز پر میں ذرا چونکا اور مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی۔ کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ انہوں نے براہ راست میرے موبائل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔

''جی انکل! السلام علیکم۔ ڈیڈی بالکل ٹھیک ہیں۔'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''اچھا بیٹا..... ایک کام کرو' تم کسی وقت فوراً مجھ سے آ کر ملو۔'' انہوں نے مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگایا۔ کیونکہ ایسا بھی پہلی ہی بار ہوا تھا کہ مجھے سیٹھ نے یوں اپنے پاس بلایا تھا۔ ''جی کامران! ایک بات کا ذرا خیال رکھنا' تنہائی آنا اور اپنی اور میری اس ملاقات کا کسی سے ذکر بھی نہ کرنا۔ اچھا تو پھر کب آ رہے ہو؟'' آخر میں ان کا لہجہ اچانک پُراسرار ہو گیا۔

''جج..... جی! بس میں آ رہا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں آپ کہاں ملیں گے؟ گھر یا.....؟'' میں نے قدرے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''بس آ جاؤ۔ میں اس وقت آفس میں ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔

''او کے انکل! میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور انکل سیٹھ اشفاق نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ذرا دیر تک یونہی گم صم کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر سیٹھ اشفاق کا یوں اچانک مجھے فون پر پُراسرار انداز میں دفتر بلانا کیا معنی رکھتا ہے۔

بہرطور میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور ذرا ہی دیر میں سیٹھ اشفاق کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کا شمار آفس شاہراہ فیصل پر واقع ایک کثیر المنزلہ عمارت کی تین وسیع و عریض منزلوں پر مشتمل تھا۔

میں ذرا دیر بعد ہی ان کے آفس میں موجود تھا۔

''بیٹے! یہ زبیر کون ہے؟'' انکل اشفاق نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر گہری متانت سے پوچھا۔ وہ ایک سالہ خاصی گھنی ہوئی جسامت اور کوتاہ قامت کے مالک تھے جنہیں دیکھ کر فوراً ہی اس بات کا اندازہ ہونے لگتا تھا کہ وہ انسان پر ہر لمحے ایک اور ایک دو کے بجائے گیارہ کرنے کی فکر سوار رہتی ہے۔ اپنے چہرے سے ہی وہ ٹھیٹ کاروباری شخصیت معلوم ہوتے تھے۔ بہرطور زبیر سے متعلق ان کے اچانک اور غیر متوقع سوال پر میں قدرے چونکا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے جواباً کہا۔

''جی انکل! زبیر..... ہمارا..... میرا مطلب ہے' میرا اکلاس فیلو ہے۔''

''کیا کرتے ہیں اس کے ماں باپ؟'' انکل سیٹھ نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔ میں نے دیکھا' ان کے چہرے پر عجیب سی سختی در آئی تھی۔ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی شدید ذہنی ہیجانی ابال کا شکار رہے ہوں۔ زبیر کے متعلق ان کا مجھ سے تفصیل معلوم کرنا' میرے اندر کی ''کھنک'' میں اضافہ کر رہا تھا۔ اور جانے کیوں میرے اندر نامعلوم سی امید افزا سنسنی سی پھیلنے لگی تھی۔

''جی انکل' زبیر کے والد میرا خیال ہے کسی سرکاری محکمے میں کلرک ہیں۔''

''ہونہہ!'' سیٹھ انکل حقارت سے بڑبڑانے والے انداز میں بولے۔ ''کہنے کا مطلب یہ کہ..... زبیر نامی وہ لڑکا جو تمہارا اور میری بیٹی نغمہ کا کلاس فیلو بھی ہے' ایک معمولی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ رائٹ آئی رائٹ؟''

سیٹھ اشفاق نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یار! تم نغمہ کو سمجھاتے نہیں ہو۔ اسے اپنی زندگی کا جیون ساتھی چننے کے لیے ایک یہی لڑکا ملا تھا؟''

سیٹھ اشفاق نے قدرے جھلا کر مجھ سے کہا اور میں جیسے آناً فاناً ساری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ سیٹھ اشفاق نغمہ کے ڈیڈی تھے اور ظاہر ہے' نغمہ نے اپنی پسند کے بارے میں اپنے ڈیڈی کو آگاہ کر دیا ہو گا وہ چونکہ یہ بات بھی جانتے تھے کہ میں بھی ان کی بیٹی نغمہ کا کلاس فیلو ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اسٹیٹس کا ہوں اس لیے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔

بہرطور باتی باتوں کا لب لباب یہ رہا تھا کہ سیٹھ انکل نے مجھے نغمہ کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔ بہ الفاظ دیگر مجھے اشاروں کنایوں میں بھی یہ باور کرا دیا تھا کہ نغمہ سے پوچھوں کہ مجھ میں آخر کیا برائی ہے؟ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ سیٹھ انکل نے اپنی بیٹی کے لیے گرین سگنل دے ڈالا تھا۔ میں نغمہ کو سمجھانے کا وعدہ کر کے وہاں سے تو گھر لوٹ آیا مگر اب سوچنے لگا تھا کہ نغمہ کو کیوں کر یہ بات سمجھا سکتا ہوں کہ وہ زبیر جیسے ایک غریب لڑکے سے شادی کا ارادہ کیوں رکھتی ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ نغمہ کے ڈیڈی سیٹھ اشفاق زبیر کو کسی قیمت پر بھی اپنا داماد بنانے پر تیار نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

بالآخر وہی ہوا جو اس قسم کی طوفانی محبتوں میں ہوتا آیا ہے۔

نغمہ نے باپ کی ساری دولت اور آسائش کو ٹھوکر مار کر زبیر سے شادی کر لی۔ نغمہ کی زبیر سے شادی کی خبر سے میں اپنا دل صحیح معنوں میں مسوس کر رہ گیا تھا۔ نغمہ میری پہلی اور آخری محبت تھی مگر میری یہ بدنصیبی ہی تھی کہ یہ محبت یک طرفہ ہی رہی۔

میں اب جانے کیوں ان دونوں ''دلفگار کپل'' کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ یہ بھی میری نغمہ سے محبت کا ایک انداز تھا۔ درحقیقت میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ خوش بھی یا اسے کسی تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ رقابت کا زہر میری رگوں میں ابھی سرایت نہیں ہوا تھا۔ تاہم مجھے حیرت ہوئی تھی کہ نغمہ جیسی ناز و نعم میں پلی بڑھی، ایک نازک اندام وڈیرہ زبیر کے عام سے کوارٹر نما گھر میں کیوں کر خود کو ایڈجسٹ کرے گی؟ بہرحال دونوں خوش تھے۔ نغمہ کے باپ سیٹھ اشفاق نے بیٹی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ تعلیم سے تو کب کی فراغت پا چکا تھا۔ اب میں نے زبیر اور نغمہ سے بھی ملنا پہلے آہستہ آہستہ کم اور بعد میں بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔ ڈیڈی مجھے ہائر اسٹڈی کے لیے باہر بھیجنا چاہتے تھے مگر میری ممی پہلے میرے سر پر سہرا سجانے کی آرزومند تھیں۔ کیونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ممی مجھے باہر بھیجنے کے حق میں نہ تھیں۔

نغمہ کو بہرحال میں بھلا نہیں پایا تھا۔ آج عجیب بات تھی کہ مجھے یاد بھی وہ بہت آ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آڈیو سی ڈی پر مہدی حسن کا پیغام گیت سن رہا تھا۔

تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے۔ لہریں بھی ہوئیں مستانی سی۔

نغمہ کو یاد کر کے میرے دل سے بار بار ہوک سی اٹھتی تھی۔ محبت میں ناکامی کیا شے ہوتی ہے۔ اس کا احساس اب مجھے رفتہ رفتہ گزرتے وقت کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اچانک میرے موبائل کی میوزیکل گھنٹی بجی۔ میں نے موبائل آن کیا ''ہیلو!''

''ہیلو' کامی!'' دوسری طرف سے نغمہ کی گھبرائی ہوئی آواز پر میں جیسے پتھر کا بت بن گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے بولا۔

''ہاں..... نن..... نغمہ! تت..... تم خیریت سے تو ہو ناں؟''

''کامی' تت..... تم مم..... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' نغمہ کے بے ربط الفاظ سے بوکھلاہٹ اور ناقابلِ بیان سی پریشانی کی جھلک نمایاں تھی۔

''ہاں..... ہاں' تم کہاں ہو اس وقت؟'' میں نے بے

قرار ہو کر پوچھا۔ نغمہ نے مجھے ایک ریسٹوران کا نام بتایا جس کے قریب ہی ٹیلی کارڈ بوتھ تھا جدھر سے اس نے مجھے فون کیا تھا۔

میں نے اسے ابھی آتا ہوں کہہ کر موبائل آف کر کے پھینکا اور آندھی طوفان کی طرح اپنی کار میں نغمہ کے بتائے ہوئے ریسٹوران کی طرف ہولیا۔

جانے نغمہ کون سی مصیبت کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کا یوں اچانک اور مصیبت زدہ لہجے میں ملتجیانہ انداز میں مجھ سے بات کرنا۔ یہ سارے عوامل ظاہر کر رہے تھے کہ نغمہ کے ساتھ کوئی ٹریجڈی واقع ہوگئی تھی۔ میں دل ہی دل میں خیر کی دعائیں مانگتا ہوا نصف گھنٹے میں مطلوبہ ریسٹوران کے قریب پہنچ گیا۔ پیلے سے رنگ کے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کے پاس نغمہ مجھے کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے کار پارک کی اور بے تابانہ انداز میں دروازہ کھول کر نغمہ کی طرف بڑھا۔ نغمہ کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر سے رقصاں رہنے والی شوخ و چنچل مسکراہٹ کی جگہ اب حزن و ملال کا جیسے کھنڈر آباد ہو گیا تھا۔ ''کیا ہوا..... نغمہ! خیریت تو ہے؟'' میں اس کے قریب آ کر بولا۔ وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگ اور آنکھوں میں غم کی پرچھائیوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بڑی کسمپرسی میں زیست کاٹ رہی ہو۔ کپڑے بھی اس نے عام سے پہنے ہوئے تھے۔

''کامی! مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔ تم..... تم' میرے اچھے دوست ہو ناں' میں نے تمہیں تکلیف دی' میں تمہارا یہ احسان.....''

''او مائی گاڈ! نغمہ پلیز لیو اٹ۔ کم آن..... یہ بات چھوڑ دو آؤ اندر اور مجھے بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے؟'' میں نے اس کی افسردہ سی لرزتی آواز کو فوراً کاٹتے ہوئے کہا اور پھر میں اسے لے کر اندر ریسٹوران کے ایک نسبتاً ویران فیملی کیبن میں لے آیا اور بیرے کو چائے اور کچھ کھانے کا آرڈر دیا۔

''ہاں' اب بتاؤ کیا بات ہے نغمہ!'' میں نے اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے تفکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔ میرے دل و دماغ میں عجیب و غریب اور انجانے وسوسوں اور اندیشوں کی یلغار جاری تھی' وہ بولی۔

''کامران! زبیر بہت بیمار ہے۔ ایسے..... اسے ہیپاٹائٹس ''سی'' ہو چکا ہے اور ڈاکٹروں نے بھی تشخیص کر دیا ہے'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا اور اس کی آنکھوں سے جانے کب کے رکے ہوئے بھل بھل آنسو جاری ہو گئے۔ میں اس کی بات پر بہت بن گیا۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان بتایا: ''ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر جلد علاج نہ ہوا تو پیٹ میں پانی پڑ جائے گا۔ آخری اسٹیج ہوگی' اس کے بعد.....'' اس کے گلے میں رقت اتر آئی اور وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

میں نے فکرمندی سے پوچھا ''تو..... اب کہاں ہے زبیر؟ کیا اسپتال میں ہے؟''

''نہیں' گھر میں رہ رہی ہیں۔'' نغمہ نے اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف افسردہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں بولی ''کامران! ڈاکٹروں نے جو انجکشن تجویز کر کے دیے ہیں' وہ بہت مہنگے ہیں۔ ایک دن چھوڑ کر لگانا ہیں پورے چھ ماہ تک اور اس میں تین سے پانچ لاکھ تک خرچا آ جائے گا۔ ہم..... مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں۔ اگر..... اگر تم سے کچھ ہو سکے تو میری مدد کرو کامی! میں تمہاری پائی پائی لوٹا دوں گی۔''

وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی اور جیسے ٹوٹ کر بکھرنے کے قریب ہو رہی تھی۔ بے چاری' بے بسی کے کرب انگیز دکھ کے انتہائی احساس تلے وہ بالکل ہی بکھر گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل اندر سے بری طرح کٹنے لگا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''نغمہ! تم بالکل فکر مت کرو۔ میں تمہیں وہ انجکشن لے کر دیتا رہوں گا۔ پلیز' تم ذرا حوصلہ تو پکڑو'' میری بات پر جیسے اس کا پگھلا ہوا چہرہ یکدم کھل اٹھا اور متشکرانہ نگاہوں سے میری طرف تکنے لگی۔

''کیا تم نے انکل! میرا مطلب ہے اپنے ڈیڈی سے.....'' میں نے یونہی اس سے پوچھنا چاہا تو اس کے ستم رسیدہ چہرے پر نفرت کی چنگاریاں سی بھڑکتے لگیں اور پھر اس نے جلتے سلگتے لہجے میں کہا۔

''مجھے اپنے باپ سے شدید نفرت ہوگئی ہے۔ اس نے اپنی جھوٹی انا کو اپنا کھاتے ہوئے مجھے دھتکار دیا تھا۔ میں ان کے پاس بھی مدد لینے گئی تھی۔ ان سے بات کر کے مجھے احساس ہوا کہ وہ یہی چاہتے ہیں کہ خدانخواستہ زبیر.....''

''اوکے..... اوکے! تم مجھے اس کے انجکشنوں والا نسخہ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ میں خود اس کا علاج کرواؤں گا۔'' میں اسے مزید دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے پرس سے انجکشن کا نسخہ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

قصہ کوتاہ میں اور نغمہ خود زبیر کو ایک دن چھوڑ کر بذکورہ ڈاکٹر کے پاس وہ انجکشن لگوانے لے جاتے رہے۔ وہ انجکشن واقعی بہت مہنگا تھا۔ میں دل مسوس کر سوچا کرتا تھا کہ بے چارہ

ایک غریب آدمی' اتنے مہنگے انجکشن خریدنے کی بھلا کہاں سکت رکھتا ہوگا۔ وہ تو بے چارہ اس موذی بیماری میں مبتلا ہو کر گویا خاموشی سے اپنی موت کا ہی منتظر رہتا ہوگا۔ میں سوچتا کہ مخیر اور فلاحی تنظیمیں اس طرح کے مہنگے اور تیزی سے پھیلتے ہوئے اس جان لیوا مرض کا علاج سستا بنانے کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتیں؟

زبیر کا علاج کامیابی سے جاری رہا۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا اور گویا نغمہ کے اندر جیسے جان پڑتی جا رہی تھی اور نغمہ کی خوشی میں میری خوشی تھی۔ میرا اب تک ایک لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا تھا لیکن میں نغمہ کی خوشی کی خاطر سب کر رہا تھا۔

☆☆☆

زبیر کا علاج مکمل ہو گیا اور اس نے لیبارٹری ٹیسٹ کروایا تو اس کے خون کی پیمائش کی منفی رپورٹ آئی۔ نغمہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دونوں میرے مشکور تھے مگر شاید تقدیر کی ستم ظریفی ابھی جاری تھی۔ کئی روز گزرنے کے بعد ایک روز نغمہ پھر میرے پاس آئی اور میں اس کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی ابھرا تھا کہ کہیں خدانخواستہ زبیر کو کسی بیماری نے آ لیا ہو۔

نغمہ کو دیکھ کر کسی زندہ لاش کا ہی تصور ابھرتا تھا۔ اس کی گلاب جیسی رنگت سیاہ پڑنے لگی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے جو کہانی مجھے بتائی اس پر بے اختیار یقین آ گیا۔ نغمہ نے مجھے بتایا۔

''کامران! پتا نہیں میری محبت میں کہاں کمی آئی تھی کہ..... کہ زبیر کی نظروں میں اب میری کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ..... وہ نسرین نامی ایک امیر کبیر گھرانے کی لڑکی کی زلف کا اسیر ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب اس لڑکی کے ایما پر مجھے عنقریب طلاق بھی دینے والا ہے۔'' میں اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ مگر میں نے اس کو تسلی دے کر گھر واپس بھیج دیا۔ پھر خود ہی میں ایک دن زبیر سے ملا اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے اور اسے سمجھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''زبیر! تم اس قدر احسان فراموش نکلو گے مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تمہیں معلوم ہے نغمہ تم سے کس قدر محبت کرتی ہے' اور تم.....''

''دیکھو مسٹر کامران! تم میرے دوست ضرور ہو اور شاید میرے محسن بھی.....'' زبیر نے انگلی کا اشارہ میری طرف کرتے ہوئے مجھے ٹوکا۔

''لیکن نغمہ والا معاملہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے تمہیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ رہا تمہارا وہ خرچا جو تم نے میرے اوپر کیا تھا' وہ تمہیں جلد لوٹا دیا جائے گا۔''

اس کے سرد اور سپاٹ لہجے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ مگر میں نغمہ کی وجہ کے تحت خود پر قابو پائے رکھا اور اپنے لہجے میں چھپی تلخی کو دباتے ہوئے معتدل لہجے میں اس سے بولا: ''زبیر! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' آخر تمہیں نغمہ جیسی اس قدر چاہنے والی وفاشعار اور خدمت گزار بیوی میں اب کون سا عیب نظر آنے لگا ہے کہ تم اسے ایک غیر لڑکی کے کہنے پر طلاق دینے پر تلے بیٹھے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نغمہ نے تمہاری محبت کی خاطر اپنے امیر کبیر باپ کی محل نما کوٹھی اور دولت کو ٹھکرا کر تم سے شادی کر لی۔''

''یہی تو اس بے وقوف کی سب سے بڑی خامی تھی۔'' زبیر بے حسی سے بولا۔ اس کے چہرے پر بڑی کمینی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ''اسے باپ کی دولت کو ٹھکرانا نہیں چاہیے تھا۔ آخر کو اس پر نغمہ کا اور میرا حق بنتا تھا۔ اپنے باپ کے خلاف نغمہ کو عدالت میں مقدمہ کرنا چاہیے تھا۔ مگر نغمہ نے میری بات نہ مانی۔ اب میرے لیے وہ بے کار ہے۔'' زبیر کی سنگدلی اور خود غرضی پر میرا خون کھول اٹھا لیکن جانے کیسے میں نے اس طوطا چشم اور بے حس شخص کے سامنے غصے کو ضبط کر رکھا تھا۔ بالآخر میں نے اسے سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی۔

''زبیر! تم جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو' اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ کیا وہ بھی اپنے باپ کی دولت.....''

''وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔'' زبیر مکارانہ ہنسی کے ساتھ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''وہ خود سامحب جائیداد ہے مگر اس نے بڑی بہادری اور دانش مندی کے ساتھ اپنے باپ کو بھی قائل کر لیا ہے۔ وہ بھی راضی ہو گیا ہے۔ بس وہ لوگ نغمہ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔''

''اور تم دولت کے لالچ میں نغمہ کی انمول محبت سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو؟'' میں نے زہر خند لہجے میں اسے گھور کر کہا۔ اس نے بے پروا... انداز میں اپنے شانے اچکا کر بے حسی سے کہا۔

''آف کورس!''

میرا جی تو چاہا کہ اس وقت اس بے ضمیر اور خود غرض انسان کا گلا دبوچ لوں۔ مگر میں اپنی اس ہیجانی خواہش پر قابو پاتے ہوئے خاموشی سے چلا آیا۔

نغمہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کا نام لیلیٰ تھا اور وہ ایک الٹرا ماڈرن اور آزاد خیال

لڑکی تھی۔

بہرطور آخر وہی ہوا' زبیر نے نغمہ کو طلاق دے ڈالی۔ نغمہ بے چاری زندہ لاش کی مثل ہوگئی تھی۔ یہ تو اچھا تھا کہ میں سائے کی طرح ان نازک اور کسی حد تک خطرناک حالات میں اس کے ساتھ تھا۔ خطرناک حالات سے میری مراد یہ کہ کہیں نغمہ زبیر کی بے حسی اور سنگ دلی سے دل برداشتہ ہوکر خود کو کوئی نقصان نہ پہنچالے۔ ظاہر ہے' طلاق کے بعد کدھر جاتی؟ باپ کے پاس دوبارہ جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہرطور پھر میں ہی نڈھال سی نغمہ کو سہارا دیے اس کے باپ کے گھر لے آیا۔

وہاں نغمہ کا باپ سیٹھ اشفاق نے ایک عجیب دھماکا کیا۔ وہ ایک جہاندیدہ شخص تھے۔ وہ پہلے ہی سے میری نغمہ میں دلچسپی کو بھانپ چکے تھے۔

لہٰذا جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی بدنصیب بیٹی نغمہ کو معاف کردیں تو انہوں نے یہ عجیب شرط رکھ دی کہ اب میں ان کی بیٹی نغمہ سے شادی کرلوں۔

پہلے تو میں ان کی بات پر بھونچکاں سا رہ گیا۔ مگر اندر سے میرا دل مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل سے نغمہ کی محبت گم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں بھی شدت آگئی تھی۔ میں نے ہاں کردی۔ نغمہ نے بھی خاموشی سے اپنا سر جھکالیا۔ یوں میری نغمہ سے شادی ہوگئی۔ بلکہ میرے دل کی دنیا آباد ہوگئی۔ میرے ویران چمن میں نغمہ کی وجہ سے بہار آگئی۔ میں ہر طرح سے نغمہ کو خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ وہ گزرے ہوئے تلخ دنوں کی زہریلی یادیں بھلا کر میرے ساتھ زندگی کے نئے سفر پر گامزن ہوجائے۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ میں نے محسوس کیا تھا کہ نغمہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ جانے کہاں جاسوئی تھی۔ وہ کسی طور پر خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر وقت گم صم سی رہتی تھی۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوجائے گی مگر یہ میری بھول تھی اور حقیقت یہی تھی کہ نغمہ زبیر کی بے وفائی کے باوجود اسے بھول نہیں پائی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا' جب کافی عرصہ گزرنے کے بعد میں اور نغمہ شاپنگ کی غرض سے اپنی کار میں طارق روڈ کی طرف نکلے ہوئے تھے کہ اچانک نغمہ چلائی۔

''کار..... روکو..... کامران' گاڑی روکو۔''

''اوہو..... کیا ہوا بھئی!'' میں نے دھیرے دھیرے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے۔ قدرے پریشان ہوکر کہا۔ نغمہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بے چین سے کھڑکی کے باہر عقب میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ پھر کار رکتے ہی دروازہ کھول کر باہر کو دوڑی۔ میں بھی حیران و پریشان اس کے پیچھے چل دیا۔ میں نے دیکھا نغمہ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے ایک چار پہیوں کی معذوروں والی بتھ ریڑھی پر براجمان ایک فقیر سے باتیں کررہی تھی۔ میں ذرا قریب پہنچا تو اس فقیر کو دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹھکا..... اور ایک لمحے کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ کیا میری آنکھیں وہی کچھ دیکھ رہی تھیں جو مجھے نظر آرہا تھا مگر میں اس عبرت ناک منظر کو کھلی آنکھوں جھٹلا بھی تو نہیں پارہا تھا۔

یہ بدنصیب اور مفلوک الحال فقیر زبیر تھا۔ وہی زبیر جس نے نغمہ کی انمول محبت کو دولت کے ترازو میں تول کر اس کا وزن ہلکا جان کر اپنی زندگی سے ہی نکال پھینکا تھا مگر آج تقدیر نے اسے بھی نہیں بخشا تھا۔ مگر آخر یہ ساری عبرت ناک کہانی کیا تھی۔ زبیر اس حال کو کس طرح پہنچا بہرطور مجھے تو نغمہ پر حیرت ہورہی تھی جو زبیر کو اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار رو پڑی اور مجھ سے رندھے ہوئے لہجے میں بولی کہ میں زبیر کو گھر لے چلوں۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب اور ناگوار تو ضرور لگا مگر پھر انسانیت کے ناتے اور نغمہ کی خواہش کی وجہ سے میں نے طوعاً و کرہاً زبیر کو سہارا دے کر ریڑھی سے اوپر اٹھا کر اپنی کار میں ڈال دیا۔ زبیر کی حالت واقعی بدتر ہورہی تھی۔ اس کے گندے سڑے وجود سے بدبو کی سڑاند بھی اٹھ رہی تھی۔ بال مچھری سے میلے چیکٹ ہورہے تھے۔ دو ناخنیں گھٹنوں کی طرف سے کٹی ہوئی تھیں۔ اس کی اس قابلِ رحم ہیئت مجموعی سے ایسا ہی اندازہ ہوتا تھا جیسے بڑی مفلسی دہ اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہو۔

ہم اسے اپنے گھر لے آئے۔ سارے راستے میرا موڈ خراب رہا۔ مجھے زبیر سے نفرت تھی۔ وہ اس سزا کا مستحق تھا۔

تاہم ہم نے اسے گیسٹ روم میں رکھا تھا۔ اس نے بھی اپنی منطقی مگر عبرت ناک انجام کی کہانی یوں بیان کی کہ جب اس نے نغمہ کو طلاق دی اور نسرین کے ساتھ شادی کی تیاریاں کررہا تھا کہ اچانک اس کا کار ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ نسرین بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اسے تو معمولی چوٹیں آئیں مگر اس کی یعنی زبیر کی دونوں ٹانگیں شدید متاثر ہوئیں اور بعد میں زہر پھیل جانے کے خدشے کے تحت ڈاکٹروں نے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دیں اور پھر جیسے مکافاتِ عمل کی کہانی نے ایک دوسری کروٹ بدلی۔ جس طرح زبیر نے نغمہ کو چھوڑ دیا تھا اسی طرح اب نسرین نے زبیر کو بیکار شے سمجھ کر دھتکار دیا۔ اور یوں زبیر جیسی کرنی ویسی بھرنی کی تفسیر بنا فٹ پاتھ پر آگیا۔ مگر آفرین

تھا کہ نغمہ اس کا دیا ہوا اتنا بڑا زخم یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔ زبیر کے لیے اس کے دل میں اب بھی تڑپ اتنی ہی شدت کے ساتھ موجود تھی جتنی کہ اس سے شادی کے وقت ہوئی لیکن بہرحال' اب یہ میری برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔

''نغمہ! آخر تم چاہتی کیا ہو؟ اس کی ٹانگیں لگوانا تو میرے بس میں نہیں۔''

بالآخر ایک دن میں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کرتے ہوئے نغمہ سے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہا تو وہ بولی۔ ''کامران! اتنے سنگ دل نہ بنو۔ یہ بھی انسان ہے۔ اسے..... اسے ذرا سی کوشش سے لکڑی کی یا کسی اور دھات کی مصنوعی ٹانگیں تو لگ سکتی ہیں ناں؟''

میں نے اس کی بات سن کر اپنا سر پکڑ لیا اور سوچنے لگا کہ آخر نغمہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ زبیر نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ وہ پھر بھی اس کا دیا ہوا زخم بھلا کر اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت تو میں چپ ہوگیا مگر پھر اگلے دن میں نے اٹل لہجے میں نغمہ سے واشگاف انداز میں کہہ ڈالا کہ میں اب زبیر کو یہاں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ اس پر نغمہ خاموش ہوگئی۔ تاہم اس کمسن بھولی نغمہ نے اپنی بات ضرور منوالی کہ ہم زبیر کو کم از کم کسی ٹھکانے تک پہنچا چھوڑ آئیں۔ زبیر کی زبان بھی ڈھکلی ہوئی لگ رہی تھی جس سے وہ بول بھی صحیح طرح نہیں پاتا تھا۔ شاید یہ بھی اس حادثے کی مرہونِ منت تھا۔

نغمہ کی ضد سے مجبور ہوکر ہم زبیر کو کار میں بٹھا کر اس کی نشاندہی پر ایک گندی فقیروں کی بستی میں داخل ہوگئے۔ وہ ایک میدان سا تھا۔ جہاں جابجا جھونپڑیاں اور پائپ نظر آرہے تھے۔ زبیر بھی ایسے ہی کسی پائپ میں رہتا تھا۔ ہم اسے اس کے ٹھکانے پر چھوڑ کر جب گھر لوٹے تو نغمہ کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہورہی تھیں۔ مجھے نغمہ کا زبیر کے لیے اس طرح آنسو بہانا ناخت ناگوار گزر رہا تھا۔ تاہم میں نے خاموشی ہی اختیار کررکھی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ نغمہ نے پھر کبھی زبیر کا نام نہیں لیا۔ تاہم میں اس کے انداز و اطوار سے محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بے چین رہنے لگی ہے۔

میں ایک اچھے پرائیویٹ ادارے میں بڑے عہدے پر کام کرتا تھا۔ ایک دن اچانک میں دفتر جلدی گھر لوٹا تو نغمہ غائب تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا پھر جب میرے گھر لوٹنے کا وقت قریب آنے لگا تو اچانک میں نے نغمہ کو اندر آتے دیکھا۔ اس وقت میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ میں فوراً ایک طرف ہوگیا۔ مقصد یہی تھا کہ نغمہ کو پتا نہ چلے کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ میرے اندر عجیب سی کھچڑی پکنے لگی۔ میں نے مصلحتاً نغمہ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں سے آرہی تھی' تاہم ایک دن میں نے بڑی چالاکی کے ساتھ اس کا تعاقب کرنے کی ٹھانی اور دفتر کے لیے کہہ کر گھر سے نکل کر ذرا فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ تب پھر میں نے نغمہ کو اپنی ذاتی کار میں کوٹھی سے نکلتے دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی کار اس کی کار کے تعاقب میں لگادی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا' نغمہ اسی فقیروں کی بستی میں داخل ہورہی تھی جدھر کسی گندے پائپ کے اندر زبیر موجود تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مجھے پہلی بار نغمہ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس نے میری مردانگی پر کاری ضرب لگائی تھی۔ کسی نے درست کہا ہے کہ عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھلا پاتی۔ میں دل و دماغ میں ہزار قسم کے طوفان لیے واپس آگیا۔

کچھ دنوں بعد جب گھل گھل کر جلنے اور جل جل کر سلگنے لگا تو میں نے نغمہ کو آڑے ہاتھوں لے لیا اور اسے اس کی بے وفائی پر خوب لعن طعن کرنے لگا۔ پہلے تو وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی پھر وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''کامران! یہ حقیقت ہی رہے گی کہ میں زبیر کی محبت کو دل سے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر نغمہ بیگم! آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟'' میں پھٹ پڑا۔

''میں نے آپ سے شادی نہیں کی تھی' آپ نے مجھ سے کی تھی۔'' وہ بدستور گم صم سے لہجے میں بولی' یہ سن کر میری آنکھیں پھیل گئیں' وہ بولی ''کامران! زبیر بہت تنگ دستی کی زندگی بسر کررہا ہے۔ اسے ہمارے سہارے کی ضرورت ہے اور..... اور میں اس کی لاٹھی بننا چاہتی ہوں۔''

''تو میں کیا کروں؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ
احساس کمتری
سے کیسے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں
احساس کمتری
اسباب | خدوخال | علاج
قیمت 20 روپے | ڈاک خرچ 23/- روپے
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر 23 کراچی 74200

''مجھے آزاد کردو' یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔'' نغمہ نے ہموار لہجے میں کہا اور میں اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ میں نغمہ کے اس عجیب جذبۂ جنون محبت پر متحیر سا رہ گیا تھا جو ایک ایسے اپاہج شخص کے لیے روا رکھا تھا' جس نے اس کی انمول محبت کی قدر نہیں کی تھی اور اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور پھر اسی سنگدل شخص کو تقدیر نے دوبارہ نغمہ کے قدموں میں لا پھینکا تو اس سے آگے مجھ میں سوچنے کی ہمت نہ تھی۔

میں نے خاموشی سے دل پر جبر کر کے نغمہ کو طلاق دے دی۔

کاش نغمہ میری زندگی میں آتی ہی نا تو اچھا تھا۔ کم از کم مجھے اس قدر تکلیف تو نہ دیتی کہ اب مجھے اس سے نفرت بھی ہونے لگی تھی۔ مگر نہیں' یہ تو میرا وقتی جذبہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نغمہ کی محبت میرے دل میں مزید پختہ ہونے لگی۔ میں جس خطرناک ''مشلٹ'' سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا آخر اس کی زد میں آ ہی گیا۔ میں نے نغمہ کو لاکھ بھلانے کی کوشش کی مگر اس کی اتنی ہی محبت بڑھتی گئی تب مجھے احساس ہوا کہ جس قسم کی جنوں خیز محبت نغمہ کو زبیر سے تھی' مجھے بھی ویسی ہی نغمہ سے ہو چلی تھی۔ آج میں نے نغمہ کی محبت کا احساس کیا تھا' کھلے دل کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن میرا دل بے چین ہو گیا۔ طلاق لینے کے بعد نغمہ اسی دن اپنا مختصر سا سامان لے کر گھر سے چلی گئی تھی۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر گئی ہوگی مگر پھر فوراً ہی میں نے اپنے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیونکہ بعد میں' میں خود نغمہ کو اس کی خواہش کے مطابق فقیروں کی بستی چھوڑ آیا تھا۔ جدھر نغمہ نے ایک بار پھر نئے سرے سے زبیر کے ساتھ اس کی لاٹھی بن کر زندگی کا آغاز کیا تھا۔

بہر طور نغمہ کے لیے آج کافی عرصہ بعد میرے دل میں بے اختیار اسے ملنے کی ایک تڑپ سی جاگی۔ میں اس سے ایک دوست کی حیثیت سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھنے کی تمنا میرے دل میں اچانک ہی بڑی شدت کے ساتھ جاگی تھی۔ میں نے کار نکالی اور فقیروں کی بستی کی طرف چل دیا۔ بستی کے قریب پہنچ کر میں کار سے اترا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر اس پائپ کی طرف آ گیا۔ جدھر میری توقع کے مطابق زبیر اور نغمہ کو ہونا چاہئے تھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔

پھر میں نے ایک قریب سے گزرتے ہوئے فقیر سے زبیر اور نغمہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

''بھیو! وہ بے چارا ماجور جو تھا ناں' وہ گریب تو کب کا مر کھپ گیا۔''

میں اس کی بات سن کر بت بن گیا۔ زبیر مر چکا تھا۔ مگر نغمہ کہاں گئی؟ میں نے دل پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ اس سے نغمہ کے متعلق دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''اور..... وہ جو اس کے ساتھ ایک لڑکی رہتی تھی' وہ کہاں گئی؟''

''ہائے ہائے' اس کی زنانی..... تھی بڑی وفادار۔'' وہ بتانے لگا اور مجھے اپنے بے ترتیب دل کی دھڑکنوں کی بازگشت صاف کانوں میں سنائی دینے لگی۔

''بھیو! اس کی زنانی تھی بھی بڑی خوب صورت۔ آخری وقت تک اپنے مرد کی کھدمت داری دادارہ کرتی رہی پر اس کو بچنا نہیں تھا۔ اچانک ہی جس طرح بہار ہوا ویسے ہی اچانک مر بھی گیا۔ بے چارہ۔ بابو' ایک روپیہ تو دے دے۔''

اس نے یہ سب بتانے کے بعد بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' میں اسے پچاس کا نوٹ دیتے ہوئے بولا ''تم نے اس کی زنانی کے بارے میں نہیں بتایا؟'' میں نے پھر دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ جانے کیوں میرے اندر سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

''وہ..... ادھر..... سامنے قبرستان ہے..... اس کی زنانی بھی وہیں رہتی ہے۔ بے چاری کو بڑی محبت تھی اپنے مرد سے۔'' فقیر نے بتایا اور میں جلدی سے دیوانوں کی طرح دوڑتے ہوئے قبرستان پہنچا پھر اس کی شکستہ دیوار پھلانگ کر میں اندر کودا۔ تو سامنے ہی میں ایک تازہ سی قبر کے کتبے والی جگہ پر ایک کھجڑی سے بالوں والی عورت کو دیکھ کر چونکا اور اس کی طرف بڑھا۔ قبرستان میں پُراسرار سی خاموشی طاری تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس عورت نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا۔ وہ نغمہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی عنقا تھی۔ اس کی حالت بن پانی کی مچھلی جیسی ہو رہی تھی۔ اس نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔ نغمہ کو ایسی حالت میں دیکھ کر میرا کلیجہ چھلنی ہونے لگا۔ میرا اندر کٹ کٹ کر ٹکڑے ہونے لگا اور میرے اندر کی ہوک..... آنسوؤں کی صورت چہرے پر امڈ آئی۔ پھر دفعتاً میں نے نغمہ کی آواز سنی۔ وہ کمزور سی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی' میں نے کان لگائے۔

''میں جلاتی رہی چراغِ سحر۔ پو پھٹی ہو گیا اجالا سا
پرندوں سے پوچھا مگر تیرا نشان نہ ملا۔ راستوں میں نہ بیٹھو ہوا تنگ کرے گی۔ پنچھڑے ہوؤں کی صدا تنگ کرے گی۔

اور میں اپنے آنسوؤں پر قابو پائے' واپس لوٹ آیا۔

نشیب و فراز

تحریر : خالد باری

محترم معراج رسول صاحب۔ آداب

آج کی دنیا میں ہوس، خود غرضی اور لالچ نے انسان کو درندوں سے بدتر بنا دیا ہے۔ بہت سے واقعات ہماری نظر سے گزرتے ہیں جہاں رشتوں کے تقدس اور اپنے پرائے تک کی تمیز مٹ گئی ہے اور پھر جہاں سونا تیلا پن آجائے تو صورت اور بھی تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔ میری کہانی بھی ان ہی دائروں میں گھومتی ہے۔ شائع کرنے پر آپ کی مشکور ہوں گی۔ دعا گو۔

راوی : غزالہ منیر' کراچی

میں نے بند کھڑکی کی جھری سے امی کی خواب گاہ میں جھانکا تو غیر متوقع منظر نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا ''نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ شجاعت صاحب تو میرے سگے ماموں ہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ انہیں مسلسل ناقابل اعتراض حالت میں دیکھ کر مجھے اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگا۔ شاید میرا دماغ چل گیا تھا۔ ''کیا کوئی سگا بھائی اپنی بہن کی عزت سے اس طرح کھیل سکتا ہے؟'' میں نے پھر جھری لی اور ایک مرتبہ پھر جھری سے اندر جھانکا۔ دل ڈوبنے لگا اور میں بے ہوش ہو گئی۔

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ وہ شرمناک منظر میرے دل و دماغ میں رچ بس گیا تھا۔ دل چاہا کہ ابھی جا کر کسی طرح ماں کے غلیظ وجود سے اس دنیا کو پاک کر دوں۔ ماموں شجاعت جیسے بے غیرت شخص کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گدھوں کے آگے ڈال دوں۔ مگر میں سولہ سال کی ایک معصوم اور بزدل لڑکی بیچ و تاب کھانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

یہ اس دن کا ذکر ہے جب بیٹھے بٹھائے مجھے شرارت سوجھی تھی۔ ''امی' میں اپنی سہیلی نرگس کے یہاں جارہی ہوں۔'' امی اس وقت کچن میں مصروف تھیں۔

''ٹھیک ہے' جاؤ مگر جلدی واپس آنا'' انہوں نے کچن ہی سے جواب دیا۔ میں نے بظاہر گیٹ کھولا لیکن پھر اسے بند کرکے دبے قدموں واپس آکر پچھلی سیڑھیوں پر آگئی۔ میں جس مقصد سے چوری چھپے کوٹھے پر آئی تھی' اس میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب کچھ وقت بے مقصد ہی چھت پر گزارنا مجبوری تھی۔

پانچ منٹ بعد ہی بیل بجی۔ امی نے گیٹ کھولا۔ میں گرج دار آواز سے پہچان گئی۔ شجاعت ماموں آئے تھے۔ ان کے اندر آتے ہی امی نے گیٹ جلدی سے بند کردیا تھا۔

میں نے مایوسی کے عالم میں ایک بار پھر چھٹے بنگلے کی چھت پر نظر دوڑائی تو میری مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ میرا مطلوبہ شخص اپنی چھت پر آچکا تھا۔ ہمارا بنگلہ ڈبل اسٹوری تھا۔ لہٰذا یہ آسانی اس بنگلے کی چھت نظر آتی تھی۔ ایک ماہ پہلے جب میں نے اسے پہلی مرتبہ سراہ دیکھا تو نظریں گویا اسی کے سراپا میں الجھ کر رہ گئیں۔ وہ ہینڈسم نوجوان پہلی نظر میں ہی وہ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ہماری ہی لائن کے چھٹے بنگلے میں داخل ہوگیا تھا۔

اسی دن سے میرا معمول بن گیا تھا کہ اکثر اپنی چھت سے چوری چھپے اس کی چھت کا جائزہ لیتی۔ جب اس کا دیدار ہوتا گویا میری عید ہوجاتی۔ اس نے میری چوری پکڑلی اور اس کے بعد چھت پر اس کی آمد ورفت بڑھ گئی۔ مجھے یک گونا مسرت کا احساس ہوا یعنی وہ بھی مجھے اہمیت دے رہا تھا۔ وہ آج کل کے نوجوانوں کے برعکس انتہائی شرمیلا نوجوان تھا۔ وقتے وقتے سے ایک نظر مجھ پر ڈالتا۔ سراہ ملتا تو بھی ایک نظر ڈال کر بوکھلاتا ہوا تیزی سے گزر جاتا۔

ایک ماہ کی جدوجہد سے اس کا امتحان لینے کے لیے آج میں دیوار اور اس کے ساتھ رکھے ہوئے گملوں کی اوٹ سے اس نوجوان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے اوپر آتے ہی بے تابانہ میری چھت کی طرف دیکھا تھا۔ وہ مجھے نہ پاکر قدرے مایوس ہوا۔ گویا میں نے عشق کی پہلی منزل سر کرلی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ اس نے قمیص اتار کر ایک جانب پھینکی اور سلمان خان کی طرح اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کا جائزہ لینے لگا۔

میں ہنستے ہوئے دیوار کی اوٹ سے اوپر ہوگئی۔ اب اس کی بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ اس نے تیزی سے قمیص پہنی اور مسکراتا ہوا ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کرکے چھت سے غائب ہوگیا۔

''شکر ہے میری اس حرکت سے وہ سلام تک تو پہنچا۔ انشاء اللہ جلد ہی کلام تک بھی پہنچے گا۔'' میں نے سوچا۔ دفعتاً میں ڈر گئی۔ امی سے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اگر ہنسی کی آواز ان تک پہنچ گئی ہوگی تو آفت ہی آجائے گی۔ اگر وہ کچن سے فارغ ہوکر اوپر والے بیڈروم میں آرام کی غرض سے آئی ہوں گی تو یقیناً میری ہنسی کی آواز ان تک ضرور پہنچی ہوگی۔ اپنے اطمینان کی خاطر میں نے دبے قدموں چند سیڑھیاں اتر کر ایک پتلی بالکونی سے ان کے بیڈروم کی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ یہ کھڑکی اس بالکونی میں کھلتی تھی مگر اس وقت بند تھی۔ میں نے ایک جھری سے جھانکا۔ میں صرف یہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ امی چھت پر میری موجودگی سے باخبر تو نہیں ہوگئی ہیں مگر بیڈ روم میں جھانکتے ہی گویا میری ہنستی بستی زندگی میں بھونچال آگیا تھا۔

میں دبے قدموں نیچے آئی اور آہستگی سے گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ گیٹ بند ہوگیا۔ چند لمحے وہیں کھڑی رہنے کے بعد میں نے کال بیل بجادی۔ بیل بجانے پر کچھ دیر بعد امی بوکھلائی ہوئی گیٹ پر آئیں اور گیٹ سے گیٹ کھولا۔ وہ بوکھلاہٹ پر قابو پاچکی تھیں۔

''غزالہ! اچھا کیا تم جلدی لوٹ آئیں۔ کچھ ہی دیر ہوئی تمہارے ماموں آئے ہیں۔ تمہیں یاد کررہے تھے۔'' امی نے جھوٹ بولا۔ اس دن ماموں بھی شرمندہ شرمندہ سے میرے سامنے آئے مگر پھر وہ بھی سنبھل گئے۔ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ عزت کے اس لبریز کے لیے میرے دل سے بددعائیں نکلنے لگیں۔

ابو کاروبار کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ کانٹوں کی سیج پر بیتا۔ ابو واپس آئے تو میں ان کے سینے سے لگ کر بلک پڑی۔ ابو حیران پریشان مجھ سے اس طرح رونے کا سبب پوچھتے رہے مگر میں کچھ بھی نہ بتاسکی۔ معاملہ ہی ایسا تھا۔ حقیقت بیان کرتی تو ابو یقین کرنے کے بجائے مجھے ہی پاگل قرار دے دیتے۔

یہ ستم کیا کم تھا کہ اگلے روز ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابو فیکٹری کے لیے روانہ ہوئے تو ایک گھنٹے بعد ان کی لاش واپس آئی۔ ان کی کار بے قابو ہوکر ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ ان کا سر ونڈ اسکرین توڑتا ہوا درخت سے ٹکرایا تھا اور وہ موقع ہی پر ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ صدمہ میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میں کافی دن زیرِ علاج رہی۔ آخر کار جب سکتہ ٹوٹا تو ابو کا چہلم بھی گزر چکا تھا۔ افسوس' میں ان کا آخری دیدار بھی نہ کرسکی تھی۔

اس پر غضب یہ ہوا کہ ماموں مستقل میرے ہی گھر پر براجمان ہوگئے تھے۔ امی کی دلجوئی کے بہانے وہ امی کے ساتھ چپکے رہتے۔ فیکٹری پر بھی ماموں ہی کا کنٹرول تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ رات کو گھر پر رہنے والا نوکر گیٹ کے برابر بنے ہوئے اپنے کمرے میں سوجاتا تو امی بظاہر ممتا کا ڈھونگ رچاتے ہوئے میرے کمرے میں آدھمکتیں اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ میں واقعی سوگئی ہوں' گراؤنڈ فلور کے ہی بیڈروم میں جاکر رنگ رلیاں منانے لگتی تھیں۔ پھر بھی میں نے نوٹ کرلیا کہ ماموں اپنا بیڈروم لاک کرکے چوروں کی طرح امی کے ہی بیڈروم میں جاکر راتیں بسر کرتے تھے اور فجر کے وقت جب پہلے نماز پڑھتے ہے' وہ اس وقت سوتے۔

ہوش میں آتے ہی مجھے وہ ہینڈسم نوجوان یاد آیا تھا۔ میں چھت پر پہنچی تو وہ پہلے سے ہی میرا منتظر تھا۔ اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جاکر مجھے سلام کیا۔ میں بلک پڑی۔ وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ایک پتھر میری طرف گویا تاک کر پھینکا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ پتھر میرے برابر میں آکر گرا۔ میں نے حیرت' تاسف اور شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک وہی تو تھا جس کے تصور نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کردیا تھا مگر وہ ظالم بھی مجھے تسلی دینے کے بجائے پتھر مار رہا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر پتھر کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ دراصل پتھر کے ذریعے اس نے ایک خط مجھ تک پہنچایا تھا' لکھا تھا۔

''ڈیئر غزالہ! سلام محبت۔

سب سے پہلے تمہارے والد کے انتقال پر دلی تعزیت قبول کرو۔ تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور تمہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔ گلی میں جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو بس پہلی ہی نظر میں دل ہار گیا۔ کوشش کے باوجود کبھی اظہارِ محبت نہ کرسکا۔ میں تمہارے والد کے جنازے اور سوئم میں بحیثیت پڑوسی شریک رہا۔ تمہارے سکتے کے دوران میں میں نے کئی بار تمہاری خیریت جاننے کے لیے امی کو بھیجا۔ میں ہر نماز میں گڑگڑا کر تمہاری محبت پانے کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ بالآخر میری محبت' میری دعائیں رنگ لائیں۔ جونہی امی نے تمہارے ہوش میں آنے کی خوشخبری سنائی' میں خوشی سے ناچنے لگا۔ امی بھی میرے انتخاب سے بہت خوش ہیں۔ وہ تو تمہارے ہوش میں آتے ہی تمہاری بلائیں لے چکی ہیں۔ اب مابدولت تمہیں اپنے دل میں بسانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہوگی اگر تم نے میری محبت قبول کرلی۔ تم راضی ہو تو انگوٹھے سے ''ڈن'' کا اشارہ کردو۔ دل تو نہیں چاہتا مگر تم ابھی غم زدہ ہو۔ یہی سوچ کر اجازت چاہتا ہوں۔

فقط..... صرف اور صرف تمہارا

سلمان احمد۔''

میں نے انگوٹھے سے ''ڈن'' کا اشارہ کیا اور شرما کر نیچے آگئی۔ اس کا خط میرے لیے امرت ثابت ہوا تھا۔ اس نے مجھ میں جینے کی نئی امنگ پیدا کردی تھی۔

اگلے روز اس کی امی آئیں۔ مجھ پر صدقے واری ہوتی رہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سلمان گریجویشن کرچکا ہے۔ وہ اداکار سلمان خان سے بہت متاثر ہے۔ اس کے کمرے میں سلمان خان کے ساتھ اس کا ایک قد آدم فوٹو گراف بھی لگا ہوا ہے۔ اس میں وہ گویا سچ مچ سلمان خان کے ساتھ کھڑا ہے۔ امی چائے پیتا کر واپس آئیں تو سلمان کی امی انتظار ہوگئیں۔ انہوں نے اپنی پرخلوص باتوں سے امی کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

مجھے رہ رہ کر ابو کی یاد ستاتی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ بڑے مضمحل اور کبیدہ خاطر نظر آتے تھے۔ میں انہیں کریدتی تو وہ ہنس کر ٹال دیتے۔ میں رات کا کھانا کبھی ان کے بغیر نہیں کھاتی تھی۔ ناشتا بھی ہر صورت ہم ساتھ کرتے تھے۔

''بیٹا! میرے بغیر کھانے کی عادت ڈالو۔ میرے بعد بھی تو تمہیں میرے بغیر ہی کھانا پڑے گا'' وہ تاسف سے بولے۔ میرا انتقال بھی تو ہوسکتا ہے۔''

میں تڑپ اٹھی۔ ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لیے ابو..... ایسی بدفال تو منہ سے نہ نکالیں۔''

''میری بچی!'' وہ مجھے سینے سے چمٹا کر بولے ''انتقال سے میرا مطلب تھا کہ میں کاروباری سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے دوسرے شہروں میں منتقل ہوتا رہتا ہوں۔''

اب جو بھی کھانا سامنے آتا۔ ابو کی وہ باتیں تڑپا جاتیں۔ سکتہ ٹوٹنے کے اگلے روز جب سلمان کی امی آئیں تو امی نے انہیں آگاہ کیا۔

''بہن! اس پگلی نے کل سے ہماری بہت کوشش کے باوجود کچھ نہیں کھایا۔ آپ ہی اسے سمجھائیں۔'' امی چائے بنانے کے لیے چلی گئیں۔

"جی' بالکل! آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل تمہاری والدہ یہاں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھاری رشوت کی پیش کش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں لاکر میں رکھا ہوا آپ کے ابو کا وصیت نامہ ان کے حوالے کردوں۔ اگر وصیت ان کے حق میں ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر ابھی واپس کردیں گی ورنہ جعلی وصیت نامہ وہ اپنے وکیل سے تیار کرواکر میرے حوالے کردیں گی۔ جسے میں لاکر میں رکھ دوں گا۔ غزالہ کو علم ہی نہیں ہو سکے گا۔"

منیجر صاحب کے الفاظ میرے اعصاب کو مفلوج کرنے لگے۔ گہرے صدمے کے گرداب سے باہر نکلی تو یقین نہ آیا کہ سگی مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے' یہ کیسی ماں تھی' جس کے قدموں کے نیچے میرے لیے جہنم تھا۔ مجھے دولت کا کوئی لالچ نہ تھا' صدمہ تھا تو اس بات کا کہ محض دولت کے لیے ماں عظمت کی بلندیوں سے ذلت کی پستیوں میں جا گری تھی۔

"بیٹا! میں نے ان کی لاکھوں کی پیشکش ٹھکرادی۔ پھر وہ دھمکیوں پر اتر آئیں۔ میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میں اصول پرست آدمی ہوں۔ جان کی مجھے پروا نہیں۔ میں یہاں رہوں یا میری جگہ کوئی دوسرا منیجر آجائے' بینک بہرحال اپنی ڈیوٹی پوری کرے گا۔ کیونکہ بینک نے اس ایگریمنٹ کی بھاری فیس لی ہے۔ مرحوم منیر صاحب سے میرے ذاتی تعلقات بھی تھے جن کی وجہ سے میں تمہیں بیٹیوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میری خواہش ہے۔ چار سال بعد تمہاری امانت یعنی وصیت نامہ۔ تمہارے حوالے کرسکوں۔ احتیاطاً میں نے آج ہی تمہاری امی کے خلاف تھانے میں درخواست دے کر اس کی کاپی تمہاری والدہ محترمہ کو بھجوادی ہے۔ اگر اس دوران میں مجھے کوئی نقصان پہنچا تو اس کی صریحاً ذمے دار تمہاری والدہ ہوں گی۔ یہ درخواست پولیس کے ریکارڈ میں رہے گی۔ مجھے امید ہے' میری اس حکمتِ عملی کے بعد زرینہ صاحبہ مجھے قتل کروانے کی حماقت نہیں کریں گی" منیجر صاحب بولے۔ مجھ پر صدموں اور حیرتوں کی یلغار تھی۔

میں گھر آئی تو امی کا ایک دوسرا ہی روپ میرے سامنے تھا "حرافہ! تو نے اپنے باپ کو کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ وہ ایسی احمقانہ وصیت کرگیا۔ منیر نے مجھے کھلا دھوکا دیا ہے" ان کے یہ زہریلے الفاظ نشتر کے مانند میرے دل میں اترتے چلے گئے۔ میں حیرت اور صدمے سے بس انہیں تکتی ہی رہ گئی۔

اذیت کی ان گھڑیوں میں سلمان کے کئی فون لندن سے آئے۔ اس کے ہر فون سے مجھے ایک نیا حوصلہ ملا۔ اس دوران میں ایک محبت بھرا خط بھی ملا جو اس کی امی نے مجھ تک پہنچایا مگر پھر اچانک سلمان کی امی جو روزانہ ہی آکر میری ڈھارس بندھاتی تھیں' بالکل ہی غائب ہوگئیں۔ سلمان کے فون بھی آنے بند ہوگئے۔ ادھر امی اور شجاعت کا رویہ روز بہ روز سخت سے سخت تر ہوتا جارہا تھا۔

پھر ایک روز میری سہیلی سیما نے ایک عجیب انکشاف کیا' اس نے پوچھا "غزالہ! کیا تمہارا ٹیلی فون نمبر بدل گیا ہے؟ کل میں نے بہت کوشش کی مگر تم سے رابطہ نہ ہوسکا۔" میں چونک پڑی پھر میں نے چیک کیا تو واقعی ہمارے نمبر پر فون نہیں مل رہا تھا۔ اسی روز کالج سے واپسی پر میں سلمان کے گھر جا پہنچی۔ بیل بجانے پر کوئی اور خاتون گیٹ پر آئیں۔

"کیا سلمان کی امی فہمیدہ خاتون گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا! وہ تو بنگلہ کرائے پر ہمیں دے کر کہیں اور چلی گئیں۔"

اس انکشاف نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنا نیا ایڈریس کسی کو بھی بتا کر نہیں گئی تھیں۔ کرائے داروں کو بھی کرایہ ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے کی ہدایت کرگئی تھیں۔

یہ معما میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ کہاں وہ ان کا خلوص کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر..... اور کہاں اس قدر بے رخی کہ الوداعی ملاقات بھی مناسب نہ سمجھی۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

ڈرتے ڈرتے اس سلسلے میں امی سے استفسار کیا تو میرے ہوش وحواس اڑ گئے۔ انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا اور بولیں۔

"حرافہ! خود ہی گل کھلایا اور ہم سے پوچھتی ہے۔ کل ہی فہمیدہ بیگم آئی تھیں۔ غصے میں آگ بگولا تھیں۔ خوامخواہ مجھ پر برس پڑیں۔ انہوں نے مجھ بے قصور کو بے نقط سنائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تم نے ان کے "معصوم" بیٹے کو اپنے "جال" میں پھنسالیا ہے۔ ان کا تم سے وہ خلوص' وہ محبت' سب دکھاوا تھا۔ وہ معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ جونہی ان کے اندازے کی تصدیق ہوئی' انہوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ اپنی بہن کی بیٹی سے کردیا اور مجھے دھمکی دی کہ اپنا فون نمبر فوراً بدلوالو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں عزت دار عورت ڈر گئی۔ فوراً فون نمبر بدلوالیا۔ خوب نام روشن کیا تم نے بیٹی ہمارا" امی ہذیانی انداز میں کہتی چلی گئیں۔

یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میرے حواس جواب دینے لگے۔ سلمان کی امی کا وہ خلوص' محبت' سب دکھاوا تھا؟ بہت سے سوالات جنم لے رہے تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا جب سلمان کو اپنی امی کے غلط رویے کا علم ہوگا' وہ میری امی سے معذرت کرکے مجھے ان سے مانگ لے گا۔ مجھے ہر صورت میں اس کا انتظار کرنا تھا۔ اب یہ انتظار ہی مجھ میں جینے کی امنگ پیدا کرسکتا تھا۔ ورنہ میری زندگی میں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

زندگی کے دو انتہائی کٹھن سال بیت گئے۔ اس دوران میں سلمان کی امی کو تلاش کرنے کی میں نے ہر ممکن کوشش کی۔ سلمان نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میری امیدوں کی کرنیں مایوسیوں کے غبار میں مدغم ہونے لگیں۔ فون نمبر بدل گیا تھا تو وہ خط تو لکھ سکتا تھا۔ ایڈریس تو تھا اس کے پاس۔ میں اندر سے بالکل ٹوٹ کر رہ گئی۔

اس دوران میں امی کا رویہ کبھی سخت ہو جاتا اور کبھی نرم۔ اب میں اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ میرا رنگ روپ نکھر کر اپنے جوبن پر آگیا تھا۔ تجارت' میرا سوتیلا باپ مجھے پُرہوس نظروں سے تکتا رہتا تھا۔ اب میں اس سے محتاط رہنے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ امی بھی احتیاط برتتی تھیں۔ اس کی موجودگی میں بھی مجھے تنہا چھوڑ کر نہیں جاتی تھیں۔ اب تو مجھے اس بدبخت کی نظروں سے ڈر لگنے لگا تھا۔

انتہائی کرب واضطراب کے عالم میں دو سال مزید بیت گئے اور خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھ سے زیادہ شجاعت اور امی کو انتظار تھا۔ وکیل صاحب بینک سے وصیت نامہ نکلوا چکے تھے۔ وقت طے کرکے ہمارے گھر آکر وکیل صاحب نے وصیت سنانا شروع کی۔

"وصیت کے مطابق اگر غزالہ منیر ولد منیر احمد کے بیس سال کی عمر کو پہنچنے تک منیر احمد صاحب زندہ نہ رہے تو ان کا پورا کاروبار اور آدھی جائداد غزالہ کے نام جبکہ آدھی جائداد زرینہ منیر کے نام منتقل کردی جائے گی....." وکیل صاحب نے یہاں پہنچ کر قدرے توقف کیا۔

"یہ ناانصافی ہے" امی اضطراری انداز میں بولیں۔

"انہوں نے کاروبار اور آدھا بینک بیلنس بھی میرے نام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ آدھا بینک بیلنس آدھا کاروبار اور یہ بنگلہ غزالہ کے نام ہونا تھا۔ میں اس وصیت نامے کو نہیں مانتی۔"

میں حیرت سے انہیں تکنے لگی "کیا واقعی یہ عورت میری سگی ماں ہے؟" میں سوچے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دولت کے لالچ میں بالکل اندھی ہو چکی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! ٹھہریئے..... وصیت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اگر زرینہ منیر نے منیر احمد کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرلی تو وہ آدھی جائداد سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اس آدھی جائداد کے لیے شرط یہی ہے کہ زرینہ منیر زندگی بھر دوسری شادی نہیں کرے گی۔ دوسری شادی کی صورت میں تمام جائداد کی بھی تنہا وارث غزالہ ہوگی۔" وکیل صاحب خاموش ہوگئے۔

امی اور شجاعت کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں ابو کی دانش مندی کی داد دے رہی تھی۔

اب گویا امی نے بظاہر برا نہیں مانا' وہ پینترا بدلتے ہوئے بولیں "میں تو مذاق کررہی تھی۔ اصل میں تو تمام جائداد کا وارث غزالہ کو ہی ہونا چاہیے تھا۔" وہ آگے بڑھ کر میری بلائیں لینے لگیں۔ شجاعت حیرت سے انہیں تک رہا تھا۔

مجھے یہ پسپائی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہوئی۔

وکیل صاحب نے کاغذات مجھے دکھائے۔ ہم ماں بیٹی سے دستخط کرائے۔ بینک منیجر صاحب ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔ وکیل صاحب نے کاغذات دوبارہ ان کے حوالے کردیے۔ اب صرف میں ہی وقتِ ضرورت وہ کاغذات بینک کے لاکر سے نکلوا سکتی تھی۔ ابو میرے لیے کیا کچھ کر گئے تھے۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

بینک منیجر اور وکیل صاحب کے جاتے ہی گھر میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔

"زرینہ! یہ لڑکی اور اس کا باپ تو بڑے ہی چالباز نکلے۔ تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم ہر چیز میں کم از کم برابر کی حصے دار ہو....." شجاعت میرے سامنے ہی پھٹ پڑا۔ شاید وہ امی سے کہتے کہتے رہ گیا تھا کہ "میں نے تو تم سے شادی ہی دولت کی امید پر کی تھی۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس حرافہ کو مجبور کرو کہ یہ جائداد کے کاغذات لاکر سے نکلوائے اور سیل ایگریمنٹ تیار کروائے' جس کی رو سے دو کروڑ کے عوض یہ ٹیکسٹائل مل زرینہ منیر کے ہاتھوں بیچ دے گی۔" شجاعت آپے سے باہر ہوا جارہا تھا۔

پھر امی نے گویا اس کے حکم پر فوراً سر جھکا دیا۔ دوسرے ہی روز سیل ایگریمنٹ کے کاغذات تیار ہو کر آچکے تھے۔ پہلے پیار اور شرافت سے دستخط کرانے کی گزارش کی گئی۔ پھر امی اور شجاعت دھمکیوں پر اتر آئے۔

"دوسری صورت میں ہم تمہیں مار ڈالیں گے اور پوری

جائداد تمہاری ماں کی ہو جائے گی۔'' شجاعت کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اس دھمکی پر عمل بھی کر سکتا تھا۔

میں سہم گئی۔ گو کہ مجھے علم تھا کہ مجھے مار کر جائداد پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وکیل اور بینک منیجر دونوں ہی دیانت دار تھے۔ وہ پوری انکوائری کرواتے۔ عین ممکن تھا' امی اور شجاعت کو دولت اور جائداد کے بجائے موت مل جاتی۔

بہرحال وہ دونوں تشدد پر اتر آئے۔ امی نے میرے ہاتھ رسی سے باندھ دیے۔ شجاعت نے میرے دونوں پاؤں مٹھی سے پکڑ لیے۔ امی ایک شیشے کا جار لے آئیں' جس کے منہ پر ایک گتا تھا' جار کے دونوں جانب دو ڈوریاں بندھی تھیں۔

''دیکھ رہی ہو اس جار میں کیا ہے؟'' امی نے خوفناک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اس پیالے میں ایک بڑی سے چھپکلی تھی' چھپکلیوں سے بچپن سے خوف کھاتی تھی۔

امی نے وہ جار میرے پیٹ کو برہنہ کر کے اس پر سختی سے باندھ دیا۔ پیٹ اور جار کے درمیان سے گتا نکال لیا گیا۔ اب وہ چھپکلی میرے پیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے سخت کراہیت محسوس ہونے لگی۔ شجاعت نے جار پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ چھپکلی میرے پیٹ پر کلبلانے لگی۔ باہر نکلنے کے لیے وہ بری طرح پنجے چلا رہی تھی۔ بے ساختہ میرے لبوں سے چیخیں خارج ہونے لگیں۔

''یہ تیرے نرم و نازک پیٹ پر کاٹ بھی سکتی ہے۔ سخت زہریلی چھپکلی ہے۔ شرافت اسی میں ہے کہ دستخط کر کے جان چھڑا لے'' امی نے مجھے مزید ڈرایا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ توجہ چھپکلی کی طرف سے ہٹانی اور آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ میں خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی۔

مگر شجاعت نے جار سے اس قدر چھیڑ چھاڑ کی کہ چھپکلی نے میرے پیٹ پر کاٹ کھایا۔ زہر پھیلنے کا خوف میری برداشت سے باہر تھا۔ دل خراش چیخ کے ساتھ میں بے ہوش ہو گئی۔

جب ہوش آیا تو میرے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ اور دونوں پیر بیڈ کے دونوں جانب سختی سے باندھ دیے گئے تھے۔ کمرے میں صرف شجاعت موجود تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری سگی ماں اس بے بسی کے عالم میں مجھے تنہا اس درندے کے ساتھ چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئی ہے؟

اس بدبخت نے درندگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

''یہ تو ابتدا ہے۔ اگر تو نے دستخط نہ کیے تو تیرے کپڑے تار تار کر دوں گا۔ پھر بھی نہ مانی تو تیری عزت کی خیر نہیں۔''

وہ طرح طرح کی فحش حرکتیں کرنے لگا۔ میں شرم سے پانی پانی ہونے لگی۔ اس شیطان کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ میں پھر بھی دستخط پر راضی نہ ہوئی تو وہ میرے کپڑے تار تار کرنے لگا۔ میں نے روتے ہوئے خدا کو مدد کے لیے پکارا۔ عین اسی لمحے بیل بجی۔ وہ شیطان بوکھلا گیا۔ اس کے گستاخ ہاتھ رک گئے۔ خدا نے میری سن لی تھی۔

شجاعت تیزی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد امی بوکھلائی ہوئی اندر آئیں۔

''اوہ بیٹی! مجھے ایک کام سے باہر جانا پڑا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شجاعت اتنا گرا ہوا شخص ہے کہ بیٹی کے دامن کو بھی تار تار کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ بہرحال میں تجھے مشورہ دیتی ہوں کہ دستخط کر کے اس عذاب سے جان چھڑا لے'' وہ جل ہو کر بولیں۔ ان کا لہجہ اب خاصا بدلا ہوا تھا۔

انہوں نے میرے کپڑے تبدیل کیے۔ دفعتاً بیل پھر بجنے لگی۔ امی کی بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔ وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ لاک کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ اس وقت میرے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے۔ میں نے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور اٹھ کر بھاگنے کی کوئی راہ تلاش کرنے لگی۔ کھڑکیاں باہر کی جانب کھلتی تھیں مگر ان پر انتہائی مضبوط گرل تھی۔ وقت کم تھا۔ میں نے کھڑکیاں کھول کر مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔

دروازہ کھلا اور امی عالم طیش میں اندر آ کر مجھ پر دہتڑ برسانے لگیں۔ ''کمینی! یہ کیا کر رہی تھی؟ باہر پولیس آیا ہے۔ خبردار..... اگر منہ سے کچھ پھوٹا۔ ہم نے انہیں بتایا ہے کہ تم سخت بیمار ہو اور بیماری میں ہذیان بکنے لگتی ہو۔ شجاعت اپنے کوٹ کی جیب میں پستول کا رخ تمہاری طرف کیے کھڑا ہوگا۔ کچھ بکنے سے پہلے ہی گولی تمہارے سینے کے پار ہو گی۔ اس صورت میں شجاعت کو وکیل کو بھی جان سے مارنا پڑے گا۔'' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دولت کے لالچ میں اندھے ہو کر وہ بڑے سے بڑا قدم اٹھانے پر تلے ہوئے تھے۔

میں نے ایڈووکیٹ عثمانی صاحب کو سلام کیا۔ شجاعت بظاہر شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا مگر اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ یقیناً اس نے پستول کا رخ میری طرف کیا ہوا ہوگا۔ میں اپنے آپ کو شدید بیمار محسوس کر رہی تھی۔

''بیٹی! میں تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دولت کا لالچ خون کے

رشتوں میں بھی دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک تو نہیں ہو رہا؟ بلا خوف کہہ دو۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہاری حفاظت کے لیے پولیس کا ایک سپاہی مقرر کرا سکتا ہوں۔ تمہارے ابو سے میری دوستی بھی تھی۔ لہٰذا ہر طرح سے تمہاری مدد کرنا میرا فرض ہے۔'' عثمانی صاحب کا لہجہ شفقت بھرا تھا۔

شجاعت نے مجھے قدرے غصے سے گھورا۔

''نن..... نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں' بس ذرا بیمار ہوں۔ آپ ابو کے دوست ہیں..... آتے جاتے رہیے گا۔''

آخری جملے پر امی نے مجھے غصے سے گھورا۔ عثمانی صاحب کے جانے کے بعد مجھے دونوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ اب مجھے واقعی شک ہونے لگا تھا کہ زرینہ میری سوتیلی ماں ہے مگر پھر میں نے سوچا کہ سگی ماں بھی تو دولت کے لالچ میں کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

''حرام زادی! تم کیا سمجھتی تھی کہ منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔ مگر تو باز نہیں آئی۔ اب وہ تیرے باپ کا پیچھا بار بار ہمیں تنگ کرنے آئے گا۔ مگر ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اب تو تہ خانے میں بند رہے گی۔ کھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ عثمانی آئے گا تو ہم اس سے کہہ دیں گے کہ آپ وہ ابو بدلنے کے لیے ہم نے تمہیں مری' تمہاری آنٹی کے گھر بھیج دیا ہے۔'' امی خونخوار لہجے میں بولیں۔

''مگر یہ چکر ہم عثمانی کو ایک ماہ سے زیادہ نہیں دے سکتے۔''

اسے شک ہو گیا تو وہ مری جانے پر اصرار کرے گا۔'' شجاعت کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اس ایک ماہ کے دوران میں اس کا بھی بندوبست کر لیں گے۔ میرے ذہن میں ایک زوردار آئیڈیا آیا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ انہوں نے مجھے اس تاریک تہ خانے میں پہنچا دیا۔ ایک موم بتی روشن کر دی گئی۔ وہاں ہوا کا گزر صرف ایک آتش دان کے ذریعے ہوتا تھا۔ جس میں لاکھ چیختی چلاتی مگر میری آواز دم توڑ دیتی۔ تہ خانے کا دروازہ بھی گویا ساؤنڈ پروف تھا۔

تہ خانے میں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ وہاں انتہائی حبس تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں آتش دان میں گھس کر بیٹھ گئی۔ جہاں ہلکی ہلکی سی ہوا آ رہی تھی۔ اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ رات سر پر آ گئی تھی اور موم بتی ختم ہوا چاہتی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں اس کے تصور ہی سے کانپ گئی۔

موم بتی کی لو آخری مرتبہ پھڑ پھڑائی اور تہ خانہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں ہولے ہولے خوف سے لرزنے لگی۔ اچانک کوئی شے نوکیلے پنجوں کے ساتھ میرے اوپر چڑھ کر میرے چہرے کی طرف آنے لگی۔ بے ساختہ میرے لبوں سے چیخ خارج ہوئی۔ میں نے ہمت کر کے اس بلا پر ہاتھ مارا۔ وہ چیں چیں کرتی ہوئی نیچے گری۔ آواز سے معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑا سا چوہا تھا۔

مجھے آوازوں سے محسوس ہوا کہ تاریکی میں دیگر چوہے بھی بل یا کاٹھ کباڑ سے باہر آ رہے تھے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں ایک چوہے کو جسم سے جھٹکتی تو دوسرا مجھ پر چڑھ دوڑتا۔ شاید بعض چوہے بھوکے تھے۔ ایک کو جسم سے نوچ کر پھینکتی تو دوسرا میری کھال نوچنے لگتا۔ میں چیختی چلاتی' تہ خانے میں ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ کاٹھ کباڑ سے ٹکرا کر بری طرح گری۔ گھٹنے پر لگنے والی چوٹ نے تو میری جان ہی نکال دی۔

''یا اللہ! مجھے اس عذاب سے نجات دلا یا پھر موت دے دے۔ اس عذاب ناک زندگی سے تو موت ہی اچھی۔'' میں روتے ہوئے چلائی۔

عین اسی لمحے تہ خانے کا دروازہ کھلا۔

خدا نے میری سن لی تھی۔ امی کھانا اور ایمرجنسی لائٹ لیے نیچے اتریں۔ مجھے لہولہان دیکھ کر وہ بوکھلا گئیں۔ چوہوں کو دوڑ کر اپنی پناہ گاہوں میں چھپتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا۔

''ارے یہ تہ خانہ تو بڑا محفوظ تھا۔ یہاں چوہے کہاں سے آ گئے؟ بہرحال..... تجھے ابھی زندہ رہنا ہے۔'' وہ تشویش سے بولیں ''مر گئی تو کاغذات پر سائن کون کرے گا؟ ان چوہوں کا بھی کوئی بندوبست کرتے ہیں۔'' مرہم لگا کر میرے زخموں کی بینڈ ایج کر دی گئی۔ پھر سوراخ میں پتھر ٹھونسے گئے اور پلاسٹر کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ شجاعت نے کیا۔

''اب انکار کا چوہوں سے تم خود نمٹ لینا۔ اور اگر اس صورتِ حال سے تمہیں عقل آ گئی ہو تو کاغذات حاضر ہیں۔ سائن کر دو۔'' امی پھر مطلب پر آ گئیں۔

میرے انکار پر شجاعت آپے سے باہر ہونے لگا۔ امی نے اسے اشتعال سے باز رکھا۔

''اب کل سے وہی ''جادو کا انجکشن'' لگانا شروع کر دو جو میں نے ایک قابل ڈاکٹر سے نکلوایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک ہفتے میں اس کتیا کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔ اس کے بعد ہر ہفتے ایک انجکشن کافی ہوگا۔ پھر یہ آسانی سے کاغذات پر دستخط کر دے گی۔ اگر پھر بھی ضد پر اڑی رہی تو زنجیروں سے

باندھ کر اسے یہیں قید رکھیں گے۔ اور اس کی دولت پر عیش کرتے رہیں گے۔" امی نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔

ان کا منصوبہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایک لمحے کے لیے میری ہمت جواب دے گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے ارادے مضبوط کر لیے۔ میں نے عہد کیا کہ مرتے مرجاؤں گی مگر ان دغابازوں کے منصوبے خاک میں ملا دوں گی۔ مجھے دولت کا لالچ نہیں تھا مگر ان کی اصلیت دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری دولت پر عیش کریں..... اور یہ بھی یقینی بات نہیں تھی کہ دولت حاصل کرنے کے بعد وہ میری جان بخش دیں گے۔

امی نے پھر امید بھرے لہجے میں پوچھا "ہاں..... تو اب تیرے پاس آخری موقع ہے۔ دستخط کرے گی یا پاگل ہونا منظور ہے؟"

"میں نے ان کے منہ پر تھوک دیا اور شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر چلائی "ذلیل عورت! تو میری ماں نہیں ہو سکتی۔ خدا کے غضب سے ڈر' جو کسی اور کے لیے گڑھا کھودتا ہے۔ خود ہی اس میں گرتا ہے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے چہرے سے تھوک پونچھا اور دوسرے ہاتھ سے زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کیا پھر تلملاتی ہوئی شجاعت کے ساتھ تہ خانے سے نکل گئی۔ تہ خانے کا دروازہ اوپر سے لاک ہوگیا۔

میں سرد آہ بھر کر فرش پر بیٹھ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں۔ بھوک لگی تھی مگر کوشش کے باوجود مجھ سے چند لقموں سے زیادہ نہ کھایا جا سکا۔ میں گہری سوچوں میں گم ہوگئی۔

دفعتاً کچھ کھٹکا سا ہوا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو ایک موٹا تازہ چوہا روٹی گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ میرے حرکت کرنے پر وہ خوفزدہ ہوگیا اور روٹی راستے میں چھوڑ کر کھاڑ میں گم ہوگیا۔ میں نے سوچا' بہتر یہی تھا کہ یہ غذا ان بچے کھچے چوہوں کے کام آجائے تاکہ پیٹ بھرنے کے بعد وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔

حبس سے گھبرا کر میں پھر آتش دان میں گھس کر بیٹھ گئی۔ وہ رات انتہائی کرب اور اذیت کے عالم میں گزری۔ میں نے اندازہ لگایا' چار چوہے باقی بچے تھے۔ شاید وہ غذا ان کے لیے کافی تھی۔ کھانا ختم ہونے کے ساتھ ہی سکوت طاری ہوگیا تھا۔

غدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اوپر چھنی کے دہانے سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی نے صبح کی نوید سنائی تھی مگر یہ صبح میرے لیے مسرتوں کا پیغام نہیں' یاسیت کے تاریک سائے لائی تھی۔

اسی لمحے ایمرجنسی لائٹ میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ شاید بیٹری ڈاؤن ہوگئی تھی۔ چوہوں کی بھوک شاید پھر جاگ اٹھی تھی۔ تاریکی چھاتے ہی انہوں نے مجھے پھر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے اعصاب پر ایک بار پھر خوف طاری ہونے لگا۔ یکا یک مجھے سلمان کا خیال آ گیا۔ وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آ چکا ہوگا یا آنے والا ہوگا۔ وہ یقیناً مجھ سے ملنے یہاں آئے گا۔ شاید وہ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکے۔ شاید کوئی معجزا رونما ہو جائے' اس احساس نے مجھے کچھ حوصلہ دیا۔ میں نے ہمت سے کام لے کر کاٹھ کباڑ کو ٹٹولا۔ لکڑی کا ایک تختہ جو چھ انچ چوڑا اور دو فٹ لمبا تھا' میرے ہاتھ آ گیا۔ میں پوزیشن لے کر ایک جگہ ساکت بیٹھ گئی۔ جونہی تاریکی میں چوہا قریب آتا محسوس ہوا میں نے پوری قوت سے تختہ اس پر دے مارا۔ میں نے کئی مرتبہ پوری قوت سے وار کیے۔ غالباً چوہے کا کچومر نکل گیا ہوگا۔

معاً تہ خانے کا دروازہ کھلا۔ امی اور شجاعت دوسری ایمرجنسی لائٹ لیے نیچے اتر آئے۔ امی نے ایمرجنسی لائٹ نیچے رکھ دی۔ شجاعت نے ناشتا میرے سامنے رکھ دیا۔

مردہ چوہے پر نظر پڑی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "زرینہ! اس بلی نے تو شکار کر لیا ہے۔ ہم خوامخواہ اس کے لیے ناشتا لائے۔"

"اے لڑکی! تیری عقل ٹھکانے آئی؟ سائن کر کے اس مصیبت سے جان چھڑا لے۔" امی نے کاغذات میرے سامنے رکھ دیے۔

میں نے چاپلوسی سے کام لیا۔ "پہلے مجھے باتھ روم لے جائیں پھر سوچوں گی" میرا خیال تھا کہ باتھ روم جاتے ہوئے بھاگنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل سکتی ہے۔

"تو دستخط کیے بغیر اس تہ خانے سے باہر نہیں جا سکتی۔" امی سفاکی سے بولیں۔

مجھے سلمان کے لیے زندہ رہنا تھا اور زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری تھا۔ میں خاموشی سے ناشتا کرنے لگی۔ میرے اس عمل سے وہ دونوں کچھ خوش ہوئے۔ سوچا ہوگا شاید عقل آ گئی' اب ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ناشتے کے بعد ایک بار پھر میرے انکار پر وہ دونوں غضب ناک ہوگئے۔

"کتیا! اب انجکشن کے لیے تیار ہو جا۔" شجاعت پھنکارا۔

امی نے میرے پیر مضبوطی سے پکڑ لیے۔ شجاعت نے

کسی بکری کی طرح مجھے پچھاڑ کر میرے سینے پر اپنے گھٹنے کا دباؤ ڈالا۔ میری چیخ نکل گئی۔ انتہائی سرعت سے اس ظالم نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی انجکشن لگا دیا۔ میری چیخیں تہ خانے ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے برتن سمیٹے اور تیزی سے تہ خانے سے نکل گئے۔

مجھ پر کچھ نشے کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ شجاعت نے بے دردی سے انجکشن لگایا تھا۔ بازو کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ پھر انجکشن نے اپنا اصل اثر دکھانا شروع کیا۔ میری بے چینی اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر تہ خانہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں چکرا کر گر پڑی اور ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگئی۔

نہ جانے مجھے کب ہوش آیا۔ اس بے ہوشی کے عالم میں کوئی آیا تھا۔ کھانا ایک بھاری برتن سے ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ ایک چوہا برتن ہٹانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ جبکہ دوسرے نے میری پنڈلی پر دانت گاڑ دیے تھے۔ اسی تکلیف کے باعث مجھے شاید قبل از وقت ہوش آ گیا تھا۔ بے دردی سے پٹنا جا رہا تھا۔ مردہ چوہا کترنے لگا تھا پھر ایک اور انجکشن اسی ظالمانہ طریقے سے لگایا گیا۔ تہ خانے میں میری اپنی غلاظت بھی بڑھتی رہی۔ اس دوران میں نے دو اور چوہے مار دیے۔ لقمہ اس قدر بڑھ گیا کہ وہاں سانس لینا دوبھر تھا۔ سر میں شدید درد اور دماغ میں عجیب سی بے چینی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سر کو تہ خانے کی دیواروں سے ٹکرانا شروع کر دوں۔ میں نے آتش دان میں گھس کر ایک تختہ اس کے آگے جما دیا۔ اس عمل سے گھٹن میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔

اگلے روز جب وہ دونوں تہ خانے میں آئے تو مجھے غائب پا کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں اس وقت ہوش و حواس میں تھی۔ ان کی پریشانی مجھے کچھ مسرت ہوئی۔ اب وہ مجھے کاٹھ کباڑ میں تلاش کر رہے تھے۔ لقمہ کی وجہ سے وہ بھی بدحال ہونے لگے۔ مگر جلد ہی انہیں آتش دان کا خیال آ گیا۔ مجھے پا کر انہوں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ان حالات میں بھی میں نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو ان کے منہ شدتِ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

وہ زیادہ دیر اس لقمہ میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ گو کہ انہوں نے دھانے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مردہ چوہے کو دس سے کاٹھ کباڑ کی طرف کر دیے۔ کھانا بھاری برتن سے اٹھا کر رکھا اور اسی بے دردی سے انجکشن لگا کر چلے گئے۔

جاتے وقت میں نے امی کی آواز سنی "تو سمجھ لے شجاعت! میں تو اب آئندہ ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔ اگلی بار تمہیں تنہا ہی آنا ہوگا۔"

اگلے روز مجھے ہوش آیا تو حواس گویا معطل تھے۔ لقمہ اب آتش دان کے اندر تک گھسا چلا آ رہا تھا۔ یقیناً اب میرا ذہنی توازن بگڑنے والا تھا۔

تہ خانے کا دروازہ کھلا۔ آج شجاعت اکیلا آیا تھا۔ کھانا اور ایمرجنسی لائٹ ایک طرف رکھ کر اس نے آتش دان میں سے تختہ نکالا اور مجھے باہر گھسیٹتا ہوا بولا۔

"غزالہ! اب تو ضد چھوڑ دے' کیا اسی تہ خانے میں مرنا چاہتی ہے؟ آج میں ایک نئی تجویز لے کر آیا ہوں۔ اگر تو راضی ہوگئی تو تمام جائداد تیرے ہی پاس رہے گی اور تیری ماں تیری جگہ اس تہ خانے میں پڑی زندگی کی آخری سانس لے رہی ہوگی۔"

میں نیم غنودگی کے عالم میں بھی چونک پڑی۔ "مم..... مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

"تت..... تجھے..... مم..... مجھ سے شادی کرنا ہوگی۔" وہ ہکلایا۔

مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میری سگی ماں کا شوہر میرا سوتیلا باپ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ شرعاً ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

"کیا بک رہے ہو؟ میری سگی ماں تمہارے نکاح میں ہے۔ بیٹی سے شادی کے خواب دیکھ رہے ہو؟" میں غضب ناک ہوگئی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تمہاری سگی ماں تمہاری پیدائش کے دوران میں ہی چل بسی تھی۔ زرینہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔ منیر صاحب نے زرینہ کو قسم دی تھی کہ یہ راز کسی بھی صورت میں کبھی بھی تم پر ظاہر نہ ہو مگر دولت کے لالچ میں وہ اتنی اندھی ہو چکی ہے کہ اس کا سوتیلا پن ظاہر ہو چکا ہے۔ تمہارے ساتھ اس نے جو کچھ کیا ہے..... کیا اس کے بعد بھی تم اسے اپنی سگی ماں سمجھ رہی ہو؟ کوشش کے باوجود اس کے یہاں اولاد نہ ہو سکی۔ اسی لیے اسے خطرہ تھا کہ ساری جائداد تم لے اڑو گی۔ اس نے کوشش کی کہ منیر صاحب ٹیکٹسائل مل اس کے نام کر دیں اور بنگلہ تمہارے نام..... جبکہ بینک بیلنس آدھا آدھا ہو جائے ورنہ اس سے پہلے یہ احساس کرتے ہوئے کہ زرینہ کے کوئی اولاد نہیں' منیر صاحب نے خوشی خوشی آدھی جائداد غیر مشروط طور پر اس کے نام کر دی تھی۔ زیادہ سے زیادہ جائداد اپنے نام کرانے کے چکر میں وہ ماری گئی۔ منیر صاحب کو اس کی فطرت بھانپ کر صدمہ پہنچا۔

انہوں نے بظاہر وصیت نامہ تبدیل کردیا۔ زرینہ مطمئن ہوگئی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وصیت نامہ نہ صرف وہی ہے بلکہ اس میں بھی شرائط عائد کردی گئی ہیں۔ زرینہ نے صرف دولت کے لالچ میں تمہارے ابو سے شادی کی تھی۔ ورنہ وہ محبت تو مجھ سے ہی کرتی تھی۔'' شجاعت نے یہاں کچھ توقف کیا۔

یہ انکشافات میرے ذہن پر بموں کے مانند برسے۔ پچھلے چند سالوں سے زرینہ کا رویہ سوتیلی ماؤں سے بھی بدتر ہوگیا تھا۔ اب اس کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔

''اب آخری ہولناک انکشاف بھی سن لو۔ جب اسے علم ہوا کہ اس کی مرضی کے مطابق وصیت نامہ تبدیل کردیا گیا ہے تو اسے تمہارے باپ کا وجود کھٹکنے لگا۔ اب وہ اسے جلد از جلد راستے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ وہ دولت کے لالچ میں اندھی ہوچکی تھی۔ یہ بات اس کے علم میں آچکی تھی کہ کسی وجہ سے گاڑی کے بریک فیل ہوچکے ہیں۔ مگر اس نے یہ بات تمہارے باپ کو نہیں بتائی اور اسے اسی گاڑی میں باہر جانے دیا۔ لہٰذا یوں سمجھو کہ تمہاری ماں ہی تمہارے ابو کی بھی قاتل ہے۔ اسے راستے سے ہٹانے کے بعد اس نے مجھے یہ خوش خبری سنائی۔ میں بھی دولت کے لالچ میں اس سے شادی کر بیٹھا۔ بعد میں پچھتاوے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تمہارے ابو بڑے عقلمند انسان تھے۔ انہوں نے زرینہ کی بدنیتی کا خوب انتقام لیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ جو عورت اتنی محبت کرنے والے شوہر سے وفا نہ کرسکی' وہ مجھ سے کیسے وفا کرے گی؟''

شجاعت خاموش ہوا تو اس اذیت ناک انکشاف پر میں لرز کر رہ گئی۔ امی کے لیے نفرت کا لاوا میرے وجود میں ابلنے لگا۔ ان سے انتقام لینے کے لیے اب مجھے سوچ سمجھ کر کوئی چال چلنی تھی۔ اس کے لیے شجاعت کو بے وقوف بنانا ضروری ہوگیا تھا۔

''ٹھیک ہے..... میں تم سے شادی کے لیے رضامند ہوں۔ تم سب سے پہلے میری چالباز ماں کو قید کرنے کے لیے اس تہ خانے میں لے آؤ۔ اور مجھے اس عذاب سے نکالو۔'' میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

وہ میری رضامندی پر خوشی سے دیوانہ سا ہوگیا۔

''غزالہ..... میری جان! تم شروع سے مجھے پسند ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بھرپور محبت دوں گا۔ ثابت ہوچکا ہے کہ تمہاری ماں بانجھ ہے۔ وہ مجھے اولاد کی نعمت دینے سے بھی محروم ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ میں نے تمہیں اسی مقصد کے لیے انتہائی کم اثر کے انجکشن دیے تھے۔ اب ہمیں یہ ڈراما کرنا ہوگا کہ میں جاکر زرینہ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ تمہارا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے' تم بہکی بہکی باتیں کررہی ہو' اس حالت میں تم آسانی سے کاغذات سائن کردو گی۔ وہ یہ اطلاع پاتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ میں انتہائی تیز اثر والا انجکشن لے کر آیا ہوں۔ جو اصل میں تمہارے لیے تھا۔ اب یہی انجکشن ہم دونوں زبردستی زرینہ کو دیں گے۔''

وہ خوش خوش واپس چلا گیا۔ مگر اب بھی جاتے ہوئے تہ خانے کا دروازہ لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ بہرحال کچھ ہی دیر بعد وہ زرینہ کو لیے داخل ہوا۔ زرینہ نے کاغذات میرے سامنے پھینک دیے۔ میں نے دکھاوے کے لیے بہکی بہکی باتیں شروع کردیں۔

عین اسی لمحے اچانک شجاعت نے زرینہ کو عقب سے پکڑ کر اسی طرح پچھاڑ دیا جیسے اس نے مجھے پچھاڑا تھا۔ میں نے انتہائی پھرتی سے اس حرافہ کی ٹانگیں مضبوطی سے تھام لیں۔ شجاعت اسی طرح زرینہ کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اسی طرح بے دردی سے زرینہ کو انجکشن لگا دیا جس طرح اس نے مجھے لگایا تھا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کی زیادتی سے پھٹی رہ گئیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات میرے لیے انتہائی سکون کا باعث بنے۔ جو گزرا تھا اس نے میرے لیے کھودا تھا' اسی میں گر پڑی تھی۔ ہم دونوں اس حرافہ کو اس تعفن زدہ ماحول میں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ انجکشن واقعی زود اثر تھا۔ میرے سامنے ہی وہ سر کو تھامے ہوئے زمین پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ باہر آکر شجاعت نے تہ خانے کا دروازہ لاک کردیا۔ چار دن بعد مجھے اس تہ خانے سے نجات ملی تھی۔ یہ چار دن گویا چار صدیوں کے برابر تھے۔

اوپر آکر میں نے سب سے پہلے غسل کیا۔ شکرانے کے نفل ادا کیے۔ شجاعت نے مجھے بڑے پیار سے اچھا سا کھانا کھلایا۔ دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ وہ اسی دن زرینہ کو طلاق دینے کے لیے بے تاب تھا۔

مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب اس نے جاتے ہوئے میرے ہاتھ پیر بیڈ کی سائڈز کے ساتھ باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

''میری جان! معذرت چاہتا ہوں..... شادی ہو جانے تک میں تم پر زیادہ بھروسا نہیں کرسکتا۔'' وہ شاطرانہ لہجے میں بولا۔

مجھے جلد از جلد فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈنا تھا مگر ہاتھ مضبوط تھیں۔ میں بیڈ پر مچلنے کے سوا کچھ بھی نہ کرسکی۔ جدوجہد کہ منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا اٹک نہ نکال سکی۔ ورنہ شور مچا کر کسی کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کرتی۔

شجاعت جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ طلاق نامہ اس نے مجھے دکھایا۔ وہ اسی روز شادی کے لیے مصر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ طلاق کی ضابطے کی کارروائیاں بعد میں پوری ہوتی رہیں گی۔

''نہیں..... میں پورے چار دن تک اپنے باپ کی قاتلہ کو تہ خانے میں تڑپتا' سسکتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس دوران میں انجکشن دے دے کر اسے مکمل پاگل کردو۔ اس ڈائن کو مار ڈالنے سے میرے جذبات کو تسکین نہیں ملے گی۔ میں چاہتی ہوں اسے پاگل کرکے دنیا کی ٹھوکروں میں چھوڑ دیا جائے۔ جہاں عزتوں کے لٹیرے بھی ہیں اور ہر طرح کے وحشی درندے بھی..... وہ ہر روز مرے اور پھر زندہ ہو۔ یہی اس کے لیے بہتر سزا ہوگی۔''

اس تجویز میں نے اسے چار دن کے لیے ٹال دیا۔ ویسے میں واقعی زرینہ کے اپنے کیے کا تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔ جب ہم تہ خانے میں اترتے تو ایک خاص خوشبو اسپرے کردیتے۔ تعفن میں وقتی طور پر کچھ کمی آجاتی۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ تہ خانے میں اب صرف ایک چوہا بچا تھا۔ بہرحال اس ایک چوہے نے بھی زرینہ کی خاصی درگت بنادی تھی۔ چوہا بھی بھوکا تھا۔ زرینہ کی قوتِ مدافعت بھی فاقے اور انجکشن کی وجہ سے جواب دے چکی تھی۔

چار دن تک میں نے زرینہ کو ہر طرح سے ذلیل کیا۔ دو دن بعد ہم نے اسے کھانا دیا تھا۔ اسے بھی میری طرح وہیں فارغ ہونا پڑتا تھا۔ تعفن روز بہ روز مزید بڑھتا جارہا تھا۔ چوتھے دن وہ مکمل طور پر پاگل ہوچکی تھی اور میری مسرتوں کا ٹھکانا نہ تھا۔

اس دوران میں مجھے بھاگنے کا کسی بھی طرح موقع نہ ملا۔ وہ جب کہیں جاتا تو اسی طرح مسہری سے باندھ جاتا۔ مگر آکر کھول دیتا مگر سائے کی طرح ساتھ لگا رہتا۔ پینتالیس سالہ ادھیڑ عمر شخص بیس سالہ دوشیزہ سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دونوں گھریلو ملازمین کو یا تو نکال دیا گیا تھا یا پھر لمبی چھٹی دے دی گئی تھی۔

''اب میری آخری خواہش کے مطابق زرینہ کو بے ہوش کرکے کار میں لے جاکر حیدرآباد چھوڑ آؤ' جہاں اس ڈائن کا کوئی بھی آشنا نہیں۔'' میں نے شجاعت سے کہا۔

''واپسی پر نکاح خواں' ایک وکیل اور دو گواہ بھی لیتا آؤں؟'' شجاعت پُرہوس نظروں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے!'' مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔

اس نے حسبِ سابق مجھے مسہری سے اچھی طرح باندھا' منہ میں کپڑا ٹھونسا اور زرینہ کو کار میں ڈال کر حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگیا۔

حیدرآباد جانے اور واپس آنے میں کم از کم پانچ گھنٹے تو لگتے۔ بس یہی وقت تھا میرے پاس۔ اس دن میں نے نظریں بچا کر تکیے میں لگا ہوا بڑا سا پن اس انداز میں پھنسا دیا تھا کہ اس میں اٹک کر میرے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا نکل سکتا تھا۔

میں نے فوری طور پر چہرے کو تکیے کے اس حصے کی طرف لے جانے کی کوشش شروع کردی۔ جب ناکام رہی تو کاندھے کے ذریعے تکیے کو ایک جانب کھسکانے لگی۔ آخرکار تکیے کا وہ حصہ جس میں پن لگا ہوا تھا۔ منہ کے قریب آگیا۔ خاصی جدوجہد کے بعد کپڑے کا ایک سرا میں پن کے اوپری حصے میں پھنسانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پن کی نوک میرے اوپری ہونٹ میں گھس گئی۔ میں چہرے کو حتی الامکان پن سے دور لے گئی۔

کام بنتا نظر نہیں آرہا تھا۔ تھوڑا سا کپڑا ہی منہ سے باہر آسکا تھا۔ ہاتھ ایک خاص زاویے سے بندھے ہوئے تھے۔ میں چہرہ اس سے زیادہ دور نہیں لے جاسکتی تھی۔ میں چہرہ واپس پن کی جانب لے آئی۔ جو کپڑا منہ سے باہر نکلا تھا' اسے کاندھے کے نیچے دبایا اور منہ کاندھے سے دور لے گئی۔ کچھ اور کپڑا منہ سے نکل آیا تھا۔ اسی طریقے سے کاندھے کے ذریعے میں تمام کپڑا منہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب میں نے حلق پھاڑ کر چلانا شروع کردیا۔ خیال تھا کہ میری آواز سن کر کوئی بھلا مانس مدد کے لیے کسی نہ کسی طرح اندر آجائے گا۔

میں چیخ چیخ کر ہلکان ہوگئی۔ شاید سارا محلہ بہرا ہوگیا تھا۔ یا آواز سن کر بھی لوگ انجان بن رہے تھے۔ شاید کسی مصیبت میں پھنسنے کا خوف سب کو کنی کترانے پر مجبور کررہا تھا۔ میں مایوس ہوکر رو پڑی۔

دفعتاً گیٹ پر ایک فقیر کی صدا نے امید کی کرن پیدا کردی۔ میں نے نئے جذبے کے ساتھ پھر مدد کے لیے چلانا شروع کردیا۔ غالباً میری چیخیں فقیر تک پہنچ گئی تھیں۔ اسے گویا سانپ سونگھ گیا۔ خاصی دیر ہوگئی' کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو امید کی یہ آخری کرن بھی دم توڑ گئی۔ غالباً فقیر کسی جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اور خاموشی کے ساتھ کھسک گیا تھا۔

تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ وقت کم تھا۔ میں نے تمام تر قوتیں مجتمع کرکے پھر چلانا شروع کردیا۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا

جیسے مین گیٹ کا تالا توڑا جارہا ہو۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ان لوگوں کی رسائی میرے کمرے تک ہوگئی۔ وہ پولیس والے تھے۔ وہ فقیر ہی مجھے دوسری زندگی دینے کا باعث بنا تھا۔ اسی نے دانش مندی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پولیس کو اطلاع دی تھی۔ وہ پولیس کے ساتھ تھا۔

''بابا! ابھی تو میرے حالات خراب ہیں۔ یہ نئی زندگی آپ ہی کی وجہ سے مجھے ملی ہے۔ آپ بعد میں مجھ سے ضرور ملیے گا۔ میں اس احسان کا آپ کی توقع سے بڑھ کر انعام دوں گی'' میں روتے ہوئے ممنونیت سے بولی۔

''نہیں بیٹی! نہیں' یہ تو میرا فرض تھا۔ میں نے یہ کام کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا۔ کیوں میری نیکی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو؟'' فقیر کے لہجے میں سچائی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا آج کے دور میں بھی ایسے فقیر پائے جاتے تھے جو سچ مچ درویش تھے؟

میں نے اپنی روداد پولیس کو سنائی تو ان کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر مجرم کو پکڑنا ہے تو اسے اس کارروائی کا شک نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا جس ساخت کا تالا مین گیٹ سے توڑا گیا تھا' بالکل ویسا ہی تالا لگادیا گیا اور پولیس گھات لگا کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد شجاعت خوش وخرم تین آدمیوں اور قاضی صاحب کے ہمراہ واپس آیا تو پولیس نے پھرتی سے کارروائی کرکے اسے گرفتار کرلیا۔ مجھے بھی تھانے جانا پڑا۔ جہاں میرا بیان لیا گیا۔ تھانے کی کارروائی مکمل کرواکر فقیر بابا نے مجھے گھر چھوڑا۔ میں نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''بابا' اسے اپنا گھر سمجھ کر آتے جاتے رہیے گا۔''

فقیر بابا مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

اگلے روز ایک اور خوشی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ بیل کی آواز پر میں نے گیٹ کھولا تو سامنے سلمان اور اس کی والدہ کو کھڑے پایا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے سکتہ سا ہوگیا۔

''محترمہ! آخر کب تک ہمیں گیٹ پر کھڑا رکھو گی؟'' سلمان شوخی سے بولا۔

''اوہ..... معاف کیجیے گا..... تت..... تشریف لائیں۔'' میں بوکھلا گئی۔

انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے فہمیدہ صاحبہ سے شکوہ کیا۔ ''آنٹی! میں نے تو اپنے جال میں آپ کے معصوم بیٹے کو پھنسالیا تھا۔ امی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے سلمان کی منگنی اپنی بہن کی بیٹی سے کردی تھی۔ اب تک تو شادی بھی ہوچکی ہوگی۔ کہاں ہے آپ کی بہو؟ یا آپ لوگ پھر میرے ''جال'' میں پھنسنے کے لیے تشریف لائے ہیں؟'' میرے لہجے میں کاٹ تھی۔

''اوہ..... اب میں سمجھی..... بیٹی! تمہاری ماں بڑی شاطر عورت ہے۔ اس نے تمہیں ہمارے بارے میں مس گائیڈ کیا اور ادھر ہمیں خوب صلواتیں سنائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ تمہاری منگنی بچپن ہی سے منیر صاحب کے دوست کے بیٹے سے طے ہے۔ اس نے الزام لگایا کہ میرے بدمعاش بیٹے نے اس کی معصوم بچی کو..... جو ابھی نہایت کم عمر ہے۔ ورغلایا ہے۔ شجاعت نے دو مسلح غنڈوں کے ہمراہ میرے گھر پر دھاوا بول دیا۔ خاصی توڑ پھوڑ مچائی۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر جان پیاری ہے تو آج ہی یہ گھر چھوڑ دو۔ ورنہ صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ یہی نہیں' انہوں نے اپنا فون نمبر بھی بدلوادیا تاکہ سلمان تم سے رابطہ کرکے حقیقت سے آگاہ نہ کرسکے۔

سلمان کو یہ صورتِ حال جب میں نے فون پر بتائی تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تمہاری منگنی میں ملے ہوچکی تھی تو تم اسے اس بارے میں ضرور آگاہ کرلیتیں..... اور ہاں بیٹی! سلمان نے اس دوران میں تمہیں چھ خط گھر کے ایڈریس پر بھی بھیجے لیکن تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا' انہوں نے گویا شکوہ کیا۔

''کل..... لیکن مجھے تو سلمان کا ایک بھی خط نہیں ملا'' میں ششدر رہ گئی۔ گویا اس حرافہ عورت نے یہ کھیل بھی کھیلا تھا۔ وہ کسی بھی سمت میں وار کرنے سے غافل نہیں رہی تھی۔

میں نے جب اپنی درد بھری داستان سلمان اور ان کی والدہ کو سنائی تو ان دونوں ماں بیٹوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ سلمان آج ہی کی فلائٹ سے واپس آیا تھا اور اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ میں نے احسان مندی سے ایک نظر اسے دیکھا اور شرما کر نظریں جھکالیں۔

☆☆☆

جلد ہی میری شادی سلمان سے ہوگئی تھی۔ شجاعت کا مقدمہ چلا۔ وہ ابو کے قتل میں برابر کا شریک ثابت ہوا۔ اسے سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس ڈائن زرینہ کا کچھ پتا نہ چلا۔ ہم آج بھی منتظر ہیں کہ شاید فقیر بابا اس سے اپنا صلہ لینے آجائیں۔ مگر وہ فرشتہ صفت انسان پھر کبھی لوٹ کر آیا۔ ایسے ہی لوگوں کے دم سے یہ دنیا قائم ہے۔

جھوٹا ہمدرد

مکرمی ایڈیٹر صاحب، آداب۔

ہر انسان کی زندگی دوسروں کے لئے کسی نہ کسی طرح ایک سبق یا عبرت بن سکتی ہے۔ میری اس سرگزشت ہی کو دیکھ لیں۔ اپنی خوشیاں اور جہالت حاصل کرنے کے لئے خود کو کس قدر بدلا۔ مگر قسمت کبھی نہ بدل سکی۔ اب اسے اپنی قسمت کہا جائے یا دوسرے کی بے حسی، مکر یا دغا؟ بہر حال یہ کہانی شاید دوسروں کو کچھ سکھا سکے۔ لہٰذا سرگزشت کے چند صفحات اگر اس کے نام کریں گے تو آپ کی ممنون رہوں گی۔

آپ کی دعائوں کی طالب
افشاں آفریدی۔ کراچی

میں اگر مغرور تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ انسان کو جو کچھ بناتے ہیں' اس کے حالات بناتے ہیں۔ کوئی پور بن جاتا ہے کوئی قاتل' میں مغرور ہوگئی۔ اپنے بے پناہ حسن پر بھی اور اپنے باپ کی دولت پر بھی۔ دولت کے ڈھیر تھے اور خرچ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اکلوتی تھی اس لیے ڈیڈی کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے سونے کا بنادیں۔ میری آنکھوں میں ہیرے جڑ دیں' میرے دانت سچے موتیوں کے بنادیں۔ نخرے اٹھانے والے موجود تھے لہٰذا میں نے خوب نخرے دکھائے۔ گھر کے ملازم دوڑنے بھاگنے لگتے کہ چھوٹی بی بی خفا نہ ہوجائیں۔ میرے خفا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی نوکری گئی۔

میں جب تک گود میں اٹھانے اور انگلی پکڑ کر چلنے کے لائق تھی۔ میری بدتمیزیاں شرارت سمجھی جاتی رہیں لیکن جب ذرا بڑی ہوئی اور گھر کے سب سے پرانے ملازم کے تھپڑ مار دیا تو ڈیڈی' ممی کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں بگڑ گئی ہوں۔ انہوں نے دبے لفظوں میں مجھے سمجھانا چاہا تو میری زبان درازی سے وہ بھی نہ بچ سکیں۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میرے دل میں جو آیا میں کرتی رہی۔

"پاگل تو نہیں ہے۔ اپنا مقام و مرتبہ دیکھے اور یہ کام دیکھے۔ یہ چیزیں جچتی ہوں گی اس پر؟"

"مجھے خود حیرت ہوتی ہے جب وہ اپنی گاڑی میں فقیروں تک کو لفٹ دیتا ہے یا گاڑی روک کر کسی نابینا کو سڑک پار کرواتا ہے۔"

"تم سے تو اس کی بات چیت ہے، تم اسے سمجھاتی نہیں؟"

"تمہاری بات چیت کروادوں گی۔ پھر تم سنبھال لینا۔" عاصمہ نے ہنستے ہوئے کہا "یار وہ عجیب سا ہے، کسی کی نہیں سنتا یہاں تو لڑکیوں نے اس کا نام ہی خیر خواہ رکھ دیا ہے۔"

اس کے بعد عاصمہ نے کیا کہا، مجھے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دل بہلانے کے لیے اسے لے کر کینے ٹیریا میں چلی گئی، وہ موڈ میں تھی کہ کاشف ہی کی باتیں کرتی رہے لیکن نہ جانے کیوں میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے نمرہ کی باتیں چھیڑ دیں۔ تھوڑی دیر میں ہم روایتی عورتوں کی طرح چغلیاں کر رہے تھے۔

دو تین دن گزرے تھے کہ کاشف نے کشمریوں کے حق میں ایک ریلی نکالی۔ اس کے دوست پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے اور وہ خود ایک غریب کشمیری کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے جو جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ دو دن پہلے میں اسے بہترین سوٹ میں دیکھ چکی تھی اور اب پھٹے ہوئے کپڑے اس کے جسم پر تھے۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ایسے ہی لوگوں نے غریبوں کا دماغ خراب کیا ہے۔ اگر میں اس امیر آدمی کو کسی جوئے خانے میں دیکھ لیتی تو اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس وقت ہوئی تھی۔

میں بہت کوشش کر رہی تھی کہ کاشف کی محبت کو دل سے نکال دوں لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کا خیال مجھے گھیر لیتا تھا اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ یونیورسٹی پہنچتے ہی جیسے ہی اس پر نظر پڑتی میرے دل میں نفرت کے جذبات ابھر آتے۔ شاید اس لیے کہ اس کی مصروفیات مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

میں نے ابھی تک اپنے جذبات اپنے دل تک محدود رکھے ہوئے تھے۔ کاشف سے ابھی تک میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ کمال تو یہ تھا کہ نمرہ تک کو میں نے ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

ایک دن میں نے سوچا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ وقت گزاری کے لیے کر رہا ہو۔ اگر میں اس کا وقت چرالوں۔ اگر اسے اپنے آپ میں مصروف کرلوں تو ممکن ہے وہ راہِ راست پر آجائے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس سے راہ رسم بڑھانے کی ٹھان لی۔ مصیبت یہ تھی کہ نمرہ علی ساسہ کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ دوسری طرف کاشف کو اس کے دوست گھیرے رہتے تھے۔ میں نمرہ اور عاصمہ پر کوئی ظاہر کیے بغیر کاشف سے ملنا چاہتی تھی۔ اسی لے دیر تک رکی تھی۔

ایک دن تقدیر نے میرا ساتھ دے دیا۔ میں لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ وہ آتا دکھائی دیا۔ اتفاق سے اس کے ساتھ کوئی لڑکا نہیں تھا اور میں بھی اکیلی تھی۔

"ہیلو مسٹر کاشف۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ہیلو۔" اس نے خندہ پیشانی سے کہا اور آگے بڑھ لگا۔ شاید اس لیے کہ میری اس سے کوئی شناسائی نہیں تھی۔

"میرا نام افشاں آفریدی ہے۔ آپ ہی کے ڈپارٹمنٹ میں پریویس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ ملتی رہیے گا۔" اپنے مشن کے لیے آپ جیسی بولڈ لڑکیوں کی ضرورت ہے۔"

"آپ مجھے چائے کے لیے آفر نہیں کریں گے۔"

"اوہ شور۔ کیوں نہیں، کیفے چلتے ہیں۔"

"یہاں کے تھرڈ کلاس ماحول میں میرے بیٹھنے کیا اچھے لگیں گے۔ گاڑی آپ کے پاس بھی پاس بھی۔ یونیورسٹی سے باہر کہیں چلتے ہیں۔"

"سوری، آج تو ٹائم نہیں ہے، پھر کبھی سہی۔"

"چلیے پھر یہیں چائے پی لیتے ہیں۔"

میں یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں اسے لے کر کینے ٹیریا میں آگئی۔ مجھے اپنے حسن اور دولت اتنا مان تھا کہ کاشف مجھے ٹھکرا نہیں سکتا، معلوم ہو رہا تھا، جیسے چاہوں گی خریدلوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے ساتھ لمحے بیٹھوں گی تو وہ موم کی طرح پگھل جائے گا۔ یہ ملاقا آئندہ ملاقاتوں کا بہانہ بن جائے گی۔

"تو میں یہ سمجھوں کہ آپ نے ہمارا گروپ جوائن کرلیا ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی کہا۔

"آپ کا گروپ؟ کیا کرتا ہے یہ گروپ؟"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کو ہمارے گروپ کے بارے میں معلومات ہوگی اسی لیے آپ نے مجھ سے ملنا ضروری سمجھا ہے۔"

"دیکھیے کاشف! ہم دونوں ایسی سوسائٹی سے تعلق ہیں جہاں لڑکے لڑکیوں کی دوستی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ آپ کو دوست بنانا چاہتی ہوں۔"

"افشاں صاحبہ دوستی کی کوئی بنیاد بھی ہوتی ہے۔"

"یہ بنیاد کیا کم ہے کہ ہمارا معیارِ زندگی ایک ہے۔ ہم ایک ہی طبقے کے لوگ ہیں۔"

"یہ تو کوئی بنیاد نہ ہوئی۔ دوستی تو مزاجوں کی ہم آہنگی سے قائم ہوتی ہے۔"

"یہ تو ساتھ رہ کر ہی معلوم ہوگا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ آپ ہمارا گروپ جوائن کرلیں۔ ہم چند لڑکے اور لڑکیاں ہیں جنہوں نے غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کو اپنا فرض بنالیا ہے۔ یونیورسٹی میں کتنے ہی اسٹوڈنٹس ایسے ہیں جو اپنے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہم سب کھاتے پیتے گھرانوں سے ہیں۔ اپنا جیب خرچ بھی جمع کرتے ہیں تو ان کی مدد ہو جاتی ہے۔ ابھی ہمارا کام یونیورسٹی تک محدود ہے لیکن جیسے ہی ممبروں کی تعداد بڑھے گی ہم ورکنگ سے باہر بھی اپنا نیٹ ورک پھیلائیں گے۔"

"کاشف، یہ تمہیں غریبوں سے ہمدردی کا سبق کس نے پڑھایا ہے۔ کیا تم اپنا وقت ضائع کر کے دنیا سے غربت مٹا دو گے؟"

"اگر ہم چند لوگوں کی مدد بھی کرسکے تو میں سمجھوں گا کہ میں بڑا کام کرلیا۔ ہر شخص اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ کام ہی کرنا ہے تو کوئی اچھا کام کرو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ یہ ڈھنگ کا کام نہیں؟"

"میرے نزدیک تو بالکل نہیں۔ یہ غریب تو پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ غریب رہیں۔"

"بات صرف غربت کی نہیں۔ کسی معذور کو سڑک پار کروا دو، یہ بھی تو نیکی ہے۔"

"مجھے تعجب ہے کہ تم ایک اتنے بڑے آدمی کے بیٹے ہوتے ہوئے ایسی سوچ رکھتے ہو۔"

"آپ تو ہمارے گروپ میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتیں؟"

"قطعی نہیں، مجھے تو صرف تم میں دلچسپی ہے۔"

"اور مجھے ان میں دلچسپی ہے جو معذور ہیں، بے سہارا ہیں، مظلوم ہیں۔"

"غریبوں کی بستی سے باہر بھی تو کوئی دنیا ہے۔"

"میں اس دنیا سے بھی لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن مجھے کسی کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

"آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔"

"میرے دوست وہ ہیں جو میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے آپ اچھی لگی ہیں لیکن میرے خیالات آپ سے نہیں ملتے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا "مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔"

وہ اٹھ کر چلا گیا اور میرا سارا موڈ غارت کر گیا۔ میں نے آج تک کبھی شکست نہیں مانی تھی لیکن وہ مجھے شکست دے گیا تھا۔ میں نے اپنا غرور ایک طرف رکھ کر اس سے دوستی کی بھیک مانگی تھی اور اس نے میرے جذبے کو ٹھکرا دیا تھا۔ میرا عقیدہ تو یہ تھا کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے لیکن وہ تو اپنا سب کچھ غریبوں میں بانٹنے کا عادی تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے اپنا غصہ ملازموں پر اتارا۔ کراکری کا ایک پورا سیٹ توڑ دیا اور کھانا کھائے بغیر بستر پر گر گئی۔ ممی نے پوچھنا چاہا تو انہیں بھی جھڑک دیا۔ میں اکیلے کمرے میں بند ہو کر کاشف کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی اور سوچتی رہی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی کہ کمرے میں آہٹ ہوئی جیسے کوئی آیا ہے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا، ممی ہوں گی۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں جاگ رہی ہوں تو ابھی سمجھانے بیٹھ جائیں گی۔

"افشاں کی بچی تو یہاں پڑی سو رہی ہے اور میں تجھے یونیورسٹی میں ڈھونڈتی رہی۔" یہ نمرہ کی آواز تھی جو میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی، میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کون سا طریقہ ہے۔ آنا ہی تھا تو بتا کر آجاتی۔" اس نے میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار، بس طبیعت ایسی گھبرائی کہ میں سیدھی گھر چلی آئی۔"

"میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تیری طبیعت ایسے ہی نہیں گھبراتی۔ کوئی بات ضرور ہے بلکہ میں تو کئی روز سے دیکھ رہی ہوں، تو مجھ سے کھچی کھچی رہنے لگی ہے۔"

"میں تجھ سے کیوں کھنچنے لگی تھی۔" میں نے کہا لیکن ظاہر ہے یہ سچ نہیں تھا۔ میں نے ان دنوں کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ نمرہ میرے ساتھ نہ ہو۔ اس کو خود نمرہ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ اب میں نے سوچا کہ اسے پوری بات بتا دوں تاکہ اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

"میں ان دنوں بہت پریشان ہوں۔" میں نے کہا "تم کاشف عظیم کو تو جانتی ہو؟"

"وہی جو خیر خواہ مشہور ہے؟"

"ہاں وہی۔"

''پھر؟''

''مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔''

نمرہ میری بات سن کر بے اختیار ہنس پڑی ''تمہیں .....اور کسی سے محبت ہوگئی ہے۔''

''یہ مذاق نہیں ہے نمرہ، میری زندگی کا سوال ہے۔''

''ارے میری پیاری افشاں تو سنجیدہ ہے۔ میں کل ہی تمہارا محبت نامہ اس تک پہنچادوں گی۔ میں کیا تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتی۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ میں اس سے بات کرچکی ہوں۔''

''افوہ! نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ پھر اس نے کیا کہا۔''

''اس پر تو غریبوں کی زندگی سنوارنے کا بھوت سوار ہے۔ بس یہی ایک خرابی ہے اس میں۔''

''تمہارے اور اس کے مزاجوں میں بہت فرق ہے۔ اسے خریدنا ہے تو اپنے مزاج میں تبدیلی لے آؤ۔''

''اس کی طرح گندے غریب لوگوں کے ناز اٹھاتی پھروں۔ یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''محبت کے لیے قربت ضروری ہے۔ اس کے قریب رہنے کے لیے تمہیں یہ سب کرنا پڑے گا۔''

''قیامت ہوجائے' یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''پھر محبت کا دعویٰ کیوں کرتی ہو۔ محبت کے لیے تو بہت کچھ کیا جاتا ہے۔''

''میں اس کے لیے سب کچھ کرسکتی ہوں لیکن کچی بستیوں میں جاکر اپنے کپڑے میلے نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر تم اسے جیت نہیں سکتیں۔''

''میں اسے ہر قیمت پر حاصل کروں گی۔''

''تم قیمت ادا کہاں کررہی ہو۔''

''وہ اگر میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتا تو نہ دے۔ اس پر تو پابندی نہیں لگاسکتا کہ میں اسے چاہوں۔ میں اسے چاہتی رہوں گی۔ مجھے یک طرفہ محبت گوارا ہے لیکن میں اس کے منصوبوں پر عمل نہیں کرسکتی۔ پھپھی یہ غریب لوگ۔ گھن آتی ہے ان کے بارے میں سوچ کر بھی۔''

نمرہ علی میرے اتنے سخت جواب کے بعد بھی مجھے سمجھاتی رہی لیکن میں جس بات پر اڑ جاتی تھی اس پر قائم رہتی تھی۔

کاشف عظیم میرے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ میں اسے اپنی شرائط پر حاصل کرنا چاہتی تھی جبکہ وہ ہر ملاقات میں مجھے اپنے گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ وہ اتنا بداخلاق نہیں تھا کہ مجھے ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ مجھ سے ملنا ضرور تھا لیکن میں اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں دیکھ رہی تھی جو محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ میری شکست نہیں تو اور کیا تھی۔ کبھی میرا جذبۂ غرور مجھ سے تقاضا کرتا تھا کہ میں بہت کر ہوں' میں اسے ٹھکرا کر آگے بڑھ جاؤں لیکن اس کی محبت مجھے قید کرلیا تھا۔

ایک دن میں نے اس کی قربت کا ایک بہانہ تلاش کیا میں نے اس سے کہا کہ میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ میرے گھر ڈراپ کردے۔ کل میں کسی مکینک کو لے آجاؤں گی۔ اس نے میری درخواست کو بہ خوشی قبول کرلیا میں اس کو بڑی کامیابی تصور کررہی تھی کہ فرنٹ سیٹ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ گھر سے پہلے کسی جگہ بیٹھ کر کچھ پئیں گے۔ جو باتیں اب تک نہیں کہہ سکی ہوں وہ سب کہہ دوں گی۔ میں انہی خیالوں میں کہ اس نے دو لڑکیوں کو دیکھ کر گاڑی روک دی۔

''گاڑی کیوں روک دی؟''

''لڑکیاں پیچھے آرہی ہیں۔ یہ پیدل جارہی انہیں بھی لے لیں۔''

''یہ پوائنٹ سے جاسکتی ہیں۔''

''کیا حرج ہے اگر پیدل جانے سے بچ جائیں۔''

اتنی دیر میں وہ لڑکیاں گاڑی تک پہنچ چکی تھیں۔ سب میری برداشت سے باہر تھا۔ میری توہین تھی کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو بھی بٹھائے۔ میں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر آئی۔

''آپ انہیں لے جائیں۔ میں کسی اور طرح چلی جاؤں گی۔''

وہ مجھے روکتا رہ گیا اور میں یونیورسٹی کی طرف واپس چل دی جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں پیدل چل رہی تھی اور وہ نواب زادیاں کار میں جارہی تھیں۔ میں واپس آکر اپنی گاڑی میں بیٹھی اور یونیورسٹی سے نکل آئی۔ دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر جلنا ہی اکیلی جلتی رہوں گی' اب اس سے ملاقات کی بھیک نہیں مانگوں گی۔

دوسرے دن کاشف ملا تو بہت خفا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میں نے غریب لڑکیوں کی توہین کی ہے۔ میں کون ہوتی تھی۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ قسمت نے تمہیں دولت گھرانے میں پیدا کردیا ہے ورنہ غریبوں کی غلیظ روحیں تمہارے بدن میں بھٹکتی پھررہی ہے۔

میں نے اس سے بول چال بند کردی تھی لیکن اسے دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ اپنے دل کی باتیں نمرہ سے کرکے خود کو سمجھاتی رہتی تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ دولت ہونے کے باوجود بھی انسان پریشان ہوسکتا ہے۔ بعض واہشات ایسی ہوتی ہیں جو پیسے سے نہیں خریدی جاسکتیں۔

نمرہ میری حالت دیکھ کر پریشان تھی۔ میں کہہ چکی تھی کہ کاشف کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی لیکن اسے حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ میرے اندر عجیب سی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ میں بہ یک وقت نفرت اور محبت کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ کاشف سے محبت بھی تھی اور اس کے جذبے سے نفرت بھی تھی۔

نمرہ مجھے مسلسل سمجھا رہی تھی کہ میں کاشف کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے مشن کی حامی بن جاؤں۔ میں اس کو یہ کوشش سے گمراہ کررہی تھی اور میری خودسری آمادہ نہیں تھی کہ میں ہتھیار ڈال دوں۔

ایک دن میں نمرہ کے ساتھ کینے ٹیریا میں بیٹھی تھی کہ کاشف اندر داخل ہوا۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ میری صحت پر اثر انداز ہوتی لیکن یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ عاصمہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں ایک ہی ٹیبل پر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں ان کی باتیں تو نہیں سن سکتی تھی لیکن عاصمہ کے چہرے پر ابھرنے والے رنگ مجھے برافروختہ کرنے کے لیے بہت تھے۔ وہ کچھ بھی باتیں کررہے ہوں لیکن میرے دل میں اندیشوں نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ جذبۂ رقابت نے ایسا زور باندھا کہ میں نے آدھا کھایا ہوا سموسہ پلیٹ میں رکھا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ نمرہ نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجبوراً اسے بھی اٹھنا پڑا۔

''کیا ہوا' اچانک چلی کیوں آئیں؟'' نمرہ نے باہر نکل کر کہا۔

''کچھ نہیں۔ بس کچھ دل گھبرا رہا تھا۔''

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ عاصمہ کی طرف سے تمہارے دل میں رقابت پیدا ہوئی تھی۔''

''ہاں۔ یہی بات ہے میں کاشف کے ساتھ کسی اور لڑکی کو بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔''

''کس کس کو روکو گی اس کے پاس بیٹھنے سے؟''

''ابھی تو میں اٹھ کر آئی ہوں آئندہ اسے اٹھادوں گی۔ ٹوٹ کردوں گی اسے۔''

''پاگل مت بنو۔ اس طرح جیل چلی جاؤں گی اور کاشف کا دل پھر بھی نہیں جیت سکو گی۔''

''پھر کیا کروں نمرہ، یہی حال رہا تو میں پاگل ہوجاؤں گی۔'' میں تقریباً رونے لگی۔

''رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ حل یہی ہے کہ کاشف کی ہم خیال بن کر اس کی قربت حاصل کرو۔ قربت کی کوکھ سے محبت کا جنم ہوتا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں جس خیال پر قائم ہوں اسی خیال پر قائم رہوں گی۔ میرے نظریات کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ کاشف کو میرا بننا پڑا گا میں نے آج تک کسی سے ہار نہیں مانی۔ مجھے معلوم ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن ہار نہیں مانوں گی۔''

''تم اپنی ضد کی آگ میں جلتی رہوگی اور عاصمہ تمہارے کاشف کو لے اڑے گی۔''

''نمرہ! اگر صورت اچھی نہیں ہے تو باتیں تو اچھی کرلیا کرو۔ کاشف میرا ہے اور میرا رہے گا۔''

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن میری آواز میں اب وہ طاقت نہیں رہی تھی۔ مجھے خود محسوس ہورہا تھا کہ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔

وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ کبھی جیت جاتی کبھی ہار جاتی۔ کبھی ایک فیصلہ کرتی کبھی دوسرا۔ نمرہ کی باتیں رہ رہ کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اگر میں نے دیر کی تو عاصمہ' کاشف کو لے اڑے گی۔ میں عاصمہ کو جیتنے نہیں دوں گی۔

میں علی الصباح اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وقت رینگ رینگ کر چل رہا تھا۔ میں جلد سے جلد یونیورسٹی پہنچنا چاہتی تھی۔ یونیورسٹی کھلنے سے پہلے مجھے وہاں ہونا چاہئے۔ ایسا نہ ہو مجھے دیر ہوجائے اور عاصمہ..... میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور نمرہ کے گھر پہنچ گئی۔ وہ ابھی سو کر بھی نہیں اٹھی تھی۔ اسے میرے آنے کی خبر دی گئی تو وہ حیران رہ گئی۔

''آج تو پہلا پیریڈ بھی نہیں ہے۔ اتنی جلدی جاکر کیا کروگی بے؟''

''جلدی جانا ہے۔ فوراً تیار ہوجاؤ۔''

''بات کیا ہے افشاں۔ تم بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو؟''

''جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ میں تمہیں راستے میں بتاؤں گی۔''

اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور میرے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھ گئی ''ہاں' اب بتاؤ کیا بات ہے۔''

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کاشف کے گروپ میں

شامل ہو رہی ہوں۔'' میں نے گیئر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' وہ تقریباً چیخ پڑی ''یہ میں کیا سن رہی ہوں؟''

''اس کے سوا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔''

''میں تمہارے خیالات جانتی ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی۔ تم جن لوگوں کے لیے کام کرو گی' ان کی طرف سے دل میں نفرت بھی رکھو گی۔ کیا یہ منافقت نہیں؟''

''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں غریبوں کی ہمدردی میں نہیں' کاشف کو حاصل کرنے کے لیے اس کے گروپ میں شامل ہو رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن شاید وہ مجھ سے بھی بڑا ضدی ہے۔''

میں نے نمرہ کو بھی دعوت دی کہ وہ بھی میرے ساتھ اس گروپ میں شامل ہو جائے لیکن ظاہر ہے وہ میری طرح مجبور نہیں تھی۔ اس نے معذرت کر لی۔

میں نے یونیورسٹی پہنچتے ہی کاشف کی کلاس میں جھانکا۔ وہ موجود نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا' وہ کلاس میں نہیں تو کہاں ہوگا۔ میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنگ کرتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''میں آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟''

''بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ہم ایسی باتیں کر رہے ہیں جو ممکن ہے آپ کو ناگوار معلوم ہوں۔'' کاشف نے کہا۔

''کاشف' میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو ٹھیک کر رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے آئی ہوں۔''

''سچ! کیا واقعی؟'' وہ سب ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ تمہاری وجہ سے ہمیں بہت سہولت ہو جائے گی۔ ہم یہاں جا رہے ہیں وہاں ہمارا سابقہ غیور توں سے پڑے گا۔ ہمارے ساتھ لڑکیاں ہوں گی تو وہ عورتیں اپنے مسائل کھل کر بیان کر سکیں گی۔''

''کہاں جا رہے ہو تم لوگ۔''

''ہم لوگ ابھی یہ بات کر رہے تھے کہ صرف مظاہروں یا اردگرد کے لوگوں کی مدد کر دینے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنے دائرۂ کار کو بڑھانا چاہئے۔ ہفتے میں نہ سہی کم از کم مہینے میں ایک دفعہ ہمیں ان آبادیوں میں جانا چاہئے جہاں پر لوگ بنیادی ضرورتوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ ہم ان کی عملی طور پر مدد کریں۔'' کاشف نے میٹنگ میں ہونے والے فیصلے سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ان کی امداد کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم سب کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم ایک فنڈ قائم کریں گے جس میں ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق رقم جمع کرائے گا۔ ہم کسی غریب کا علاج کرا سکتے ہیں۔ کسی بیوہ کا وظیفہ باندھ سکتے ہیں۔ کسی لڑکی کی شادی کرا سکتے ہیں۔''

''پھر کیا سوچا آپ لوگوں نے۔''

''ہمارا پروگرام ایک کچی آبادی میں جانے کا ہے۔ ہمیں ایک ایسے گھرانے کا پتا چلا ہے جو ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ پہلے وہاں جا کر ان کے حالات معلوم کریں گے پھر ان کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائیں گے۔''

''کل دس بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔''

یہ پروگرام طے ہو گیا تو میں نمرہ کے ساتھ واپس آ گئی۔ دل ہی دل میں خوش تھی کہ تمام معاملات بہ خوبی طے ہو گئے۔ کاشف کی آنکھوں میں مجھے وہی چمک نظر آئی جو ایک چاہنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

دوسرے دن ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی کاشف کی تھی لہٰذا وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ اعزاز دیا کہ فرنٹ سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ پچھلی سیٹ پر اس کے دو دوست اور عاصمہ بیٹھے تھے۔ میں یہ سوچ کر بہت خوش ہو گئی کہ اگر میں نہ ہوتی تو اس جگہ عاصمہ بیٹھی ہوتی۔ میں نے کتنی خوبصورتی سے عاصمہ کو راستے سے ہٹا دیا۔ ایک دن آئے گا کہ وہ اس گاڑی میں بھی نہیں ہو گی۔

سفر طویل تھا لیکن باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ گاڑی آگے نہیں جا سکتی تھی لہٰذا سب کو نیچے اترنا پڑا۔ اب اس کے گھر تک پیدل چلنا تھا۔ پیدل چلنے میں مضائقہ نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ بارش ہو چکی تھی۔ پوری گلی میں کیچڑ بھری ہوئی تھی۔ گلی والوں نے جگہ جگہ اینٹیں رکھ کر گزرنے کا راستہ بنا دیا تھا۔

''آپ لوگ کہاں آ گئے۔ اتنی تو بدبو ہے یہاں۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''دیکھ لو' یہ بھی تو ہماری طرح کے انسان ہیں جو دن رات اس بدبو کے درمیان رہتے ہیں۔''

''ان کا تو مقدر ہی یہ ہے۔ تم ہمیں کیوں لے آئے۔ یہ تو دیکھ لیتے کہ یہاں کتنی کیچڑ ہے۔''

''میرا ہاتھ پکڑ لو اور پتھروں پر پاؤں رکھتی ہوئی چلی آؤ۔'' کاشف نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کا ہاتھ' ہاتھ میں آیا تو جی چاہا کہ یہ کیچڑ اسی طرح ہمارے ساتھ چلتی رہے۔ پتھروں سے بنا ہوا یہ راستہ بھی ختم نہ ہو لیکن یہ فاصلہ دو چار پتھروں سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے بعد راستہ کچا تھا لیکن یہاں کیچڑ نہیں تھی۔

کاشف یہاں پہلے بھی آ چکا تھا لہٰذا کسی سے پوچھے بغیر وہ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ عاصمہ نے پردہ ہٹا کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ وہی عورت دروازے پر آئی تھی۔

''ہم لوگ ایک ادارے کی طرف سے آئے ہیں۔'' عاصمہ نے ہمارا تعارف کرایا۔ ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ آپ بتائیں تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔''

''آپ لوگ اندر آ جائیں۔''

ہم لوگ اندر چلے گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی گھر ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کمرے میں اس نے ہمیں بٹھایا اس میں دو بچوں کی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک پیٹی رکھی ہوئی تھی۔ ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ جس پر ایک ٹیبل فین رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر طاقچے لگے ہوئے تھے جن پر برتن سجے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی پر دو بچے سو رہے تھے۔

''ہاں' اماں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔'' عاصمہ نے پوچھا۔

''بیٹا میں بیوہ عورت ہوں' چھ بچے ہیں میرے۔ خود بھی بیمار رہتی ہوں۔ اس بستی کا ایک آدمی ہے جبار وہ اس پلاٹ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جہاں میں بیٹھی ہوں۔ مجھے طرح طرح سے تنگ کر رہا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ اب وہ جبار آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔''

وہ عورت دعائیں دینے لگی۔ میں نے کاشف کو خوش کرنے کے لیے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس عورت کو جو مسئلہ درپیش تھا اسے حل کرنا کاشف کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ اس کے والد پولیس کے بہت بڑے افسر تھے۔ اس نے اپنے والد سے بات کی اور جبار کو بلا لیا گیا۔ اسے وارننگ دے دی گئی کہ آئندہ وہ اس عورت کے گھر کا رخ نہ کرے۔

اس پہلے تجربے نے کاشف اور اس کے دوستوں کی ہمت افزائی کی تھی۔ اب وہ مستقل ایسی بستیوں کے چکر لگا رہے تھے۔ کاشف کی خاطر مجھے بھی ان کے ساتھ جگہ جگہ جانا پڑ رہا تھا۔ مجھے ان غریبوں سے ہمدردی تو کیا ہوتی نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ ہر گھر میں دس دس بچے موجود تھے۔ آمدنی کچھ نہیں اور بچے اتنے۔ کم از کم یہ تو ان کے اپنے ہاتھ میں تھا کہ بچے کم پیدا کرتے۔ ایک مرتبہ تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہم نے ایک گھرانے کو پکا کر کھانا بنانے کے لیے پیسے دیے۔ کچھ دن بعد ہمارا اس طرف سے گزر ہوا تو وہ لوگ اسی طرح جھگی میں رہ رہے تھے۔ ان لوگوں کی نیتیں خراب ہوتی ہیں اسی لیے یہ غریب رہتے ہیں۔ کاشف مجھ سے پوچھتا تھا کہ تمہیں یہ کام کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے یا نہیں اور میں اسے خوش کرنے کے لیے اپنی خوشی کا اظہار کرتی تھی حالانکہ دل سے دعا کرتی تھی کہ کاشف کو ان بے کار کاموں سے نفرت ہو جائے۔

میں اگر خوش تھی تو اس لیے کہ اب مجھے کاشف کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ نمرہ کا یہ فلسفہ بھی سچ ثابت ہو رہا تھا کہ قربت کی کوکھ سے محبت جنم لیتی ہے۔ واقعی ایسا ہو رہا تھا۔ کاشف کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دوسروں پر مجھے ترجیح دے رہا تھا۔ عاصمہ تو بالکل ہی پس منظر میں چلی گئی تھی بلکہ میں یہ دیکھ رہی تھی کہ کاشف اسے نظر انداز کرنے لگا ہے۔ ایک تبدیلی یہ بھی آئی تھی کہ میں اور کاشف اکیلے گھومنے کے لیے جانے لگے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل میں بیٹھ جاتے کبھی کسی پارک میں وقت گزارتے۔ میں اگر ایک دن یونیورسٹی نہ جاتی تو وہ بے چین ہو جاتا۔ بار بار مجھے فون کرتا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ ہماری ہر شام اکٹھے گزرنے لگی۔ کاشف کو ناز تھا کہ اسے مجھ جیسی لڑکی کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔ اس کا وہ برملا اظہار کرتا تھا۔ شکر گزار بھی تھا کہ اس کی خاطر میں نے اپنے خیالات تبدیل کر لیے۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ میں تبدیل نہیں ہوئی ہوں بلکہ میں نے اپنے اوپر ایک خول چڑھایا ہوا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں آہستہ آہستہ اسے راہِ راست پر لے آؤں گی۔ میں اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ ''نچلے طبقے'' کے بارے میں فکر مند ہونا چھوڑ دے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے بجائے ایسے لوگوں سے تعلقات استوار کرے جن کا معاشرے میں کوئی مقام ہے۔ میں اسے سدھارنے کی فکر میں لگی ہوئی تھی اور وہ اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکلنا عذاب تھا۔ یہ دنیا ضرورت مندوں سے بھری ہوئی ہے اور وہ ہر ایک کی ضرورت پوری کرنے کے مواقع تلاش کرتا رہتا تھا۔

ایک دن ہم نے گاڑی ایک جگہ پارک کی اور چہل قدمی کے انداز میں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک عورت دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔ وہ سڑک پار کرنا چاہ رہی تھی لیکن ٹریفک

اتنا تھا کہ اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی پھر پیچھے ہٹا لیتی۔ اس کے چہرے پر سخت پریشانی تھی۔ بچے بھی سہمے ہوئے تھے۔ مجھ میں اس وقت نہ جانے کون سا جذبہ بیدار ہوا۔ میں آگے بڑھی اور اس عورت کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے شکر گزار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میرے ساتھ قدم بڑھا دیے۔ رواں ٹریفک میں راستہ بناتے ہوئے میں نے اسے سڑک پار کرادی۔ سڑک کے دوسری طرف پہنچتے ہی بچوں کے چہرے کھل اٹھے۔ اس عورت نے مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اس کی دعاؤں میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ خوشی میری روح میں اتر گئی۔ بچوں کے معصوم چہرے دیکھ کر مجھے ایسا سکون ملا جس کی لذت سے میں اب تک آشنا نہیں تھی۔ مجھ پر اچانک یہ عقدہ کھل گیا تھا کہ کاشف کیوں لوگوں کی مدد کرتا پھرتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنے سے جو خوشی ملتی ہے دراصل وہی سچی خوشی ہے۔ اس کی لذت وہی جان سکتے ہیں جو دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

میں اس عورت کو سڑک پار کرا کے واپس آئی تو بالکل بدل چکی تھی۔ کاشف اس پورے عمل کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

''آج مجھے میری محبت کا پھل مل گیا۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کاشف مجھے یہ کہنے میں ذرا تکلف نہیں کہ اب تک میں تمہارے کاموں میں محض تمہاری خوشی کے لیے شریک ہوتی رہی تھی لیکن آج میں نے اپنی مرضی سے اس عورت کی مدد کی ہے۔ اور آج ہی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سچی خوشی کسے کہتے ہیں۔

''جب تم بدل ہی گئی ہو تو آؤ اس خوشی میں تمہاری دعوت کی جائے۔''

ہم گاڑی میں بیٹھے اور ہوٹل اواری پہنچ گئے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے یہاں اس لیے لایا ہے کہ پُرتکلف کھانا کھلائے گا لیکن اس نے کھانے کے درمیان ہی وہ بات چھیڑ دی جسے سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔

''افشاں! صرف تم ہی نہیں میں بھی پہلی ہی ملاقات میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں لیکن تمہارے خیالات دیکھ کر مجھے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ میں سمجھیں نہیں سکتا کہ اس دوران مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں تم سے دور جانے کی جتنی کوشش کرتا تھا اتنا ہی قریب آتا تھا۔ تم میرے حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ اپنے کام کو خیر باد کہہ کر کہیں اپنا لوں لیکن پھر مجھے ہزاروں ضرورت مندوں کا خیال آجاتا تھا۔ میں اس خود غرضی پر تیار نہ ہو سکا۔ پھر تم میرے مشن میں شامل ہو گئیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم دل سے میرے ساتھ نہیں ہو۔ آج میری خوشی کی انتہا نہیں۔ آج تم دل سے میرے ساتھ ہو۔''

''کاشف' میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔ تم نہ ہوتے تو میں اس سرور سے محروم رہتی جو اس عورت کی مدد کر کے حاصل ہوا ہے۔ اب میں اپنی زندگی ان رفاہی کاموں کی نذر کر دوں گی۔''

''ہم بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔ ہم شادی کر لیں گے اور مل جل کر انسانیت کی خدمت کریں گے۔'' اس نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

یہ دوسری خوشی تھی جو مجھے مل رہی تھی۔ کاشف نے میرے ایثار کا شہت جواب دے دیا تھا۔ اب ہم کسی بھی مناسب وقت پر ایک دوسرے کے ہو سکتے تھے۔

اس دن کے بعد سے مجھ میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ اب میں نے انسانوں کو دولت کے معیار سے ناپنا چھوڑ دیا تھا۔ اب میں ضرورت مندوں کو خود ڈھونڈنے لگی۔ کاشف اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہر اس دروازے پر جاتی تھی جہاں کوئی ضرورت مند رہتا تھا۔ میری چیک بک غریبوں کے لیے تھی۔ گھر کے نوکروں کے تمام شکوے دور ہو گئے تھے اب میں ان کے لیے شفیق مالکن تھی۔

کاشف سے میری ملاقاتیں مسلسل ہو رہی تھیں۔ ہر ملاقات کے بعد ہماری بے تابی بڑھ جاتی تھی۔ آخر ایک دن کاشف نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم منگنی کر لیں اور دو مہینے بعد جب ہمارے امتحان ختم ہو جائیں تو شادی کر لیں۔

کاشف نے اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجا اور باقاعدہ رشتہ لے کر آئے۔ میں نے امی کو کاشف کے بارے میں بتا دیا تھا لہٰذا وہ ذہنی طور پر تیار تھیں۔ کاشف کا گھرانہ ایسا نہیں تھا کہ ہمارے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ امی کو کوئی اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گئیں اور اس کے ایک ہفتے بعد ہی ہماری منگنی ہو گئی۔

''دو مہینے بعد امتحان ہونے والے تھے۔ کاشف کا فائنل ایئر تھا۔ جبکہ میرا پہلا سال تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ فائنل امتحان شادی کے بعد دوں گی۔ کاشف ان دنوں سخت محنت کر رہا تھا جبکہ میں پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کے باوجود ہم دو سرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں گھومنے ضرور نکلتے تھے۔

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھی نوٹس تیار کر رہی تھی۔ کلاسیں آف ہو چکی تھیں۔ طلبہ ایک ایک کر کے لائبریری میں سے اٹھنے لگے۔ اب میں رہ گئی تھی اور میری کلاس کی ایک لڑکی زہرہ رہ گئی۔ زہرہ بہت غریب لڑکی تھی۔ میں نے اس سے اس کے پورے حالات معلوم کر لیے تھے۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ماں کپڑے سی کر اس کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی تھیں۔ زہرہ خود بھی ٹیوشنز پڑھاتی تھی۔ وہ بے چاری اپنے حالات سے اتنی مجبور تھی کہ ہنسا بھول گئی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ لڑکے تو لڑکے کوئی لڑکی بھی اس کی دوست نہیں تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ میں دوستی اس لیے نہیں کرتی کہ دوستوں پر خرچ کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ لڑکوں میں مغرور مشہور ہو گئی تھی۔ کئی لڑکے تو سرِعام دھمکی دے چکے تھے کہ وہ اس کے غرور کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ ان دھمکیوں کی پروا کیے بغیر اپنی روش کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کتابیں سمیٹ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جانے والی تھی۔ چہرے سے پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے پیش کش کی کہ میں اسے اپنی گاڑی میں گیٹ تک چھوڑ دوں گی۔ اس نے پہلے تو انکار کیا مگر پھر تیار ہو گئی۔ میں نے بھی جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹیں اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ لائبریری سے نکلے۔ کار پارکنگ تک آئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تبھی کہ اچانک زہرہ کو اپنا رجسٹر یاد آ گیا۔ وہ اپنا رجسٹر لائبریری میں بھول آئی تھی۔

''جس پر میں اپنا کام کر رہی تھی' نوٹس تیار کر رہی تھی وہ تو وہیں بھول آئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں گاڑی میں بیٹھی ہوں' تم اپنا رجسٹر لے آؤ۔''

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لائبریری کی طرف گئی۔ درمیان میں ایڈمنسٹریشن بلاک آتا تھا اس لیے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن جب بہت دیر ہو گئی تو مجھے فکر ہوئی۔ میں نے گاڑی لاک کی اور پیدل چلتی ہوئی لائبریری کی طرف گئی کہ دیکھوں وہ کر کیا رہی ہے۔

اسے جس حالت میں' میں نے دیکھا میرے ہوش اڑ گئے۔ ایک گاڑی کھڑی تھی اور دو لڑکے زہرہ کو زبردستی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ میں چیخنا بھول گئی۔ میری آواز گلے میں ہی کہیں دفن ہو گئی اور میری آنکھوں کے سامنے زہرہ اغوا ہو گئی۔ میں بھاگتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف گئی تاکہ اس گاڑی کا پیچھا کر سکوں میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مین گیٹ کی طرف بھاگی۔ وہ لوگ زہرہ کو لے کر اس تیزی سے دوڑے تھے کہ اب ان کی گاڑی کا نام و نشان تک نہیں تھا لیکن مجھے یہ اطمینان تھا کہ ان میں سے ایک لڑکے کو میں پہچان چکی تھی۔ وہ نعیم تھا جو پوری یونیورسٹی میں اپنی غنڈہ گردی کی وجہ سے بدنام تھا۔ بااثر باپ کا بیٹا تھا اس لیے سب اس سے ڈرتے تھے۔

میں نے اپنی گاڑی کاشف کے گھر کی طرف دوڑائی تاکہ اسے خبر کروں' پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے مگر میرے بدقسمتی یا زہرہ کی کہ اس کی پوری فیملی لاہور گئی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ دو دن بعد آئیں گے۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں دوسرے دن کا انتظار کروں۔ زہرہ یونیورسٹی آئے تو اس سے پورے حالات معلوم ہوں یا پھر میں کاشف کے دوستوں کی مدد سے اغوا کی رپورٹ درج کراؤں۔

دوسرے دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ زہرہ یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ میں کاشف کے دوستوں احسن اور جمشید سے ملی اور انہیں پورا واقعہ بتایا۔ نعیم کا نام سن کر وہ بھی ڈر گئے۔

''وہ تمہیں معلوم بھی ہے تم کس کا نام لے رہی ہو۔ نعیم کو جانتی ہو ہی؟''

''اگر نہ جانتی تو اس کا نام مجھے کیسے معلوم ہوتا۔''

''ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ خاموش رہو یا کم از کم کاشف کے آنے کا انتظار کرو۔''

''اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔ ہمیں زہرہ کے گھر والوں سے مل کر نعیم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانی ہے۔''

سوال یہ تھا کہ زہرہ کا گھر کہے معلوم ہے۔ اتنی دیر میں عاصمہ آ گئی۔ اسے زہرہ کا گھر معلوم تھا۔ اب احسن اور جمشید کی بھی ہمت ہو گئی۔ سب کو میں نے اپنی گاڑی میں سوار کیا اور زہرہ کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر دوسرا ہی منظر نظر آیا۔ زہرہ نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی ماں نے بتایا کہ وہ رات بھر غائب رہی تھی۔ صبح گھر پہنچی تھی میں پوچھتی ہی رہ گئی اور اس نے کمرا اندر سے بند کر لیا۔ میں نے کچھ خیال نہیں کیا لیکن مجھے یہ فکر برابر ستا رہی تھی کہ وہ رات بھر کہاں رہی۔ میں نے غصے میں آ کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تو میں نے محلے والوں کو بلا کر دروازہ تڑوایا۔ اس کے بعد ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دوسری عورتوں نے بتایا کہ زہرہ نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کی ہے۔

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی ماں کو پورا واقعہ بتایا اور ان پر زور دیا کہ وہ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیں اور اغوا کی رپورٹ درج کرائیں۔ ان کی حالت

ہرگز ایسی نہیں تھی کہ پولیس اسٹیشن جاتیں۔ زہرہ کی ایک خالہ کو ہم نے اپنے ساتھ لیا اور تھانے پہنچ گئے۔

نعیم ہم سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ یونیورسٹی کی حدود سے اغوا ہوا تھا۔ ہمیں اسی تھانے میں رپورٹ درج کرانی تھی۔ اس نے پہلے ہی وہاں جوڑ توڑ کرلیا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو کوئی رپورٹ درج کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ ہم نے کاشف کے والد کا نام بھی لیا لیکن رپورٹ درج نہیں ہوئی۔ اب مجبوری تھی کہ کاشف کا انتظار کیا جائے۔ شام ہی کو نعیم کا فون آگیا۔ وہ مجھے دھمکا رہا تھا کہ اگر میں نے اس کے نام کی رپورٹ کی تو وہ مجھے دیکھ لے گا۔ میں بھی کہاں دبنے والی تھی۔ اس کو کھری کھری سنائیں اور فون بند کردیا۔

کاشف دوسرے ہی دن آگیا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ رپورٹ درج نہ ہو۔ اس نے اپنے والد سے فون کرادیا اور ایف آئی آر درج ہوگئی۔

نعیم کو اغوا کرتے ہوئے میرے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اسے خطرہ تھا تو مجھ سے تھا۔ اگر میں اس کے خلاف بیان دیتی تو پھر اس کا بچنا محال تھا۔

نعیم کے باپ کو امید ہی نہیں تھی کہ ایف آئی آر درج ہوگی لیکن کاشف کے والد کی وجہ سے ہمیں اس میں کامیابی مل گئی تھی۔ پھر بھی نعیم کے والد کے تعلقات اتنے کام آئے کہ اس نے ضمانت قبل از گرفتاری کرالی۔

میں نمرہ کے ساتھ لائبریری کی طرف جارہی تھی کہ نعیم ہمارے سامنے آگیا ''ہاں مس افشاں آفریدی! کیا دیکھا تھا اس روز آپ نے؟''

''میں نے جو کچھ دیکھا تھا' عدالت کو بتاؤں گی۔ آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے؟'' میں نے کہا۔

''یہی سمجھانے آیا تھا آپ کو' آپ بھول جائیں کہ آپ نے کیا دیکھا تھا آپ عدالت نہیں جائیں گی۔''

''میں نے یہ ظلم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں چپ نہیں رہ سکتی۔''

''اگر آپ کو چپ کرادیا جائے تو؟''

''تمہارا جو جی چاہے کرو۔''

''دیکھو' تمہارے علاوہ کسی نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ اگر تم گواہی نہ دو تو میں صاف بچ جاؤں گا۔''

''اور وہ جو اپنی جان سے چلی گئی۔''

''آپ ہی اپنی سہیلی کو سمجھائیں کہ مجھ سے ٹکر نہ لے۔'' اس نے نمرہ سے کہا۔

''افشاں اس کی بات مان لو۔ زہرہ تو اپنی جان سے چلی گئی۔ اب وہ تو واپس نہیں آسکتی۔''

''نمرہ! ظالم کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ میں گواہی ضرور دوں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں ایک گھنٹا آپ کو دیتا ہوں۔ آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیں اس کے بعد آپ سے کوئی درخواست نہیں کروں گا۔''

وہ یہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ نمرہ بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ وہ مجھے بار بار سمجھا رہی تھی کہ میں نعیم کی بات مان لوں لیکن میں اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

ایک گھنٹا گزر گیا اور میں ابھی تک اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ کچھ دیر بعد نعیم اپنا جواب لینے آگیا۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں اس کے خلاف گواہی دوں گی۔ اس نے نہایت اطمینان سے میرا جواب سنا اور خاموشی سے پلٹ گیا۔

''افشاں' اس کی خاموشی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

''یہ بزدل میرا کیا بگاڑے گا۔ آیا تھا مجھے ڈرانے۔''

''اس کے باوجود تمہیں احتیاط کرنی چاہئے۔ تم کاشف سے کیوں نہیں ملتیں۔''

''وہ گھر بیٹھا اسٹڈی میں مصروف ہے۔ یونیورسٹی نہیں آرہا ہے۔''

''چلو اس کے گھر چلتے ہیں۔''

ہم دونوں اسی وقت کاشف کے گھر گئے اور اسے پوری بات بتائی۔ وہ بھی سن کر پریشان ہوگیا۔ پہلے تو اس نے یہ تجویز پیش کی کہ میں کچھ دن کے لیے اس کے گھر رہنے لگوں لیکن ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر اس نے فون پر اپنے والد سے بات کی۔

''ڈیڈی کہہ رہے ہیں تمہارے گھر پر دو گن مین والے بٹھادیں گے۔''

''میں کیا کبھی گھر سے باہر نہیں نکلوں گی۔''

''اس کا بھی کچھ انتظام ہوجائے گا۔ کچھ دن نہ نکلو پھر دیکھا جائے گا۔''

''ہونا تو یہ چاہئے کہ نعیم کو گرفتار کیا جائے۔ وہ دھمکیاں دیتا پھر رہا ہے' تمہارے والد جیسے پولیس افسر ہیں۔''

''ڈیڈی آئیں گے تو ان سے یہ بات بھی کروں گا' تم بے فکر رہو۔''

اس کی باتوں سے کچھ تقویت ملی اور میں گھر آگئی۔ شام کو دو پولیس والے آگئے جنہیں ہم نے گارڈ روم میں بٹھادیا۔ اب میرے گھر والوں کو بھی معلوم ہوگیا کہ کیا معاملہ ہے۔ عام

مفت کی پیتے تھے.....

چالیس سال قبل امریکا کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر 'لکی اسٹرائیک' نامی ایک سگریٹ کا اشتہار تواتر سے آیا کرتا تھا۔ اس اشتہار کی ماڈل جین سیکمن نامی ایک بے حد حسین لڑکی تھی جس کی عمر بائیس برس تھی۔ اس کی پرکشش شخصیت نے عوام کو اس قدر متاثر کیا کہ جین اور لکی اسٹرائیک ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوکر رہ گئے اور اس طرح وہ ''لکی اسٹرائیک گرل'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ پچاس کی دہائی کے آغاز میں لکی اسٹرائیک سگریٹ امریکا کا بے حد مشہور (اور اسٹرانگ) سگریٹ تھا جسے جین کی دلفریب شخصیت نے بام عروج پر پہنچادیا۔ اشتہاری مہم کے دوران وہ خود بھی سگریٹ نوشی کی عادی ہوگئی اور اگلے 33 سال تک سگریٹ پیتی رہی یہاں تک کہ 55 سال کی عمر میں گلے کے کینسر نے اسے آگھیرا اور پے درپے آپریشن سے اس کے پھیپھڑے اور VOICE BOX کا ایک بڑا حصہ ختم ہوگیا۔ جس سے اس کی آواز بھدی ہوگئی۔ باسٹھ سال کی عمر میں جین نے سگریٹ نوشی کے خلاف مہم کا بیڑہ اٹھایا۔ اس سلسلے میں اس نے ٹی وی، اشہارات ورسائل میں سگریٹ نوشی کے خلاف لیکچرز اور انٹرویوز دیے۔ اس طرح کے ایک انٹرویو میں اس نے کہا ''مجھے اس دن پر سخت پچھتاوا ہے جب میں نے لکی اسٹرائیک کا پہلا کش لیا اور اس سگریٹ کے اشتہار کی ماڈل بنی اور بے شمار نوجوانوں کو سگریٹ نوشی پر اکسایا۔ اب میں اپنی باقی عمر عوام کو سگریٹ نوشی کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد میں گزار کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں گی۔''

مرسلہ: مرزا احمد خان لاہور

حالات میں وہ بہت گھبرا جاتے لیکن انہیں معلوم تھا کہ کاشف کے ڈیڈی پولیس میں ہیں' میری پوری حفاظت کرسکتے ہیں۔ اس لیے وہ مطمئن تھے۔

رات کو کاشف اور اس کے ڈیڈی آگئے۔ انہوں نے تمام حالات کا بہ غور جائزہ لیا اور مجھے یہ خبر سنائی کہ وہ نعیم کی ضمانت منسوخ کرانے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ گرفتار ہوگیا تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں رہے گی۔

نعیم کے والد اتنے بااثر تھے کہ ضمانت منسوخ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ کاشف کے والد پولیس میں ہوتے ہوئے بھی بے بس ہوگئے تھے۔ اس کوشش میں انہیں ایک مہینا لگ گیا۔ کاشف کے اور میرے امتحان شروع ہوچکے تھے' امتحانوں کے بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی شادی کے بعد مجھے کاشف کے گھر میں رہنا تھا جہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اب اتنے دن گزر گئے تھے کہ نعیم کی دھمکیاں صرف دھمکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اسے کچھ کرنا ہوتا تو کرچکا ہوتا۔

آخری پرچا تھا۔ میں امتحان دے کر باہر نکلی۔ نمرہ میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر نمرہ اپنی گاڑی کی طرف چلی گئی میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگی' اچانک ایک گاڑی آئی میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ اس میں دو لڑکے بیٹھے ہیں۔ اس گاڑی سے فائرنگ ہونے لگی جس کا نشانہ میں تھی کئی گولیاں میرے بدن میں آگ بن کر اتر گئیں' میں بے ہوش ہوکر زمین پر گر گئی۔

لڑکیوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کوئی بھی گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ نہ کرسکا۔ مجھے اسپتال پہنچادیا گیا۔ فوراً میرے اور کاشف کے گھر والے اسپتال پہنچ گئے۔

کسی نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا لہٰذا نامعلوم افراد کے خلاف رپورٹ درج ہوئی۔ صرف شک کے طور پر نعیم کا نام درج کیا گیا۔ اس کے سوا میرا کون دشمن تھا لیکن اسے کسی نے نہیں پہچانا تھا حتیٰ کہ نمرہ بھی کسی کو نہیں دیکھ سکی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ نعیم نے اپنے آدمیوں سے فائرنگ کرائی ہو۔ وہ خود اس واردات میں شامل نہ ہو۔

جس وقت قاتلوں نے فائر کھولے تھے میں گاڑی میں بیٹھنے کے لیے سر اندر ڈال چکی تھی۔ اس لیے ساری گولیاں میرے نچلے دھڑ میں پیوست ہوئی تھیں۔ دو گولیاں ریڑھ کی ہڈی میں دھنس گئی تھیں۔ ڈاکٹروں کے نزدیک یہی گولیاں خطرناک ثابت ہوسکتی تھیں۔ میں زندگی بھر کے لیے معذور ہوسکتی تھی۔

میں اسپتال میں پڑی تھی اور اسپتال سے باہر کاشف کے ڈیڈی اور نعیم کے والد کے درمیان تعلقات کی جنگ چل رہی تھی۔ پولیس میرا بیان لینے آئی تھی۔ میں نے ظاہر ہے نعیم پر اپنا شک ظاہر کیا تھا لیکن محض شک کی بنیاد پر تو کسی کو سزا نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ گرفتار ہوسکتا تھا لیکن وہ معمولی باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ گرفتار ہوا لیکن دوسرے ہی دن واپس آگیا۔ اب مجھے یہ خطرہ تھا کہ میں بچ گئی ہوں' وہ میری جان لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میرے کمرے میں پولیس کا پہرا تھا لیکن مجھے

اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ جب تک کاشف میرے پاس بیٹھا رہتا تھا میں مطمئن رہتی تھی لیکن اس کے جاتے ہی طرح طرح کے اندیشے دل میں جنم لینے لگتے تھے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ کاشف کے والد کا ٹرانسفر اندورن سندھ کردیا گیا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ دشمنوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔

میں تقریباً چھ مہینے تک اسپتال میں رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپاہج ہوگئی۔ میرا نچلا دھڑ بے کار ہوگیا تھا۔ میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اب مجھے ہوں پوری زندگی وہیل چیئر پر گزارنی تھی۔ میں گھر منتقل کردی گئی۔ کاشف پر مجھے اب بھی بھروسا تھا۔ وہ تقریباً روز مجھے دیکھنے آتا تھا' میری ہمت بھی بڑھاتا رہتا تھا۔ نمرہ تو بیشتر وقت میرے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

انہی دنوں زہرہ کے اغوا کا مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔ عدالت نے گواہی کے لیے مجھے طلب کیا۔ نمرہ کا اب بھی یہی کہنا تھا کہ میں نعیم کے خلاف گواہی نہ دوں لیکن اب میرے پاس رہا کیا تھا جو بچاتی۔ اب مجھے اپنی جان کی بھی فکر نہیں تھی۔ معذوری کی زندگی سے تو یہی بہتر تھا کہ نعیم آئے اور مجھے قتل کردے، کاشف نے بھی میرا ساتھ دیا اور میں عدالت پہنچ گئی۔ میں نے وہی کہا جو میں نے دیکھا تھا۔ میرے علاوہ کوئی اصل واقعے کا عینی شاہد نہیں تھا۔

مجھے امید تھی کہ میرے بیان کے بعد کوئی طاقت نعیم کو نہیں بچا سکے گی۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کر کے ایک اور گواہی اس نے اپنے خلاف پیدا کرلی تھی۔ یہ مقدمہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔ افسوس یہ ہے کہ میں زہرہ کا بدلہ نعیم سے نہیں لے سکی۔ اس پر الزام ثابت نہ ہوسکا اور عدالت نے اسے بری کر دیا۔

ادھر کاشف نے بھی مجھے مایوس کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ پہلے تو روز مجھ سے ملنے آتا تھا لیکن پھر وقفے آنے شروع ہوگئے۔ وہ ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد آتا تو بجھا بجھا سا نظر آتا جیسے اب اس کی دلچسپیاں کم ہونے لگی ہوں۔

میں نے نمرہ سے ذکر کیا تو اس نے سر جھکا لیا ''افشاں' میں تجھے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تجھے تکلیف ہوگی۔ کاشف اب پھر سے عاصمہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ عاصمہ ہر جگہ اس کے ساتھ نظر آرہی ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے میری غلط فہمی ہو۔ تم خود کاشف سے بات کر کے دیکھ لو۔''

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کاشف سے بات کروں کہ ایک دن کاشف کے والدین ہمارے گھر آگئے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر آتے تھے۔ میں خوش بھی ہوئی کہ کاشف کو نہ سہی اس کے بڑوں کو تو میرا خیال ہے۔

چائے وغیرہ کے بعد کاشف کی ممی میری ممی کو الگ لے گئیں۔ اس کے بعد میں نے بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ جب وہ دونوں بات کر کے کمرے سے نکلیں تو بھی میں خوش تھی۔

وہ لوگ چلے گئے تو میں نے ممی سے پوچھا ''کیا کہہ رہی تھیں آنٹی؟' جواب دینے کے بجائے ممی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ منگنی توڑ کر چلی گئی ہیں۔

''اس میں کاشف کی مرضی کو دخل نہیں ہوگا۔ اس نے تو اپنی زندگی بے کس' مظلوموں کے لیے وقف کردی ہے۔ وہ بے سہارا لوگوں کی مدد کرتا ہے اور اس وقت مجھ سے زیادہ بے سہارا کون ہے۔''

''وہ کہہ رہی تھیں' خود کاشف نے انہیں بھیجا ہے۔''

''جھوٹ کہہ رہی تھیں وہ' میں ابھی کاشف کو فون کرتی ہوں۔''

میں نے فون کیا تو اتفاق سے کاشف ہی نے فون اٹھایا ''کاشف تمہاری ممی آئی تھیں کیا تم نے انہیں بھیجا تھا؟''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر کاشف کی آواز آئی ''افشاں' برا مت ماننا۔ میں کسی معذور لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔''

''تم تو ہمدردی کا پیکر بنے پھرتے تھے۔ اب کیا ہوگیا۔ میں نے تمہارے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے یہ چوٹ کھائی ہے۔ کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرو گے کہ مجھے اپنا لو۔ کیا وہ سب ڈھونگ تھا' نمائش تھی جسے دکھانے کے لیے تم کچی بستیوں میں جاتے تھے؟''

''میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں جس کی تمہیں ضرورت نہیں لیکن تم سے شادی نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی بھی مجھے فون کرسکتی ہو۔'' اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں سوچ رہی تھی کہ نیکی کی راہ پر چلنا کتنا مشکل ہے۔ ہمدردی کے کیسے گیت گائے جاتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو سب پیٹھ دکھا جاتے ہیں۔ اجنبیوں کو سڑک پار کرانے والا میرا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں۔ کہاں گئی اس کی خیر خواہی۔

کاشف نے عاصمہ سے شادی کرلی ہے۔ اب تو مجھے کسی خیر خواہ کا انتظار بھی نہیں۔ پہلے میں غریبوں سے نفرت کرتی تھی' اب تو مجھے محبت کرنے والوں سے بھی نفرت ہے۔

لمحۂ قاتل

تحریر : یمنیٰ احمد

مکرمی ایڈیٹر صاحب، آداب عرض۔

یہ واقعہ بہت عرصے پہلے کا ہے اور میں نے سوچا تھا کہ اسے اپنے تک ہی محدود رکھوں۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ جب شہر میں حالات کی ذرا سی بہتری کے بعد پھر سے جو تشدد کی نئی لہر اٹھتی ہے شاید اس کی وجوہات میں سے ایک یہ حقیقت بھی ہو جو سلیم نے مجھے سنائی تھی اور جو ہماری نئی نسل کے لیے باعث عبرت بھی ہو۔ خدا ہمیں اور ہمارے بچوں کو ایسے حالات سے محفوظ رکھے۔ مگر ایسا ماحول قائم رکھنے کے لیے ہمیں ہمت عقل اور تحمل سے کام لینا پڑے گا۔

آپ کی خیریت کا طالب

زوہیب انصاری۔ کراچی

''میری نظر میں بڑی عجیب چیز بنایا ہے اللہ نے انسان۔ آرام سے رہ ہی نہیں سکتے تم لوگ۔ سچ سچ کی رٹ لگاتے ہو اور سچ بھی کچھ سدھار نہیں پاتے۔ جھوٹ میں ہی غوطہ زن رہتے ہو۔''

''نہ نہ ایسا نہ کہو شہریار! ایسا نہیں ہے' تمہیں کیا خبر ہم لوگ کس آگ میں جلتے ہیں' تب کہیں جا کر دو چار سطریں لکھ پاتے ہیں اور یہ بات بھی غلط ہے تمہاری کہ ہم معاشرے کو سدھار نہیں پاتے۔ ارے یار! تم کیا جانو کہ ہمارے یہ دو چار سچ کڑوے الفاظ بعض اوقات سوچوں میں انقلاب کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔''

میں اس وقت اپنے بچپن کے دوست شہریار کے ساتھ اس تھانے میں بیٹھا تھا جہاں وہ بحیثیت ایس ایچ او کے تعینات تھا اور ہم ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک دوسرے کے ساتھ بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ اس نے ہر بار کی طرح اس بار بھی میری بات سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا اور میری دانست میں اس نے میری باتوں کا مذاق اڑانے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے بھی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھا اور سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں شہریار' کہ تم بظاہر میرا مذاق اڑاتے ہو لیکن دل سے میری باتوں کی سچائی سے انکار نہیں کرسکتے۔

میں لکھاری ہوں اور جو موضوع مجھے بے سکون کرتا ہے' صرف اسی پر قلم اٹھاتا ہوں۔''

''جانتا ہوں' جانتا ہوں یار! کیوں دل پر لیتا ہے میری باتوں کو۔ مجھے معلوم ہے' تو کس چکر میں میرے پاس آتا ہے۔ شاید تجھے پھر سے کسی اچھوتے موضوع کی تلاش ہے جس پر تو اپنے قلم کا وار کر سکے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں' بڑی بے چین روح بنائی ہے اللہ نے تم ادیبوں کو' ہر وقت کھوج میں لگے رہتے ہو۔ چل چلتے ہیں۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے بات کر لی تھی' جیل چلتے ہیں۔ میں بھی ان سے بات کر لوں گا اور تو بھی اپنے مطلب کا موضوع منتخب کر لینا' اوکے!''

''اوکے' تھینک یو یار! یو آر واقعی گریٹ.....''

میں نے گرم جوشی سے گھڑے ہو کر شہریار کو پکڑ کر گلے لگا لیا اور ہمارا مشترکہ قہقہہ اس کے کمرے میں گونج گیا۔ مگر باہر نکلتے ہی ہم دونوں ایک دم چونک گئے۔ وہاں ایک لڑکی ملتجیانہ انداز میں دہائیاں دے رہی تھی۔ ہم نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ شہریار آواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی ہمارے قریب آ گئی۔ وہ روتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی: ''انسپکٹر صاحب! میرا بھائی بے قصور ہے' خدا کے لیے میرا یقین کریں۔ ذیشان بالکل بے قصور ہے۔ وہ ڈائن خود میرے بھائی کے پیچھے پڑی تھی۔'' شہریار نے ایک ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ ''دین محمد! یہ عورت کیا کہہ رہی ہے؟ کس لیے آئی ہے یہ؟''

اس کا مخاطب اے ایس آئی دین محمد تھا۔ اس نے شہریار کو ذیشان نامی لڑکے کے بارے میں کچھ تفصیلات سے آگاہ کیا۔ بہرحال شہریار نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور اس لڑکی سے چند ضروری باتیں کر کے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور میرے ساتھ تھانے کی حدود سے باہر نکل آیا۔ پھر میری جانب فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ''جی مسٹر زیب انصاری! کیسے کچھ کریڈٹ ہم بے چاروں کو بھی جاتا ہے نا' معاشرتی سدھار کی کوششوں میں یا نہیں؟ یہ موصوف ذیشان صاحب آوارگی کے بڑے عادی ہیں۔ مزاج کی یہ آوارگی انہیں راہ سے بھٹکا رہی ہے اور بے چاری بہن اسے معصوم اور بے قصور سمجھ رہی ہے۔''

''بس..... یہی تو المیہ ہے ہمارا..... بہرحال ہم تو جہاد پر ہیں۔ تم اپنے قانون کے ذریعے اور ہم اپنے قلم کے ذریعے۔'' میں نے مختصراً جواب دیا کیونکہ اب میں مزید کسی نئی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

میں اپنے بارے میں بتاتا چلوں کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ یہ میرا پیشہ نہیں ہے بلکہ میرا شوق ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ لکھنے کے جراثیم جب مجھے بہت زیادہ بے چین کرنے لگتے ہیں تو کچھ نہ کچھ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ شہریار میرا بچپن کا دوست ہے۔ بڑے ہو کر اس نے قانون کا پیشہ اختیار کیا اور میں نے انجینئرنگ کی ڈگری لے لی۔ میرا پیشہ سن کر بہت سے لوگوں نے کہا کہ ایک انجینئر بھلا رائٹر کیسے ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ ایک رائٹر انجینئر نہیں بن سکتا اور میں ہمیشہ ہنس کر یہی کہتا ہوں کہ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے دوستو!''

☆☆☆

''یار شہری!'' بڑا خوفناک چہرہ ہے اس کا۔ لگتا ہے' کوئی بہت ہی خطرناک مجرم ہے؟'' ایک قیدی میری طرف دیکھ کر مسکرایا تو میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

اس کا چہرہ واقعی بڑا خوفناک تھا' کالا رنگ' بڑی بڑی سرخ آنکھیں اور ہونٹوں پر نوک دار لمبی لمبی مونچھیں۔ اس کے چہرے کے دائیں جانب گہرے زخم کا ایک عمودی نشان بھی تھا' جیسے کسی نے خنجر کا وار کر دیا ہو۔ مجھے یہ زخم کوئی بہت زیادہ پرانا نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اس پر ہلکے براؤن رنگ کا کھرنڈ سا آ رہا تھا۔ وہ میری ہی طرف بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہم اس وقت سینٹرل جیل میں تھے۔ میری بات سن کر شہریار نے بھی تصدیق کر دی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو زیب' یہ واقعی بڑا خطرناک قیدی ہے۔ اس نے یہاں بھی اپنی دہشت کا خوب مظاہرہ کیا ہوا ہے۔ اس پر تو حکومت نے انعام رکھا ہوا تھا۔ کمبخت بڑی مشکل سے گرفتار ہوا ہے۔''

میرا ذہن نہ جانے کیوں اس قیدی میں الجھ سا گیا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں کچھ کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھیں۔ میں دراصل قیدیوں کے بارے میں آرٹیکل لکھنا چاہتا تھا اور اسی مقصد سے شہریار کی مدد لے کر سینٹرل جیل کا دورہ کرنے آیا تھا۔ میں نے اپنے مطلوبہ پوائنٹ کا بغور مشاہدہ کیا۔ میں نے ایک بار پھر اس قیدی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس وقت بھی میری طرف تھیں۔

شہریار نے جیل افسران سے میرا تعارف کرایا اور میرے مقصد کا بھی ذکر کیا۔ ہم فارغ ہو کر باہر آنے لگے کہ ہمارے قدم ایک اجنبی آواز پر تھم گئے۔

''نئی کراچی گلی نمبر 18' مکان نمبر 123 کالی مارکیٹ کا اندرونی بازار۔ زیب انصاری عرف زیبو بھیا!'' کوئی مجھے میرے پرانے ایڈریس اور نام سے پکار رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا تو وہی خونخوار چہرے والا قیدی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی خوف زدہ سا ہو گیا تھا مگر پھر اگلے ہی لمحے سنبھل کر پوچھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ کہ

ے زمیں بدلے زماں بدلے' زمانے کی ہوا بدلے
ظفر سب کچھ بدل جائے' نہ قسمت کا لکھا بدلے

یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں زیب بھائی کہ آپ اتنے مشہور رائٹر بن گئے اور میں..... میں یہاں ''آرام'' فرما رہا ہوں۔''

آخری جملہ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ شہریار خلاف توقع اس وقت بالکل انجان بنا کھڑا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ بھی بہت حیران ہو رہا ہے۔ چوکنا کھڑا تھا۔ اب میرے اندر تجسس نے جنم لیا تھا۔ میں مزید دو قدم بڑھا کر اس قیدی کے قریب آ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس قیدی کے لہجے میں بڑی اپنائیت اور عزت تھی میرے لیے۔

''میں سمجھا نہیں تھ..... تم کہنا کیا چاہتے ہو آخر؟'' تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

''ہاہاہا..... اس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور بولا۔

''آپ کو کون نہیں جانتا زیب انصاری صاحب! لیکن میں تو زیبو بھائی کی بات کر رہا تھا جو مجھے ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے' بچپن میں۔''

''تم..... تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟''

''حیرت ہے..... آپ کی طرح آج مجھے بھی زمانہ جانتا ہے تو آپ کیوں نہیں جانتے..... مجھے واقعی حیرت ہے۔ ویسے مجھے سالما کہا جاتا ہے۔''

اس نے میرے تجسس کو مزید ہوا دیتے ہوئے اصل حقیقت اب بھی چھپالی تھی اور اسی انداز نے میرے اندر اس کے لیے مزید جاننے کی بے تابی پیدا کر دی تھی۔ میں نے ذہن پر زور ڈال کر ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن مجھے اب بھی کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

''مگر میں نے کسی بھی سالما کو کبھی نہیں پڑھایا۔''

''کیا کریمو چاچا کو بھی بھول گئے جو درزی ہوا کرتے تھے..... اور..... اور ان کے بیٹے' کو بھی بھول گئے' جو بڑی شرارتیں کرتا تھا؟''

''کریمو..... چاچا..... درزی..... ان کا بیٹا.....''

میں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے ایک بار پھر ماضی میں جھانکا تو اچانک بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ ''کہیں..... کہیں تم..... تم سلیم تو نہیں ہو؟''

میں نے بے اختیار کہا تو اس قیدی کے چہرے پر بھی بے اختیار مسکراہٹ رینگ گئی' جس سے اس کا چہرہ مزید دہشت ناک لگنے لگا۔ لیکن جیسے ہی ماضی کا وہ سارا دور میری نگاہ میں گھوما' جب وہ ایک معصوم سا شرارتی بارہ سالہ بچہ ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ہم لوگ بھی اسی علاقے میں رہا کرتے تھے۔ سلیم نے مجھے چونکانے کے لیے میرا نام اور پرانا پتا دہرایا تھا۔ میں اس وقت کئی بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھایا کرتا تھا تاکہ اپنے تعلیمی اخراجات نکال سکوں۔ پھر جب ہمارے حالات ذرا بہتر ہوئے تو والد صاحب نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور پھر زندگی اتنی مصروف ہو گئی کہ کبھی پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے یا سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مگر اب میں اس کے بارے میں مزید جاننے کے لیے بے تاب سا ہو گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں جس اچھوتے موضوع کی تلاش میں تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔

میں جلد از جلد یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایک معصوم سے طالب علم نے یہاں تک کا خطرناک راستہ کس طرح طے کیا۔ میں نے شہریار کو اشارہ کیا کہ ''میں کچھ دیر اکیلے میں اس سے

قد میں اضافہ ممکن ہے

آپ خواہ مرد ہوں یا عورت اپنے پستہ قد میں مزید اضافہ کر کے اپنی شخصیت کو خوبصورت اور پُروقار بنانے کے لئے ہمیں اپنے موجودہ قد کی پیمائش اور عمر کی تفصیل ہمراہ جوابی لفافے کے بھیجیں اور مفید معلومات حاصل کریں۔

نوٹ: بیرونِ ملک سے لکھنے والے خط رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ فرمائیں۔

KAYBEE HOME

پوسٹ بکس نمبر 2535 - کراچی 74600

باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

شہریار نے اگرچہ مجھے اجازت تو دے دی تھی مگر فکرمند سا ہو کر وہ آفس کی جانب چل دیا تھا۔ میں سلیم عرف سالما کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم نے کیا حالت بنالی ہے سلیم! میں نے تمہیں ایک طالب علم کی حیثیت سے چھوڑا تھا اور آج تم ایک خطرناک دہشت گرد کے روپ میں سامنے آئے ہو۔ ایسا ظلم کیوں کیا تم نے اپنے ساتھ؟ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم وہی سلیم ہو جسے علم سے بے تحاشا پیار تھا۔ تم تو بہت ذہین اور شریف ہوا کرتے تھے پھر تم نے یہ تباہی کی راہ کیسے اختیار کر لی؟ کیا کریمو چاچا جانتے ہیں کہ تم یہاں ہو؟"

"کریمو چاچا کا پانچ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے زیبو بھائی۔" سلیم نے بڑے کربناک لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کیا مجھے بتانا پسند کرو گے؟..... اپنے حالات کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟"

"تاکہ آپ اپنے قلم کا پیٹ بھر سکیں! ڈر لگتا ہے آپ لکھاری لوگوں سے۔ کہیں بھی کچھ بھی لکھ دیتے ہیں" اس نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے پہلو بچانا چاہا تو میں نے بھی نفسیاتی حربہ آزمانے کی کوشش کی۔ "اگر میں صرف ایک لکھاری ہوتا تو تمہاری یہ بات جائز تھی لیکن میں تمہارا استاد بھی ہوں اور پھر ابھی خود ہی تم نے مجھے بھیا کا بھی درجہ دیا ہے۔ اس لیے میرا حق بن جاتا ہے تمہارے بارے میں جاننے کا۔ اگر چاہو تو بتا دو، اچھا ہے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"بس ایک لمحہ..... ایک لمحہ تھا وہ..... کیا بتاؤں، بس ایک ہی تو لمحہ تھا وہ۔ کاش....." سلیم شاید خود کلامی کا بھی عادی تھا اور اس وقت بھی وہ خود سے ہی ہم کلام تھا۔ بہت پچھتاوا تھا اس کے لہجے میں۔ نہ جانے کیا تھا اس ایک لمحے میں؟ اگرچہ میرا تجسس جلد از جلد سب کچھ جان لینے کے لیے بے تاب تھا لیکن میں ایک لکھاری ہونے کی حیثیت سے انسان کی نفسیات کو بھی جانتا تھا۔ خاص طور سے مجرمانہ نفسیات بڑی پیچیدہ ہوتی ہے جو صرف اپنی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کاش زیبو بھیا! اس لمحے کو میں واپس لا سکتا..... یا کاش اس ایک لمحے میں خود کو کنٹرول کر لیتا۔"

"اگر چاہو تو اپنے زیبو بھیا کو بتا دو سلیم۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔"

"ہونہہ..... بہتری..... اور میرے لیے۔ ناممکن، زیبو بھیا! ناممکن۔" اس نے ایک بار پھر جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ناامیدی کا اظہار کیا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے میں بار بار اور تھرل سے بھرپور کوئی انگلش موویز دیکھ رہا ہوں مگر یہ فلم نہیں بلکہ ایک سچی حقیقت تھی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے تسلیم کرنا پڑ رہا تھا۔ میں چونکہ کافی مشہور شخصیت بن چکا تھا اور یہ بھی اب میں انکار نہیں کر سکتا تھا کہ سلیم بھی اب شہرت پا چکا تھا بدنام زمانہ دہشت گرد "سالما" کی حیثیت سے۔ مجھے کسی شاعر کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔"

بہرحال مجھے سلیم نے پھر آنے کو کہا اور میں چلا آیا۔ لیکن مجھے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا مگر مجھے اب ایک ہفتے بعد اس سے ملاقات کے لیے جانا تھا اور اپنے اس کمٹمنٹ سے میں نے شہریار کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے بھی اپنے اطمینان کی خاطر مجھ سے چند ضروری سوالات پوچھے اور مجھے محتاط رہنے کی تاکید بھی کی۔ آخر کار وہ پہلے میرا دوست تھا، بعد میں پولیس آفیسر تھا۔

ایک ہفتے بعد میں وعدے کے مطابق سلیم کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت ہم آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے۔ وہ جاننا تھا کہ میں اس کی کہانی کے جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ اسی لیے وہ خود ہی موضوع پر آ گیا تھا۔ اس کی کہانی اب میں اس کی زبانی آپ کو سناؤں گا۔ تاکہ تمام جزئیات کا تقاضا پورا ہو سکے۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں وہ یہ تھیں۔

"یہ تو آپ جانتے ہی تھے کہ ہم گھر میں تیرہ افراد تھے اور اماجی بہت کمزور، بوڑھے ہو چکے تھے۔ آپ کے سامنے بڑے بھائی کی شادی تو ہو چکی تھی، کچھ عرصے بعد چھوٹے بھائی کی بھی شادی ہو گئی۔ مگر اب گھر میں عجیب طرح کی جنگیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ چھوٹے بھیا صائمہ باجی کو یونیورسٹی چھوڑنے جاتے تھے لیکن جب چھوٹی بھابی آئیں تو انہیں چھوٹے بھیا کا صائمہ باجی کو یونیورسٹی چھوڑنے جانا زہر لگنے لگا۔ صائمہ باجی کے بی اے آنرز کا آخری سال تھا بلکہ اب تو امتحانات بھی نزدیک ہی آ چکے تھے۔ ہر روز صبح چھوٹی بھابی کے لڑنے کی آوازوں سے آنکھ کھلتی تھی اور میں صائمہ باجی کو روتے دیکھتا تھا۔ میرا خود بھی بی اے پارٹ ون چل رہا تھا، تو بے چارے مجبور تھے۔

آپ نے جب وہ محلہ چھوڑا تھا اس کے تین سال بعد اماں کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ہمارا گھر اب دونوں بھائیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی دو بہنیں اور مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور تین بہنیں اور تھیں۔ جہاں اتنا بڑا کنبہ ہو

اور وہاں کے سرپرست اتنے کمزور ہوں یا سرپرست موجود نہ ہو تو تباہی و بربادی وہاں کا راستہ دیکھ لیتی ہے۔ مجھ سے روز روز کی کل کل برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ صائمہ باجی نے ایک دن کہہ دیا کہ میں اب اور نہیں پڑھ رہی۔ اگر بھابی کی یہی خوشی ہے تو یہی سہی۔ مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ صائمہ باجی نے ایک طرف تو پورا گھر سنبھالا ہوا تھا اور دوسری طرف ماسٹر کرنا ان کا خواب تھا۔ ایسے میں اگر بھیا اور بھابی رکاوٹ بن رہے تھے تو میرا فرض تھا کہ میں اپنی بہن کا ساتھ دیتا اور میں نے یہی کیا۔ اب میں نے صائمہ باجی کو لانے لے جانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی لیکن اب مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ بھیا کی موٹر سائیکل میرے تصرف میں رہنے لگی تھی اور بھابی کو یہ بات اور بھی تکلیف دے رہی تھی۔ وہ اس بات پر اب مزید چراغ پا رہنے لگیں۔ بات بات پر طعنے دیتیں۔ یہ ہمارے لیے آزمائش کا کڑا وقت تھا۔

اس دن بھی جب میں گھر میں کھانا کھانے آیا تو بھابی نے مجھے بیٹھ کر کھانے کے طعنے دیے اور جب چھوٹی بہن گڑیا نے روتے ہوئے میرے آگے کھانا لا کر رکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ خاموشی سے اٹھ کر میں نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور باہر آنے لگا تو گڑیا نے میرا راستہ روک لیا۔ "بھائی! صبح بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا، اب بھی بھوکے پیٹ جا رہے ہو!"

"ہٹ جا گڑیا! بس بھوک نہیں لگ رہی۔" میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کے روکنے کے باوجود باہر نکل آیا۔ جانتا تھا کہ اگر ایک لفظ بھی بولا تو گھر میں طوفان آ جائے گا، جس کی زد میں میری بہنیں اور بوڑھا باپ ہی آئیں گے۔

باہر نکل کر میں نے آستین سے آنسو پونچھے اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے صائمہ باجی کو لینے چل دیا۔ انہیں لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ مجھے ایک جگہ فون کرنا تھا۔ میں نے باجی سے کہا کہ "باجی! میں نے ایک جگہ ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔ خیال نہیں رہا، صبح ہی وہاں فون کرنا تھا۔ آپ ٹھہریں میں سامنے سے فون کر کے آتا ہوں۔" میں نے ایک پی سی او کے پاس گاڑی روکی اور اندر جا کر بات کرنے لگا۔ تین چار منٹ بعد جب میں باہر نکلا تو دیکھا صائمہ باجی بڑی ہراساں سی کھڑی تھیں اور ان کے گرد چار اوباش قسم کے لڑکے کھڑے تھے۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میری غیرت جوش میں آ گئی۔ میں نے انہیں کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے باجی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے باجی! کون ہیں یہ لوگ؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں مگر تم چلو یہاں سے۔"

باجی نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تو مجھے لگا، باجی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ وہ مجھے گاڑی کی جانب دھکیل رہی تھیں۔ "چلو سلیم! پلیز..... یہاں سے نکل چلو۔ آج کل زمانہ ہی کچھ ایسا ہے، ان کے منہ نہ لگو۔"

"کہاں لے جا رہی ہو شہزادی اپنے شہزادے کو۔ ابھی تو ہم سے ملاقات بھی....."

"بکواس بند کرو..... یہ میرا بھائی ہے۔" ان اوباشوں میں سے ایک نے پھبتی پورے انداز میں کہا تو باجی چلا اٹھیں۔ مجھے بھی اس کی بکواس سن کر شرمندگی سی ہوئی۔ میں غصے میں ان کی طرف بڑھا تو باجی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"میں نے کہا نا بے غیرتوں کے منہ مت لگو۔ چلو یہاں سے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو قابو میں کیا اور باجی کا خیال کرتے ہوئے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لی۔ ابھی باجی بیٹھ ہی رہی تھیں کہ ان میں سے وہی لڑکا آگے بڑھا اور باجی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ "کمال ہے، ہمیں بے غیرت بھی کہتی ہو اور ہماری بے غیرتی دیکھے بغیر ہی جا بھی رہی ہو۔"

"تو واقعی بے غیرت ہے۔ کتے کے بچے!" بس یہی وہ ایک لمحہ تھا جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ میں نے موٹر سائیکل چھوڑی اور اس پر جھپٹ پڑا، جس نے باجی کو اپنا ناپاک ہاتھ لگایا تھا۔ بس پھر کیا تھا، باجی روتی رہ گئیں، مجھے روکتی اور چلاتی رہ گئیں۔ وہ چاروں مجھ پر پل پڑے۔ پھر وہاں موجود کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ ان میں ایک لڑکے کا گھر دیبی تھا۔ کیونکہ اس کی والدہ بھی نکل آئی تھیں۔ وہ شاید جانتی تھیں اپنے بیٹے کی فطرت کو۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے ان کے دام سے چھڑایا۔ میرے کافی زخم آ گئے تھے۔ باجی نے روتے ہوئے اپنی چادر سے میرے زخموں سے خون صاف کیا اور پھر ہم کس طرح گھر پہنچے مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیونکہ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ اس نے میری بہن کی طرف ہاتھ کیوں بڑھایا، کیوں انہیں چھوا؟ میرا بس چلتا تو میں اس کے ہاتھ کو توڑ دیتا لیکن چونکہ لڑنا میری فطرت میں شامل نہیں تھا اس لیے اس سے پہلے مجھے ایسا کوئی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔

شام کے وقت میری ملاقات اپنے دوستوں سے ہوئی۔ انہوں نے میری حالت دیکھی تو حیرت اور دکھ کا اظہار کیا۔ میرے دوست ظفر اور توقیر کے ساتھ اس وقت دو لڑکے اور

تھے جن سے اکثر میری بھی سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔ لہٰذا میں نے بلا جھجک تمام صورت حال سے انہیں آگاہ کر دیا۔ تو قیر نے تو مجھے درگزر سے کام لینے کا کہا لیکن ظفر نے مجھے انتقام لینے پر اکسایا اور ساتھ میں اس کے دونوں دوستوں نے بھی بھرپور حمایت کی اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین بھی دلایا۔ اس وقت میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ ایک طرف گھر کی پریشانی تھی۔ دوسری جانب آج کے واقعے نے میرا ذہن بالکل ماؤف کر دیا تھا۔

میں نے اور باجی نے گھر میں بالکل اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ڈر تھا کہ بھائی اور بھابیاں ہمیں مزید طعنوں کا نشانہ بنائیں گے اور باجی کی تعلیم پھر ادھوری رہ جائے گی۔ بس میں نے اپنے دوستوں کی ہمدردی پاکر ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ تو قیر کو کوئی کام پڑ گیا اور وہ مجھے ایک بار پھر سب کچھ بھول جانے کی تاکید کر کے چلا گیا لیکن ظفر اور اس کے دونوں دوستوں شاہد اور ذاکر نے بار بار پھر سے مجھے ان لڑکوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے اکسایا۔ مجھ پر تو اس لڑکے کو مارنے کا جنون سوار تھا ہی لیکن اب شہ پاکر میرے جنون کو مزید جلا ملی اور میں نے اسی رات اس پر حملہ کرنے کا سوچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ ساتھ وہ لڑکے مزید اپنے دوستوں کو لے آئے اور ہم چھ سات لڑکے ایک گاڑی میں بھر کر اس محلے میں چلے گئے جہاں یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ اتفاق سے اوباش لڑکوں کا وہی گروپ ہمیں وہیں گلی کے کونے پر ہی مل گیا۔ انہوں نے جیسے ہی مجھے پہچانا اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم تعداد میں ان سے زیادہ تھے لہٰذا ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

چلتے ہوئے مجھے شاہد نے ایک عدد چھوٹا سا پستول بھی دے دیا تھا یہ کہہ کر کہ ''یہ بھی رکھ لے یار! انہیں ڈرانے دھمکانے کے کام آئے گا۔'' اور میں نے دیکھا تھا کہ اس نے بھی ایک ریوالور اپنی خفیہ جیب میں رکھ لیا تھا۔

مار پیٹ کے دوران میں ان لڑکوں میں سے ایک نے فائر کر دیا تھا جس کا نشانہ بالخصوص میں تھا۔ گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور لوگ بھاگنا شروع ہو گئے۔ میں نے بھی جنون میں پستول نکال لیا اور بے اختیار فائر کر دیا۔ مجھے ایک دوسری گولی چلنے کی بھی آواز آئی اور گولی بھاگتے ہوئے مخالف گروپ کے ایک لڑکے کے سر میں لگی جو زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ ہمارا پورا گروپ بھی فوراً وہاں سے بھاگ نکلا۔ میرے بازو سے خون رس..... رہا تھا لیکن مجھے لگا کہ اسی جنوں خیزی میں میرے ہاتھوں سے ایک قتل ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکا مر چکا ہوگا مگر مجھے یہ حیرت بھی تھی کہ دوسری گولی کس نے چلائی تھی۔ مجھے تو یہی یقین تھا کہ اس لڑکے کو میری ہی گولی لگی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرے ہاتھوں سے کبھی خون بھی ہوگا۔ مجھے شاہد اور ظفر ایک خفیہ جگہ پر لے آئے تھے۔ اگلے دن اخبار میں خبر چھپی تھی کہ نامعلوم دہشت گردوں کی فائرنگ سے ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ ساتھ ہی اس متوفی کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ شاہد اور ظفر نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وہ میری ہی گولی سے مرا تھا اور اب یقیناً پولیس میرے پیچھے ہوگی اور میں پکڑا گیا تو پھانسی کی سزا ہوگی۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود کو پولیس کے حوالے کروں یا نہ کروں اور پھر یہ بھی کہ میرے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ میری بہنوں کی بدنامی ہوگی اور پھر ان سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ میری وجہ سے میری بہنوں کے گھر نہیں بس پائیں گے۔

میں نے اپنے دوست ظفر سے مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ تمام دنیا تیری بہنوں کو قاتل کی بہنیں اور بوڑھے باپ کو قاتل کا باپ کہے گی لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تو کچھ دن یونہی شاہد کے ساتھ یہاں چھپا رہ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے لیکن آگے کچھ بھی کرنے سے پہلے ہی شاید میری تقدیر نے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔

''ایک ہفتے تک تو مجھے ان لوگوں نے چھپا کر رکھا لیکن کب تک۔ میرے گھر والے الگ پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ ظفر نے مجھے یہی بتایا تھا کہ گھر میں سب ٹھیک ہے لیکن سب ٹھیک نہیں تھا۔ ادھر جب میں نے شاہد سے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں تو اس کا اصل رنگ مجھے نظر آیا۔ وہ کمرہ مسکراہٹ سے بولا ''جانو! جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ مت بھولنا کہ تم ایک قاتل ہو اور ہم اس راز سے واقف ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے یار..... جرم وہ دلدل ہے جس میں صرف ایک بار پاؤں جاتا ہے' چاہے پھسل کر ہی کیوں نہ جائے' پھر باہر نہیں آتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو..... کیا میں ہمیشہ یہیں رہوں؟''

واقعی اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں الجھ کر بولا تو اس نے بڑے ہی تسلی آمیز انداز میں اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک آفر ہے یار تیرے لیے میرے پاس..... اگر

قبول کر لی تو نہ صرف تیری بلکہ تیرے گھر والوں کی بھی زندگی بن جائے گی۔''

''کیسی آفر.....؟ کھل کر بات کرو۔''

''ہمارے گینگ میں شامل ہو جا اور اوپر سے جو آرڈر آئے اس کی تعمیل کرتا جا۔''

''مثلاً.....؟'' میں اب کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ اس کا تعلق کن لوگوں سے ہو سکتا ہے اور یہ کہ وہ مجھ سے اب کیا کام لینا چاہتا ہے یا اس کے اوپر والے کیا چاہتے ہیں' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''مثلاً کارلفٹنگ' ڈاکے' قتل' فائرنگ اور..... دھماکے' وغیرہ وغیرہ۔''

''سوری..... مم..... میں یہ سب کچھ..... نہیں کر سکتا۔''

''تو سوری' پھر ہم بھی زیادہ دیر تک آپ کے ہم راز نہیں رہ سکتے۔''

میرے انکار پر شاہد نے انتہائی کرخت لہجے میں دوٹوک فیصلہ سنا دیا تھا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہا۔

''مم..... میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

''ٹھیک ہے..... ایک ہفتہ..... صرف ایک ہفتہ تمہارے پاس ہے۔ سوچنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا دل' دماغ اور جسم ہمارے حوالے کرنے کے لیے۔ صرف اسی صورت میں تم اور تمہارے گھر والے محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ.....''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں بہت برے لوگوں کے چنگل میں پھنس چکا ہوں۔ میں باہر نکلا تو پیچھے سے شاہد کی آواز آئی۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہاری نگرانی نہیں کر رہے۔ تمہاری کوئی بھی غلط حرکت تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' میں بنا جواب دیے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے ذہن میں بڑی تیز آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک دم سے مجھے گھر کی فکر نے گھیر لیا۔ آج تقریباً چھٹا دن تھا مجھے گھر سے غائب ہوئے۔ معلوم نہیں گھر میں کیا حال ہوگا۔ سب لوگ میرے لیے پریشان ہوں گے۔ باجی..... اور پھر باجی..... کا خیال آتے ہی میرا دل بے قابو سا ہو گیا۔ مجھے ان میں سے ماں کی مہک آتی تھی۔ ان میں ممتا چھلکتی محسوس ہوتی تھی مجھے۔ اور اس وقت میرا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ میں اماں کی یا باجی کی گود میں سر رکھ کر دل بھر کر روؤں اور وہ مجھے اپنی ممتا کی چادر میں اس طرح چھپا لیں کہ میں ان تمام مکروہ چہروں اور جرائم سے چھپ جاؤں۔ کبھی ان کے ہاتھ نہ آؤں۔ میں گناہ کی دلدل میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ گناہ نادانستگی میں ہوا تھا۔ ورنہ قتل و غارت گری کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اس ایک لمحے کو بہت پچھتا رہا تھا جب میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

میں گھر پہنچا تو ایک منحوس روح فرسا خبر میری منتظر تھی اور ہمیشہ سے بھی زیادہ بھابیوں کے چبھتے ہوئے طنز کے تیر میرا سینہ چھلنی کر گئے۔ معصوم بہنوں اور بوڑھے باپ کی جھکی ہوئی کمر مزید جھک گئی اور سر شرم سے نیچے ہو گئے تھے۔ میری صائمہ باجی تین دن سے گھر سے غائب تھیں۔ تین دن پہلے صائمہ باجی یونیورسٹی گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھیں۔ گڑیا نے بتایا تھا۔ ''اس دن بھی صائمہ باجی میرے غائب ہونے کے کئی دن کے بعد لوٹی تھیں۔ مجھ سے کسی نے بھی سیدھے منہ بات نہ کی بس دو چھوٹی بہنوں کے علاوہ سب ہی مجھے الزام دے رہے تھے کہ میں بھی تو کئی دن بعد گھر آیا ہوں تو یقیناً کوئی بڑا ہی کارنامہ انجام دے کر آیا ہوں گا۔

نادانستگی میں کہہ تو سب ہی ٹھیک رہے تھے۔ میں واقعی بڑا ہی برا کام کر کے آیا ہوں، لیکن کیسے اور کیوں؟ اس بات سے کوئی باخبر نہیں تھا اور میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح خود میری صائمہ باجی کی عزت خطرے میں پڑ جاتی مگر ..... صائمہ باجی..... کہیں..... کہیں ایسا تو نہیں کہ ان ہی لوگوں کی حرکت ہو۔ میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ میں نے تمام اسپتالوں میں تو دیکھ لیا مگر تھانوں میں جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہوئی۔ بڑے بھائی وہاں گئے اور رپورٹ درج کرآئے۔ میں نے تو قیر اور ظفر سے بات کی۔ خاص طور پر ظفر پر ناراض بھی ہوا کہ مجھے میرے گھر سے بے خبر رکھ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اس نے کہا ''سوری یار! مجھے شاہد نے منع کر دیا تھا کہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی زبان بند رکھی'' میں اور تو قیر یا گلوں کی طرح صائمہ باجی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ تھانے سے ہمیں اطلاع ملی کہ ایک سنسان علاقے سے ایک لڑکی کی لاش ملی ہے جس کے جسم کو جگہ جگہ سے داغا گیا تھا۔ کئی جگہ بلیڈ کے کٹ لگے تھے اور گینگ ریپ کے بعد گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اور یہ دو دن پرانی لاش تھی اور پھر شناخت کے لیے گھر والے گئے تو معلوم ہوا' وہ میری پیاری صائمہ باجی ہی تھیں۔

اف..... یہ خبر تھی کہ آگ جو میرا پورا جسم و دماغ بھسم کر گئی تھی۔ میری معصوم اور پاکباز بہن کو کتنی اذیتوں کے بعد موت ملی تھی اور مرنے کے بعد بھی بدنامی اس کا اور ہمارا مقدر

بن گئی تھی اور پھر اس ایک لمحے کی چنگاری اب مکمل شعلے کا روپ دھار چکی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ حرکت ان ہی لوگوں کی تھی تو انہوں نے بالآخر اپنا انتقام میری معصوم بہن کو اذیت ناک موت دے کر لے لیا تھا۔''

میرے ذہن میں رہ رہ کر شاہد کے الفاظ بھی گونج رہے تھے۔ میں سیدھا اس کے پاس گیا اور غصے سے بے قابو ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ کیونکہ اب مجھے اپنے انجام کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں اس پر چیخا۔

''میرے گھر پر جو قیامت ٹوٹی ہے' اس میں تیرا کتنا ہاتھ ہے؟ سچ سچ بتانا مجھے۔ اور یہ مت بھولنا کہ میں ایک قاتل بھی ہوں۔ ایک خون کے بعد میں اب دس خون بھی کرلوں تو میری سزا پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''خ..... خدا کی قسم سلیم! میرا..... میرا یقین کر۔ ہمارا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے'' وہ میرے ہاتھ میں وہی پستول دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا جو اس نے خود ایک بار مجھے دیا تھا اور جس سے میں ایک قتل بھی کر چکا تھا۔

''تو پھر..... تو پھر بتا' یہ کام کس کا ہے ورنہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے مجھ سے اتنی بڑی خبر چھپائے رکھی۔ تیرے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ تو دوست کے روپ میں اتنا بڑا دشمن نکلے گا' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''ہمارے کام میں یہی تو بات ہے سلیم کہ ایک گناہ کے بعد ہم بار بار گناہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں' لیکن میرا یقین کر' تیری بہن کا اغوا اور ریپ ہم نے نہیں کیا۔ یہ وہی ہمارا مخالف گروپ ہے جس میں سے ایک لڑکے کی جان تو نے لی تھی یہ ان کا ہی انتقام ہے اور یہ خبر مجھے اپنے بڑے اعتماد کے آدمی سے ملی ہے۔ لیکن تو فکر نہ کر ہم بھی ان سے ایسا ہی انتقام لیں گے ہم بھی ان کی عزت کا یہی حال کریں گے۔''

اور پھر ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی اپنے دروازے خود ہی کھول لینے کی طاقت پا لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میرے دماغ میں بھی انتقام کی آگ ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ بلکہ یار دوست دوستی کے نام پر اس آگ کو مزید ہوا دیتے رہے۔ پھر میں اپنی صائمہ باجی کے انتقام کے لیے ابھی منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا کہ دو دن بعد مجھے ذاکر کے ذریعے شاہد نے بلا بھیجا۔ میں اس کے ساتھ شاہد کے پاس گیا تو وہ مجھے ایک سنسان علاقے میں لے گیا جہاں بہت کم آبادی تھی اور مکانات کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ گویا یہاں کسی کو کسی کی نہ خبر تھی اور نہ ہی کوئی پروا تھی کہ کوئی کیا کر رہا ہے؟ رات کے اندھیرے میں ذاکر مجھے جس جگہ پر لے کر گیا وہاں بڑا گہرا اندھیرا تھا۔ ذاکر نے حلق سے مخصوص آواز نکالی اور دو تین منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا شاہد تھا۔ یہ بدلتے موسم کے دن تھے جن میں نہ تو گرمی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی سردی پریشان کرتی ہے۔ گویا بڑا خوشگوار موسم تھا۔ میں نے شاہد سے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے کاندھے سے پکڑ کر تیزی سے اندر کی طرف لے آیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے میرے منہ سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

''شش..... خبردار! زیادہ زور سے بات نہ کرنا۔ بول کیا کہہ رہا تھا؟''

''یار! یہ سب کیا ہے؟ اتنی دہشت کیوں ہے تیرے لہجے میں۔ اور تو نے مجھے اس وقت اور یہاں کیوں بلوایا ہے؟ تو اپنے اسی گھر میں کیوں نہیں ہے؟''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شاہد نے ایک گہرا سانس لیا اور قریب پڑے ایک صوفے پر گر گیا اور مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

''یار! یہ دہشت نہیں ہے بلکہ زندگی کی راحت ملنے کا احساس ہے۔''

''کیا مطلب؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے۔'' میں نے الجھ کر پوچھا تو اس نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''تجھ سے وعدہ کیا تھا نا کہ ہم بھی تیری بہن کا بدلہ اتنی ہی بے عزتی کر کے لیں گے؟ ادھر دیکھ..... اس بند کمرے کی طرف..... وہاں وہ شہزادی موجود ہے..... ہم نے خبر لگائی تھی تیری بہن کو جوادنامی اس لڑکے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اغوا کیا تھا جس سے تیری پہلے دن لڑائی ہوئی تھی۔ وہاں اس کمرے میں اسی کی بہن موجود ہے۔''

''ننگ..... کیا کہا تو نے.....؟'' مجھے شاہد کی اتنی گھٹیا بات سن کر حیرت کا بڑا شدید جھٹکا لگا تھا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر تقریباً جھنجوڑ ڈالا تھا۔ ایک گناہ کے بعد دوسرا اتنا بڑا گناہ..... اس کا میں نے سوچا تک نہ تھا۔ میں تو..... میں تو صرف اس لڑکے سے بدلا لینا چاہتا تھا۔ جس نے اتنی گھٹیا حرکت کی تھی۔ میں صرف اس کی جان کا دشمن تھا لیکن شاہد نے میرے ہاتھوں سے خود کو چھڑاتے ہوئے بڑی درشتگی سے کہا۔ ''خود کو سنبھال سلیم! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ہمارے ہی ہاتھوں ضائع ہو جائے۔ تو میرے یار کا یار ہے' اس لیے تیری اتنی قدر کرتا ہوں' اس کا اشارہ میرے دوست ظفر کی طرف تھا۔

''مجھے..... مجھے کیوں بلوایا ہے تو نے؟'' میں نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے..... دو دن سے ہم اپنا حصہ وصول کر رہے تھے..... جا..... آج تیری باری ہے..... تو یار ہے نا ہمارا' دیکھ تیرا کتنا خیال ہے ہمیں..... اور ویسے بھی یہ تیری بہن کے عوض ادھر لائی گئی ہے۔ تاکہ وہ لوگ بھی تیری طرح تڑپتے رہیں۔ روتے رہیں اور مارے شرمندگی اور شرم کے دنیا والوں سے منہ چھپاتے رہیں۔ ان کی عزت کا جنازہ بھی ایسے ہی نکلے جیسے کہ..... جیسے کہ.....''

اس نے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میرا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ ایک طرف تو شاہد کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں اور دوسری طرف مجھے اپنا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ کسی کی عزت سے کھیلنا کب سیکھا تھا ہم نے۔ مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر شاہد نے میری رضامندی سمجھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہ اس بند کمرے کی جانب چل دیا جہاں بقول شاہد کے وہ شہزادی موجود تھی۔ شاہد نے مجھے دروازہ کھول کر اندر کمرے میں دھکا دے کر باہر سے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ ''جا..... جا شاباش عیش کر میش.....''

مجھے شاہد کی آواز اپنے عقب میں سنائی دی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کمرے میں ایک بہت ہلکا بلب روشن تھا اور ایک طرف نیچے زمین پر کونے میں ایک گٹھری نما چیز رکھی تھی۔ کمرے میں اور کچھ نہیں تھا۔ میری آہٹ سے اس گٹھری میں حرکت ہوئی وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ ایک جھٹکے سے اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا ''اف.....'' اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے نہ جانے کیوں دکھ کا شدید احساس ہوا۔ میں نے اس کے سراپے پر نگاہ ڈالی تو احساس ہوا کہ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس نے پھٹی ہوئی چادر اٹھائی اور جلدی سے اپنے گرد لپیٹ لی۔ لیکن وہ بھی اس کا بدن ڈھانپنے کے لیے ناکافی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو وہ سہم کر مزید سمٹ گئی اور بڑے کربناک انداز میں میرے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔

''نہیں..... نہیں' نہیں خدا کے لیے اب نہیں..... مم..... میری جان لے لو۔ مگر..... اب نہیں..... تمہیں اللہ رسول کا واسطہ اب نہیں.....''

''نہیں..... ڈرو نہیں..... تم..... تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''میں اللہ کو حاظر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ کبھی مجھے اس قسم کے حالات سے واسطہ پڑنا تو دور کی بات' کبھی مذاق میں بھی نہیں سوچا تھا میں نے کہ کبھی میرا سامنا اس قسم کے حالات سے بھی ہوگا۔ اس لیے مجھے ذہنی طور پر جو اذیت ہو رہی ہے وہ میں شاید صحیح طور سے بیان نہ کرسکوں۔'' اس کی بے چارگی دیکھ کر میرا دل رو پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے صائمہ باجی کا بھی خیال آیا لیکن میں نے تیزی سے جھٹک دیا۔ بہرحال میں مجبور تھا' اب ان لوگوں کے اشاروں پر ناچنے کے لیے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو یہ لوگ نہ صرف مجھے بلیک میل کریں گے بلکہ میرے مظلوم گھر والوں کو بھی نقصان پہنچائیں گے جو پہلے ہی میری وجہ سے بے انتہا مشکلات کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن میرا بھی اصل میں کوئی قصور نہیں تھا۔ بس ایک چھوٹی سی غلطی کی بدولت تقدیر مجھے اس جگہ لے آئی تھی۔ اور ستم یہ تھا کہ سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔

میں اس کی نیم برہنہ حالت دیکھ کر مزید مشکل صورتِ حال کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ دو دن سے ان درندوں نے اس معصوم سی گڑیا جیسی نازک لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اور اب وہ مجھے بھی ان ہی درندوں کا ساتھی سمجھ رہی تھی۔ یقیناً اس وقت اس کے گھر میں بھی صفِ ماتم بچھی ہوگی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''دیکھو! تمہاری بھی بہن ہوگی..... خدا کے لیے اس کا ہی خیال کرلو۔ کیوں مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ میرا کیا قصور ہے آخر..... میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا..... میرے ماں باپ..... میرے ماں باپ تو شرم سے مر گئے ہوں گے۔ مار ڈالو..... مار ڈالو..... خدا کے لیے مجھے بھی مار ڈالو..... میری جان لینا چاہتے ہو لے لو' لے لو میری یہ غلیظ جان بھی لے لو۔ اب تو میں خود بھی نہیں جینا چاہتی..... مگر..... مگر خدا کے لیے اب مجھے ہاتھ نہ لگانا.....'' وہ میرے آگے سر جھکا کر سجدے میں گر گئی ''میں مرنا پسند کروں گی مگر اپنی اور تذلیل نہیں سہ سکتی۔''

وہ بہت حسین' بہت معصوم تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال ہوگی۔ خوف اور دہشت کے سائے اس کی آنکھوں سے اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھے۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تاکہ اٹھا سکوں، لیکن میرا لمس پاتے ہی اسے کرنٹ لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر گٹھری کی صورت سمٹ کر کونے میں گھس گئی۔

''میں نے تمہیں اللہ رسول کا واسطہ دیا ہے' دیکھو مجھے ہاتھ نہ لگانا۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دیوار توڑ کر اس میں

سما جائے۔ اس کی نہ صرف آنکھیں سوج رہی تھیں بلکہ پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اور بازو پر بھی زخم کا نشان تھا جبکہ لباس پھٹنی ہو چکا تھا۔

''دیکھو! مجھے غلط نہ سمجھو'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح سنبھالوں' خود میری اپنی کیفیت بھی بکھر رہی تھی۔ مجھے اسے ہاتھ تو نہیں لگانا تھا۔ کیونکہ میری نیت میں اس کے لیے کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اور نہ ہی میرے اندر اس کے لیے انتقام کے جذبات تھے۔ میں عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے بدترین دشمن کی بہن تھی لیکن میں اس امر پر حیران تھا کہ قدرت نے میرے دل میں اس کے لیے بڑے انوکھے اور پاکیزہ جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے۔ مجھے اس کی حالت پر بے پناہ رحم آرہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ باہر شاہد اور ذاکر یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں نے اپنے دشمن سے اپنی بہن کا انتقام لے لیا ہوگا یا لے رہا ہوں..... مگر..... مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا ہوگی' یہ کب سوچا تھا میں نے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ کس طرح مسئلہ حل کرنا ہوگا لیکن اب کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی مسئلہ حل ہونے کی..... جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا' اس لڑکی کی عزت جا چکی تھی۔

''سنو! کیا تم گھر واپس جانا چاہو گی.....'' میں اس سے بات کر کے کوئی حل نکالنا چاہتا تھا۔

''ہاں..... مم..... مگر..... تم.....؟''

اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ سانس بھی مشکل سے لے پا رہی ہے۔

''مم..... مجھے ان جنگلیوں سے بچالو..... خدا کے لیے دو دن' دو راتوں سے ان وحشیوں نے میرے جسم کو نوچ نوچ کر بے حال کر دیا ہے۔ مم..... مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو.....'' اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔

''کیا پڑھتی ہو؟'' میں نے بات جاری رکھنے کی خاطر سوال کیا۔

''ہاں..... پڑھتی تھی پر اب تو..... اب تو شاید ہی.....''

''کون سی کلاس میں؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑی تو میں نے اگلا سوال کر دیا۔

''فرسٹ ایئر میں' اب تو امتحانات بھی نزدیک تھے۔''

مجھے یہ سب سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہو رہا تھا کہ ایک تھوڑے سے غصے کی وجہ سے نہ صرف میری بہن کی عزت اور جان گئی بلکہ میرے گھر کی طرح ایک اور گھر بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ ایک اور معصوم زندگی برباد ہو گئی۔ اس نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

''مم..... میں بہت پڑھنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر بننا خواب تھا میرا..... مگر اب تو..... سب تباہ ہو گیا۔'' اس کے لہجے میں بڑا کرب چھپا تھا۔ آج کی یہ پوری رات میرے نام لکھ دی گئی تھی لہٰذا میں اس سے باتیں کر کے وقت گزار رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے دل سے میرے لیے خوف اور نفرت میں کچھ کمی آگئی تھی اور اب وہ اتنی خوف زدہ نہیں رہی تھی۔ لیکن ان درندوں نے اسے جو تکلیفیں پہنچائی تھیں' ان کے اثرات اب تک اس کے چہرے اور جسم پر نظر آرہے تھے۔ مگر میں خود مجبور تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا بھی تو کچھ نہ کر پاتا۔ میں اس کے گھر اور اس کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ کیا اس حالت میں اس کے گھر والے اسے قبول کر لیں گے؟ کیا معاشرہ اسے عزت سے جینے دے گا؟ یہ تو ویسے بھی ہر طرح سے تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ جیسے کہ میری زندگی تباہ تھی۔ میرا مستقبل بھی تو برباد ہو چکا تھا۔ میں بھی تو گرجیویشن کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مگر اب..... میں ایک قاتل تھا..... صرف قاتل جس کے پیچھے پولیس لگی تھی۔ صرف ایک وجہ سے میرا پورا گھر معاشرے کے طنز کا نشانہ بن گیا تھا۔

میں کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ شاہد اور ذاکر دوسرے کمرے میں لیٹے باتیں کر رہے تھے' مجھے دیکھا تو شاہد چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''بول شہزادے! کیا بات ہے؟ کیا شہزادی پسند نہیں آئی؟''

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور تیسرے کمرے میں لے آیا۔ شاہد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی ابھی اچانک جو آئیڈیا میرے ذہن میں آیا تھا مجھے خود امید نہیں تھی کہ اس پر عمل ہو سکے گا یا نہیں۔ شاہد نے کہا ''بول کیا بات ہے؟''

''یار! تو نے بہت ظلم کیا ہے' مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا'' میں نے جھنجلا کر کہا تو وہ مجھ پر گرم ہو گیا۔

''اوئے سنبھال خود کو۔ یہ سب میں نے صرف اور صرف تیری خاطر کیا ہے۔ تیری بہن کا بدلہ لیا ہے۔''

''میری بہن کا بدلہ کس طرح لینا تھا یہ فیصلہ کرنا میرا کام تھا۔ تو نے یہ سب کیوں کیا ہے؟ اب بول کیا کرے گا اس کا؟''

اس نے بڑی بے پروائی سے ''کرنا کیا ہے..... سالی کو آج صبح ہونے سے پہلے مار دیں گے۔ پڑی ہوئی کسی جھاڑی میں مسخ شدہ لاش کی شکل میں۔''

''نہیں' نہیں۔ شاہد! اتنا ظلم نہ کر..... انسان اور جانور میں فرق تو رکھ۔'' میں اس کا ارادہ سن کر سر تا پیر لرز اٹھا تھا۔ میرے دل میں نہ جانے کیوں اس کے لیے اس وقت بے اختیار محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس نازک حسینہ کو ساری دنیا کے ظلم سے چھڑا کر کسی پرسکون گوشے میں لے جاتا جہاں کسی کی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ میں نے شاہد کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''یار! اگر تو واقعی میرا یار ہے تو میرا ایک کام کر دے۔''

''کیا مطلب..... کیسا کام؟''

''تو..... تو میری خاطر..... میری خاطر اس لڑکی کی جان بچالے۔ تیرا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔''

''مشکل ہے..... بلکہ ناممکن ہے۔ تو' تو پاگل ہو گیا ہے اوئے شرافت کا ڈھونگ چھوڑ..... دنیا میں ایک تو ہی نہیں ہے شریف' اپنی یاد رکھ تو اب قاتل ہے اور قاتل صرف قاتل ہوتا ہے اس کا شرافت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ عزت نام کی کوئی شے اس کے حصے میں نہیں آتی۔''

اس نے بڑے سخت لہجے میں مجھے میری اوقات یاد دلائی اور مزید کہا۔ ''تو اس کی جان کی بات کر رہا ہے..... اپنے بارے میں بھی سوچا ہے تو نے..... ذرا سا انکار کرے گا۔ ان کے کسی حکم سے' جنہوں نے تجھے تحفظ دیا ہوا ہے تو خود ہی دیکھ لے گا کہ اگلے دن کا سورج تجھے ملتا بھی ہے یا نہیں؟''

اس کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے ایک قتل کر دیا تھا اور اب تک پولیس کے ہاتھوں محفوظ بھی تھا اور اسی خیال نے میرے اندر ان دیکھے دیوتاؤں کے لیے ایک دہشت سی پیدا کر دی تھی۔ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''پلیز' پلیز شاہد! میں..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے کسی حکم سے انحراف نہیں کروں گا۔ جو کہو گے کروں گا بس میرے دو کام کر دو۔ ایک تو میرے خاندان کے تحفظ کی گارنٹی دو اور دوسرے..... دوسرے اس لڑکی کی زندگی کی بات کرو..... جو کچھ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا۔ میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ مم..... میں اسے اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''بے وقوف! اب اسے یہ معاشرہ قبول کرے گا۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ البتہ اس کی لاش دیکھ کر اس کے ماں باپ کو شاید قرار آجائے ہم کبھی بھی قانون کو اپنا نشان نہیں دیں گے۔''

''ایک منٹ ٹھہر' میں ابھی آتا ہوں۔''

میں اسے حیران چھوڑ کر واپس لڑکی والے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی تک وحشت زدہ سی اسی طرح بیٹھی تھی جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اس سے بات کی ''سنو..... ایک بات غور سے سنو اور جواب دو کہ اگر کوئی تمہیں اس حالت میں قبول کر لے تو کیا تم عزت سے اس کے ساتھ رہنا چاہو گی؟ مجھے فوری طور پر جواب دو' ہاں یا نہ۔''

''مم..... مجھے بس میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو۔''

اس نے پھر سے لرزتے ہوئے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے مگر میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ ''دیکھو' ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ آج صبح تک تمہیں مار دیں گے۔ بالفرض تم چلی بھی گئیں تو بھی تباہی و بربادی ہے۔ تمہیں تو شاید تمہارے گھر والے بھی قبول نہ کریں۔''

''مم..... مگر کون کرے گا مجھ سے شادی؟ یہ وحشی تو خود لٹیرے ہیں۔'' اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔

''کیا مجھ سے نکاح کرو گی؟'' میں نے بے اختیار سوال کیا، تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ پھر جیسے ٹرانس میں آگئی ہو۔ بڑی دھیمی سی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی ''ہاں.....'' اور پھر میں تیزی سے باہر نکل گیا اور شاہد کے پاس پہنچا۔

''یار شاہد! بس تو بات کر اوپر..... میں نے اپنی تمام زندگی تمہارے نام لکھ دی لیکن اسے میرا جیون ساتھی بنا دو۔ میری ادھوری زندگی کا ساتھی'' وہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگا۔

بہر حال بڑی مشکلات کے بعد سمیرا میری زندگی میں شامل کر دی گئی۔ شاید ان دیکھے دیوتاؤں کا یہ بھی مجھ پر بڑا احسان تھا۔ مجھے اس سے شاید کوئی خاص غرض نہیں تھی کہ سمیرا کے گھر والوں پر کیا گزری۔ میں نے تو اپنی دانست میں ایک زندگی کو کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ اور وہ اب میری عزیز ترین شے بن گئی تھی۔

جرائم کی دنیا میں اپنی شمولیت کو میں نے سمیرا سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ اگرچہ وہ جانتی ہے میرے بارے میں مگر کبھی کھل کر مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ میرا اپنے گھر والوں سے بھی کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ میری طرف سے کچھ رقم انہیں وقتاً فوقتاً گھر پہنچ جاتی ہے۔ آج کل تو جرائم معمول بن گئے ہیں۔ گاڑیوں کی چوری... زبردستی چھیننا' قتل' ڈاکے' فائرنگ' کیا نہیں ہوتا۔ اور ان میں

سے اکثر میں' میں اور میرے جیسے لوگ ملوث ہیں یا تو مجبوراً یا ذاتی ہوس اور لالچ میں۔''

وہ ذرا خاموش ہوا تو میں نے پوچھا ''مگر تم بااثر حلقوں کے زیر اثر ہو تو پکڑے کیسے گئے؟''

وہ مسکرایا ''یہ تو میں کسی اور کی جگہ عارضی طور پر یہاں وقت گزار رہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''آپ کسی کو بتائیے گا نہیں۔ ہم جیسے لوگ کبھی کبھی مصلحتاً بھی حوالات یا جیل کی سیر کو آجاتے ہیں۔''

''تو تم جب چاہو نکل سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ مگر جس وجہ سے میں یہاں ہوں پہلے وہ کام تو ہو جائے'' میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ ایک سگریٹ سلگاتا ہوا میرے اور بھی قریب آ گیا ''اور اب زیبو بھائی! میں آپ کو وہ بات بتانے لگا ہوں جو میں کبھی کسی کو نہیں بتا سکتا۔'' میں الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔

''میرے پہلے جھگڑے میں جو لڑکا مارا گیا تھا اسے میری چلائی ہوئی گولی نہیں لگی تھی۔''

''میرے لیے یہ واقعی ایک بڑا انکشاف تھا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بولا۔

''یہ تو مجھے جیل میں آنے کے بعد پتا چلا ہے کہ وہ لڑکا بھی ایسے ہی کسی گروہ میں شامل تھا اور وہ گروہ ان کا مخالف تھا لہٰذا اس لڑکے کو مارنے کا پہلے سے منصوبہ بن چکا تھا۔ جب میرے جھگڑے کی بات انہیں معلوم ہوئی تو اتفاقیہ لڑکا ان کا مطلوبہ شخص نکلا۔

مجھے تو یونہی پستول پکڑا دیا گیا تھا مگر جب میں نے اشتعال میں آ کر گولی چلائی تو وہ کسی کے بھی نہیں لگی۔ اسی لمحے ایک اور گولی چلی تھی جو سیدھی اس کے سر کا نشانہ لے کر چلائی گئی تھی۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''صرف مجھے اپنے گروہ میں پھنسانے کے لیے۔'' پھر تھوڑی دیر خلاؤں میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کس نے چلائی تھی۔ اس طرح نہ جانے کتنے معصوم اور بے بس نوجوان ان مگروہ جرائم میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

''تو اب تم کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب میں اپنے اس دشمن سے انتقام لوں گا جس نے مجھے انسان سے درندہ بنا دیا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میں اپنا کام کر جاؤں گا۔ اب تو میں ان ہی لوگوں کی تربیت سے بہت بڑا اور ماہر جرائم پیشہ بن چکا ہوں۔ اب میں بھی اپنے ان ازلی دشمنوں کو انگلیوں پر نچاؤں گا۔''

''مگر اس کا انجام؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اس کا انجام جو بھی ہو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں جو دھندے کر رہا ہوں' ان کا کیا انجام ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں تحفظ دیں گے۔ مگر جرائم پیشہ گروہ بھی کسی کو تحفظ نہیں دیتے۔ وہ صرف اس وقت تک آپ کو بچاتے ہیں جب تک آپ ان کے لیے مفید ہوں یا نقصان کا باعث نہ بن سکیں۔''

میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس سے رخصت لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟'' وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف بڑے احترام سے دیکھتا ہوا بولا۔

''زیبو بھیا! میں نے اپنی زندگی کا یہ اہم ترین پہلو بھی آپ پر روشن کر دیا ہے بلا یہ سوچے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بہر حال آپ میرے نہ صرف استاد ہیں بلکہ بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ بس ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو سمیرا آپ سے رابطہ کرے گی۔ بس اس کی زندگی کا کسی طرح تحفظ کروا دیجئے گا'' اور پھر وہ بڑے خلوص سے مجھ سے گلے ملا اور مجھے اپنے ساتھ بھینچ کر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ''میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ آپ جیسے چاہنے والوں سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ میرا تو اب سکون اور شرافت کی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہے۔''

میں اداسی سے بھاری قدموں کے ساتھ اس جیل سے باہر آیا.... اور پھر میں نے سلیم اور اس کی کہانی کو بھولنے کی کوشش کی۔ شہریار نے جب مجھ سے ہاتھ ملانے کی جستجو میں مجھے چھیڑا تو میں بڑی خوب صورتی سے ٹال گیا اور ایک جھوٹی سی فرضی کہانی بیان کر کے اسے مطمئن کر دیا۔ اس بات کو پانچ سال ہو چکے ہیں مگر ابھی تک میں سلیم کو بھلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک معصوم اور باعصمت بہن کی خاطر اشتعال میں آنے والے ایک پُرسکون اور ذہین نوجوان کو کس طرح غلط راہوں پر ڈال دیا گیا۔ لکھاری ہونے کے ناتے آخر میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ خدا معلوم اب سلیم کہاں ہیں۔ مجھے امید ہے' وہ زندہ ہی ہوگا۔ ورنہ شاید سمیرا مجھ سے رابطہ کر چکی ہوتی۔

اللہ والے

جناب معراج رسول صاحب، السلام علیکم۔

آج کل تو جگہ جگہ عاملوں اور کاملوں کے چرچے ہیں اور بعض تو باقاعدہ اشتہارات کے ذریعے اس کاروبار کو وسعت دینے میں لگے رہتے ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں تو اللہ والے وہ ہیں جو نہ تو آسانی سے ملتے ہیں نہ خود کو ایسا ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن سچ جانیے کہ اب بھی ایسے پہنچے ہوئے بزرگ ہم میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں جن کے دم سے کارِ خیر آج بھی جاری ہے۔ اب میری ہی کہانی پڑھ لیجئے۔ امید ہے آپ اسے اپنے پرچے میں شائع کرنے کے قابل سمجھیں گے۔ آپ کا ممنون ہوں گا۔

خالد احمد۔ گوجرانوالہ

مجذوب نے مجھے مارنے کے لیے پتھر اٹھا لیا تھا۔ ''اب میرے قریب آیا نا تو تیرا سر پھاڑ دوں گا۔''

''چاہے کچھ بھی کرو' میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا'' میں نے کہا۔

''تو پھر یہ لے'' مجذوب نے پتھر مار ہی دیا۔

وہ پتھر سیدھا میرے سر پر آ کر لگا۔ میں اس کی ضرب سے ناچ کر رہ گیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس صورتِ حال سے گھبرا کر بھاگ جاتا لیکن مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ کچھ بھی ہو' اس کا پیچھا ہرگز نہ چھوڑنا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

مجذوب مجھے مارنے کے بعد پھر ایک طرف چل دیا لیکن میں کہاں باز آنے والا تھا' میں پھر اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس دفعہ اس نے بہت جل کر مجھے گالی دی تھی ''ابے تو چاہتا کیا ہے۔ کیوں میری جان کا عذاب ہو گیا ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں'' میں نے کہا۔

''بڑا حوصلے والا معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں' تم کو دیکھ کر یہ حوصلہ ہوا ہے اور میں اوروں کی طرح بھاگنے والا نہیں ہوں۔''

''بہت ہی ڈھیٹ آدمی ہے تو'' مجذوب نے کہا۔ ''اچھا'

کل آجانا اسی وقت۔"

"یہ تم مجھے ٹالنے والی بات کررہے ہو۔ میں کل نہیں آؤں گا' میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

"میں نے کہا نا کل آجانا۔" مجذوب غصے سے بولا "ورنہ میں تیری کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

یہ دھمکی ایسی تھی کہ مجبوراً مجھے وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔ ویسے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجذوب سے دوسرے دن پھر ملاقات ہوجائے گی کیونکہ یہ مجذوب اسی علاقے میں بھٹکتے رہتے تھے۔

بہت دنوں سے میں شدید پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ زندگی دن بدن عذاب ہوتی جارہی تھی۔ پہلے تو نوکری ختم ہوئی' اس کے بعد بیوی کو بیماریوں نے آگھیرا۔ جتنے پیسے تھے وہ اس کے علاج میں ختم ہوگئے اور میں پائی پائی کو محتاج ہوگیا۔ میں نے اس دوران میں دو چار کام کرنے کی کوشش بھی کی لیکن سوائے ناکامیوں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بندش ہوگئی ہو۔

اس وقت کسی نے مجھے اس مجذوب سے ملنے کا مشورہ دیا۔ "تم اس مجذوب کے پیچھے پڑجاؤ۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ایسے لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں' وہ تقدیر بدل سکتے ہیں۔"

"بھائی! میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔ "تقدیر بدلنے والا صرف خدا ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن یہ لوگ خدا کے خاص بندے ہوتے ہیں' خدا ان کی دعائیں جلدی سن لیتا ہے۔"

اس وقت میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا لیکن جب میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو وہ جھک اٹھی "ہاں ہاں' ضرور جائیں۔ میں نے بھی ان کے بارے میں بہت سنا ہے۔"

"ارے بابا! یہ سب کہانیاں ہیں۔"

"آپ جاکر تو دیکھیں لیکن آپ کو پیچھے پڑجانا پڑے گا۔ وہ گالیاں دیں گے' پتھر ماریں گے لیکن آپ اگر ثابت قدم رہئے' ان کا پیچھا نہیں چھوڑا تو پھر وہ آپ کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔"

یہی بات ایک دو اور آدمیوں نے بھی بتائی کہ مجذوب صاحب گالیاں دیں گے۔ بھگانے کی کوشش کریں گے۔ پتھر مار کر زخمی بھی کرسکتے ہیں لیکن ان سے چمٹے رہنا۔ جتنی ثابت قدمی دکھاؤ گے' اتنا ہی فائدہ ہوگا۔

اس لیے میں ان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

وہ مجذوب ایک عرصے سے ہمارے علاقے میں دکھائی دے رہے تھے۔

لانبا سا کرتہ' جس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے' بڑھے ہوئے بال اور داڑھی۔ دونوں ہاتھوں میں کڑے۔ یہ تھا ان کا حلیہ لیکن ان کی پوری شخصیت میں سب سے نمایاں ان کی آنکھیں تھیں' لودیتی ہوئی آنکھیں۔ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان آنکھوں میں بے پناہ جلال تھا۔

میں نے گھر واپس آکر اپنی بیوی کو اس دن کی کارگزاری بتائی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان کے سامنے کھڑے رہے۔"

"لیکن میری کمر تو زخمی ہوگئی ہے نا۔"

"اس کا بھی منافع ہوگا آپ کو" اس نے کہا "آپ خود دیکھ لیجئے گا' مجذوب صاحب پتھر بھی اسی کو مارتے ہیں جس کی مراد پوری ہونے والی ہوتی ہے۔"

دوسری صبح میں پھر مجذوب صاحب کے راستے میں بیٹھ گیا۔ وہ اسی راستے پر کسی طرف سے نمودار ہوا کرتے تھے اور ہوحق کرتے ہوئے گزر جایا کرتے تھے' میں اگر چہ ان کی باتوں کا قائل نہیں تھا' اس کے باوجود دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش تھی کہ شاید مجذوب صاحب کی توجہ سے میرا مسئلہ حل ہوجائے۔

اور میرا مسئلہ میری بے روزگاری' غربت یا بیوی کی معمولی بیماریاں نہیں تھیں بلکہ کچھ اور تھا اور یہ بات میں نے اپنی بیوی سے بھی چھپا رکھی تھی بلکہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے کے لیے اپنے آپ سے کہا کرتا تھا کہ کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے جو کچھ ہے' وہ بہت معمولی ہے۔"

مجھے برین ٹیومر تھا۔

یہ ایک انتہائی خطرناک مرض ہوا کرتا ہے۔ اس کی تکلیف خدا کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ انسان بے حال ہوکر رہ جاتا ہے۔ مجھے بھی اس بے پناہ درد کے دورے پڑا کرتے تھے لیکن میں بیوی سے یہ کہا کرتا کہ مجھے آدھے سر کا درد ہوا کرتا ہے۔ جسے درد شقیقہ کہا کرتے ہیں اور یہ کوئی خاص مرض نہیں ہے۔

وہ بے چاری میری اس بات پر یقین کرلیتی تھی۔

میں نے ڈاکٹروں سے مل کر کچھ ایسا بندوبست کررکھا تھا کہ کسی طرح بیوی کو یہ بات نہ معلوم ہو۔ میں اپنے ایکسرے کی رپورٹ وغیرہ بھی اس سے چھپا کر رکھا کرتا تھا۔ میں جانتا

تھا کہ وہ اس سانحے کو برداشت نہیں کرسکے گی۔

یہ کیسے کرب کی بات تھی کہ میں اتنے موذی مرض میں مبتلا تھا اور کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دے رہا تھا۔ کسی کو کیا' صرف بیوی کو۔ کیونکہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹروں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک زندہ رہوں گا۔ اگر اس دوران میں آپریشن کرالیا جائے تو بھی زندگی کے امکانات تیس فی صد سے زیادہ نہیں ہیں۔ پھر اس آپریشن میں بے پناہ اخراجات تھے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر آپریشن ہوتا تو بیوی کو اس کا علم ہوجاتا اور میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

میں اس راستے پر کھڑا ہوا یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مجذوب آتے ہوئے دکھائی دے گئے اور بے نیازانہ میرے برابر سے گزرتے چلے گئے۔ انہوں نے میری طرف دھیان بھی نہیں دیا تھا۔

میں کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ اسی لیے میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

اب وہ جس طرف سے بھی جاتے' میں ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ایک میدان راستے میں آیا تو اس میدان میں رک کر وہ غصے سے میری طرف دیکھنے لگے "تو پھر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ آج آجانا۔"

"مجھے یاد نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو یاد ہے نا۔ میں تو اسی طرح ساتھ ساتھ رہوں گا۔"

"بہت ہی بے شرم آدمی ہے تو۔"

"کچھ بھی کہہ لو۔ جب دامن تھام لیا ہے تو پھر اسی طرح ساتھ رہتا رہوں گا۔"

"لیکن ابھی تک دامن کہاں تھاما ہے؟"

"تم قریب تو آنے دو۔"

"اچھا اچھا' آ میرے ساتھ۔" مجذوب نے کہا۔ "دیکھو ہمسی' تو کتنی دیر کا مہمان ہے؟"

میں پھر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میدان ملے ہوا' کئی گلیاں آئیں اور مجذوب صاحب گزرتے چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ ان کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ وہ جدھر سے گزرتے' لوگ ادب سے سلام کرتے اور ان کے گزرنے کے لیے راستہ دے دیا کرتے۔

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ کہاں لے جارہے ہیں لیکن آج میں نے جی میں ٹھان لی تھی کہ میں ان کے ساتھ ہی لگا رہوں گا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی' جب یہ سفر قبرستان کے مرکزی دروازے پر جاکر ختم ہوا تھا۔

یہاں پہنچ کر میرے قدم رک گئے تھے۔ مجذوب مجھ سے آگے جارہے تھے۔ مجھے رکا ہوا دیکھ کر انہوں نے زور سے پکارا "کیا ہوا' رک کیوں گیا' کیا یہاں آنا نہیں چاہتا؟"

شاید یہ ذومعنی جملہ تھا۔ میرا مرض مجھے وہیں تو لے جانے والا تھا۔

"بتاتا کیوں نہیں' کیا ہمت جواب دے گئی؟"

"میری ہمت اتنی جلدی جواب نہیں دے گی" میں نے بھی اسی انداز سے پکار کر کہا۔

"تو پھر آجا۔ میری کٹیا اسی قبرستان میں ہے۔"

ایک بار پھر میں مجذوب کے ساتھ ساتھ تھا اور ان کی کٹیا واقعی قبرستان کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ تھی۔ انتہائی غلیظ' چاروں طرف چیتھڑے پھیلے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک پرانی چارپائی تھی۔ ایک کونے میں ایک مٹکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کٹیا میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس دن مجھے پتا چلا تھا کہ مجذوب صاحب رہتے کہاں ہیں۔

اور نہ جانے کس طرح میرے دل میں ایک عجیب سا

خیال آ گیا۔ پتا نہیں کیوں' میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔ مجذوب صاحب نے پکار کر کچھ کہا بھی تھا لیکن میں نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

قبرستان سے باہر ایک دکان تھی۔ میں نے اس دکان سے ایک جھاڑو خریدی اور مجذوب صاحب کے پاس واپس پہنچ گیا۔ ''تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میں بھاگ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہ جھاڑو لینے گیا تھا۔''

''یہ کس لیے؟''

''تمہاری کٹیا کی صفائی کرنے کے لیے۔ اب تم خاموشی سے بیٹھے دیکھتے رہو گے۔''

''اچھا اچھا' جا صفائی کر۔''

میں نے دو چار ہاتھ ہی مارے تھے کہ اچانک سر میں درد کی وہی ناقابلِ برداشت لہر اٹھی۔ اور میں کربناک آواز میں چیختا ہوا کٹیا کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں گا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد سر میں ہونے والی مسلسل دھمک یہ بتا رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے میں دورے کی کیفیت سے گزر چکا ہوں۔

''کیا ہوا ہے تجھے؟'' مجذوب صاحب نے پوچھا۔ وہ اس وقت میرے پاس ہی کھڑے تھے۔

''مجھے برین ٹیومر ہے بابا!'' میں نے بتایا۔

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''تمہیں اس سے کیا؟'' میں نے کہا۔ ''تم کو تو کسی سے مطلب ہی نہیں ہے۔''

''اچھا اچھا' نخرہ مت کر' بتا کیا ہے یہ؟''

''دماغ میں پھوڑا ہے میرے۔ اور ڈاکٹروں نے چھ مہینے کا وقت دیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اسی لیے تو تمہارے پیچھے لگا ہوں۔''

''کیوں' میرے پیچھے کیوں لگا ہے' میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں۔ تم صرف تماشا دیکھتے رہو۔'' میں نے کہا۔

''پاگل مت بن۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔''

''تو تم سے مانگ کون رہا ہے؟ میں تو صرف تمہاری خدمت کرنا چاہتا تھا۔''

''اچھا اچھا' بک بک مت کر' خاموش ہو جا۔''

میں اس وقت مجذوب صاحب کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں فرش پر گرا تھا' ہو سکتا تھا کہ خود مجذوب صاحب نے اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا ہو۔

''دیکھ لینا میرا تماشا'' میں نے کہا۔ ''یہی ہوتا ہے میرے ساتھ۔ دو چار جھٹکے اور لگیں گے' اس کی بعد سب ختم ہو جائے گا۔ اور لوگ دیکھتے رہیں گے کہ مجذوب صاحب نے اس کے لیے کیا' کیا۔''

''ابے کیوں پاگل بنتا ہے۔ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اوپر والے کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے۔''

''اوپر والے نے تو تمہیں اپنا چہیتا بنایا ہے۔''

''بکواس مت کر' چلا جا یہاں سے۔''

''مجھے کہیں نہیں جانا۔''

مجذوب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ کچھ آہستہ آہستہ بول بھی رہے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا ''ٹھیک ہے۔ تماشا بنانا چاہتا ہے تو بنا لے تماشا۔ اس نے سات پھیرے کیے تھے' میں چودہ پھیرے کر دوں گا۔''

اتنا کہہ کر مجذوب صاحب نے اس پلنگ کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ ''ہا ہا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

مجذوب صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چکر لگاتے رہے' ایک چکر' دو' دس' چودہ' میں چیختا رہا اور پھر درد کی ایک تیز لہر نے مجھے غافل کر دیا تھا۔

اس کے بعد میری آنکھ میرے گھر میں کھلی تھی۔ بعد میں پتا گیا کہ محلے کے کچھ لوگ قبرستان میں کسی کو دفن کرنے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے گیٹ پر بے ہوش پڑا ہوا پایا تھا۔ وہ مجھے اٹھا کر گھر لے آئے تھے۔

میں دو دنوں تک بستر پر لیٹا رہا۔ بے پناہ نقاہت تھی مجھ میں اور جب میں کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے مجذوب صاحب کی تلاش میں چل پڑا۔ قبرستان کے نگراں نے یہ خبر سنائی کہ مجذوب صاحب کا دو دن پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

اس واقعے کو کئی برس گزر چکے ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میڈیکل سائنس کی تاریخ میں یہ ایک حیرت انگیز بات ہو گی کہ میرا برین ٹیومر ختم ہو چکا ہے۔ خود ڈاکٹرز حیران ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔ ٹیومر کس طرح تحلیل ہو گیا۔ میرے کئی دوست اور کئی ڈاکٹر اس حیرت انگیز واقعے کے گواہ ہیں۔ ان مجذوب صاحب کی قبر ابھی بھی موجود ہے۔ اور میں وقت نکال کر فاتحہ خوانی کے لیے ضرور جاتا ہوں۔

زہرِ عشق

تحریر : نوشاد عادل

محترم معراج رسول صاحب، السلام علیکم۔

یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سرگزشت میں ''سچ بیانیوں'' کا سلسلہ کتنا دلچسپ ہے۔ میں بھی ایک سرگزشت اپنے من پسند پرچے کے لئے بھجوا رہا ہوں۔ دنیا میں آج بھی لوگ عشق و محبت کے لئے اپنا تن من دھن لٹا دیتے ہیں اور ایسے واقعات میں شاید زیادہ قصور وار ان کے ارد گرد کا ماحول ہوتا ہے' یا ان کے اپنے رویوں کی تلخی ایسے واقعات کو جنم دیتی ہے۔ یہ سچ بیانی لکھتے ہوئے آج بھی میرا دل بہت دکھی ہے۔ اسے قابلِ اشاعت سمجھیں تو سرگزشت میں جگہ ضرور دیں۔

آپ کا خیر طلب
محمد وسیم خان۔ حیدر آباد

مجھے محسوس ہوا کہ ساجد بھائی کچھ مضطرب سے ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ بڑے آرام سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں ان کا ایک دوست محمد علی آیا اور ان کے کان میں کچھ کہہ کر پھر کہہ کے چلا گیا پھر ساجد بھائی اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے پاس آ کر بولے۔

''وسیم..... میں ذرا ایمرجنسی میں کراچی جا رہا ہوں۔ کل صبح آؤں گا۔ تم دکان کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی اپنے کپڑے لینے آئے تو کہہ دینا کہ ساجد بھائی آ کر دیں گے۔''

میں نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن یہ اتنا اچانک آپ کراچی کیوں جا رہے ہیں؟''

''یار وہ اصل میں ابھی محمد علی ایک خبر سنا کر گیا ہے۔'' انہوں نے زیرِ لب مسکرا کر بتایا۔

''کسی کا انتقال ہو گیا ہے؟'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''ابے انتقال ہو گا تو میں خوش ہوں گا؟'' وہ جھک کر رازداری سے میرے کان میں بولے ''یار وہ تیری بھابی شاہانہ کراچی گئی ہے اپنے ماموں کے پاس..... اور میرے لیے پیغام بھجوا گئی ہے کہ میں بھی فوراً وہاں پہنچ جاؤں۔''

''تو کیا آپ ابھی کراچی جا رہے ہیں۔ اسی وقت!'' میں نے تعجب خیز نظروں سے انہیں گھورا۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ اس وقت کراچی جانا منع ہے کیا؟'' وہ عجلت آمیز لہجے میں بولے۔

اس وقت دکان میں..... میں وکیل بھائی اور راجا موجود تھے۔ وکیل بھائی اپنی مشین پر کوئی قمیص سینے میں مصروف تھے۔ راجا قمیصوں میں بٹن ٹانکنے میں مصروف تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ساجد بھائی پینٹ شرٹ اور کوٹ پہنے آگئے۔ ان کے کپڑوں سے خوشبوؤں کی کپٹیں پھوٹ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے بھئی میں جارہا ہوں..... وکیل..... یار یہ دونوں قمیصیں آج ہی نمٹا دینا۔ کل یہ دینا ہیں..... اور ذرا دیکھ بھال کر دکان بند کرنا۔ میں آجاؤں گا کل گیارہ بجے تک.....'' انہوں نے عجلت آمیز لہجے میں کہا اور پھر دراز کھول کر کچھ بڑے نوٹ نکالے اور جیب میں ٹھونس لیے۔ میں ان کی ایک ایک حرکت بغور دیکھ رہا تھا پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

ساجد بھائی میرے پھوپی زاد بھائی تھے اور ان کا گھرانا ایک اچھا خاصا متمول گھرانا کہلاتا تھا۔ یونس پھوپا کی پہلے پہل مٹھائی کی بڑی سی دکان تھی۔ ان کے چار بیٹے بیٹیاں تھیں۔ ساجد بھائی کا نمبر تیسرا تھا ان سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ سب سے بڑے بھائی سجاد نے بھی زیادہ نہیں پڑھا تھا لیکن وہ ذہین تھے۔ ساجد بھائی شروع سے ہی پڑھائی کے چور تھے۔ اسکول سے بھاگنا اور دوستوں میں رہ کر آوارہ گردی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پھوپا غصے کے بے حد تیز تھے۔ انہیں ساجد بھائی کی حرکتوں کا علم ہوا تو ڈنڈا لے کر ان کے پیچھے بھاگتے تھے۔

بے چاری پھوپی ان کو بچاتی تھیں اور بعد میں پیار سے سمجھاتی جاتی تھیں ''دیکھ ساجد اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ بیٹا چھوڑ دے اب یہ حرکتیں۔ اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو دیکھ کتنی سی عمر سے وہ کاروبار میں لگ گیا ہے۔ تو بھی اس سے سبق سیکھ۔ دکان پر بیٹھا کر اور اسکول بھی پابندی سے جایا کر.....''

''امی پڑھائی میں میرا دل ہی نہیں لگتا۔ بلاوجہ ماسٹر مارتے رہتے ہیں۔'' ساجد بھائی منہ بنا کر بولتے۔

''تو پھر دکان پر بیٹھ جایا کر۔'' پھوپی ان سے کہتیں۔

''وہاں بھائی جان حکم چلاتے رہتے ہیں مجھ پر۔ کاریگروں کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ جیسے وہ مالک ہیں دکان کے۔ آپ ان کو سمجھا دینا..... پھر میں بیٹھنے لگوں گا۔'' ساجد بھائی بولتے۔

''ٹھیک ہے۔ آج رات ہی میں سجاد سے بات کر کے اسے سمجھا دوں گی۔'' پھوپی ان کو تسلی دے دیتیں۔

اس طرح پھوپی سجاد بھائی کو سمجھا دیتیں اور ساجد بھائی اگلے روز سے دکان جانا شروع کر دیتے۔ تب پھوپا ان سے پوچھتے۔

''کیوں بھئی۔ اسکول نہیں گئے آج؟'' وہ لال لال آنکھوں سے ساجد بھائی کو گھورتے ہوئے سوال کرتے۔

''وہ..... وہ میں دکان پر بیٹھوں گا۔'' ساجد بھائی ساری دنیا میں صرف اپنے والد سے ہی خوف کھاتے تھے۔

''یعنی جاہل کا جاہل رہے گا۔ پڑھے گا نہیں۔'' پھوپا سر ہلا کر بولتے۔ جواب میں ساجد بھائی ہکلانے لگتے ''وہ..... میں نے امی سے بول دیا تھا۔ انہوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ دکان پر بیٹھ جانا۔''

''اور باپ سے پوچھنا تو فضول ہے۔'' پھوپا کا دماغ گرم ہونے لگا۔

''مم..... میں..... میں.....'' ساجد بھائی ہکلاہٹ کا شکار ہو گئے۔

''کل سے اسکول جانا..... اور پھر اسکول کے بعد گھر سے کپڑے بدل کر کھانا لیتے ہوئے سیدھے دکان پر آنا۔'' پھوپا نے انہیں حکم دیا۔

اگلے روز سے چار و ناچار ساجد بھائی نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا لیکن پڑھائی میں وہ بدستور زیرو کے زیرو ہی رہے۔ وہ صرف اسکول مار کھانے کے لیے جاتے تھے۔ پھوپا نے تنگ آ کر ساجد بھائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ پڑھائی کے وقت برباد نہ کرے اور کوئی ہنر وغیرہ سیکھ لے۔ یہ ساجد بھائی کے دماغ میں بھی یہی بات اچھی طرح سے بیٹھ چکی تھی۔ انہیں واقعی کوئی کام سیکھ لینا چاہیے۔ انہوں نے اس سلسلے میں امی سے بات کی۔ پھوپی نے پھوپا کو سمجھایا۔ آخر پھوپا اس بات پر راضی ہو گئے کہ ساجد بھائی کو اسکول سے اٹھا لیا جائے اور اب وہ سارا دن دکان پر اپنے بڑے بھائی سجاد کے ساتھ بیٹھیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا ساجد بھائی کی اسکول سے چھٹی کے لیے جان چھوٹ گئی لیکن انہیں اردو پڑھنا لکھنا آ گیا تھا۔ اب وہ دکان پر سجاد بھائی کے ساتھ بیٹھنے لگے۔ سجاد بھائی ان کی چالاک کاروباری دماغ رکھتے تھے اور انہوں نے بہت سے کی منصوبہ بندی بھی کر رکھی تھی۔ انہوں نے اس بات کی دبی مخالفت کی تھی کہ ساجد کو ان کے ساتھ دکان پر بٹھایا جائے ان کا کہنا تھا کہ ساجد کو کوئی دوسرا ہنر سیکھنا چاہیے لیکن پھوپا نے ان کی بات رد کر دی۔ اس کے باوجود سجاد بھائی نے یہ کی کہ ساجد بھائی کو کاریگروں کے ساتھ مٹھائیاں بنانے

لگا دیا اور خود صاف ستھرے کپڑوں میں کاؤنٹر پر موجود رہتے تھے۔ تمام کیش انہی کے پاس رہتا تھا۔ ساجد بھائی کو روز کے تھوڑے سے پیسے ملتے تھے۔ تب ساجد بھائی نے کاؤنٹر کی دراز سے پیسے مارنا شروع کر دیئے۔ ایک مرتبہ سجاد بھائی نے ان کو دیکھ لیا اور اپنے والد سے ان کی شکایت کر دی۔

پھوپا نے گھر آتے ہی ساجد بھائی کو مارنا شروع کر دیا۔ ساجد بھائی کی چیخوں سے سارا محلہ جمع ہو گیا۔ پھوپی بے چاری الگ رو رہی تھیں۔ محلے کے بڑوں نے آگے بڑھ کر بچایا۔

''ارے..... ارے..... کیا کر رہے ہو یونس بھائی..... مار ہی ڈالو گے کیا اس بے چارے کو.....؟'' طاہر بھائی نے ان کے ہاتھ سے جوتا چھین لیا۔

''ہاں یہ کمین آج میرے ہاتھوں جان ہی سے مر جائے گا..... اس ذلیل کے اتنے پر نکل گئے ہیں۔ اب یہ اپنے باپ کی چوری کرنے لگا ہے..... اور پتا نہیں کہاں کہاں چوریاں کرتا پھرتا ہوگا..... پوچھو اس سور سے کن دوستوں کے ساتھ رہ رہا ہے یہ..... کن نے سکھائی ہیں اس کو چوریاں..... پوچھو.....''

''کتنی غلط بات ہے ساجد۔'' امین ماموں نے ساجد کو سمجھایا ''کیوں کی تھی تم نے چوری؟''

''مجھے..... مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی.....'' ساجد بھائی نے درد سے کراہتے ہوئے بتایا۔

''ضرورت تھی۔ تو ذلیل مانگ لیے ہوتے منہ سے..... سے مانگتے ہوئے موت آ رہی تھی تجھے۔'' یونس پھوپا پھر ان کی طرف جھپٹے مگر امین ماموں نے بروقت ان کو پکڑ لیا۔

''میں پوچھ رہا ہوں بھائی صاحب۔ ہاں بھئی..... تو تم نے پیسے مانگے کیوں نہیں تھے؟''

''مانگے تھے۔'' ساجد بھائی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بھائی جان سے مانگے تھے..... لیکن انہوں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے پیسے نکالے تھے۔''

''سن لیا..... سن لیا کیسی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اپنا کارنامہ سنا رہا ہے کمینہ کہیں کا۔'' پھوپا چلائے۔

بہرحال لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ پھوپا نے اپنے ایک درزی دوست کی دکان پر ساجد بھائی کو بٹھا دیا۔ اتفاق سے وہاں ساجد بھائی کو ان کے ہم خیال اور ہم دماغ لڑکے مل گئے۔ اس طرح وہ بڑی دلچسپی سے ٹیلرنگ کا کام سیکھنے لگے۔ ان کے استاد بھی مطمئن تھے۔ ساجد بھائی نے بہت تیزی اور محنت سے یہ کام سیکھ لیا تھا۔

یہاں ان کو روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ برے دوستوں کی صحبت میں پڑ کر بہت سی برائیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کیونکہ کام بھی خوب کرتے تھے اس لیے استاد ان کو اچھے خاصے پیسے دیتے تھے۔ یہ تمام پیسے ساجد بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر خرچ کر ڈالتے تھے۔ ان دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے انہوں نے چھپ چھپ کر سگریٹ بھی شروع کر دی تھی۔ پھوپا تو سارا دن دکان پر ہوتے تھے یا پھر باہر کے کام نمٹاتے پھرتے تھے۔ ساجد بھائی پوری آزادی اور مزے سے اپنے شوق پورے کر رہے تھے۔ ان دنوں وی سی آر نیا نیا آیا تھا اور زیادہ تر لوگ سینماؤں میں ہی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ سادہ اور شریفانہ دور تھا۔ اچھے اور شریف گھرانوں کے لوگ سینما میں جا کر فلمیں دیکھنا معیوب سمجھا کرتے تھے۔ ساجد بھائی راتوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ سینما میں فلمیں دیکھنے جانے لگے تھے۔ مگر میں کوئی بھی بہانہ کر دیتے تھے۔ اپنی امی کا تو اتنا ڈر نہ تھا صرف اپنے والد سے ہی جان نکلتی تھی۔ لہٰذا راتوں کو گھر کی دیوار کود کر اندر داخل ہوتے تھے یا پھر آہستہ آہستہ دروازے کی کنڈی بجاتے تھے۔ ان کی امی انتظار میں جاگ رہی ہوتی تھیں۔ وہ جلدی سے جا کر دروازہ کھول دیتی تھیں کہ

کہیں ساجد کے ابو نہ جاگ جائیں۔ وہ ساجد بھائی کو دبی دبی آواز میں ڈانٹتی بھی تھیں اور پیار سے بھی سمجھاتی تھیں۔

ایک مرتبہ ساجد بھائی کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ یونس پھوپا کو کسی جاننے والے نے پکی رپورٹ دے دی کہ ساجد اپنے دوستوں کے ساتھ سینما میں انگلش فلم دیکھنے گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"آج یہ کمینہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔ اس ذلیل کو اپنی عزت کی تو کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ باپ کی نیک نامی پر بھی بٹا لگا رہا ہے وہ کتا۔" پھوپا کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ سارے گھر والے سہمے ہوئے تھے۔

"ارے کسی کام سے گیا ہوگا۔ وہ فلم ولم دیکھنے نہیں جاتا۔" پھوپی نے کھوکھلے سے لہجے میں ساجد بھائی کی حمایت میں کہا۔

"تم گھر میں بیٹھے بیٹھے کیسے بول سکتی ہو۔ ہم باہر رہتے ہیں۔ ہمیں سب معلوم ہیں اس کی حرکتیں۔" پھوپا دہاڑے۔

"کسی نے غلط بتایا ہوگا۔" پھوپی نے ہمت کر کے دوبارہ کہا۔

"کسی کو غلط بتانے کی کیا پڑی ہے۔" پھوپا نے پلٹ کر خوں خوار نظروں سے پھوپی کو گھورا "میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا..... پھر دیکھتا ہوں کیسے جاتا ہے وہ بے ہودہ فلمیں دیکھنے۔"

معمول کے مطابق ساجد بھائی رات کے ایک بجے آئے اور دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ بجانے لگے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ اس وقت سب گھر والے جاگ رہے ہیں اور ان کے والد خاص طور پر ان کے منتظر ہیں۔ اس سے پہلے کہ پھوپی جا کر دروازہ کھولتیں۔ یونس پھوپا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود جا کر دروازہ کھول دیا۔ ساجد بھائی سامنے ہی کھڑے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ صورتِ حال سمجھتے، پھوپا نے انہیں دبوچ لیا اور اندر گھسیٹ لیا۔

"آ گیا مردود..... اب میں تجھے بتاتا ہوں فلمیں کیسے دیکھتے ہیں۔" انہوں نے ساجد بھائی کے سنبھلنے سے پہلے ہی ان کے کنپٹی ہاتھ جڑ دیئے۔ ان کے تو دہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آج انہیں ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بدقسمتی سے ساجد بھائی کے منہ سے سگریٹ کی بو بھی پھوپا نے سونگھ لی۔ وہ گنگ رہ گئے۔ انہوں نے ساجد بھائی کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"بول..... تو نے سگریٹ پی ہے۔ بتا..... چرسی موالی۔" ان کی آنکھوں میں خون کی لالی جھلکنے لگی تھی۔

"نہیں..... نہیں....." ساجد بھائی درد کے مارے سسکتے ہوئے بولے۔

"جھوٹ..... ایک تو نشہ کر کے آرہا ہے۔ اوپر سے باپ سے جھوٹ بول رہا ہے۔" پھوپا نے لاتوں گھونسوں کی گویا مشین چلا دی۔ ساجد بھائی بری طرح چلا رہے تھے پھر وہ زور سے بولے۔

"ہاں..... ہاں پی ہے سگریٹ..... کوئی گناہ تو نہیں کر دیا نا میں نے..... کوئی شراب تو نہیں پی لی ہے نا!"

پھوپا ساکت رہ گئے پھر ان کے منہ سے نکلا "تیری یہ مجال۔ یہ مجال تیری۔ بس اب..... اب ختم..... اب تو ختم....." یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑے۔ پھوپی نے فوراً جان لیا کہ وہ اپنے کمرے میں کیوں گئے ہیں۔ یونس پھوپا کے کمرے میں ایک خفیہ جگہ لائسنس یافتہ دو نالی والی لمبی سی بندوق رکھی رہتی تھی۔ اس وقت وہ غصے میں بھوت بنے ہوئے تھے۔ اگر بندوق لے آئے تو لازماً ساجد بھائی کو گولی مار دیتے۔ پھوپی کے علاوہ ساجد بھائی کی دونوں بہنیں عذرا اور نسرین بھی انہیں بچانے کے لیے دوڑیں۔

"بھاگ لے تو فوراً..... بھاگ جا یہاں سے....." پھوپی کے جسم میں خوف کے باعث لرزہ تھا۔

"ہاں بھائی..... تم کسی کے بھی گھر چلے جاؤ ورنہ ابو....." نسرین نے ساجد بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹا اتنی دیر میں عذرا نے گلی کا دروازہ کھول دیا۔ ساجد نے بھی اسی میں عافیت جانی کہ وہ یہاں سے فی الحال کھسک لیں اور وہ برق رفتاری سے گلی میں آ گئے۔ کئی افراد گلی میں کھڑے تھے غالباً فائرنگ کی آواز سن کر وہ نیند سے بیدار ہو گئے تھے انہیں مکمل صورتِ حال کا تو علم نہ ہو پایا تھا البتہ اتنا ضرور سمجھ گئے تھے کہ ساجد بھائی کی وجہ سے ہنگامہ ہو رہا ہے۔ گلی میں طفیل صاحب بھی کھڑے تھے انہوں نے ساجد بھائی کو بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکلتے دیکھا تو انہیں فوراً آواز لگا دی۔

"ساجد..... ادھر آ..... کہاں بھاگا جا رہا ہے۔"

ساجد بھائی نے طفیل صاحب کو دیکھا اور بڑی تیزی سے ان کی طرف لپکے۔

"چچا بچا لیں۔ مجھے بچا لیں۔ ابو..... مجھے گولی مار دیں گے۔" ساجد بھائی نے طفیل صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"آؤ..... اندر آ جاؤ۔" طفیل صاحب معاملہ فہم اور گھر دار آدمی تھے۔ انہوں نے ادھر ہی تفصیل پوچھنے میں وقت

ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساجد بھائی کو لیے اپنے گھر میں گھس گئے اندر سے انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔

ادھر یونس پھوپا بندوق لیے اپنے کمرے سے باہر نکلے۔

"کدھر ہے یہ کمینہ..... کتا..... آج وہ میرے ہاتھوں قبرستان پہنچ جائے گا۔" انہوں نے بندوق کی نالی کا رخ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

عذرا اور نسرین کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دونوں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ پھوپی کی بھی کم وبیش یہی کیفیت تھی۔ البتہ سجاد بھائی ان لوگوں سے الگ ہٹ کر اپنے کمرے کے نزدیک چپ چاپ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

"وہ..... وہ باہر..... باہر چلا گیا....." پھوپی نے گلی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔

"چلا گیا یا تم لوگوں نے بھگا دیا۔ تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں آلو کا پٹھا ہوں۔" انہوں نے سرخ آنکھوں سے ان لوگوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

ساجد بھائی طفیل صاحب کے گھر چھپے ہوئے تھے اور وہ رات انہوں نے ادھر ہی گزار دی۔ اگلے روز صبح ہی سجاد بھائی اور یونس پھوپا دکان کے لیے چلے گئے۔ تب ساجد بھائی طفیل چچا کے ساتھ اپنے گھر آئے۔ سب نے ان کو سمجھایا پھر جب رات میں یونس پھوپا گھر آئے تو ساجد بھائی ان کے قدموں میں گر گئے اور اپنی زبان درازی کی معافی مانگی۔

کئی افراد نے ان کی ضمانت لی اور بالآخر یونس پھوپا نے انہیں معاف کر دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ ادھر نہیں رہے گا۔ اپنے بڑے تایا کے گھر کراچی چلا جائے گا اور وہیں ازمت وغیرہ کرے گا۔

اس طرح ساجد بھائی کراچی چلے گئے اور ان کے تایا نے ان کو وہاں ٹیک گارمنٹ فیکٹری میں لگوا دیا۔ وہ ٹھیک ٹھاک کمانے لگے۔ کام میں تو پہلے ہی ماہر تھے۔ لہٰذا بڑی جلدی انہوں نے وہاں اپنی جگہ بنالی۔

یہ تمام باتیں مجھے پھوپی نے ہی وقتاً فوقتاً بتائی تھیں۔ ان باتوں میں بہت جھوٹا تھا۔ کئی سال تک ساجد بھائی کراچی میں اپنے تایا کے گھر رہتے رہے تھے۔

پھر ان کا ارادہ واپس حیدرآباد آنے کا ہوا۔ وہ حیدرآباد میں اپنی ذاتی دکان کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت پھوپا نے کافی مالی مدد کی تھی۔ انہیں ایک بارونق جگہ پر موقع کی بڑی سی زمین بھی دلائی تھی۔ جہاں انہوں نے مارکیٹ بھی تعمیر کرالی۔ نیچے بہت سی دکانیں بنوائیں اور اوپر فلیٹ بنوالیے۔ اپنا بڑا سا گھر تو پہلے سے تھا ہی۔ پوری گلی میں سب سے بڑا اور اونچا گھر میری پھوپی کا ہی تھا۔

جب ساجد بھائی کراچی سے واپس حیدرآباد آئے تو ان میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ خوب صورت تو وہ پہلے ہی تھے۔ اب بڑے اسمارٹ اور خوش پوش بھی ہو گئے تھے۔ ہمہ وقت ان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر شرارت سی ناچتی رہتی تھی۔ پچیس سال کی عمر میں بھی ان کے چہرے پر بچوں کا سا بھولپن تھا۔ گلی میں شاید ہی کوئی ایسا تھا جو ان جیسا لباس پہنتا ہو۔ محلے کی کئی لڑکیاں ان میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ ان کے پرانے اور بچپن کے دوستوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"یار تو تو بالکل ہی بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔" مشتاق بھائی نے ساجد بھائی سے کہا "یہ کراچی کا پانی صحیح معنوں میں تجھے لگا ہے۔"

"رنگ بھی بہت صاف ہو گیا ہے۔ کیا کھا رہا تھا وہاں؟" نوید بھائی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"حلال کی کمائی کھا رہا تھا محنت کر کے۔" ساجد بھائی نے ان پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "اگر تم بھی کھا لو تو تمہارا حلیہ بھی درست ہو جائے گا۔"

"اور کوئی لونڈیا پھنسائی کراچی میں؟" مجاہد بھائی نے اوباشوں کی طرح آنکھ ماری اور قاہ قاہ کر کے ہنس دیئے۔ یہ ان کے ہنسنے کا مخصوص انداز تھا۔

"کہاں یار..... وہاں فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ تمہاری طرح فالتو تھوڑی گھومتا رہتا تھا وہاں۔" ساجد بھائی نے بتایا۔

"یا پھر کوئی پھنسی ہی نہیں تجھ سے۔" مجاہد بھائی نے کہا ان کا لہجہ مسخرا اڑانے والا تھا۔

"بیٹے لڑکی پھنسانا میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تو جو بھی لڑکی کہے دو دن میں پھنسا کر دکھا دوں۔" ساجد بھائی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" نوید بھائی بولے "اگر اتنا ہی ناز ہے تو پھر شاہانہ کو پھنسا کر دکھا۔"

"شاہانہ..... کون شاہانہ.....؟" ساجد بھائی چونکے۔

"ابے شاہانہ کو ہی بھول گیا اپنی گلی میں جو رہتی ہے۔" مشتاق بھائی ہنسے۔

"وہ..... وہ شاہانہ..... مگر..... وہ تو چھوٹی سی ہے اپنے سامنے تو اسکول جاتی تھی۔" ساجد بھائی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اب تجھے اسکول بھیج دے گی وہ..... اسے دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔'' مجاہد بھائی اپنے مخصوص انداز میں ہنسے ''اسے پھنسا کر دکھاتو مانیں۔''

''ٹھیک ہے..... پہلے دیدار تو کرنے دے اس کا۔'' ساجد بھائی نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

اور جب ساجد بھائی نے شاہانہ کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ جب وہ یہاں تھے اور کراچی نہیں گئے تھے تو اس وقت شاہانہ اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ محلے کے لڑکے اس کی طرف توجہ کرتے۔ البتہ چند سیانوں نے اسے دیکھتے ہوئے پہلے ہی پیش گوئی کردی تھی کہ اگلے دو چار سال میں یہ لڑکی محلے میں فساد کروائے گی۔ اس وقت شاہانہ اسکول جاتی تھی اور ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ اب وہ کالج میں آچکی تھی۔ ایسا رنگ روپ نکالا تھا کہ لڑکوں نے آوارہ گردی چھوڑ کر گلی کو ہی اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا تھا۔ شاہانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے گھر میں ریوڑیاں اور گزک بنتی تھی۔ اس کے بھائی اور باپ گھر میں ہی سارا دن کام کرتے تھے پھر شام کے وقت دو بھائی اپنے اپنے ٹھیلوں پر ریوڑی گزک فروخت کرنے کے لیے نکل جاتے تھے ایک بھائی گلیوں میں ٹھیلہ لے کر گھومتا پھرتا تھا اور دوسرا بھائی ایک معروف سینما کے آگے ٹھیلہ لگاتا تھا۔ یہی کچھ ان کا ذریعۂ معاش تھا اور اس سے ہی اتنا بڑا گھرانا چل رہا تھا۔ شریف اور ملنسار لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

شاہانہ بہت شریف اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ پہلے تو وہ گھر سے نکل آتی تھی مگر اب کالج آنے جانے کے علاوہ اس کا نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محلے کے لڑکے ہر وقت گلی میں ہی منڈلا رہے ہوتے تھے۔ ساجد بھائی نے اپنی ماموں زاد کے ہاتھوں پسندیدگی کا پیغام شاہانہ تک پہنچا دیا۔ ان کی ماموں زاد شہرین شاہانہ کی سب سے اچھی دوست تھی اور پھر ساجد بھائی نے اتنی تیزی سے قدم بڑھائے کہ شاہانہ کو ہاں کرتے ہی بنی۔ وہ بھی ساجد بھائی کو پسند کرنے لگی تھی لیکن اظہار کرتے ہوئے ٹھہر رہی تھی پھر محلے کے تمام لڑکے دیکھتے رہ گئے اور ساجد بھائی نے میدان مارلیا۔ شروع شروع میں تو ساجد بھائی نے بہت احتیاط کی لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ چھپی رہتی۔ آہستہ آہستہ ساجد بھائی اور شاہانہ کی داستانِ محبت محلے کے بچے بچے کو معلوم ہوگئی۔ ساجد بھائی نے اسے چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ آخر انہوں نے ایک معرکہ سر انجام دیا تھا۔ محلے کے لڑکے ان کی صلاحیتوں کے معترف ہوگئے تھے اور سچے دل سے انہیں اپنا گرو مان لیا تھا۔ پھوپی کا گھر بہت بڑا تھا۔ اس کے بیرونی حصے کی طرف تین بڑی بڑی دکانیں بھی تھیں جو کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ساجد بھائی کراچی سے اس لیے واپس آئے تھے کہ وہ یہاں اپنی ذاتی دکان کھولیں گے۔ انہوں نے اپنی امی سے بات کی اور آخر ان کے لیے ایک دکان خالی کرالی گئی۔ ایک ہی ہفتے بعد ساجد بھائی نے دکان سیٹ کرلی۔ انہوں نے دو کاریگر رکھ لیے تھے اور ایک لڑکے کو باہر کے کاموں کے لیے رکھ لیا تھا۔ سارا دن وہ دکان پر مصروف ہوتے تھے اور رات کے وقت گلی میں ڈیرہ ڈال لیتے تھے۔ سب کو ان کی کہانی معلوم تھی۔ جب پھوپی کو معلوم ہوئی تھی تو انہوں نے دبے دبے الفاظ میں ساجد بھائی کو سمجھایا تھا۔

''یہ شاہانہ کے ساتھ کیا چکر چل رہا ہے تیرا؟'' ساجد بھائی اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ اپنی امی کے پوچھنے پر وہ چونک گئے۔

''چکر نہیں چل رہا ہے بلکہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے۔'' انہوں نے گلے ہی لمحے صاف جواب دیا۔

''تو کیا مطلب ہے تیرا؟'' پھوپی نے بھنک کر انہیں دیکھا۔

''یہی کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ساجد بھائی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''پاگل ہوا ہے کیا؟'' پھوپی نے بمشکل آواز کو بلند ہونے سے روکا۔ ''جانتا ہے وہ لوگ کون ہیں؟''

''کون لوگ.....''

''وہی شاہانہ والے..... اور کون.....''

''انسان ہیں اور کون ہیں۔''

''ذات کے نیچ ہیں وہ۔ اچھے لوگ نہیں ہیں وہ ان کی بس وہی ان کے گھر میں پڑھ لکھ گئی ہے۔ باقی اس کے بھائیوں کو دیکھا نہیں..... سب کے سب جاہل گنوار ریوڑی گزک کے ٹھیلے لگاتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اونچے خاندان والوں نے کہاں شادی کرلی۔''

''کچھ نہیں ہوتا ذات پات سے۔ مجھے کون سا اس بھائیوں سے شادی کرنا ہے۔ مجھے شاہانہ پسند ہے۔ اسے کیسے بھی خاندان سے تعلق رکھتی ہے مجھے اس سے کوئی نہیں ہے۔'' ساجد بھائی نے بے پروائی سے اچکائے۔

''تیرے باپ کو پتا چل گیا تو ایک نئی آفت آجائے گی

جانتا ہے ان کا غصہ ناک پر ہی دھرا رہتا ہے۔ وہ تو مر کر بھی اس رشتے پر تیار نہیں ہوں گے۔ سوچ لے اچھی طرح..... اب بھی وقت ہے۔'' پھوپی نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''سب سوچ رکھا ہے میں نے۔'' ساجد بھائی اپنی بات پر قائم رہے۔ ''کوئی اس رشتے پر راضی ہو یا نہ ہو۔ مجھے تو شاہانہ سے ہی شادی کرنی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔'' ان کا لہجہ اٹل تھا۔

جب ساجد بھائی نے کراچی سے آنے کے بعد اپنی دکان کھولی تو بھی اس وقت میں بھی خاصا سمجھ دار ہوگیا تھا۔ مجھے بھی ان کی لو اسٹوری معلوم تھی۔ ساجد بھائی سے میری بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ہمارا اچھا خاصا ہنسی مذاق تھا لیکن چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں ان کا بڑا احترام بھی کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بالکل اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ ہم اکثر بات بھی کرلیا کرتے تھے۔

''ساجد بھائی..... چھوڑو شاہانہ کا پیچھا..... آگے کچھ نہیں ہو گا..... پھوپا راضی نہیں ہوں گے اس شادی پر۔''

''ہوں..... شادی تو میں پھر بھی کروں گا۔'' وہ بے پروائی سے جواب دیتے۔

''شاہانہ کے گھر والے ہو جائیں گے اس شادی پر راضی؟'' عمران نے ان کے پوچھا۔

''ہو کیا جائیں گے۔ وہ تو پہلے ہی راضی بیٹھے ہیں۔ میں نے اس کے بڑے بھائی سے بات کی تھی۔''

''شاہانہ کے بڑے بھائی سے بات کر بھی لی؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا ''اتنی ہمت کیسے کرلی؟''

''بس کرلی۔ آخر شادی بھی تو کرنی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ہنستے وقت ان کے دونوں گالوں پر گڑھے پڑ جاتے تھے جو بہت بھلے دکھائی دیتے تھے۔

''پھر کیا کہا اس کے بھائی نے؟'' میرے دوست عمران نے پوچھا۔

''وہ تو راضی ہے بے چارہ۔ کہنے لگا ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تم اپنے گھر والوں سے بات کر کے انہیں رشتہ لینے کے لیے بھیج دو۔''

''تو بھیج دو۔'' میں نے کہا۔

''بھیج تو دوں..... مگر..... مگر وہ ابھی ابو کا مسئلہ بھی تو باقی ہے۔ انہیں بھی تو راضی کرنا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ راضی ہوتے ہیں یا نہیں پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اس معاملے کو ایسے ہی بیچ میں تو نہیں چھوڑنا نا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سنجیدہ ہوگئے تھے۔ ساجد بھائی اپنی دکان بہت اچھی طرح سیٹ کر چکے تھے اور وہ بہت خوبی سے چل نکلی تھی۔ ساجد بھائی کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ سب ہی ان سے کپڑے سلوانے لگے تھے۔ ساجد بھائی اپنے کام میں بڑے ماہر تھے۔ ہاتھ میں بڑی نفاست اور صفائی تھی۔ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں ان کا کام عروج پر پہنچ گیا۔ تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ وسیم تیرے اسکول کی چھٹیاں ہیں تو ایک مہینے کے لیے میری دکان پر آجا۔ میں نے گھر والوں سے پوچھ کر ہامی بھرلی اور ان کی دکان پر آنے لگا۔ گاہکوں کے نام، ناپ وغیرہ میں ہی لکھنے لگا۔ ساجد بھائی اور شاہانہ کی محبت دن بدن بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اب تو یہ حال ہوگیا تھا کہ دونوں گلی میں کھڑے ہو کر بھی باتیں کرنے لگے تھے۔ اس بات پر شاہانہ کے بھائیوں نے اس پر سختی شروع کردی لیکن ان کی سختیوں سے بھی شاہانہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ساجد بھائی جتنا کماتے تھے آدھے سے زیادہ شاہانہ پر لٹا دیتے تھے۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ایک بار محلے میں ایک شادی کی تقریب میں لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔

تمام رسومات کے بعد جب کھانے کا وقت آیا تو ساجد بھائی لیڈیز پورشن میں چلے آئے۔ وہاں شاہانہ ان کی منتظر تھی۔ تمام عورتیں، لڑکیاں کھانے میں مصروف تھیں۔ وہ دونوں ایک ٹیبل کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر قریب قریب بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالنے لگے۔ انہیں کسی کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دونوں یہاں تنہا ہیں۔ سب لوگوں کی موجودگی کو انہوں نے یکسر فراموش کر ڈالا تھا۔

بہت سی عورتیں کان پکڑنے لگیں ''توبہ توبہ..... کیا زمانہ آگیا ہے۔ انہیں کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔''

''بے شرمی کی انتہا ہوگئی ہے۔ گھر والوں کو کوئی فکر ہی نہیں ہے۔''

''ارے سب پتا ہوگا ان کے گھر والوں کو۔ جان بوجھ کر کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔''

''اور اس لڑکی کو تو..... ہائے ہائے..... کتنی شریف بنتی تھی..... اب دیکھو ذرا..... کیسے پر نکالے ہیں۔ سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''

جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں تو ضرور ہوں گی۔ یہ بات چھپی تو نہیں رہ سکتی تھی اور بالآخر پھوپا کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ ایک دم جلال میں آگئے ''اچھا..... آوارہ گردی چھوڑی تو اب یہ حرکتیں شروع کردیں۔ باپ کی برسوں کی

بنائی ہوئی عزت کو خاک میں ملا رہا ہے وہ۔ کھلم کھلا عشق لڑایا جا رہا ہے..... اور وہ بھی ایک نیچ ذات کی لڑکی سے۔''

''بہت سمجھایا تھا میں نے۔'' پھوپی نے ڈرتے ڈرتے بتایا ''لیکن وہ مانتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔''

''ادھر ہی گڑھا کھود کر زندہ گاڑ ڈالوں گا کمینے کو۔ چار پیسے کیا کمانے لگا کہ شادی کی بات کرنے لگا ہے۔ اگر شادی ہو گی تو ہماری مرضی سے ہو گی۔ کسی اچھے خاندان میں۔ ایسے گرے پڑوں میں ہرگز شادی نہیں کرنے دوں گا میں۔''

پھوپی بے چاری اور بھلا کیا کہتیں، خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔ ساجد بھائی کا عشق بدستور چلتا رہا۔ ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ان کے والد تھے ورنہ تو شاہانہ کے گھر والے اس رشتے پر راضی تھے۔ شاہانہ کے اور بھی رشتے آ رہے تھے لیکن شاہانہ انکار کر دیتی تھی۔ اس کے گھر والے اسے سمجھاتے تھے کہ اگر ساجد اس سے واقعی شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر اپنے گھر والوں کو رشتہ لینے کے لیے کیوں نہیں بھیج رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ساجد صرف وقت گزاری کر رہا ہے۔ شاہانہ اپنے گھر والوں کی باتیں سن کر ساجد بھائی سے کہتی تو وہ ہنس کر کہتے۔

''اور تم نے یقین کر لیا ان کی باتوں پر۔ کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ میری محبت پر اعتبار نہیں ہے تم کو؟''

''ہے..... ہے..... لیکن ساجد..... کچھ کرو..... جلدی کچھ کرو۔'' شاہانہ سخت پریشانی کے عالم میں بولی ''آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا ہم کس کس کی باتیں سنتے رہیں گے۔ لوگ ہمارے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''بے فکر رہو۔ سب کے منہ بند ہو جائیں گے بس تھوڑا سا اور انتظار کر لو۔ امی، بہن وغیرہ تو تیار ہیں رشتے کے لیے۔ بس ابو کا مسئلہ رہ گیا ہے..... مگر وہ بھی راضی ہو ہی جائیں گے۔ کسی نہ کسی طرح انہیں میں رضامند کر ہی لوں گا۔'' ساجد بھائی نے شاہانہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہ جانے کب راضی کرو گے۔'' شاہانہ نے دوپٹے کا کونہ انگلی پر لپیٹتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا ''تمہیں پتا ہے میرے کتنے رشتے آ رہے ہیں۔ گھر والوں کو میری بہت فکر لگی ہوئی ہے۔ امی بول رہی تھیں کہ ساجد پتا نہیں رشتہ بھجوائے گا یا نہیں۔ بلاوجہ تیری عمر نکلی جا رہی ہے۔''

''جتنی تمہیں فکر ہے اس سے زیادہ مجھے بھی ہے۔ تم معاملے کو ٹالتی رہو۔ میں ابو کو راضی کر لوں گا۔'' ساجد بھائی نے کہا۔

''اور اگر تمہارے ابو تیار نہ ہوئے تو..... تو پھر کیا ہو گا؟''

شاہانہ نے وہ سوال کیا جس نے اندر ہی اندر ساجد بھائی کو بھی ہلکان کر رکھا تھا۔

''تو..... تو پھر میں تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا۔ اس کا بس ایک یہی حل باقی ہے۔'' ساجد بھائی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

لیکن پھوپا کسی بھی طرح ساجد بھائی کی شاہانہ سے شادی پر راضی نہیں ہوئے۔ کس قدر جھگڑے ہوئے ان کے درمیان۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا۔

''ٹھیک ہے یہ شادی کرنا چاہتا ہے نا اس نیچ ذات کی لڑکی سے۔ تو کر لے..... لیکن اس گھر میں ہرگز نہیں رہے گا۔ بھلے یہاں سے کہیں اور دفع ہو جائے لے جائے اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ..... اور ایک پائی نہیں دوں گا اسے..... اور نہ یہ میرے گھر سے کوئی چیز لے کر جائے گا۔ بول دو اس کو۔'' انہوں نے پھوپی سے کہہ دیا تھا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ نہیں لے جاؤں گا۔ مجھے اللہ میاں نے ہاتھ پیر دیئے ہیں۔ کما لوں گا خود ہی۔'' پہلی مرتبہ ساجد بھائی نے اپنے باپ کے آگے زبان کھولی تھی۔ پھوپی اپنی اولاد اور شوہر کے درمیان میں ہکا بکا کھڑی ان کی صورتیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے ساجد بھائی کو دھکیلا۔

''تو..... تو جا ادھر سے۔ کیوں ان کو غصہ دلا رہا ہے تو!''

''دیکھ لیا اس ذلیل کو۔ کیسی زبان چلنے لگی ہے باپ کے آگے۔'' پھوپا چلانے لگے۔ ساجد بھائی نے بھی مناسب سمجھا کہ وہ ان کا سامنا نہ کریں۔ وہ گھر سے نکل آئے اور پھر ایک ہفتے تک گھر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس دوران میں وہ اپنی ایک خالہ کے گھر رہے تھے۔ پہلی بار ساجد بھائی نے اپنے والد کے آگے زبان کھولی تھی جس کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو کر بستر سے جا لگے۔ سارا کاروبار ساجد بھائی نے سنبھال لیا تھا۔ ان کی تو خواہش ہی یہی تھی۔ باپ کی تمام جائداد ان کی ہو جائے اس لیے وہ دبے لفظوں میں ساجد بھائی کے خلاف اپنے باپ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ ادھر شاہانہ کے گھر والوں نے اچانک ہی اس پر بے حد سختی کرنا شروع کر دی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا گھر کے دروازے میں بھی کھڑا ہونا بند کر دیا گیا تھا۔ شاہانہ نے لاکھ شور مچایا، بہت احتجاج کیا، لیکن بھائیوں کے آگے اس کی ایک بھی نہ چلی۔ بلکہ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی جلد از جلد کہیں اور کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ظاہری بات ہے وہ بھی اسی محلے اور اسی گلی میں ہی رہتے تھے۔ انہیں بھی ساجد بھائی کے گھر کے حالات کے بارے میں ایک ایک بات کی رپورٹ مل جاتی تھی۔

انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ساجد کے والد اس رشتے پر کبھی بھی رضامند نہیں ہوں گے اس لیے شاہانہ کو مزید گھر بٹھائے رکھنا حماقت بلکہ کسی حد تک خطرناک بھی ہے۔ لہٰذا انہوں نے شاہانہ کے لیے آئے ہوئے رشتوں کی پڑتال شروع کر دی کہ کون سا رشتہ بہتر رہے گا۔ ساجد بھائی کی توجہ دکان پر سے بہت حد تک ہٹ چکی تھی۔ اب وہ دکان پر کم ہی بیٹھتے تھے۔ میں اپنے دوست عمران کے ساتھ گھر کی چھت پر راتوں میں اب بھی بیٹھتا تھا اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایسے میں ہمارا ایک اور دوست سہیل بھی آ جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہم تینوں کی گفتگو میں ساجد بھائی بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ان کی سرخ آنکھوں اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے سے واضح معلوم ہو رہا تھا کہ وہ نشے میں ہیں۔

''ابے تم تینوں اتنی اتنی دیر تک یہاں بیٹھ کر کیا باتیں کرتے رہتے ہو؟''

''کچھ نہیں بس اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں۔'' میں کہتا۔

''آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ ایسی کون سی باتیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتی ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے ہمارے پاس بیٹھ جاتے۔

''ساجد بھائی تم نے نشہ شروع کر دیا ہے نا؟'' عمران نے ان کی صورت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں..... میں لگ رہا ہوں نشے میں.....'' ساجد بھائی نے خود کو سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

''بالکل..... صاف پتا چل رہا ہے۔ آواز بھی لڑکھڑا رہی ہے۔ منہ سے بھبکے بھی آ رہے ہیں۔'' عمران نے سر ہلایا۔

ساجد بھائی چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گئے پھر ایک طویل سانس لے کر بولے ''یہ محبت بہت بری چیز ہے یار۔ آدمی کو بالکل ناکارہ کر دیتی ہے۔ مجھے دیکھ لو کہیں کا نہیں رہا۔ اب اگر نشہ بھی نہیں کروں تو اور پھر کیا کروں۔''

''اور شادی کا معاملہ آگے بڑھا کہ ابھی ادھر ہی ہے؟'' سہیل نے پوچھا۔

''لگتا ہے اب تو شاہانہ کو بھگا کر ہی لے جانا پڑے گا۔'' ساجد بھائی پھیکے سے انداز میں ہنسے۔

''اس کے بھائی بہت ماریں گے۔'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''ابے اس کے بھائیوں کی ایسی کی تیسی۔'' وہ مکا فضا میں لہرا کر بولے ''وہ سالے مچھر میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ اگر انہوں نے کوئی رکاوٹ ڈالی تو ایسا غائب کرواؤں گا کہ پتا ہی نہیں چلے گا وہ کدھر چلے گئے۔''

اس کے بعد ساجد بھائی صرف شاہانہ کی ہی باتیں کرتے رہے۔ ان کا کوشش کے باوجود کسی بھی طرح شاہانہ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاہانہ کے گھر والے اس کی اس قدر سخت نگرانی کر رہے تھے کہ اگر اس کی کوئی سہیلی بھی اس سے ملنے آتی تھی تو شاہانہ کی والدہ ان کے پاس اس وقت تک بیٹھی رہتی تھیں کہ جب تک سہیلی واپس نہ چلی جائے۔ اس طرح وہ ساجد بھائی کے بارے میں کوئی بات معلوم بھی نہیں کر پاتی تھی۔

یونس پھوپا اب مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ اس وقت انہوں نے سجاد بھائی کی شادی کر دی تھی۔ دونوں بیٹیوں کی شادیاں تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ اب صرف ساجد بھائی ہی رہتے تھے۔ پھوپی ان کو اکثر سمجھاتی رہتی تھیں۔

''دیکھ اب چھوڑ دے اپنی یہ ضد۔ نکال دے شاہانہ کا خیال دل سے۔ تیرے ابو کبھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اگر تو کہے تو ایک سے ایک خوب صورت لڑکی سے تیری شادی کروا دوں گی۔''

''مجھے صرف شاہانہ سے شادی کرنی ہے۔'' ساجد بھائی کا دماغ اسی دائرے میں گھوم رہا تھا۔

''اور کوئی لڑکی نہیں ہے دنیا میں شاہانہ کے علاوہ۔'' پھوپی کو بھی غصہ آ گیا۔

''کم از کم میرے لیے نہیں ہے۔'' ساجد بھائی نے شانے اچکائے۔

''تو تو پاگل ہو گیا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔'' ان کے جواب سے پھوپی کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی۔

''یہ بات تو میں کب سے کہہ رہا ہوں۔'' ساجد بھائی ہنستے ہوئے بولے ''مگر کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔''

ساجد بھائی کا خیال تھا کہ شاہانہ پر سے سختی کچھ دنوں بعد ختم کر دی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں عمران اور سہیل ان کو چھت پر بہت سمجھاتے تھے مگر ان کے دماغ میں شاہانہ کے علاوہ اور کوئی چیز ہی نہیں سما رہی تھی۔ تب پھر اچانک ہی یونس پھوپا کا انتقال ہو گیا۔ انہیں کئی موذی مرض چٹ گئے تھے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئے تھے۔ پھوپا کے انتقال کے بعد صحیح معنوں میں تمام جائداد کے مالک ساجد بھائی بن گئے۔ ان کی دکانوں اور فلیٹس کے جو کرائے آتے تھے وہ ان کی جیب میں جانے لگے۔ وہ اپنی والدہ کو گھر کے خرچ کے لیے ایک اچھی بھلی رقم دے دیتے تھے۔ پھوپی بھی بے چاری سادہ لوح تھیں وہ سجاد بھائی کی چالبازیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اگر بھی

پوچھ بھی لیتیں کہ دکانوں اور فلیٹس سے کرائے کی مد میں اتنا پیسہ آ رہا ہے وہ کہاں ہے تو سجاد بھائی انہیں دس پریشانیاں، انکم ٹیکس اور مختلف حسابات بتانے بیٹھ جاتے تھے۔ جو پھوپی کے سر کے اوپر سے گزر جاتیں۔ اور اصل بات جو کافی عرصے بعد کھلی وہ یہ تھی کہ اندر ہی اندر سجاد بھائی اپنا بینک بیلنس بڑھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ خاموشی کے ساتھ اپنی ذاتی پراپرٹی میں بھی اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ جس کا علم صرف ان کی بیوی کو ہی تھا۔

اِدھر دوسری طرف ساجد بھائی کی بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کافی دنوں سے شاہانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ دکان پر کام بھی کرتے تھے لیکن گاہے بہ گاہے گلی میں چکر بھی لگاتے رہتے تھے، کہ شاید کسی طرح یا اتفاق سے شاہانہ نظر آ جائے۔ انہوں نے گلی کے کئی ہوشیار بچوں کی ڈیوٹیاں لگا دی تھیں کہ جیسے ہی کبھی شاہانہ نظر آئے انہیں دکان پر اطلاع کر دیں۔ ایک رات ہم تینوں چھت پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ساجد بھائی بھی آ گئے وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے نا..... بہت پریشان لگ رہے ہو؟'' سہیل نے ان سے استفسار کیا۔

''خیریت اب کہاں۔ شاہانہ کو اس کے گھر والوں نے کراچی بھیج دیا ہے اس کے ماموں کے پاس۔'' انہوں نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

''اوہو..... یہ تو ظلم ہو گیا تمہارے ساتھ۔'' عمران بولا

''ارے چھوڑو ساجد بھائی۔ اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ کوئی اور لڑکی دیکھ لو اچھی سی۔ تم تو ماشاء اللہ اتنے اسمارٹ، خوب صورت اور کماؤ ہو۔ ایک سے ایک لڑکی مل جائے گی تمہیں۔''

''بیٹے تم یہ بات اس لیے کر رہے ہو کہ تم نے کبھی محبت نہیں کی۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے پھر انہوں نے مجھ سے جگ میں ٹھنڈا پانی منگوایا اور اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک پلاسٹک کی بوتل نکالی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے بوتل دیکھتے ہوئے پوچھا۔ عمران اور سہیل بھی حیرت سے بوتل دیکھ رہے تھے۔

''یہ دوا ہے۔'' انہوں نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اسے جگ میں انڈیل دیا ''اسے پی کر انسان کے سارے غم دور ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا تو یہ شراب ہے۔'' سہیل نے خالی بوتل سونگھی۔ ساجد بھائی ہنسنے لگے۔

ہم لوگ انہیں سمجھاتے رہے اور وہ مزے سے شراب پیتے رہے۔ آخر ایک روز ہمیں یہ خبر ملی کہ شاہانہ کے گھر والوں نے اس کی چپکے سے کراچی میں ہی شادی کر دی ہے۔ ساجد بھائی پر تو یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کے علاوہ کبھی کسی کے سامنے شراب نہیں پی تھی لیکن جب سے انہیں علم ہوا کہ شاہانہ کی شادی ہو گئی ہے تو اس رات انہوں نے گلی میں بیٹھ کر کئی گلاس پی لیے تھے۔ کچی شراب ویسے ہی بہت خطرناک اور تیز ہوتی ہے۔ اسے پی کر ساجد بھائی نے گلی میں زور زور سے شاہانہ کا نام لے کر چلانا شروع کر دیا اور اس کے گھر کے آگے پہنچ گئے۔ شور سن کر گلی والے نکل آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ساجد بھائی شاہانہ کے گھر کے دروازے پر لاتیں گھونسے مار رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو گالیاں دیتے ہوئے باہر نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ بمشکل گلی کے لڑکوں نے انہیں پکڑا اور واپس لے آئے۔ پھوپی نے ان کی یہ حالت دیکھی تو رونے لگیں۔

ساجد بھائی الٹا ساجد بھائی پر گرم ہو گئے ''بس اب شراب کی کمی رہ گئی تھی۔ آج وہ بھی پوری ہو گئی۔ اس کی ایسی ہی حرکتوں کی وجہ سے ابو مرے تھے۔ اس نے جلا جلا کر مار ڈالا ہے انہیں۔ خود کی تو کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ ہماری عزت بھی دو کوڑی کی کر کے رکھ دی ہے۔ اب ماں بچی ہے اسے بھی کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگانا ہوا ہے۔''

''اس پر اثر ہی کہاں ہوتا ہے۔ باتیں سن سن کر اب تو عادی ہو گیا ہے۔'' سجاد بھائی کی بیوی یاسمین بھابی بھی تڑخ کر بولی اٹھیں۔

''یہ اب گھر میں نہیں رہے گا۔ اگر یہ رہا تو پھر میں نہیں رہوں گی۔'' سجاد بھائی نے اپنی والدہ سے کہا۔

''نا میں رہوں گا..... چلا جاؤں گا..... اب خوش.....''

ساجد بھائی نے سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''اتنی ہی ناک ہے تو ابھی دفع ہو جا اور ہے۔'' سجاد بھائی نے چلا کر کہا۔

''کیا ہو گیا ہے سجاد۔'' محلے کے ایک بزرگ حاجی صاحب نے انہیں سمجھایا ''وہ تو اپنے ہوش میں نہیں ہے تم بھی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ ہوش میں آئے گا تو میں اسے سمجھا دوں گا۔''

سجاد بھائی اور یاسمین بھابی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ میں بھی وہاں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ ساجد بھائی شاہانہ کا غم بھول جائیں گے اور اپنی تقدیر سے سمجھوتا کر لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے خود کو شراب میں ڈبو لیا تھا۔ تھوڑا بہت

پہلے دکان کو وقت دے لیتے تھے اب اس سے بھی گئے۔ نتیجتاً دکان تباہ و برباد ہو کر رہ گئی۔ گاہکوں سے جھگڑے ہونے لگے۔ دکان پر ہر وقت ان کے بدمعاش ٹائپ کے دوست بیٹھے رہتے تھے۔ خوب خوب بوتلیں چلتی تھیں۔ ان کے کئی دوست کافی اثر و رسوخ والے بھی تھے اس لیے انہیں پولیس وغیرہ کا بھی ڈر نہیں تھا اور پھر جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا جب سجاد بھائی نے دکان میں اپنے ہاتھوں سے تالے ڈال دیئے۔ اس رات ان کے گھر بڑا جھگڑا ہوا۔

''بس اب اسے دکان نہیں ملے گی۔ وہاں بیٹھ کر ہوتا ہی کیا ہے۔ دوستوں بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی جاتی ہے۔ قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ اس کی دکان داری اب رہی کہاں ہے۔'' سجاد بھائی اپنی والدہ سے کہہ رہے تھے۔ اتفاق سے میں بھی وہاں موجود تھا ''امی اس کو کہہ دیں کہ یہ کہیں جا کر نوکری یا مزدوری کر لے..... مگر اب اس کو دکان ہرگز نہیں ملے گی۔''

''کیسے نہیں ملے گی۔'' ساجد بھائی کو بھی غصہ آ گیا ''وہ میری دکان ہے۔ میرے باپ نے مجھے دی تھی۔ آپ تو ساری مارکیٹ لپنے ہاتھ میں کر کے آرام سے کمار ہے ہیں اور میرا ایک دکان پر بھی حق نہیں ہے؟''

یہ سنتے ہی سجاد بھائی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے ''لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے نا کہ تم وہاں بیٹھ کر شراب پیو۔ عیاشیوں کو جمع کر لو۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ ہمارے باپ دادا نے بھی شراب نہیں سونگھی اور تو بے دریغ پی رہا ہے۔''

''میری مرضی میں کچھ بھی کروں۔ چاہے وہاں ننگا ہو کر ناچوں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے ٹوکنے والے۔'' ساجد بھائی کا دماغ گھوم گیا۔

''ساجد بھائی آرام سے۔ ایسی بات نہ کریں۔'' اس موقع پر میں نے مداخلت کی۔

''میں اس کو اندر لے جا۔ خوا مخواہ جھگڑا بڑھے گا۔'' پھوپی نے پریشان ہو کر مجھ سے کہا اور میں ساجد بھائی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے کمرے میں لے آیا پھر انہیں کافی دیر تک سمجھاتا رہا۔ کچھ بھی تھا۔ ساجد بھائی نے بدتمیزی کی تھی۔ ساجد بھائی کیسے بھی سہی لیکن ان کا کہنا درست اور بجا تھا۔ کم از کم انہیں دکان دکان سمجھنا چاہیے تھا وہ روزگار کی جگہ تھی۔ اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ ساجد بھائی یہ سب کچھ شاہانہ کے غم کی وجہ سے کر رہے تھے۔ ان کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ بار ہا وہ عمران، سہیل اور مجھ سے کہہ چکے تھے کہ اب انہیں زندہ رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں بھلا دکان اور کمانے سے کیا دلچسپی ہو گی۔

''یہ تو حماقت ہے۔ بھلا ایک عام سی لڑکی کے لیے زندگی سے دشمنی کہاں کی عقل مندی ہے۔'' میں نے ان کی بات پر اعتراض کیا۔

''بس تم اسے کچھ بھی سمجھ لو۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولے ''وسیم میری ایک بات یاد رکھنا۔ کبھی کسی سے محبت نہ کرنا۔ ورنہ کہیں کے نہیں رہو گے۔'' ان کی اس بات پر میں خاموشی کے ساتھ انہیں دیکھتا چلا گیا۔

ساجد بھائی نے ان سے الجھنا تو چھوڑ دیا تھا مگر دوسرے طریقوں سے انہوں نے اپنی کارروائیاں جاری رکھی تھیں۔ وہ اپنی جیب سے ساجد بھائی کو ایک روپیہ بھی نہیں دیتے تھے۔ دکان تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ مزاج ایسا پایا تھا کہ اب وہ کسی کی نوکری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساجد بھائی کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ سگریٹ کی لت تو بہت پہلے سے تھی۔ ایک ایک سے سگریٹ مانگ کر پینے لگے۔ اکثر میں سگریٹ کا پاکٹ اور ماچس خرید کر ساجد بھائی کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیتا تھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسے رہ جاتے اور کہتے۔

''بتاؤ یار۔ عشق کو ہمیں یہ دن بھی دکھانے تھے۔ کہاں ہماری جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں اور کہاں اب ہم ایک ایک روپے کو ترس رہے ہیں۔'' ان کے بہت سے مطلب پرست اور خود غرض دوست ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ساجد بھائی کو اس بات کا بھی بے انتہا دکھ تھا۔ ان کے ایک دوست نے انہیں ایک سستا آئٹم بتا دیا جو شراب سے زیادہ تیز ہوتی تھی اور نشہ آور بھی۔ وہ کوئی دوائی کی بوتل تھی جو میڈیکل اسٹورز پر مل جاتی تھی لیکن اس کا حصول اتنا آسان نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر میڈیکل اسٹورز والے وہ نہیں دیتے تھے۔ ایک روز میں نے ساجد بھائی کے پاس وہ دوائی کی بوتل دیکھی تب انہوں نے ہی اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس بوتل پر واضح الفاظ میں ''زہر'' لکھا تھا۔ میرا تو دماغ ہی سن ہو کر رہ گیا تھا۔ ساجد بھائی جان بوجھ کر زہر پی رہے تھے۔

''یہ تو زہر ہے ساجد بھائی۔'' میں نے بوتل پر لگا ہوا لیبل انہیں دکھایا۔

''معلوم ہے۔'' وہ تلخی سے ہنسے ''ہم تو عشق کا زہر پی چکے ہیں اور اب تک زندہ ہیں بھلا یہ زہر ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔''

وہ صحیح معنوں میں عاشق تھے۔ انہوں نے ثابت کر دیا تھا۔ ادھر شاہانہ کے بارے میں صرف یہ پتا لگ سکا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ اس خبر نے ساجد بھائی کو مزید

توڑ کر رکھ دیا تھا جس کی خاطر انہوں نے زندگی کی رنگینیوں سے منہ موڑا تھا وہ کسی اور کے ساتھ خوش تھی۔ ساجد بھائی کو سب سے زیادہ اسی بات کا صدمہ تھا۔ کون کس کو کب تک سمجھاتا ہے۔ آخر ساجد بھائی کو سمجھانے والے انہیں تھپتھپا کر کے تھک گئے۔ صرف پھوپی تھیں جو انہیں اب تک سمجھاتی تھیں۔ اپنی جوان اولاد کی یہ حالت دیکھ کر وہ کڑھتی رہتی تھیں۔ ساجد بھائی اور ان کی بیوی یاسمین بھابی کا رویہ ساجد بھائی کے ساتھ تحقیر آمیز ہوتا تھا۔

سخت سردیوں کے موسم میں ہم نے چھت پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک رات میں پھوپی کے گھر ٹی وی پر ایک ڈراما دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ پھوپی بھی تھیں ڈراما بڑا دلچسپ تھا۔ ساجد بھائی، یاسمین بھابی اپنے کمرے میں تھے۔ اتنے میں مین گیٹ پر دستک ہوئی۔ میرے جانے سے پہلے سجاد بھائی اپنے کمرے سے نکل کر دروازے تک جا پہنچے شاید وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے تھے۔ دروازہ کھلنے پر سجاد بھائی کا منہ بن گیا۔ سامنے ساجد بھائی کھڑے تھے آج ان کا حال کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہا تھا کھڑے کھڑے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ساجد بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ساجد بھائی اندر آئے۔ مجھے دیکھا تو بولے۔

''ابے تو اب تک یہاں ہے.....''

''ڈراما دیکھ رہا تھا..... بڑا اچھا ہے۔ دیکھ لو تم بھی.....'' میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انہوں نے معافی کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور لڑکھڑاتے لہجے میں بولے ''معاف کردے بھائی..... میں بھلا کیسے دیکھوں گا..... مجھے تو ٹی وی ہی چار چار نظر آرہے ہیں.....'' کہہ کر وہ جھومتے جھامتے چلے گئے۔ ڈراما دیکھنے کے بعد میں گھر واپس آ گیا۔ اگلی صبح میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں سے میری واپسی ایک بجے ہوئی تھی۔ جب میں گلی میں داخل ہوا تو ایک چبوترے پر نعیمہ باجی کو بیٹھا روتے دیکھا تو بڑا حیران ہوا میں ان کی طرف بڑھا اور پوچھا۔

''خیریت تو ہے نعیمہ باجی..... کیوں رو رہی ہو آپ؟''

انہوں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ بولیں ''مجھے نہیں معلوم.....''

''آخر ہوا کیا..... بتاؤ تو.....'' میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''اپنے ساجد کا انتقال ہو گیا ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔'' انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا اور میرے جسم سے جان نکلتی چلی گئی۔ ایسا لگا کہ میں دھڑام سے زمین پر گر جاؤں گا۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کیسے میں نے یہ معمولی سا فاصلہ جو مجھے کوسوں میل کا لگ رہا تھا طے کیا اور پھوپی کے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ پورا گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رونے اور بین کرنے کی آوازیں کلیجا کاٹے دے رہی تھیں۔ ایک عجیب سی وحشت طاری کر دینے والی سوگواری طاری تھی۔ زیادہ تر گلی محلے اور خاندان کے لڑکے رو رہے تھے۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ ساجد بھائی میرے بہت اچھے بھائی اور دوست تھے۔ ان کے جنازے میں اکثریت نوجوان لڑکوں کی تھی سب رو رہے تھے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ رات کے وقت وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے تھے پھر انہیں شدید گرمی لگی تو وہ صحن میں آ کر لیٹ گئے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی اور وہ ایسے ہی ٹھنڈے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ پھوپی تو اپنے کمرے میں جا کر سو چکی تھیں۔ اس وقت تک سجاد بھائی واپس نہیں آئے تھے۔ جب آئے تو یاسمین بھابی نے دروازہ کھولا تھا پھر دونوں اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال گونج رہا تھا کہ کیا سجاد اور یاسمین نے صحن میں پڑے ہوئے ساجد کو نہیں دیکھا؟ کیا ان دونوں میں سے کسی ایک کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی؟ سجاد بھائی اور یاسمین بھابی کا کہنا تھا کہ واقعی انہوں نے ساجد کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح بہت سے لوگوں کو ان کی بات پر یقین نہیں آیا ہوگا۔

اور یہ بات بہت عرصے بعد کھلی تھی کہ سجاد بھائی نے شاہانہ کے بڑے بھائی سے کہہ دیا تھا کہ ساجد اب شاہانہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہے لہٰذا تم لوگ شاہانہ کی شادی جہاں چاہو کر دو اور اس طرح ان لوگوں نے شاہانہ کی شادی کہیں اور کر دی۔ شاہانہ نے بھی یہ سمجھا تھا کہ ساجد اب اس سے واقعی شادی نہیں کرے گا۔ اس لیے اس نے اپنے نصیب سے سمجھوتا کر لیا تھا اور شوہر کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

نہ جانے ساجد بھائی جیسے کتنے عاشق صادق ہوں گے جو عشق میں جاں سے گزر گئے ہوں گے لیکن کم از کم آج کے دور میں ایسے چاہنے والے نظر نہیں آتے۔ وہ محبتیں اب فنا ہو چکی ہیں!

*

فیصلہ

مکرمی ایڈیٹر صاحب، آداب عرض۔

میرے خیال میں اگر انسان دوسروں کی غلطیاں تلاش کرنے اور ان پر انگلی اٹھانے سے پہلے خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لے تو بہت سی آفات آنے سے پہلے ہی رک جائیں۔ لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ مرد خاص طور سے ہر معاملے میں خود کو نہ جانے کیوں بہت سی **پابندیوں** سے مبرّیٰ سمجھتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں بھی آ تو گئی، مگر میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی غلطی کا کھل کر اعتراف کرسکوں البتہ اپنی غلطیوں کی تلافی کا ایک عمدہ راستہ مجھے مل گیا تھا۔ اللہ ہم سب کو سیدھی راہ دکھائے۔ آمین۔

آپ کی خیریت کا طالب

اسلم ..... لاہور

آخری خط مکمل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پیر سے جان نکل چکی ہو۔ ایک سکتے کا سا عالم تھا جس میں نہ جانے کتنی ہی دیر میں مبتلا رہا تھا۔ ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو پہلا احساس یہ ہوا کہ میں رو رہا ہوں۔

''میں رو کیوں رہا ہوں؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''مجھے رونا نہیں چاہیے۔'' میں نے خود سے کہا۔

''مجھے تو اسے قتل کر دینا چاہیے جس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔'' میں نے سوچا تھا اور پھر اسی ارادے سے میں اٹھا بھی تھا لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گیا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' میں نے خود سے کہا۔

''وہ اکیلی اس جرم میں شریک نہیں ہے۔'' ذہن کے اس گوشے نے جس میں اب بھی اس کی حمایت موجود تھی، دلیل دی اور پھر میں اس سمت سوچنے لگا لیکن اس کے شریکِ جرم کے نام کا صرف ایک حرف میں ان خطوط کے ذریعے جان سکا تھا۔

میں نے دوبارہ خط پڑھنے شروع کیے لیکن صورتِ حال ایک بار پھر وہی رہی تھی مگر دوسری بار خطوط پڑھنے سے مجھے اس بات کا بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ''معاملات''

ابھی صرف خطوط تک ہی ہیں، حالانکہ اپنے آخری خط میں بھی ''ن'' نے بہت زور دیا تھا کہ ''عید'' پر وہ ضرور ملنا چاہتا ہے۔ چاہے یہ ملاقات چند منٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔ دوسری بار خط پڑھ لینے کے بعد میں کسی حد تک پُرسکون ہو چکا تھا۔

''اس کا جواب تو خود زرینہ ہی دے سکتی ہے۔'' میں نے خود ہی جواب دیا۔

شام کے سائے بڑھ رہے تھے لیکن میں نہر کے کنارے بیٹھا رہا، میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف جاؤں اور پھر ذہن اس روز صبح کے ہونے والے واقعات کو دہرانے لگا۔

وہ عید کا دن تھا۔ میں رات ہی گاؤں پہنچا تھا اور صبح اٹھتے ہی عید کی نماز کی تیاریوں میں لگ گیا تھا۔ ان تیاریوں میں میرا چھ سال کا بیٹا بھی میرے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ وہ پہلی عید تھی جب وہ میرے ساتھ نماز پڑھنے جا رہا تھا اور یہ اسی کی ضد تھی کہ وہ پرفیوم لگائے بغیر نماز پڑھنے نہیں جائے گا۔

''بابا..... یہ والی نہیں۔'' اس نے میرے ہاتھ میں موجود پرفیوم کی شیشی دیکھ کر کہا تھا۔

''وہ والا پرفیوم لگاؤں گا جو امی لگاتی ہیں۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''یار وہ تو عورتوں والا پرفیوم ہے۔'' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کس پرفیوم کی بات کر رہا ہے لیکن اسے ٹالنا ضروری تھا کیونکہ اس پرفیوم کی شیشی میز پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

''لیکن میں تو بچہ ہوں۔'' اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

''تم بچے تو ہو لیکن یہاں پر وہ شیشی نظر نہیں آ رہی ہے۔'' میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی۔

''امی وہ پرفیوم یہاں رکھتی ہیں۔'' اس نے ایک دراز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس کی ہاتھ کی پہنچ سے اونچی تھی۔

میں نے اس کی بتائی ہوئی دراز کھولنی چاہی لیکن وہ لاک تھی۔

''یار یہ تو لاک ہے۔'' میں نے بیٹے سے کہا۔

''چابی ادھر رکھی ہے۔'' بیٹے نے الماری کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں اس نے اشارہ کیا تھا وہاں چابی موجود تھی۔

میں نے دروازہ کھولا سامنے ہی وہ پرفیوم موجود تھا جس کی بیٹا ضد کر رہا تھا لیکن پرفیوم کی بوتل کے نیچے ایک عدد عید کارڈ بھی رکھا تھا۔

یہ عید کارڈ خاصا قیمتی تھا اس لیے میں نے یونہی بغیر سوچے اسے اٹھا لیا لیکن اسے کھولتے ہی جیسے میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا۔

''اسی زری کے لیے جسے میں اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔''

میں نے وہ فقرہ پڑھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

''بابا.....'' پرفیوم لگائیں۔'' میرے بیٹے نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ ''امی آ گئیں تو ناراض ہوں گی۔'' اس نے مجھے اپنے تئیں معاملے کی نزاکت سمجھانی چاہی۔

میں نے بیٹے کی ضد پوری کی اور عید کارڈ اور پرفیوم رکھنے سے پہلے میں نے دراز کے اندرونی حصے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں مجھے خطوط کا ایک بنڈل سا نظر آیا۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اسی وقت پڑھتا اس لیے میں نے خطوط نہ جانے کیوں جیب میں ڈال لیے اور پرفیوم اور عید کارڈ واپس اپنی جگہوں پر رکھ کر میں بیٹے کو لیے عیدگاہ کی جانب چل پڑا تھا۔ اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی نماز میں نے اس طرح پڑھی ہو جیسے کہ یہ عید کی نماز پڑھی تھی لیکن عیدگاہ سے واپسی پر میرا ایک ایک قدم جیسے من من کا ہو رہا تھا پھر اسی کیفیت میں گھر جانے کے بجائے میں باجی کے گھر کی جانب چلا گیا تھا۔

اس گھر سے میرے کئی رشتے تھے۔ باجی کا گھر ہونے کے علاوہ وہ میری سسرال بھی تھی اور میری باجی کا گھر بھی تھا، میرا بہنوئی زرینہ کا بھائی تھا۔

آٹھ برس پہلے جب میں ملیشیا سے باجی کی شادی میں شرکت کے لیے پہنچا تھا تو مجھے گاؤں پہنچ کر معلوم ہوا تھا کہ شادی صرف باجی کی نہیں بلکہ میرے دونوں کی بھی شادی ہے۔ اپنی دلہن کا نام سن کر میں نے انکار کرنا چاہا تھا لیکن پھر مجھے راضی ہونا ہی پڑا تھا۔

میرے انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی بلکہ صرف اور صرف میری اور زرینہ کی عمر کا فرق میرے ذہن میں تھا۔ چار سال قبل جب میں ملیشیا گیا تھا تو وہ پانچویں کلاس میں تھی اور میں انٹر کر چکا تھا۔

جملہ عروسی میں داخل ہونے تک میرے ذہن میں زرینہ کا وہی خیال تھا۔ گرمیوں کی دوپہر میں چپکے سے گھر سے نکل جانے والی اور پھر اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل کود کی مصروف جانے والی لیکن جب گھونگٹ اٹھایا تو اس میں سے ایک مختلف زرینہ نکلی تھی۔

''تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔'' میرے ہونٹوں سے

اختیار نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی جھکی جھکی نظریں کچھ اور جھک گئی تھیں۔

رات جب صبح میں تبدیل ہوئی تو میں اپنی اس حماقت پر خود نادم تھا کہ میں زرینہ جیسی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کرتا رہا تھا۔

میں ملیشیا غیر قانونی طور پر گیا تھا اور میرا وہاں قیام بھی غیر قانونی ہی تھا لیکن واپس آتے ہوئے میں اتنا انتظام ضرور کر آیا تھا کہ مجھے دوبارہ ملیشیا جانے میں کچھ زیادہ رکاوٹوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میرا پروگرام یہ تھا کہ ایک ماہ میں ہی دوبارہ جانے کی تیاری کروں گا۔ زرینہ نے کچھ اس طرح اپنا اسیر کیا کہ مجھے اپنے ارادے ڈانواڈول ہوتے ہوئے نظر آئے۔ رہی سہی کسر ایک رات زرینہ نے پوری کر دی۔

''آپ واپس جائیں گے؟'' اس نے میرے سینے میں چہچہاتے ہوئے سوال کیا۔

''جانا تو ہے۔'' میں نے اوپری دل سے کہا۔

''آپ نہ جائیں۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور مجھے اپنے ارادوں کی عمارت ہلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''گاؤں میں رہ کر کیا کروں گا؟'' میں نے اسے آنے والی معاشی مشکلات سے آگاہ کرنا چاہا لیکن اس کا جواب بھی اسی کے پاس تھا۔

''آپ بھائی کی طرح کوئی نوکری کر لیں۔'' اس نے میرے بہنوئی اور اپنے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا اور میری ہلتی ہوئی ارادے کی عمارت زمیں بوس ہو گئی۔

''میں صبح بات کرتا ہوں۔'' میں نے اپنا ارادہ بتایا اور اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

''میں نے باجی سے بات کی تھی۔'' اس نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''باجی نے آج ہی مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے بھائی سے بات کی تھی اور بھائی نے کہا ہے کہ اگر آپ واپس جانے کا ارادہ نہیں کرتے تو ان کے یہاں اسٹور میں ایک نوکری ہے۔'' زرینہ نے تفصیل بتائی۔

''لیکن یہاں پیسے تو کم ملیں گے۔'' میں نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر سینے میں سر چھپا لیا تھا۔

''میں چٹنی روٹی کھا کر بھی گزارہ کر لوں گی۔'' اس نے شرمائے شرمائے انداز میں کہا تھا۔

ملیشیا واپسی کا ارادہ اس وقت بالکل ہی ختم ہو گیا جب میرے بہنوئی نے مجھے اس فیکٹری کے مالکان سے ملوا دیا۔ جہاں وہ کئی برسوں سے ملازم تھا اور مجھے اگلے ہی دن سے نوکری پر حاضر ہونے کو کہا گیا۔

میں لاہور آیا تو تھا صرف انٹرویو دینے لیکن میری واپسی پورے ہفتے بھر بعد ہوئی تھی لیکن زرینہ اس کے باوجود خوش تھی اور اس نے اپنی اس خوشی کو ظاہر کرنے میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔

زندگی ایک پٹری پر آ گئی۔ میں چھٹی والی رات گھر پہنچ جاتا اور چھٹی کا دن گزار کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتا لیکن یہ احساس مجھے تھا کہ اس تنخواہ میں زرینہ کو میں وہ خوشیاں نہیں دے سکوں گا جو اس کا حق ہیں اور یہ احساس کہ مجھے اپنی تعلیم جو جاری رکھنا چاہیے اس وقت زیادہ ہوا جب زرینہ نے مجھ سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی بات کی تھی۔

''میں گھر میں یوں بھی بور ہوتی ہوں، کم از کم میٹرک ہی کر لوں گی۔'' اس کا کہنا تھا۔

میں نے چپکے چپکے بی اے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن کبھی کوئی کتاب گھر نہیں لاتا تھا جبکہ زرینہ چھٹی والے روز بھی اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔

ہماری شادی ہوئی تو وہ نویں میں تھی اور امتحان دینے کی

زندگی سنوارنے اور نکھارنے والی
کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی
مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
احساس کمتری
اسباب ۔۔۔ تدارک ۔۔۔ علاج
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ.....
قیمت 30 روپے ۔۔۔ ڈاک خرچ 23 روپے
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 کراچی 74200
فون: 5802551 5802552-5893313 فیکس:

تیاری بھی مکمل تھی لیکن ابھی امتحانوں میں بہت دن تھے کہ ہمارے پہلے بیٹے کی آمد کا اعلان ہوگیا اور امتحانوں سے پہلے اس کی طبیعت اس طرح خراب ہوئی کہ وہ امتحان نہ دے سکی لیکن بیٹے کی پیدائش کے کچھ دن بعد اس نے پھر سے اسکول جانا شروع کردیا۔ وہ اپنی باقی ساتھیوں سے پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس کی اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔

زرینہ نے میٹرک اور میں نے بی۔اے ساتھ ساتھ کیا لیکن میں نے بی۔ اے کرنے کے ساتھ کمپیوٹر کے چھوٹے چھوٹے کچھ اور کورس بھی کرلیے تھے۔

میں نے چاہا کہ میری پہلی والی نوکری پر بھی مجھے ترقی مل جائے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو میں نے دوسری نوکری تلاش کرنی شروع کردی اور پھر کچھ دنوں بعد مجھے ایک زیادہ بڑی فیکٹری میں دوگنی تنخواہ پر ایک ملازمت مل گئی۔

میں نے نئی ملازمت شروع کی تو میرے بہنوئی اور میرے تعلقات میں دراڑ آ گئی۔ وہ مجھ سے اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے ان کے کہنے پر ملنے والی نوکری چھوڑنے سے پہلے ان سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

زرینہ اپنے بھائی سے اس بات پر مجھ سے زیادہ ناراض تھی یہاں تک کہ اس نے میکے جانا بھی تقریباً ختم کردیا۔ بھائی کی موجودگی میں تو وہ بالکل ہی نہیں جاتی تھی۔

ایم۔ اے کا پرائیویٹ امتحان چپکے چپکے دینے کے بجائے میں نے زرینہ کو بتانا ضروری سمجھا تھا لیکن جب میں نے اس سے بات کی تو اس نے بھی پی ٹی سی میں داخلے کی خواہش ظاہر کردی۔

''تم ٹیچر بنو گی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''فی الحال تو میں صرف کورس کرنے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔'' اس نے میرے مذاق کا برا مانے بغیر کہا تھا۔ سال بھر بعد اس کا یہ کورس بھی مکمل ہوگیا لیکن اس کے کچھ دنوں بعد ہم ایک بیٹی کے بھی والدین بن گئے۔

اپنی نئی نوکری میں مجھے ایک بڑا بریک اس وقت ملا جب فیکٹری مالکان کے علم میں یہ بات آئی کہ مجھے کمپیوٹر میں بھی شدھ بدھ ہے۔ انہوں نے اسٹور کا پورا سسٹم کمپیوٹر پر منتقل کرنے کے فیصلہ میں مجھ سے بات کی اور میں نے ان سے اتفاق کیا کہ اس طرح سے کام بھی کئی گنا بڑھ جائے گا۔

تنخواہ میں اضافے کے ساتھ ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں لیکن میں ایمانداری اور تندہی سے اپنا کام کررہا تھا کہ میرے بہنوئی کو بغیر کسی معقول وجہ کے نوکری سے نکال دیا گیا۔ بہنوئی نے اس پر یہ کیا کہ نئی نوکری ڈھونڈنے کے بجائے گاؤں میں ہی دکان کھول لی اور زرینہ کو ایک اور بہانہ مل گیا۔ اب اس نے ضد کرنی شروع کردی کہ میں بھی نوکری چھوڑ کر گاؤں واپس آ کر بھائی کی طرح کوئی کاروبار شروع کردوں لیکن میں نے اپنی نئی نوکری سے بڑی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔

دوسری بیٹی کی پیدائش تک یہ ضد اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی کہ اچانک ایک دن زرینہ نے نوکری کرنے کی بات کردی۔

''تم کہاں نوکری کرو گی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''قصبے کے اسکول میں۔'' اس کا جواب تھا۔

میرے سوال کے جواب میں جو تفصیل اس نے بتائی وہ کچھ اس طرح تھی کہ قصبے کے گرلز اسکول میں کچھ آسامیاں خالی ہیں اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے گاؤں سے جانے والی ایک استانی کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا کہ زرینہ چاہے تو وہ فوری طور پر اس کی نوکری کا بندوبست کرسکتے ہیں۔

قصبے کا یہ اسکول بیک وقت بوائز سیکنڈری اور گرلز پرائمری اسکول تھا جس کی انتظامیہ ایک ہی تھی لیکن دونوں حصے الگ الگ تھے۔

مجھے زرینہ کے نوکری کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لیے میں نے یہ کہتے ہوئے اسے اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ بچوں کی ذمے داریوں کے ساتھ وہ نوکری کرسکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

زرینہ کی نوکری پر اس کے بھائی نے اعتراض کیا اور اس اعتراض میں باجی اور میری والدہ کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں لیکن پھر یہ آوازیں آہستہ آہستہ دب گئیں۔

زرینہ پہلی تنخواہ لے کر آئی تھی تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا کہ وہ تنخواہ بینک میں جمع کروادے کیونکہ گھر کا خرچ تو یوں بھی چل ہی رہا ہے۔ زرینہ نے میری بات پر عمل ضرور کیا، لیکن ہر ماہ وہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم نکال لیتی تھی اور یہ رقم وہ اپنے کپڑوں اور دوسری ضروریات پر خرچ کرتی تھی۔

زندگی کی گاڑی ایک مخصوص رفتار سے چل رہی تھی کہ یہ واقعہ ہوا جس نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے کس راستے پر قدم بڑھانا ہے۔ وہ دن بھی میں نے بظاہر خود پر کنٹرول کیے ہوئے گزارا تھا لیکن جس طرح گزارا تھا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ نماز کے بعد باجی کے گھر جانے پر میں نے خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میری اندرونی کیفیت میری ماں جائی سے چھپی نہ رہ

ایک زہرہ جمال، فتنہ خصال کے
ماورائی کمالات کا قصہ

اُنکا

اپنے وقت کی مقبول ترین کہانی
جمیل احمد خان کی سرگزشت

ماہنامہ سب رنگ میں شائع ہونے والی اپنے وقت کی مقبول ترین کہانی

6 انچ کی وہ گڑیا بڑے بڑے شہہ زوروں سے زیادہ طاقت کی مالک تھی۔ انسانی خون اس کی غذا اور انسانوں کے سروں پر اس کا بسیرا تھا۔ اس کی تسخیر کا خواب بڑے بڑے پنڈتوں کی نیندیں حرام کیے رکھتا۔ بڑی لگن اور جان لیوا تپسیا کے بعد ہی کبھی کوئی پنڈت قوت و اقتدار کی اس دیوی کے حصول میں کامیاب ہوتا، لیکن وہ پہلا شخص تھا جس کے سر پر انکا بغیر کسی جاپ اور چلے کے آ گئی تھی اور ایک ایسے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کررہی تھی جہاں ہر قدم پر عداوتیں، نفرتیں اور کشت و خون کے سوا کچھ بھی نہ تھا..... اور پھر یہی کچھ ہوا۔ جب تک اسے انکا کی مدد حاصل رہی، اس نے سارے ہندوستان کو اپنی انگلیوں پر نچایا لیکن ایک روز بالآخر ایک پنڈت اپنی کڑی تپسیا کے بعد انکا کو اس سے چھیننے میں کامیاب ہوگیا اور وہی راحتِ جاں جمیل احمد خان کے لئے دشمن جاں بن گئی۔

ایک ایسی ناقابلِ فراموش داستان جس میں حسن کی رعنائیاں بھی ہیں اور عشق کی کرم فرمائیاں بھی، جاں نثاری سے لبریز دوستیوں کے پیمانے بھی ہیں اور کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنیوں کے افسانے بھی۔

ازل سے جاری خیر و شر کی کشمکش میں ایک حیرت انگیز معرکہ آرائی

(دو حصوں میں مکمل ..... قیمت فی حصہ 60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے)

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

سکی اور اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ ''کیا میں پریشان ہوں؟'' میں نے انہیں ٹال دیا اور گھر پہنچا تو وہاں زرینہ نے اسی طرح میرا استقبال کیا جس طرح وہ کرتی تھی لیکن مجھے اس کی ہر ہر بات میں منافقت کا احساس ہو رہا تھا۔

''آپ نے یہ میری چوڑیاں دیکھی ہی نہیں۔'' اس نے اپنے ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اتنی مشکل ہوئی تھی میچنگ کی یہ چوڑیاں تلاش کرتے ہوئے لیکن جب یہ چوڑیاں نظر آئی تھیں تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے قیمت وصول ہوگئی ہو۔'' اس نے کہا تھا۔

وہ اپنی ہی دھن میں کہے جا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔ اگرچہ والدہ اور بچوں کی موجودگی کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''آپ نے تو آج تک میری کسی چیز کی تعریف نہیں کی۔'' اس نے والدہ کے اٹھ جانے کے بعد شکایت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''میرے تعریف کرنے کی اب تمہیں ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے بہ مشکل کہا تھا اور وہاں سے اٹھ آیا تھا۔

''واہ یہ کیا بات ہوئی۔'' اس نے کہا تھا۔

''آپ ہی کی تعریف سننے کے لیے تو یہ سب کچھ کرتی ہوں۔'' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کا فقرہ سنا تھا۔

''کیا..... واقعی.....؟'' میں نے پلٹ کر سوال کیا اور پھر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ پاتی میں وہاں سے نکل آیا۔

دل بہلانے کے لیے میں پہلے دوستوں کی طرف گیا تھا لیکن وہاں بھی دل نہیں لگا تو میں خطوط کا پلندا جیب میں لیے نہر پر آ گیا تھا۔ جہاں میں اس وقت بیٹھا اپنے راستے کا تعین کر رہا تھا لیکن راستے کا تعین کرتے ہوئے مجھے زرینہ کا کہا ہوا آخری فقرہ یاد آیا تو جیسے کئی کھڑکیاں کھل گئیں۔

اس یک لفظی نامے کے ہر خط میں زرینہ کی تعریفوں کے ڈھیر تھے۔ اس کی آنکھوں کی تعریفیں، اس کے لمبے گھنے بالوں کی تعریفیں، اس کے کپڑے پہننے کا سلیقہ اور نہ جانے کیا کیا۔

''تو یہ وجہ ہے۔'' میں نے خط کے مندرجات کو یاد کرتے ہوئے سوچا تھا۔

ہماری شادی کے وقت وہ پندرہ برس کی بھی نہیں تھی اور شادی کے آٹھ برس بعد بھی وہ اگرچہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی لیکن ابھی تک اس نے تیس کا ہندسہ نہیں چھوا تھا۔ میں حالات کا تجزیہ کرتا رہا اور جوں جوں آگے بڑھتا رہا۔ مجھے اس کی غلطی میں شعوری کمزوری کے مقابلے میں فطری ضرورت زیادہ نظر آئی تھی۔

''کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار اس سے بات ضرور کروں گا۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے سوچا تھا لیکن گھر کی جانب آتے ہوئے میں ان اقدامات کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو میں اٹھا سکتا تھا۔ ''قتل کر دینا، ایک مکمل ہے لیکن اس کے مارے جانے اور میرے جیل جانے کے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی ذہن نے جو تصویر دکھائی تھی وہ اپنی بھیانک تھی کہ میں کانپ گیا تھا۔ میرا بہنوئی اپنی بہن کے قتل کے بعد یقیناً میری بہن کو بھی اپنے گھر میں نہیں رکھتا۔ پھوپی بچوں کے پاس آ جاتی لیکن دادی اور پھوپی انہیں دربدر پھرنے سے نہیں بچا سکتی تھیں۔ شاید گاؤں کے کچھ لوگ ترس کھا کر ان کے آگے کچھ ٹکڑے ڈال دیتے لیکن ان کی حیثیت فقیروں سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ طلاق ایک دوسرا قدم تھا لیکن اس کا جواب بھی ضرور ملتا۔ میری بہن کا گھر بھی لازمی طور پر برباد ہو جاتا اور اس کے بچے بھی ماں سے محروم ہو جاتے۔

میں گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا لیکن زرینہ ابھی تک انہی کپڑوں میں تھی۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن کچھ دیر مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' میں نے اور وہ بھی مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے مجھ سے اس سلوک کی توقع نہ ہو۔

میں نے اکیلا رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن بچوں نے آ کر میری اس خواہش کو پورا نہیں ہونے دیا۔ ''بابا آپ نے ہمیں عیدی بھی نہیں دی۔'' بیٹے نے شکایت کی۔

''ہاں..... بتایا میں بھول گیا تھا۔'' میں نے بیٹے کو قریب بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''بتایا یہ ہمیشہ ضروری باتیں بھول جاتے ہیں۔'' زرینہ نے فقرہ کسا لیکن میں اسے نظر انداز کر کے بچوں کے ساتھ مصروف رہا۔

زرینہ دوبارہ آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے تھی۔ میز پر چائے رکھنے کے بعد اس نے ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہا لیکن اس وقت والدہ نے آواز لگائی کہ ''کچھ مہمان آئے ہیں۔''

زرینہ کے جانے کے بعد میں بظاہر بچوں میں الجھا ہوا تھا

لیکن میرا ذہن اسی الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے.....؟

''میں اسے معاف بھی تو کر سکتا ہوں۔'' ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی۔

''اس نے اتنی بڑی غلطی تو نہیں کی جتنی میں خود کرتا رہا ہوں۔'' میں نے سوچا۔

''اپنی غلطیوں کو میں نے یاد کرنا شروع کیا تو ملایشیا سے لاہور تک پھیلی ہوئی غلطیاں مجھے یاد آتی چلی گئیں اور ان غلطیوں کے آخر میں سہیلا کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔

سانولی سی پیلنگ سپروائزر سہیلا نور سے ملاقات تو نوکری کے پہلے دن ہی ہوئی تھی اور ابتدا میں اس کے ذومعنی فقروں کو میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا لیکن کچھ دنوں بعد میں نے بھی جواب دینا شروع کیا پھر یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ میں نے اسے فیکٹری سے باہر مدعو کیا اور وہ بخوشی تیار ہوگئی لیکن واپس جاتے ہوئے ایک نیا شوشہ چھوڑ گئی تھی۔

''بس ٹی۔ کھانا کھلا کر رخصت کر دیں گے؟'' اس نے جاتے جاتے کہا تھا اور میں بھونچکا رہ گیا تھا۔

رمضان شروع ہونے سے ایک روز قبل اس نے مجھے مدعو کیا لیکن یہ دعوت اس نے اپنی ایک ساتھی کے گھر پر دی تھی جو میرے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد کھسک لی تھی۔

سہیلا میرے قریب آ گئی تھی لیکن اس نے ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔

''میں آپ کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہوں..... مگر.....'' اس نے واضح طور پر کہا تھا۔

''لیکن میں شادی شدہ ہوں۔'' میں نے کہا تھا۔

''میں دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہوں۔'' سہیلا نے جواب دیا تھا۔

''میں آپ سے اپنے لیے کچھ بھی نہیں مانگوں گی۔'' اس نے کہا تھا۔

''میری تنخواہ اتنی ہے کہ میں اپنا خرچ اٹھا سکوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ جب تک چاہیں میں اس شادی کو خفیہ رکھنے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' اس نے فخریہ کہا تھا۔

میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا لیکن میرا ذہن یہ کچھ دہرانے میں مصروف تھا۔ بچے سونے کی تیاریاں کرنے لگے تو زرینہ انہیں ایک ایک کر کے منتقل کرتی رہی۔

''کھانا لگاؤں؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا لیکن میرے انکار کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بیٹے کو منتقل کر دینے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو میں نے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھتے ہوئے اس سے عید کارڈ کے بارے میں سوال کیا لیکن اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''کون سا عید کارڈ؟'' اس نے جواب میں سوال کیا۔

''اس کا عید کارڈ جس نے یہ تمام خط تمہیں لکھے ہیں۔'' میں نے اس کے خطوط کا پلندہ اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا اور وہ آنکھیں پھاڑے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''ان خطوں کے بارے میں یاد آ جائے تو مجھے بتانا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

میں نے خود پر قابو پانے کے لیے ایسا کیا تھا ورنہ زرینہ کی جانب دیکھتے ہوئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کا گلا دبا دوں۔

''مجھے معاف کر دو۔'' اس نے اچانک میرے پیر پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ سب کیوں کیا؟'' وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''اس نے تمہارے قصیدے پڑھے اور.....'' میں نے کہا لیکن میرے مزید کچھ کہنے سے قبل وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔

''میں جانتی ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے اور بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' وہ معافی مانگنے کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر رہی تھی۔

''میری غلطی ناقابلِ معافی ہے لیکن اپنے بچوں کے صدقے مجھے معاف کر دو۔'' اس نے یہ کہا اور پھر آنسوؤں سے تر چہرہ اس نے میرے قدموں پر رکھ دیا۔

''کتنی بار ملیں تھیں تم اس سے؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے
طالوت
(3 حصوں میں مکمل)
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں۔
گستاخ بکس گھر کلب
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

''کہاں.....؟'' اس نے سوال کیا۔

''کہیں بھی..... شہر میں..... کسی اور جگہ..... کسی کے گھر پر.....'' میں بولتا چلا گیا۔

وہ سنتی رہی اور پھر اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ الماری پر رکھا ہوا قرآن شریف لے کر وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں اس سے تنہائی میں کہیں نہیں ملی حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ میں اس سے ملوں لیکن.....''

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے قرآن شریف لے لیا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے قرآن شریف رکھنے کے بعد پلٹ کر سوال کیا تھا۔

''معاف کردو گے تو میں یہیں رہوں گی۔'' اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا تھا۔ ''طلاق دو گے تو بھائی کے گھر نہیں جاؤں گی بلکہ خود کو ختم کردوں گی اور اگر جان سے مارنا چاہو گے تب بھی میری درخواست یہی ہوگی کہ میرے گندے خون سے اپنے ہاتھ گندے نہ کرو بلکہ مجھے حکم دو کہ میں خود کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جان دے دوں گی۔ کیونکہ اگر تم میرے قتل کے جرم میں جیل گئے تو میرے بچے در بدر ہو جائیں گے۔'' وہ روتی جارہی تھی اور کہتی جارہی تھی۔ زرینہ نے تقریباً وہی باتیں کی تھیں جو میں خود بھی سوچتا رہا تھا۔

''وہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا اور زرینہ نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''میں نہیں بتاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ جذبات میں آ کر کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس کے نتیجے میں آپ میری غلطی کی سزا بھگتیں۔'' اس نے اپنے انکار کی وجہ بھی بتادی۔

''اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے مجھے بہکانے کی کوشش کی لیکن بڑا جرم میرا ہے کہ میں نے کیوں اس کی باتوں پر توجہ دی۔'' وہ کہے جارہی تھی۔

''اگر آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو ختم ہو جانا چاہیے تب بھی آپ مجھے حکم دیں خدا کی قسم میں یہ کام اپنے ہاتھ سے کروں گی لیکن آپ کا سایہ بچوں کے سر پر رہنا چاہیے۔''

''میں ایک شرط پر یہ سب کچھ بھولنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کچھ دیر رکنے کے بعد کہا تھا اور اس کی امید بھری نظریں میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''تم بھی سب کچھ بھول جاؤ گی اور دوبارہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا اور وہ میرے پیروں پر گر گئی۔

وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی لیکن اس کے بہتے ہوئے آنسو بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ میں بھی اپنے آنسو نہیں روک سکا تھا۔

میں نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا۔ ''یہ خط اور عید کارڈ البتہ میرے پاس رہیں گے اور اگر تم سے دوبارہ کوئی غلطی سرزد ہوئی تو.....'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''مجھے منظور ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

میں نے اسے خاموش کروایا اور کہا کہ وہ منہ دھو آئے لیکن وہ منہ دھونے گئی تو وضو کر آئی۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں دو رکعت پڑھ لوں۔'' اس نے کہا اور پھر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز میں اس نے نہ جانے کیا کہا یا کیا دعا کی، لیکن میں اپنی جگہ بیٹھا ہوا اپنے معبود سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ مجھے آئندہ ان غلطیوں سے دور رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ قبولیت کی کون سی گھڑی تھی۔ کیونکہ عید کی چھٹیوں کے بعد میں دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ سہیلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ پولیس کے چھاپے میں پکڑی گئی تھی اور گرفتار ہونے والوں میں اسٹور کے منیجر صاحب بھی تھے۔

سہیلا اور ہمارے منیجر صاحب کو نوکری سے نکال دیا گیا اور مجھے اسٹور منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ میری تنخواہ دوگنی ہوگئی اور ساتھ ہی گاڑی کی سہولت بھی مل گئی۔

اس ہفتے گھر واپس آیا تو یہ خبر میری منتظر تھی کہ زرینہ نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔ اسے منانے ہیڈ ماسٹر صاحب خود آئے تھے لیکن زرینہ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ''ایک تو بچے بڑے ہو رہے ہیں، اب انہیں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور دوسرے یہ کہ امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی ہے۔''

اس کے اسکول چھوڑنے کی اصل وجہ سے میں واقف تھا لیکن میں نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ زرینہ نے مجھے پچھلے چھ برسوں میں کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا البتہ میری والدہ کو اس سے یہ شکایت ہے کہ ''بہو تو گھر سے باہر ہی نہیں نکلتی۔''

اس کے خطوط اور عید کارڈ میں عرصہ ہوا جلا چکا ہوں لیکن اب بھی عید کی ہر نماز کے لیے جاتے ہوئے اس واقعہ کی یاد ضرور آتی ہے اور میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس نازک مرحلے پر مجھ پر کرم کیا جب میں کوئی ایسا فیصلہ بھی کرسکتا تھا جو دو گھروں کو تباہ کردیتا۔

غلطی

محترم معراج رسول صاحب، آداب عرض۔

ہمارے معاشرے میں جذباتی فیصلوں سے بعض اوقات جو بربادی اور تباہی پھیلتی ہے اس سے سب ہی واقف ہیں مگر پھر بھی ہم اکثر لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ ایسا تو بہت کم ہوتا ہے کہ آپ خود تباہی کو دعوت دیں اور پھر بعد میں اس سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ میری یہ روداد بھی کچھ ایسی ہی حقیقت بیان کرتی ہے۔ اگر اس کی اشاعت کسی کے لیے باعث اصلاح بن سکے تو اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ آپ کے تعاون کا ممنون۔

احقر

عمّار۔ کراچی

شادی کے بعد چند دنوں کے اندر ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں نے رومانہ سے شادی کر کے کوئی عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں رومانہ کے بارے میں جانتا نہیں تھا۔ رومانہ میرے سگے اور اکلوتے ماموں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس میں وہ تمام خرابیاں تھیں جو کسی اکلوتی اولاد میں ہوتی ہیں اور اس کی کوئی خوبی کم از کم میرے علم میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس سے صرف اس لیے شادی کرلی کہ اس نے خود مجھ سے ایسا کرنے کی التجا کی تھی اور اپنی اس غلطی کا احساس رومانہ کو بھی ہوگیا تھا۔

میری امی اور میرے ماموں، نانا کی دو ہی اولادیں تھیں۔ اسی وجہ سے ان میں بے انتہا محبت تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ جب امی کی شادی ہوئی تو ان کی رخصتی کے وقت امی سے زیادہ ماموں کا برا حال تھا۔ امی رخصت ہو کر حیدر آباد سے کراچی آرہی تھیں۔ اس وجہ سے بھی ماموں زیادہ اداس تھے۔ ابو کراچی کے رہنے

والے تھے۔ مزے کی بات ہے کہ نانا اور دادا آپس میں دوست تھے۔ کم عمری میں وہ ایک ساتھ سرحد عبور کر کے اس نئی مملکت میں آئے تھے مگر ایک حیدر آباد میں جا بسے اور دوسرے نے کراچی میں ڈیرا لگایا۔ نانا ابو کی دو کے مقابلے میں دادا ابو کی چھ اولادیں تھیں۔ ان میں ابو چوتھے نمبر پر تھے۔ دادا اور نانا باقاعدگی سے ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ کم از کم سال میں ایک بار ضرور ملتے تھے۔ کبھی نانا ابو کراچی آجاتے اور کبھی دادا ابو حیدر آباد چلے جاتے تھے۔ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شادی کے بعد بھی جاری رہا تھا۔

ان دنوں امی کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ جب دادا ابو نانا ابو سے ملنے آئے' نانی جان اس وقت انتقال کر گئی تھیں' جب امی میٹرک میں تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد امی نے سارا گھر بے حد خوبی سے سنبھال رکھا تھا۔ دادا ابو امی کے سلیقے' حسن صورت اور حسن سیرت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان کے دل میں آیا کہ امی کو بہو بنالیں۔ میرے دونوں تایاؤں کی اس وقت شادی ہو چکی تھی اور سب سے چھوٹے چچا ابھی پڑھ رہے تھے۔ "لے دے کہ بس ابو بچے تھے' جو اس وقت کے پی ٹی میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے۔ دادا ابو نے نانا ابو سے بات کرنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ ابو سے بات کرلیں۔ انہوں نے کسی بہانے نانا ابو سے امی کی ایک تصویر لے لی اور کراچی آکر ابو کو دکھائی۔ ابو ویسے بھی سعادت مند بیٹے تھے' انہوں نے جواب دیا۔

"ابو! اس کی کیا ضرورت تھی' آپ میرے لیے جو فیصلہ کریں گے' مجھے قبول ہوگا۔"

"جیتے رہو بیٹا!" دادا ابو خوش ہو گئے اور اگلے ہی روز نانا ابو کے پاس چلے گئے۔ وہ انہیں اتنی جلدی دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔

"خیریت مستقیم! اتنی جلدی واپسی؟"

"ہاں محمد بھائی' بس ایک فرض تھا سوچا اسے بھی جلد نمٹا دوں۔ بات یہ ہے کہ میں تمہاری بیٹی کو اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتا ہوں۔"

نانا ابو کھل گئے تھے۔ "کیوں نہیں یار! میرے لیے تم سے بڑھ کر کون ہوگا؟"

یوں امی اور ابو کا رشتہ طے پایا۔ دادا ابو پان کا کاروبار کرتے تھے اور انہوں نے پی ای سی ایچ ایس کے علاقے میں کبھی پلاٹ لے کر اس پر بڑا سا مکان بنوالیا تھا۔ ابو اور سب بھائی اسی میں رہتے تھے۔ میری امی بھی بیاہ کر اسی گھر میں آئی تھیں۔ اتفاق سے میری دادی جان بھی کچھ عرصے پہلے انتقال کر گئی تھیں۔ دادا ابو ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اداس اور خاموش رہنے لگے۔ مگر ابو امی کی شادی پر وہ جتنے خوش تھے' اس سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی انتقال کر جائیں گے۔ وہ امی ابو کی شادی کے تیسرے مہینے ہی انتقال کر گئے تھے۔ ان کے مرتے ہی گھر میں بٹوارے کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ دونوں تایاں.... اس جگہ سے نکل کر نئی آباد ہونے والی بستی گلشن اقبال کی طرف جانا چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے' دونوں تایا بھی بیویوں کی حمایت کر رہے تھے۔ ابو گھر نہیں بیچنا چاہتے تھے اور یہی رائے چچا اور پھوپو زرینہ کی تھی۔

لیکن دونوں تایاؤں کے سامنے کسی کی نہیں چلی۔ انہوں نے مکان بیچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ خاصا بڑا مکان تھا' اس کی فروخت سے بڑی رقم ہاتھ آئی۔ دونوں تایا اپنا اپنا حصہ لے کر اپنی بیویوں کے ساتھ الگ ہو گئے۔ ابو کو اس مکان کی وجہ سے سہولت تھی' بندرگاہ انہیں اس علاقے سے زیادہ دور نہیں پڑتی تھی۔ مجبوراً انہوں نے ذرا دور آباد ہونے والی ایک سوسائٹی میں دو سو گز کا پلاٹ لے لیا۔ چچا حامد نے اپنا حصہ لے لیا تھا مگر رہتے وہ ابو کے ساتھ ہی تھے اور ان کی تنخواہ کا کچھ حصہ ابھی تک ابو ہی برداشت کر رہے تھے۔ پھپو کا حصہ ابو نے سیونگ اسکیم میں لگا دیا کہ جب ان کی شادی کا وقت آئے گا تو کیش رائیس گے۔ زرینہ پھپو بھی ابو کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اگرچہ دو سو گز کا گھر بھی کم نہیں ہوتا لیکن کہاں بارہ سو گز پر بنا مکان اور کہاں دو سو گز۔ شروع میں امی ابو کو عجیب لگا لیکن پھر وہ عادی ہو گئے۔ ویسے بھی یہ ان کا اپنا گھر تھا۔ چچا اپنے میں مگن تھے' وہ صرف کھانے اور سونے کے لیے آتے تھے البتہ زرینہ پھپو اس چھوٹے سے گھر سے سمجھوتہ نہیں کر سکی تھیں۔ وہ آئے دن یہی شکایت کرتی تھیں۔

"میرا اس چھوٹے سے گھر میں دم گھٹتا ہے۔"

امی ابو انہیں سمجھاتے تھے کہ یہ گھر بھی چھوٹا نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ہے لیکن وہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھیں۔ امی ابو سے جھگڑتیں اور ضد کرتیں کہ پرانے گھر میں واپس چلا جائے۔ دراصل پھپو شروع سے گھر بھر کی لاڈلی رہی تھیں۔ ہر ایک ان کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا۔ لیکن جب بڑے تایا کی شادی ہوئی اور تائی امی آئیں تو صورت حال بدل گئی۔ اب بڑے تایا پھپو پر پہلے جیسی توجہ نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ بڑے تایا ہی انہیں سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھپو چڑچڑی ہو گئیں۔ پھپو کی کسی سے نہیں بنتی تھی اور دونوں تائیاں ان سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔

دراصل کوئی بھی ساری عمر تو لاڈلا نہیں رہتا۔ پھپو یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ گھر میں آئے دن جھگڑے ہوتے تھے۔ دادا ابو کے انتقال کے بعد جب تایاؤں نے گھر کے بٹوارے کا فیصلہ کیا تو اس کے پس پشت ایک یہ وجہ بھی تھی۔

زرینہ پھپو زبان کی تیز تھیں اور ان کے مزاج میں بچپنا تھا۔ ان کی امی سے بھی یہ مشکل بنتی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ امی ان کی کڑوی کسیلی باتیں صبر و سکون سے برداشت کر لیا کرتی تھیں۔ اس گھر میں آنے کے بعد میں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ میں امی ابو کا اکلوتا تھا لیکن پھپو کے اور بھی بھتیجے بھتیجیاں تھیں اس لیے ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ مجھ سے خاص پیار نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاتی تھیں کہ امی مجھ پر توجہ دے سکیں۔ بچپن میں' میں خاصا رونے دھونے والا بچہ تھا۔ بے چاری امی ہر وقت پریشان رہتی تھیں۔ ابو بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کر کے تھکے ہارے آتے تھے اس لیے امی انہیں ذہنی پریشانی سے بچانے کے لیے پھپو کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ امی کو گھر کے باہر کے کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ ذرا سمجھ آتے ہی مجھے ان کی تکالیف کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس لیے میں انہیں تنگ نہیں کرتا تھا۔

پھپو کی عمر چوبیس سال ہو چکی تھی جو اس زمانے میں شادی کے لحاظ سے خاصی گزر جانے والی عمر تھی۔ آج سے کوئی تیس سال پہلے لڑکیوں کی شادی انیس بیس سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی۔ دادا جان کا یہاں کوئی اور رشتے دار انہیں تھا۔ اس لیے خاندان میں رشتے.... ہی نہیں تھے۔ کچھ واقف کار تھے لیکن سب ہی پھپو کی تیز طبیعت سے واقف تھے حالانکہ پھپو صورت شکل کی ہزاروں میں اچھی تھیں لہٰذا پھپو کی گھر بیٹھے اتنی عمر ہو گئی تھی۔

میں نے بتایا کہ ماموں امی سے بے حد محبت کرتے تھے اور اکثر امی سے ملنے کے لیے کراچی آتے تھے۔ وہ خود بھی کراچی شفٹ ہونا چاہتے تھے لیکن نانا ابو کی وجہ سے مجبور تھے۔ دراصل نانا ابو کا سارا خاندان حیدر آباد میں تھا۔ پھر نانی جان کی قبر بھی وہی تھی اس لیے وہ حیدر آباد کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر میری پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے نانا ابو کا بھی انتقال ہو گیا اور پھر ماموں اس کے چند مہینے بعد کراچی آگئے۔ حیدر آباد میں ان کا بیڑی بنانے کا کارخانہ تھا لیکن ان کی زیادہ تر سپلائی کراچی میں ہی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے انہیں کراچی منتقل ہونے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ انہوں نے اپنا حیدر آباد والا کارخانہ فروخت کر دیا اور کراچی میں بیڑی پان' مسالے' گٹکا اور اسی قسم کی چیزوں کا ہول سیل کاروبار کرنے لگے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے پہلے تو ہمارے گھر کے قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا اور روزانہ گھر جانے سے پہلے امی سے ملتے آجاتے تھے۔ وہ خاص طور پر مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔

ماموں کا نام کمیل تھا اور وہ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے۔ بیڑی اور پان مسالے کا کاروبار کرنے کے باوجود انہیں ان میں سے کسی شے کی لت نہیں تھی۔ تعلیم ان کی انٹر تک تھی اس سے زیادہ وہ پڑھ نہیں سکے کہ کسب معاش میں لگ گئے تھے۔ خاصی کم عمری میں کمانے لگے تھے اور امی کی شادی پر بھی انہوں نے خاصا خرچ کیا تھا۔

اب امی کہتیں تھیں "بھائی شادی کرلیں۔"

مگر ماموں ٹال جاتے۔ دراصل کسی زمانے میں ماموں کو ایک لڑکی پسند آئی تھی اور اس کی شادی ان سے نہ ہو سکی اس لیے اب وہ شادی کے نام سے بھی بدکنے لگے تھے۔ امی جب بھی ان سے شادی کی بات کرتیں' وہ منع کر دیتے' کہتے "ابھی میں اپنا کاروبار سیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ابو سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ابو بھی چاہتے تھے کہ وہ شادی کر کے اپنا گھر بسالیں۔ ایک روز امی اور ابو بات کر رہے تھے کہ ابو نے اچانک امی سے کہا۔ "ناہید' میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔"

"کیا؟" امی نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ زرینہ اور کمیل کی جوڑی کیسی رہے گی؟"

امی چپ ہوگئیں' وہ ابو کی کی منشا پا گئی تھیں۔ ''مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی لیکن سوچ لیں' زرینہ کے دماغ اونچے ہیں اور بھائی سرے سے شادی ہی کرنا نہیں چاہتے۔''

ابو ہنکچا کر بولے ''دیکھو' میرا خیال ہے کہ اسے بھی احساس ہو رہا ہے کہ اس کے رویے کی وجہ سے اب تک اس کے رشتے نہیں آرہے ہیں' دوسری طرف میرا خیال ہے کہ سہیل کو بھی اب تنہائی ستانے لگی ہے۔ ہم دونوں پر ذرا زور دیں تو شاید دونوں ہی مان جائیں۔''

امی کے خیال میں پھپھو کا گھر یقیناً بس جاتا لیکن ماموں کی زندگی خراب ہو جاتی اور لیساوہ کسی صورت نہیں چاہتی تھیں۔ دوسری طرف ابو کو واضح انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ انہوں نے بے دلی سے کہا ''میں سہیل بھائی سے بات کروں گی۔''

''بات نہیں کرو' اسے راضی کرو۔'' ابو نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تم ایسا کر سکتی ہو۔''

اور جب امی نے ماموں سے بات کی تو وہ خلافِ توقع معمولی سی ہچکچاہٹ کے بعد مان گئے۔ شاید وہ زرینہ پھپھو کو پہلے سے ہی پسند کرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے' ان کا ہمارے ہاں مسلسل آنا جانا تھا۔ ماموں جب بھی آتے' پھپھو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھیں۔

اور جب ابو نے پھپھو سے اس موضوع پر بات کی تو وہ غصے میں آگ بگولہ ہوگئیں ''بھائی' آپ مجھ سے اتنے ہی بیزار ہو گئے ہیں جو ایسے شخص سے بیاہ رہے ہیں۔ اس کا کاروبار چلتا ہے' کتنا گھٹیا لگتا ہے مجھے بیزی کا لفظ؟''

''زرینہ! وہ پڑھا لکھا اور مہذب شخص ہے۔'' ابو نے نرمی سے سمجھایا ''ہمارا رشتے دار ہے اور مالی طور پر مضبوط ہے۔ مجھے یقین ہے' وہ تمہیں خوش رکھے گا۔''

''لیکن مجھے کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرنی۔'' پھپھو نے صاف انکار کر دیا۔

امی کو پتا چلا تو انہیں بے حد غصہ آیا تھا۔ ''یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے۔ میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے' کوئی گرا پڑا شخص نہیں ہے۔ میں اس کی شادی اچھی سے اچھی جگہ کرا سکتی ہوں۔''

''تم اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔'' ابو نے انہیں نرمی سے سمجھایا ''زرینہ کا مزاج تم جانتی ہو۔ میں اسے راضی کرلوں گا۔''

اور ابو نے بالآخر کسی نہ کسی طرح پھپھو کو راضی کر لیا لیکن ان کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ دل سے راضی نہیں ہیں۔

مجبوراً اس رشتے پر رضامند ہوئی ہیں۔ امی ان کا رویہ دیکھ کر ہولتی تھیں۔ انہوں نے ابو سے کہا۔

''سنیے' میرا ایک ہی بھائی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ان کی زندگی خراب ہو۔ آپ زرینہ کا رویہ دیکھ رہے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لڑکیاں بس اپنے میکے میں ایسی اکڑفوں دکھاتی ہیں' شوہر کے گھر جا کر سب ٹھیک ہو جاتی ہیں' تم فکر مت کرو۔''

ابو کی تسلی سے امی کی فکریں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں پھپھو اور ماموں کی شادی کی بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر شادی ہوگئی۔ امی نے دونوں طرف سے خاصی دھوم دھام کی تھی۔ ماموں نے ہمارے علاقے میں ہی ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ اسے ابو کی طرف سے پھپھو کو دیے گئے جہیز اور دوسرے سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ شروع کے کچھ مہینے تو ماموں اور پھپھو بے حد خوش رہے۔ پھپھو کا رویہ بھی حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پہلے والے رویے کی طرف لوٹنے لگیں۔ انہوں نے ماموں سے رمزاجی سے پیش آنا شروع کر دیا۔ ابو انہیں سمجھاتے تو پھپھو ان سے بھی بدمزاجی سے پیش آتیں۔ سال بھر کے اندر ماموں کی زندگی پریشان ہو کر رہ گئی۔ سارا دن کام پر باہر رہتے' سر کھپا کر واپس آتے تو گھر میں پھپھو کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیے رکھتی تھیں۔

ابو تو نہیں امی اس صورتِ حال سے بے حد پریشان تھیں۔ اپنے بھائی کی زندگی کی اس خرابی کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتی تھیں کہ آخر انہوں نے کھل کر اس رشتے کی مخالفت کیوں نہیں کی۔ محض اپنے سر سے بوجھ اتارنے کے لیے ماموں کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ ماموں جب بھی آتے' پھپھو کی کسی حرکت کے بارے میں بتاتے تو امی ردیا کرتی تھیں۔ پھر جب سال بھر تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو امی نے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کو کہا اس پر ماموں جان نے انکشاف کیا کہ زرینہ خود ابھی اولاد نہیں چاہتی ہے۔ اس نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے اس سلسلے میں ساز باز کر رکھی ہے اور جب بھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے وہ اسے ختم کرا دیتی ہے۔

امی یہ سن کر دنگ رہ گئی تھیں۔ زرینہ پھپھو اس حد تک آگے بڑھ جائیں گی انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس زمانے میں منصوبہ بندی کی سہولتیں اتنی عام نہیں تھیں۔ اس کے لیے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا تھا اور پھپھو دلیری سے یہ بھی کر گزری تھیں۔ امی نے پہلے تو ابو سے کہا اور پھر خود پھپھو سے بات کرلی۔ اس پر وہ چیخ کر بولیں۔

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ چاہے میں بچہ پیدا کروں' چاہے نہ کروں۔ کوئی مجھے سمجھانے والا کون ہوتا ہے۔''

''زرینہ' ہوش کی دوا کرو۔'' امی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں بیک وقت تمہاری نند بھی ہوں اور بھاوج بھی۔ میں تمہیں سمجھانے کا حق رکھتی ہوں۔''

''میں بھی آپ کی نند ہوں اور بھاوج بھی۔ براہِ کرم مجھے ہدایات مت دیں۔''

''دیکھو..... اولاد تو اللہ کی نعمت ہوتی ہے اور پھر سہیل بھائی کو بھی بچے کی خواہش ہے۔''

''میں سہیل کی بیوی ہوں۔ اس کی خواہشات پوری کرنے کی مشین نہیں ہوں۔'' پھپھو نے تڑخ کر کہا۔

امی ابو کے پاس کھیل رہا تھا۔ پھپھو کے اس طرح چلّانے سے گھبرا کر رونے لگا تھا۔ ابو نے پھپھو کو سمجھانا چاہا تو وہ روتی ہوئی گھر سے چلی گئیں۔ امی بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر رونے اور جھگڑنے لگیں ''آپ نے میرے بھائی کی زندگی خراب کر دی ابو۔ یہ عورت انہیں کوئی خوشی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ابو نے امی کو تسلی دی اور امی اپنے گھر کا ماحول خراب ہونے سے بچانے کے لیے چپ ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد یہ جھگڑے روز کا معمول بن گئے تھے۔ نتیجے میں ماموں نے دکان سے دیر سے آنا شروع کر دیا۔ اس پر پھپھو کو اعتراض ہونے لگا کہ وہ ان پر کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں۔ جب ابو نے ماموں سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے سرد مہری سے کہہ دیا ''آپ کی بہن کو میری توجہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اور ابو ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ ان ہی دنوں پھپھو کے پاؤں میں چوٹ لگی۔ ٹخنے کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا تھا۔ وہ غسل خانے میں پھسل گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے دو مہینے کے لیے ان کے پاؤں پر پلاستر باندھ دیا۔ ظاہر ہے اب وہ بغیر کسی سہارے کے حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ ماموں نے ان دنوں میں ان کی جی جان سے خدمت کی۔ نہ صرف خود ان کے پاس رہتے تھے بلکہ ان کی خدمت کے لیے ایک نرس بھی رکھ لی تھی جو صبح سے رات تک ان کے پاس رہتی تھی۔ اسی دوران میں انکشاف ہوا کہ پھپھو امید سے تھیں اور ظاہر ہے اب وہ اس معاملے کو ختم بھی نہیں کرا سکتی تھیں۔ دو مہینے بعد جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو اب دیر ہو چکی تھی۔ مجبوراً پھپھو کو اپنے پیٹ میں آجانے والے اس بچے کو قبول کرنا پڑا' جیسے انہوں نے ماموں کو قبول کیا تھا۔ البتہ ماموں بے حد خوش تھے۔ ان کی دیرینہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔ پھر رومانہ نے جنم لیا تھا۔

اس وقت میری عمر چار سال تھی۔ میں نے دیکھا کہ امی بے حد خوش ہیں لیکن پھپھو جن کی یہ پہلی اولاد تھی۔ اس سے کچھ بے زار نظر آرہی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اسے دودھ پلانے سے بھی انکار کر دیا۔ امی اور ماموں نے ان پر زور دیا کہ رومانہ کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ جب خدا نے انہیں ایک نعمت عطا کی تھی تو وہ اس سے اپنی بچی کو کیوں محروم کر رہی تھیں۔ مگر پھپھو نے حسبِ معمول ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

جب تک پھپھو اسپتال میں رہیں' امی ہی رومانہ کو سنبھالتی رہی تھیں۔ پھر اس کے بعد بھی امی اکثر ماموں کے گھر جا کر رومانہ کے بے شمار چھوٹے موٹے کام کر آتی تھیں کیونکہ پھپھو کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس اتنا کرتیں کہ دودھ تیار کر کے اس کے منہ میں فیڈر دے دیا کرتی تھیں اور جب اس کے کپڑے زیادہ ہی گندے ہو جاتے تو انہیں تبدیل کر دیتی تھیں۔ بے چارے ماموں اس کی کسی ماں کی طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس کے لیے کپڑے اور کھلونے لاتے تھے۔ اس سے کھیلتے تھے لیکن عجیب بات تھی کہ رومانہ ماموں سے زیادہ مانوس نہیں تھی۔ اگر کبھی وہ روتے لگتی تو پھپھو کی گود میں جا کر ہی بہلا کرتی تھی حالانکہ وہ اسے حتی الامکان گود میں لینے سے گریز کرتی تھیں۔ جب رومانہ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تب بھی چاروں ہاتھوں پیروں سے ماں کی طرف ہی لپکتی تھی۔

ماموں رومانہ کی پیدائش پر بے حد خوش تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے ہاں اور بچے ہوں۔ خاص طور سے انہیں ایک بیٹے کی خواہش تھی لیکن اس بار بھی پھپھو کا وہی رویہ تھا بلکہ انہوں نے ایک بار جب ماموں حیدر آباد گئے تھے' خاموشی سے اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا آپریشن کروا لیا تاکہ حادثاتی طور پر بھی ماں بننے سے ''محفوظ'' رہیں۔ یہ بات خاصے عرصے بعد جا کر ماموں کے علم میں آئی تھی۔

رومانہ کی پیدائش کے باوجود گھر کا ماحول تلخ ہی رہا۔ پھپھو گھر اور ماموں سے یکساں طور پر بے نیاز تھیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ جب ماموں رات کو کام سے تھکے ہارے آتے تو پھپھو نے ان کے لیے کھانا بھی نہیں بنایا ہوتا تھا۔ زندگی کی ان ہی تلخیوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ چالیس برس کی عمر میں پچاس کے لگنے لگے تھے۔ امی ان کی حالت پر کڑھا کرتی تھیں لیکن پھپھو سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔ انہیں امی کا آنا ناگوار گزرتا تھا حالانکہ وہ ان کے

بھائی کا گھر تھا اور خود وہ آئے دن ہمارے ہاں آتی رہتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا۔ اس وقت میں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا جب ماموں کو پہلی بار ہارٹ اٹیک ہوا' اس وقت ان کی عمر صرف بیالیس سال تھی۔ اس زمانے میں دل کا مرض اتنا عام نہیں تھا اور اسے بھی بوڑھوں کا مرض سمجھا جاتا تھا۔ ماموں کو اس حال تک پھپو کے رویے نے پہنچایا تھا۔ انہیں دکان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کے ملازمین نے انہیں اسپتال تک پہنچایا۔ امی کو اطلاع ملی تو وہ روتی ہوئی مجھے لے کر اسپتال جا پہنچیں۔ ابو بھی دفتر سے وہیں آ گئے۔ اپنے نیک نفس ماموں کو بے ہوشی کی حالت میں آکسیجن کی نلکی لگے دیکھ کر مجھے رونا آ گیا تھا۔ پھپو کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی لیکن وہ اس وقت تک نہیں آئی تھیں۔ دراصل وہ شاپنگ کے لیے گئی تھیں۔ وہاں سے واپسی پر اطلاع ملی تو آئی تھیں' ان کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر امی ان پر برس پڑی تھیں۔ ''میرا بھائی تمہاری وجہ سے اس حال کو پہنچا ہے۔ ارا نہیں کچھ ہوا تو میں تمہیں دیکھ لوں گی۔''

''میں آپ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' انہوں نے بدتمیزی سے کہا پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''میرے شوہر کی حالت کیسی ہے؟ یہ بچ جائیں گے یا مر جائیں گے؟''

''تم نے مارنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی ہے'' امی نے چلا کر کہا اس پر ڈاکٹر نا گواری سے بولا۔

''پلیز' آپ لوگ یہ جھگڑے باہر جا کر نمٹائیں۔ اس وقت مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔ ابھی یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔''

پھپو بہ مشکل وہاں نصف گھنٹے ٹھہریں اور پھر رومانہ کو لے کر واپس چلی گئیں۔ مجھے ابھی بھی یاد ہے' اس وقت رومانہ کا ردعمل ایک ایسی بچی کا نہیں تھا جس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ جبکہ وہ آرام سے اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بعد ماموں جان پورے چوبیس گھنٹے آئی سی یو میں رہے تھے اور پھر ان کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ انہیں عام وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ پھپو دوبارہ نہیں آئی تھیں اور امی مسلسل اسپتال میں تھیں۔ پھپو کی بے پروائی پر میں نے پہلی بار ابو کو بے حد غصے میں دیکھا تھا۔ انہوں نے جا کر پھپو کو نہ جانے کیا کہا کہ وہ اسپتال آ گئیں' اس وقت ماموں ہوش میں آ گئے تھے اور ان کی نظریں پھپو اور رومانہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ جب پھپو آئیں تو ماموں کے چہرے پر پہلی بار رونق آئی تھی۔ پھپو نے عام سے انداز میں ماموں کی طبیعت پوچھی اور ایک طرف جا بیٹھیں۔

''رومانہ کہاں ہے؟'' ماموں نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

''گھر پر ہے۔ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اب اسے اسپتال کے منحوس ماحول میں کہاں لاتی۔'' پھپو نے بے زاری سے کہا۔

''میرا اسے دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے لیکن خیر تم نے ٹھیک کیا۔''

امی نے پھپو سے کہا کہ وہ ماموں کے پاس ٹھہریں' اتنی دیر میں امی گھر جا کر کھانے کو کچھ بنائیں گی اور کپڑے بدل کر آئیں گی۔ اس پر پھپو نے کہا ''ذرا جلدی آیئے گا' میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔''

امی نے افسوس سے انہیں دیکھا۔ ''نہ جانے تم کیسی عورت ہو۔''

میں ابو کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔ امی نے آ کر میرے اور ابو کے لیے کھانا بنا کر فریج میں رکھا اور نہا دھو کر کپڑے بدل کر دوبارہ اسپتال چلی گئیں۔ ماموں ایک ہفتہ وہاں داخل رہے اور اس دوران میں امی تین چار بار ہی چند گھنٹوں کے لیے گھر آئیں اور پھپو اتنی ہی بار تھوڑی دیر کے لیے اسپتال آئی تھیں۔ اسپتال کا عملہ ایک طرف تو بھائی کے لیے فکر اور خدمت گزاری پر متاثر تھا تو بیوی کی اتنی بے اعتنائی پر حیران بھی تھا۔ ماموں کے گھر آنے کے بعد بھی امی مہینوں تک ان کے پاس گھر جاتی رہیں۔ ان کے لیے اپنے ہاتھ سے ہلکے اور زود ہضم کھانے بنا کر لے جاتی تھیں کیونکہ پھپو کو کھانے بنانے سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے مہلک دل کے دورے سے ماموں نہ جانے کیسے بچ نکلے تھے۔ اس پر بھی پھپو کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اس وقت میں تیرہ سال کا ہو رہا تھا اور ذہنی طور پر خاصا باشعور تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ماموں ان دنوں کچھ کھوئے کھوئے اور متفکر رہتے ہیں جیسے اپنی زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا ہو۔ شاید انہوں نے آنے والی موت کی آہٹ قبل از وقت محسوس کر لی تھی۔ ایک روز امی ان سے ملنے گئیں تو ماموں نے ان سے کہا ''میں کل تمہارے ہاں آؤں گا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''ایسی کیا ضروری بات ہے' آپ ابھی کر لیں۔''

''نہیں کل' میں رات کو دکان سے آؤں گا۔'' ماموں نے کہا۔

اگلے روز امی نے ماموں کی پسندیدہ ماش کی دال اور آلو کے کباب بنائے تھے۔ ماموں حسب معمول ذرا دیر سے

آئے۔ بیماری کے دنوں میں کام کا جو حرج ہوا تھا' اب وہ اس کا ازالہ کر رہے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے آرام کا کہا تھا۔ اس کے باوجود ان کی مصروفیات کم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس رات ابو کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد امی نے برتن سمیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''عمار بیٹا! آپ جا کر ہوم ورک کریں۔ میں دودھ لے کر آتی ہوں۔''

''جی امی'' میں کہہ کر اٹھ گیا۔ اپنا ہوم ورک کیا۔ پھر دودھ پیا۔ اس کے بعد میں لیٹ کر سو جاتا تھا لیکن اس روز مجھے خیال آیا کہ ابھی ماموں جان ہیں' انہیں خدا حافظ کہہ دوں۔ میں ڈرائنگ روم کی طرف آیا تو میں نے امی کو کہتے سنا ''خدا نہ کرے بھائی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''بس' میں نے موت کو اتنے نزدیک سے دیکھا ہے کہ زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم رومانہ کا خیال رکھو گی۔ عمار میرے لیے بیٹے کی طرح ہے لیکن پر میرا اتنا حق تو ہے۔''

امی رو رہی تھیں پھر ان کی بھیگی ہوئی آواز آئی ''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں رومانہ کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی لیکن بھائی! کیا آپ کے اس بات کو ماننے کی؟ آپ نے اس کی فطرت دیکھی ہے' وہ ہم دونوں' بہن بھائیوں سے بلاوجہ نفرت کرتی ہے کیا وہ اس رشتے کو قبول کرے گی؟''

''میرا خیال ہے وقت اس کے کس بل نکال دے گا۔''

ماموں بولے ''پھر عمار اس کا بھی تو خون ہے۔ مجھے امید ہے' وہ اس رشتے سے انکار نہیں کرے گی۔''

''خدا جانے'' امی نے گہری سانس لی ''اب تک تو اس سے ہمیں ایک خوشی بھی نہیں ملی ہے۔''

میری سمجھ میں ان لوگوں کی باتیں نہیں آ رہی تھیں اور پھر امی نے مجھے سمجھایا تھا کہ کسی کی بات چھپ کر سننا بہت بری بات ہے۔ اس لیے میں کمرے میں آ گیا۔ ''ماموں جان! میں آپ کو اللہ حافظ کہنے آیا ہوں' میں سونے جا رہا ہوں'' میں نے کہا تو ماموں جان نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ یہ کس مجھے ہمیشہ یاد رہا کیونکہ اس کے بعد میں نے ماموں جان کو کفن میں لپٹے دیکھا تھا۔

ایک ہفتے بعد ماموں کو پھر ہارٹ اٹیک ہوا اور انہیں اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ ہمیں اطلاع ملی تو ہم بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے۔ امی تو ماموں جان کی لاش دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ابو نے ضروری کارروائیاں کیں۔ پھپو بھی آ گئی تھیں' میں نے انہیں پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ اس روز رومانہ بھی رو رہی تھی اور بار بار ماموں جان کی لاش سے لپٹی جا رہی تھی۔ ان کی لاش گھر لائے۔ کیونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے انہیں صبح دفنانے کا فیصلہ ہوا۔ امی بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں اس لیے ڈاکٹر نے انہیں نیند کا انجکشن لگا دیا۔ صبح ماموں کا جنازہ اٹھا تو امی کا رونا اور چیخیں نہیں رک رہی تھیں۔ ان کا ایک ہی بھائی تھا اور اس سے انہوں نے بے پناہ محبت کی تھی۔ صرف چوالیس برس کی عمر میں ماموں جان کا انتقال ہو گیا تھا۔

رفتہ رفتہ ہر غم کو قرار آ ہی جاتا ہے۔ امی بھی صبر کر کے بیٹھ گئیں۔ ابو، زرینہ پھپو اور رومانہ کو گھر ہی لے آئے تھے کہ پھپو عدت کے دن ہمارے ہاں ہی گزاریں۔ اس دوران میں ابو چھٹیاں لے کر ماموں جان کی دکان کا حساب دیکھ رہے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ اس دکان کو چلانا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسے ملازموں پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اس لیے انہوں نے پھپو کو مشورہ دیا کہ دکان بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی رقم سے سیونگ سرٹیفکیٹ لے لیے جائیں تاکہ اس سے ماہانہ رقم ملتی رہے۔ پھپو مان گئیں' انہیں خود بھی احساس تھا کہ وہ دکان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی ہیں۔

ابو نے بھاگ دوڑ کر کے دکان بیچ دی۔ دراصل یہ صرف دکان نہیں بلکہ پورا ایک کاروبار تھا اس لیے اس کی خاصی معقول قیمت مل گئی۔ پھپو نے اس رقم سے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لیے۔ اس سے اس زمانے میں اتنی معقول آمدنی ہوتی تھی کہ پھپو اور رومانہ کو کوئی مالی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس وقت ابو امی کا خیال تھا کہ اب پھپو اور رومانہ ان کے ساتھ رہیں گی اور ان کا مکان وہ کرائے پر اٹھا دیں گے۔ امی اگرچہ پھپو سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں لیکن وہ بھی انہیں اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب یہ تجویز پھپو کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''جب میرا اپنا مکان ہے تو میں دوسروں کے در پر کیوں پڑی رہوں۔''

''یہ کوئی دوسرا نہیں تمہارا بھائی ہے'' امی نے جواب دیا۔

''تم اور رومانہ اکیلی کیسے رہو گی؟'' ابو نے پھپو کو سمجھانا چاہا لیکن وہ سمجھنے والی تھیں ہی نہیں' اس لیے عدت پوری کرتے ہی وہ واپس اپنے مکان میں چلی گئی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر کوئی اڑتیس سال تھی لیکن اپنی عمر سے کم ہی لگتی تھیں۔ اس لیے امی ابو نے دوسری شادی کرانے کا سوچا۔ مگر پھپو نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کا جواب حیران کر دینے والا تھا۔

''خدا خدا کر کے تو مجھے ایک مرد کی غلامی سے نجات ملی

ہے۔ دوبارہ غلامی میں جانا مجھے قبول نہیں ہے۔ براہِ کرم آپ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

پھر سچ مچ امی ابو نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اس طرح کہ ان کی زندگی میں دخل دینا بند کر دیا۔ لیکن ان کی خبر گیری جاری رکھی۔ ابو ہفتے میں دو تین بار ان کے پاس جاتے تھے۔ ان سے ان کی ضروریات کا پوچھا کرتے تھے۔ ان کے باہر کے سارے کام جیسے مہینے کا سودا لانا بل وغیرہ جمع کرانا سب ابو یا امی ہی کیا کرتے تھے اور کسی بھائی نے آ کر انہیں کبھی پوچھا بھی نہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ جو چار چار بھائی تھے وہ ان کے گھر بھی نہیں گئے۔ یہاں سے ایم ایس سی کر کے وہ بیرونِ ملک چلے گئے تھے۔ اور جب ماموں جان کا انتقال ہوا تو انہوں نے فون کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ پھپھو کو تو کوئی پروا نہیں تھی لیکن ابو؟ ابو کو اس بات کا بہت دکھ ہوا تھا۔

پھپھو اور رومانہ ہاں بہت کم آتی تھیں اور میں بھی ان کے ہاں کم ہی جاتا تھا۔ میٹرک کے بعد ابو نے مجھے موٹر سائیکل دلا دی تھی تاکہ میں گھر کے بہت سارے کام کر سکوں اور موٹر سائیکل بہت کام آئی تھی۔ مجھے کالج آنے جانے میں بھی آسانی ہو گئی تھی۔ میٹرک کر کے میں نے ڈی جے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

وقت ایسے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا مجھے لگا جیسے میں نے ابھی کالج میں داخلہ لیا تھا اور ابھی گریجویشن کر لیا۔ اس دوران میں پی آئی اے میں ایئر ہنٹس شپ نکلی تھی۔ میں نے اس میں درخواست دی۔ انٹر میں میرا اے ون گریڈ تھا اس لیے مجھے وہاں پر کامیابی ہوئی۔ میں نے کامیابی سے کورس مکمل کیا اور مجھے ملازمت مل گئی۔ اس وقت رومانہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ جوان ہو کر بے حد خوبصورت نکلی تھی۔ پھپھو سے بھی زیادہ لیکن میں نے کبھی اسے پسند نہیں کیا۔ لاکھ خوبصورتی کے باوجود اس کی عادتیں اور خاص طور سے رویہ مجھے ناپسند تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ پھپھو کا پرتو تھی۔ اسکی زبان میں بھی وہی تیزی اور کاٹ تھی' ان دنوں میں اور امی عمرے پر جا رہے تھے۔ رومانہ پھپھو کے ساتھ آئی تو اس نے پہلی بار مجھ سے ذرا لگاوٹ سے بات کی۔ ''اللہ کتنا مزہ آتا ہوگا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر۔''

''ہاں' مزہ تو آتا ہے'' میں ذرا گڑبڑا گیا تھا۔

''عمار بھائی مجھے بھی لے کر چلیں'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''تم کیسے جا سکتی ہو'' میں نے اسے سمجھایا ''ائرلائن صرف مجھے اور میرے رشتے داروں کو فری ٹکٹ دیتی ہے۔''

''تو میں بھی تو آپ کی رشتے دار ہوں'' اس نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔

''بھئی' رشتے داروں سے مراد ہے ماں باپ' بیوی اور بچے.....''

''یعنی آپ کی بیوی کے کتنے مزے ہوں گے۔ ہمارے برابر میں ایک آنٹی رہتی ہیں' ان کے شوہر پی آئی اے میں ہیں۔ وہ ہر سال کہیں نہ کہیں جاتی ہیں۔ کبھی سنگاپور' کبھی بنکاک اور کبھی دبئی۔ اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے لاتی ہیں کہ بس.....''

''بابا ان کے شوہر کسی بڑی پوسٹ پر ہوں گے۔ ہر ایک کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے ہیں'' میں نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ پھپھو ہماری باتیں غور سے سن رہی تھیں' انہوں نے رومانہ سے کہا۔

''میری بیٹی کیوں نہیں جائے گی۔ اور عمار ہی لے کر جائے گا' کیوں بھابی؟'' انہوں نے امی سے کہا تو وہ پھیکے انداز میں مسکرا دی تھیں۔

''کیوں نہیں ذرینہ!''

اس پر پھپھو اور رومانہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی تھیں۔ میں جلدی سے وہاں سے اٹھ گیا۔ میں ان دونوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کچھ سال پہلے تک جب میں پڑھ رہا تھا تو پھپھو اور رومانہ دونوں ہی مجھے منہ لگانے کی روادار نہ تھیں اور اب جبکہ مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی تو وہ دونوں ہی میرے آگے پیچھے ہونے لگی تھیں۔ اس روز کے بعد پھپھو اور رومانہ آئے دن ہمارے ہاں موجود ہوا کرتیں۔ جب میں اور امی عمرے پر جانے لگے تو انہوں نے شاپنگ کی ایک لسٹ پکڑا دی کہ یہ سب لانا ہے۔ ابو نے غصہ ضبط کرتے ہوئے پھپھو اور رومانہ سے کہا۔

''معاف کیجئے گا' میں اور امی وہاں عمرے کے لیے جا رہے ہیں۔''

''ارے تو ہم کون سا مفت میں منگوا رہے ہیں'' پھپھو نے تنک کر کہا اور مجھے دس ہزار کی رقم دی۔ میں یہ رقم انہیں واپس کرنا چاہتا تھا مع لسٹ کے لیکن امی نے مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں نے احتجاج کیا۔ ''آپ نے سامان کی فہرست دیکھی ہے' اتنا ہم لائیں گے کیسے؟ ہر مسافر کو ایک خاص وزن لانے کی اجازت ہوتی ہے۔'' پھر میں نے پھپھو سے کہا۔

''دیکھیں پھپھو' ہم آسانی سے جتنا لا سکے' لے آئیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی..... میں تو یہ سب رومانہ کے جہیز

کے لیے منگوا رہی ہوں'' پھپھو نے معنی خیز انداز میں کہا۔

عمرے کے بعد جب ہم جدہ آئے تو وقت کم تھا۔ مجھے بھاگ دوڑ کر کے خریداری کرنا پڑی اور رقم کم پڑ گئی تھی اس لیے کچھ رقم اپنی طرف سے بھی ملانی پڑی تھی۔ اس کے بعد اس سامان کو طیارے پر بار کرانے کا مسئلہ ہوا لیکن یہاں پی آئی اے کی ملازمت کام آئی۔ اتفاق سے اسٹیشن منیجر واقف کار نکل آیا اور اس نے سامان کلیئر کروا دیا۔ ائرپورٹ پر بھی تعلقات کام آئے۔ ورنہ اضافی سامان کی خاصی بھاری رقم دینا پڑتی۔ اس چکر میں خود ہماری چھوٹی موٹی شاپنگ رہ گئی تھی۔ میں نے امی سے کہہ دیا۔ ''آئندہ میں پھپھو کا کوئی سامان نہیں لاؤں گا۔''

''مجبوری ہے بیٹا' آدمی کو رشتے داری نبھانی پڑتی ہے'' امی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''اور یہ پھپھو کیا اشاروں میں کہتی رہتی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں رومانہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔''

''کیوں' اس میں کیا برائی ہے؟ ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔''

''امی صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی عادتیں دیکھی ہیں آپ نے؟''

امی یہ سن کر چپ ہو گئی تھیں پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ کراچی میں آ کر جب یہ سامان پھپھو کے حوالے کیا تو وہ خوشی سے کھل گئی تھیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں کہ میں اگلی بار کب باہر جاؤں گا؟

''کبھی نہیں'' میں نے جل کر کہا ''ایک ہی تجربہ کافی ہے۔''

امی نے ڈانٹا ''کیا بک رہا ہے لڑکے! اللہ کے گھر سے آ رہا ہے۔''

میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا ''میرا یہ مطلب تھوڑی ہے۔ میں تو اس شاپنگ کی بات کر رہا ہوں' اس سامان کی وجہ سے ہمیں آب زم زم تک وہاں چھوڑنا پڑا۔''

پھپھو نے جیسے سب سنا ہی نہیں تھا۔ وہ سامان کو فہرست کے مطابق دیکھ رہی تھیں اور شکوے کر رہی تھیں۔ میں بھنا کر ان کے گھر سے نکل گیا کیونکہ سامان کی ہی وجہ سے ہم سیدھے ان کے گھر میں آئے تھے ائرپورٹ سے۔

اس کے بعد امی نے براہِ راست تو نہیں لیکن اشاروں کنایوں میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ رومانہ کو بہو بنا کر لانا چاہتی ہیں۔ خاص طور سے جس روز پھپھو اور رومانہ ہمارے ہاں سے ہو کر جاتے تھے' امی یہ موضوع ضرور چھیڑا کرتی تھیں۔ میں جواب میں کہتا۔

''امی' زندگی ایسے ہی نہیں گزرتی ہے۔ عورت میں سلیقہ اور گھر داری نہ ہو تو یہ سب چیزیں بے کار ہیں۔''

''اسے کھانا پکانا آتا ہے۔''

''رہنے دیں امی!'' میں نے برا سا منہ بنایا ''اسے ڈھنگ سے چائے تک بنانا نہیں آتی ہے۔ جتنی بار اس کے گھر گیا' مجھے جوشاندہ نما چائے زہر مار کرنا پڑی۔''

''بیٹا' سب چیزیں وقت کے ساتھ آ جاتی ہیں۔ میں بھی جب اس گھر میں آئی تھی تو مجھے بہت سارے کام نہیں آتے تھے مگر جب کرنے پڑے تو سب آ گئے۔''

''بشرطیکہ لڑکی میں کچھ کرنے کا جذبہ ہو اور مجھے رومانہ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ بے حد سطحی قسم کی لڑکی ہے اور بالکل پھپھو پر گئی ہے۔''

''بیٹا' وہ شادی کے بعد بدل جائے گی۔''

''امی' میں نے کہہ دیا۔ میں رومانہ سے شادی نہیں کر سکتا'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

امی نے ابو سے مدد چاہی لیکن وہ اس معاملے میں غیر جانبدار رہے ''بھئی اگر عمار مان جاتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''وہ نہیں مان رہا ہے'' امی بے بسی سے بولیں۔

''بھئی' میں نے کہا نا کہ یہ تمہارا اور عمار کا معاملہ ہے' میں اس میں دخل نہیں دے سکتا۔'' ابو نے صاف کہہ دیا۔

ابو سے مایوس ہو کر امی نے میرے ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ رومانہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوگی کیونکہ وہ ماموں جان جیسے اچھے آدمی کی بیٹی تھی مگر امی یہ بھول جاتی تھیں کہ رومانہ بالکل اپنی ماں پر گئی تھی حالانکہ پھپھو چاہتی تھیں کہ وہ اب گھر داری سیکھے۔ مگر خواہش کرتے وقت وہ بھول جاتی تھیں کہ خود انہوں نے بھی گھر داری نہیں کی تھی تو اب بیٹی سے اس کی توقع کیسے کر سکتی تھیں۔ میں ان کا بھتیجا تھا اور انہیں میرے مزاج کا اندازہ بھی تھا۔ اس لیے وہ رومانہ کو اس ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ میں اسے قبول کر لوں۔

ماموں کی بار ہویں برسی تھی۔ بڑی ہمارے ہاں ہی منائی گئی تھی اور جب قرآن خوانی کے بعد ماموں کی مغفرت کے لیے دعا ہو رہی تھی تو امی رو دیں اور انتاروئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ میں یہ سن کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ بہر حال ذرا دیر بعد بڑی مشکلوں سے امی کو ہوش آ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ پھپھو آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ امی نے

میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور نحیف سی آواز میں بولیں ''عمار! آج مجھے ایسا لگا جیسے تیرے ماموں کی روح آئی ہو اور مجھ سے شکوہ کررہی ہو کہ میں نے ان سے کیا جانے والا وعدہ کیوں پورا نہیں کیا؟''

''کیسا وعدہ؟'' میں نے امی سے نظریں چرائیں۔

''تیرے ماموں نے جب آخری بار ہمارے ہاں آئے تھے تو مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں روبینہ کو اپنی بہو ضرور بناؤں گی۔ اب میں کیا منہ لے کر بھائی کے سامنے جاؤں گی؟'' امی کے آنسو دوبارہ بہنے لگے۔

''امی پلیز! نہ روئیں'' میں نے التجا کی۔

''بیٹا' یہ شرمندگی مرتے دم تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی کہ میں نے مرتے بھائی سے کیا جانے والا وعدہ پورا نہیں کیا۔''

امی کے [illegible] میں ایسا گداز تھا جیسے میرے اندر سے کچھ پگھلنے لگا۔ میں نے امی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا ''امی' میرے ہوتے آپ کبھی شرمندہ نہیں ہوں گی۔ آپ..... آپ ماموں جان سے کیا جانے والا وعدہ پورا کرلیں۔''

''سچ!'' امی اٹھ کر بیٹھ گئیں ''تو سچ کہہ رہا ہے؟''

''ہاں'' میں کھڑا ہوگیا ''مگر یہ میں صرف آپ کی خوشی کے لیے کررہا ہوں۔''

''خوش رہ بیٹے! آج تو نے ماں کو شاد کردیا'' امی بولیں۔ انہوں نے شاید میرا پورا جملہ سنا نہیں تھا یا اسے اہمیت نہیں دی تھی۔

انہوں نے پھپھو کو میری رضامندی سے آگاہ کیا تو وہ بھی خوش ہوکر میری بلائیں لینے لگیں۔ ابو اس فیصلے پر چپ سے ہوگئے تھے مگر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھپھو کے لیے ماموں جان خاصی دولت چھوڑ کر گئے تھے' اس لیے وہ دل کھول کر رومانہ کے لیے خرچ کررہی تھیں۔ ان کے مجبور کرنے پر مجھے بہت سارے سامان کی خریداری کے لیے دبئی کا ایک چکر لگانا ہی پڑا۔ امی نے بھی اپنی بساط سے بڑھ کر بری تیار کی۔ امی کا کہنا تھا اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو میرا سر ہمیشہ کے لیے رومانہ کے آگے جھکا رہے گا جو اتنا شاندار جہیز لے کر آرہی تھی۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف تھا لیکن امی اور پھپھو کے آگے میری ایک نہیں چل رہی تھی۔ ہاں' جب پھپھو نے سلامی میں مجھے نئی موٹر سائیکل دینے کی بات کی تو میں نے سختی سے انکار کردیا۔

''پھپھو' اول تو میرے پاس موٹر سائیکل ہے اور نہ بھی ہوتی تو میں ان چیزوں کے سخت خلاف ہوں۔ میرے نزدیک جہیز اور سلامی وغیرہ فضول چیزیں ہیں۔''

''ارے واہ! میں اپنی اکلوتی بیٹی کو کچھ نہ دوں؟ اور تمہاری موٹر سائیکل تو اب کھٹارا ہے۔ میری بیٹی اس پر بیٹھتی اچھی لگے گی؟'' پھپھو نے کہا ''میں تو موٹر سائیکل ضرور دوں گی۔''

''شوق سے دیجئے'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''لیکن میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اسے رومانہ ہی چلائے گی۔''

یوں یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ اگرچہ پھپھو کئی دن مجھ سے خفا رہی تھیں۔ پھر شادی کے دن آگئے۔ دونوں طرف سے ہنگامے جاگ اٹھے۔ ان دنوں میں ایک امتحان دے رہا تھا جس کے بعد میری ترقی ہوجاتی۔ میں ان ہنگاموں سے بے زار تھا اس لیے امتحان کی تیاری کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس پر بھی پھپھو نے ہنگامہ کیا کہ میں شادی کے دنوں میں بھی گھر میں نہیں ٹک رہا۔

''اس لڑکے کا ابھی سے یہ حال ہے' شادی کے بعد تو یہ میری بچی کو اکیلا مار دے گا۔''

''زرینہ' اس کے منگھے کا ایک امتحان ہورہا ہے'' ابو نے سختی سے انہیں ڈانٹ دیا ''اس کی تیاری کے لیے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں جاتا ہے۔''

''ارے' امتحان بھی ان ہی دنوں دینا تھا'' پھپھو نے ہاتھ نچا کر کہا ''لگتا ہے اسے شادی کی خوشی نہیں ہے۔''

اور یہ بات سو فیصد درست تھی' مجھے اس شادی کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ نہ ہی دل میں کوئی جوش ولولہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ شادی والے دن بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ رومانہ بیاہ کر میرے گھر آگئی۔ میں نے اس کو بیوی کے سارے حقوق دیے لیکن اس کے لیے اپنے دل میں وہ محبت اور کشش نہ محسوس کرسکا جو اس رشتے کا ایک لازمی تقاضا ہوتا ہے۔ دوسری طرف میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ رومانہ کو بھی مجھ سے وہ محبت نہیں تھی جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔ شاید اسے بھی محض ایک شوہر ہی درکار تھا۔

شادی کے ابتدائی دن ہی اتنے رونے پھیکے تھے کہ میں آنے والے دنوں کا سوچ کر رہ جاتا کہ مستقبل میں ہم ایک دوسرے کو کیسے برداشت کریں گے۔ رومانہ عام طور سے دیر تک پڑی سوتی رہتی تھی۔ شادی کے بعد میں نے صرف چار دن کی چھٹیاں لی تھیں تاکہ شادی کی دعوتوں سے نمٹ کر کہیں گھومنے پھرنے کے لیے جائیں تو دوبارہ چھٹیاں لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ جس روز مجھے پہلی بار دفتر جانا تھا' اتفاق سے اس

روز امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ صبح کا ناشتا عام طور سے وہی بنایا کرتی تھیں۔ میں نے رومانہ کو اٹھانے کی کوشش کی' وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

''سونے دو مجھے' اتنی صبح کیوں اٹھا رہے ہو؟''

''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے ناشتا بنا کر دو' دفتر سے دیر ہورہی ہے۔'' اس بار میں نے اسے زیادہ زور سے جھنجوڑا۔

وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی ''اگر تمہاری ماں کی طبیعت خراب ہے تو میں کیا کروں؟ باہر سے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ اور کھا کر دفتر چلے جاؤ۔''

رومانہ روز اول سے مجھ سے تم کر کے بات کرتی تھی لیکن اس روز مجھے اس کا لہجہ برا لگا تھا' خاص طور سے اس نے امی کے بارے میں جس طرح بات کی تھی۔ میں نے اسے جھڑکا ''تمیز سے بات کرو۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔''

وہ چلانے لگی ''اور میں بھی تمہاری بیوی ہوں کوئی نوکرانی نہیں ہوں جس کے ساتھ اس طرح پیش آرہے ہو۔''

میں خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ بلکہ گھر سے بھی چلا گیا۔ بعد میں امی نے بتایا کہ میرے جانے کے بعد بھی رومانہ نے خوب ہنگامہ کیا اور فون کر کے اپنی امی کو بھی بلا لیا۔ دونوں ماں بیٹیوں نے امی پر چڑھائی کردی۔ حالانکہ نہ تو انہیں اس بات کا علم تھا اور نہ ہی ان کا کوئی قصور تھا۔ ان دونوں ماں بیٹی نے اس کا خیال بھی نہیں کیا کہ امی کی طبیعت خراب ہے۔ چیخنے چلانے کے بعد پھپھو رومانہ کو لے کر چلی گئیں۔ امی نے فون کر کے مجھے دفتر میں اس بات سے آگاہ کیا۔

''جانے دیں امی' جب اس کا دماغ درست ہوگا تو خود ہی آجائے گی۔''

''لیکن بیٹا' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ابھی تم دونوں کی شادی کو چوتھا دن ہی تو ہے۔ تمہیں اس سے کام کے لیے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آج شام کو دفتر سے آتے ہوئے اسے لیتے آنا۔''

''اگر آپ کا حکم ہے تو میں لے آؤں گا لیکن مجھے اس سے بہتری کی امید نہیں ہے۔''

شام کو میں رومانہ کو لینے گیا تو دونوں ماں بیٹی کا موڈ حسب توقع خراب تھا۔ رومانہ تو مجھے دیکھتے ہی اندر چلی گئی اور پھپھو نے تیوری چڑھائی تھی ''واہ بھیا! بڑا اچھا رکھا میری پھول سی بچی کو۔''

''کیوں کیا ہوا اس کے ساتھ۔ اگر امی کی طبیعت خراب تھی اور میں نے اس سے ناشتا بنانے کو کہہ دیا تو کیا قیامت آگئی جو آپ دونوں نے اتنا بڑا فساد کھڑا کردیا۔''

''تمہاری ماں کی طبیعت تو ٹھیک لگ رہی تھی'' وہ بولیں۔ ''جب میں آئی تھی۔''

میں کھڑا ہوگیا ''یہ رومانہ آپ کی زبان بول رہی تھی۔ تمہاری ماں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ کیا وہ اس کی ممانی اور آپ کے بھائی نہیں لگتی ہیں۔ یہ بتائیں کہ رومانہ کو میرے ساتھ بھیج رہی ہیں یا نہیں؟''

پھپھو نے میرے تیوروں سے بھانپ لیا کہ میں ان سے اکھڑ گیا ہوں۔ انہوں نے جلدی سے پینترا بدلا ''ارے جائے گی کیوں نہیں' وہ تو میں اس لیے اسے لے آئی تھی کہ اداس ہورہی تھی' اے رومانہ! ادھر آ۔''

''میں نہیں جاؤں گی'' اس نے سامنے آتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی لے جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو امی کے کہنے پر آگیا تھا۔''

''تو چپ کر'' پھپھو نے اسے ڈانٹا ''بچہ تھکا ہارا آیا ہے' اسے چائے پانی پوچھنے کے بجائے جھگڑا شروع کردیا۔ تم دونوں نکھٹو' میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''نہیں پھپھو! میں صرف رومانہ کو لینے آیا تھا' چائے پھر کبھی پیوں گا'' میں نے منع کردیا۔

رومانہ جانے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن پھپھو نے اسے آنکھیں دکھائیں تو بادل ناخواستہ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ مگر گھر آکر بھی اس کا منہ پھولا ہی رہا تھا۔ اس نے امی سے بات نہیں کی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ امی کے کہنے پر میں نے رات پیار سے اسے سمجھایا کہ یہ اس کا گھر ہے اور اسے یہاں کام کرنا چاہیے۔ پتا نہیں بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس نے کچھ اور نہیں کہا۔ ہاں' یہ اور بات ہے کہ تین مہینے گزرنے کے بعد بھی اس نے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ امی نے تو اس سے بھی کسی کام کا نہیں کہا تھا لیکن میرے معمولی سے کام کرتے ہوئے بھی وہ ایسی صورت بنائی تھی جیسے شدید تکلیف میں ہو۔ آخر ایک روز میں نے اس سے کہہ دیا۔

''رومانہ اس طرح کب تک چلتا رہے گا۔ آخر تم اس گھر کے کاموں میں اپنا حصہ کب ادا کروگی؟''

''کون سا حصہ؟'' اس نے ناخن چباتے ہوئے کہا ''میں اس گھر میں کام کرنے کے لیے نہیں آئی ہوں۔''

''تو پھر کس لیے آئی ہو؟'' میں نے غصے سے کہا ''آخر

امی بھی تو کام کرتی ہیں۔"

"تو کیا ہوا' یہ ان کا گھر بھی تو ہے۔ آخر وہ مالکن ہیں تو کام بھی کریں یا تمہیں اتنی تکلیف ہے تو نوکرانی رکھوا دو۔"

"اگر یہ ان کا گھر ہے تو پھر تم کس استحقاق کی وجہ سے یہاں رہ رہی ہو؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ اچھل پڑی تھی "تو اب تم مجھے اس گھر میں رہنے پر طعنہ دے رہے ہو۔ یہ تمہاری ماں کا گھر ہے' ٹھیک ہے..... وہ یہاں رہیں' میں اپنی ماں کے گھر جا رہی ہوں۔"

"پلیز رومانہ! بچوں کی سی باتیں مت کرو۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"میں اچھی طرح سمجھنے لگی ہوں تمہارا اور تمہاری ماں کا مطلب..... تم لوگ مجھے اصل میں نوکرانی بنا کر لائے ہو۔ مجھ سے سارے گھر کا کام کروانا چاہتے ہو۔ میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو" میں نے سخت لہجے میں کہا "میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"بس تم لوگوں کو یہ یاد ہے۔ تم میرے شوہر ہو اور وہ بڑھیا میری ساس....."

میرے بھرپور تھپڑ سے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ چکرا کر بستر پر جا گری۔ ایک لمحے کو تو میں بھی سن رہ گیا۔ میرا ارادہ تھپڑ مارنے کا نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے میرا ہاتھ گھوم گیا۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے بے تحاشا رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ امی بوکھلا کر ہمارے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

"کیا ہوا بیٹی!" انہوں نے رومانہ سے پوچھا "کیوں رو رہی ہو؟"

"مجھ سے کیا پوچھتی ہیں' اپنے لاڈلے سے پوچھیں' اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔" وہ حلق کے بل چلائی۔

"اپنی بے ہودہ حرکت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"عمار! پاگل..... بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے" امی نے غصے سے مجھے دیکھا۔

"بشرطیکہ بیوی..... بیوی بن کر رہے اور یہ عورت....." میں نے رومانہ کی طرف انگلی اٹھائی "کسی صورت میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔"

"میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی تو میں یہاں کیوں رہوں۔ میں جا رہی ہوں اپنی ماں کے گھر" اس نے اٹھ کر اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیے۔

"شوق سے جاؤ" میں نے کہا۔

امی نے اسے سمجھایا۔ مجھے بھی ڈانٹتی رہیں لیکن رومانہ رکی نہیں بلکہ جب اس نے سوٹ کیس تیار کر لیا تو بڑے زہریلے لہجے میں بولی "ڈرامے بازی مت کریں۔ یہ سب آپ کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے" اس کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔

"میرا خیال ہے تم مزید مار کھا کر اپنے گھر جانا پسند کرو گی" میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ چلانے لگی۔

"اس جانور کو مجھ سے دور رکھیں..... وحشی..... درندہ....."

"تمہاری جیسی عورتوں کے لیے آدمی کو درندہ ہی بننا پڑتا ہے۔"

رومانہ نے سوٹ کیس تیار کر کے اپنی ماں کو فون کیا اور خود سوٹ کیس لے کر باہر جا کھڑی ہوئی۔ محلے والوں نے بھی حیرانی سے دیکھا تھا۔ پھپھو کار لے کر آئیں اور رومانہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ شام کو جب ابو آئے اور رومانہ کے بارے میں پوچھا تو امی نے انہیں سارا واقعہ سنایا۔ ابو اسی وقت امی کو لے کر پھپھو کے گھر گئے۔ وہاں پر جو بات ہوئی وہ بعد میں مجھے بتائی۔ انہیں دیکھتے ہی پھپھو نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"یہ تو غیر ہیں بھائی! لیکن آپ کی تو رومانہ بھی بھانجی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ایسا سلوک!"

"میری بھی وہ بھتیجی ہے" امی نے کہا۔

"اگر اسے بھتیجی سمجھتیں تو اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔" پھپھو نے تلخی سے کہا۔

"زرینہ خدا گواہ ہے' میں نے اس کے ساتھ کبھی سخت لہجے میں بات بھی نہیں کی۔ میں تو اس کے کسی معاملے میں مداخلت بھی نہیں کرتی" امی نے تحمل سے کہا "مجھے بتاؤ' میں نے اس کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے؟"

"ارے یہ سلوک کیا کم ہے کہ بیٹے کو ہر وقت اس کے خلاف سکھاتی پڑھاتی رہتی ہو۔" پھپھو نے کہا تو ابو کو غصہ آ گیا۔

"ثمینہ نے کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی" ابو نے سخت لہجے میں کہا "بلکہ رومانہ کا رویہ درست نہیں ہے۔ وہ گھر میں اس طرح نہیں رہنا چاہتی جیسے ایک بہو رہتی ہے۔"

"آپ بھی اسے بہو سمجھیں' نوکرانی نہ سمجھیں۔"

"اس میں نوکرانی ہونے کی کیا بات ہے' کیا وہ گھر اس کا نہیں ہے؟"

"وہ گھر اس کا نہیں' بھابی کا ہے۔ عورت کا گھر تو وہی ہوتا

ہے جو اس کے شوہر نے بنا کر دیا ہو۔ جب رومانہ کا شوہر اس کے لیے گھر بنا لے گا تو وہ اپنی ذمے داریاں پوری کرے گی۔"

پھپھو بے پروائی سے بولیں۔

"دیکھو زرینہ! تم رومانہ کے لیے برا کر رہی ہو" ابو بولے "تم نے اپنا گھر ٹھیک طریقے سے نہیں بسایا اور نہ بیٹی کا بسنے دے رہی ہو۔ ہوش کے ناخن لو۔"

"بھائی جان! میں نے فیصلہ کر لیا ہے رومانہ وہاں اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ بہتر ہوگا عمار اسے الگ گھر لے کر دے دے یا پھر....." وہ ذرا چپ ہوئیں پھر بولیں "عمار یہاں آ جائے۔"

امی ابو نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔ تمہارا مطلب ہے عمار اپنا گھر چھوڑ کر یہاں گھر داماد بن جائے؟" ابو بولے۔

"تو اس میں کیا حرج ہے۔" پھپھو بے پروائی سے بولیں "آخر عمار میرا بھتیجا بھی تو ہے۔"

ابو نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "دیکھو' یہ ہمارے رواج میں نہیں ہے۔ پھر عمار کبھی بھی نہیں مانے گا' اس طرح گھر داماد بن کر رہنا۔"

"نہ مانے..... اس صورت میں رومانہ بھی نہیں جائے گی۔ ہاں وہ الگ گھر لے لے تو میں سوچ سکتی ہوں" پھپھو نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"پلیز زرینہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" امی نے ان سے التجا کی "ہم چاہیں بھی تو عمار نہیں مانے گا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"کیوں جب تم اپنے میری بیٹی کے خلاف بہکاتی ہو تب تو وہ سمجھ جاتا ہے۔" پھپھو تنک سے بولیں۔

ابو کھڑے ہو گئے "چلو ثمینہ! یہ نہیں سمجھے گی۔ اس نے ساری عمر اپنی من مانی کی ہے۔ اپنی زندگی خراب کی ہے اور اب بیٹی کی زندگی بھی برباد کر رہی ہے۔" ابو نے جاتے جاتے پھپھو سے کہا۔ "اگر تمہیں یا تمہاری بیٹی کو عقل آ جائے تو مجھے فون کر دینا' میں اسے آ کر لے جاؤں گا۔ عمار اسے لینے نہیں آئے گا۔ ماموں ہونے کے ناتے میں اتنا کر سکتا ہوں۔"

امی ابو جب واپس آئے تو میں ان کی صورت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ بات نہیں بنی۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ "آپ اتنا پریشان مت ہوں۔ جب اسے عقل آئے گی تو وہ خود آ جائے گی۔"

ابو نے سرد آہ بھری "اسے تو شاید عقل آ جائے لیکن تمہاری پھپھو کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔"

امی نے ان کی تائید کی "رومانہ خود بری نہیں ہے لیکن زرینہ اسے سکھاتی پڑھاتی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے جلد وہ خود سے سوچے گی تو واپس آ جائے گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ آپ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ نا سمجھی ہے۔ وہ کسی طرح پھپھو سے کم نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے' وقت بڑے بڑوں کو سبق سکھا دیتا ہے" ابو نے میرا شانہ تھپکا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"مجھے ایسا نہیں لگتا" میں نے مایوسی سے امی کی طرف دیکھا "وہاں پر کیا ہوا تھا؟"

امی نے مختصر الفاظ میں وہاں کی روداد سنائی پھر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "عمار! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہیں اوپر والے حصے میں کمرے بنوا دیں اور تم....."

"میں آپ دونوں سے الگ نہیں رہ سکتا۔ بے شک ایک ہی مکان میں کیوں نہ رہیں اور دوسرے پھپھو اور رومانہ کی تو پالیسی ہی الگ ہے۔ آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے وہ مجھے گھر داماد بنا کر رکھنا چاہتی ہیں اور ایسا میں مرکر بھی نہیں کر سکتا۔"

"خدا نہ کرے" امی دہل کر بولیں "مریں تیرے دشمن۔"

"بس تو پھر آپ مجھے اس بارے میں کچھ مت کہیے گا۔ میں آپ کو اور ابو کو کسی صورت بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"اچھا میں نہیں کہوں گی" امی نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد امی اور ابو نے دو تین بار اور کوشش کی کہ پھپھو رومانہ کو واپس بھیج دیں مگر وہ نہیں مانیں۔ ابو نے براہ راست رومانہ سے بات کی تو اس نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ امی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرے گی۔ مجھے اس کی اتنی پروا نہیں تھی لیکن امی میری سوتی زندگی دیکھ کر پچھتاتی تھیں۔ ان کی ضد پر میں نے رومانہ سے شادی کرنے کی حامی بھری تھی اس لیے وہ خود کو قصوروار قرار دیتی تھیں۔ حالانکہ میں انہیں سمجھاتا تھا۔

"امی' یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں۔"

"نہیں' یہ میرا جذباتی فیصلہ تھا اگر میں تمہاری شادی کسی اچھی لڑکی سے کرتی تو آج تم آباد ہوتے۔ اس طرح اکیلے نہ رو رہے ہوتے۔"

"آپ دل پر بوجھ نہ لیں" میں نے جلدی سے کہا "مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"یہ تو تمہاری سعادت مندی ہے ورنہ میں خود کو تمہاری

مجرم محسوس کرتی ہوں۔" امی بولیں۔

کچھ عرصے سے امی کو دل کی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ای سی جی کرانے پر پتا چلا کہ ان کے دل کی کچھ شریانیں بلاک ہو رہی ہیں اس لیے میں امی کا خیال رکھتا تھا کہ وہ کوئی بات دل پر نہ محسوس کریں۔ رومانہ کو گھر سے گئے ایک سال ہونے کو آیا تھا' اپنی شادی کی سالگرہ میں نے سڑکوں پر مارے مارے پھر کر منائی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں کتنے خوش ہیں' ہنستے مسکراتے جوڑے ایک دوسرے کی محبت میں سرشار جب میرے سامنے سے گزرتے تو دل میں ہوک سی اٹھتی کاش خدا نے رومانہ کو جتنی اچھی صورت دی تھی' اتنی ہی اچھی سیرت بھی دی ہوتی تو آج میرا گھر بھی آباد ہوتا۔

امی بہ ظاہر صحت مند تھیں اور انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اس صورتِ حال پر گھلتی جا رہی تھیں۔ ایک روز جب ہم رات کا کھانا کھا کر ٹی وی پر خبریں دیکھ رہے تھے تو امی نے اچانک بے چینی محسوس کی۔ ان کے بائیں ہاتھ میں درد سا ہو رہا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید کام کرتے ہوئے کوئی جھٹکا آ گیا ہوگا۔ میں آیوڈیکس لگا رہا تھا کہ اچانک امی کی رنگت متغیر ہو گئی اور وہ پسینے پسینے ہونے لگیں۔ ابو نے ان کی حالت دیکھی تو مجھ سے بولے۔

"جلدی سے اکرم صاحب سے گاڑی لے آؤ۔ تمہاری امی کو اسپتال لے جانا ہے۔"

اکرم چچا ہمارے پڑوسی تھے۔ میں بھاگ کر ان سے گاڑی مانگ لایا۔ امی کو اس میں لے کر ہم اسپتال کی طرف بھاگے لیکن امی راستے میں ہی سانسیں ہار گئی تھیں۔ ابو جو انہیں سنبھالے بیٹھے تھے' پریشان ہو کر امی کو آوازیں دینے لگے۔

"عمار! دیکھو تمہاری امی کو کیا ہوا ہے' گاڑی تیز چلاؤ۔"

میں نے گاڑی تیز کر دی۔ ابو جان بھی گئے تھے لیکن حوصلے سے امی کی لاش کو سنبھالے بیٹھے رہے' جب اسپتال میں جاتے ہی انہیں اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے جایا گیا اور ڈاکٹر نے تجلت میں ان کا معائنہ کیا تو اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"شی از آل ریڈی ڈیڈ..... آئی ایم سوری۔"

ابو یہ سن کر حواس کھو بیٹھے تھے۔ میں انہیں سنبھالنے لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ امی ہمیں چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ بلکہ کئی دن تک یقین نہیں آیا تھا۔ پھپھو کی طرف سے یہ دوسری زندگی تھی جو انہوں نے لی تھی۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر ماموں اور امی دونوں کی زندگی ختم کرنے میں پھپھو کا کردار بھی تھا۔ اس وقت مجھے اس نام سے چڑ ہونے لگی تھی۔ پھپھو امی کے مرنے پر آئیں۔ سوئم والے دن تک ہمارے ہاں رہیں۔ رومانہ بھی آئی لیکن میں نے اس سے بات نہیں کی بلکہ اس کے سامنے بھی نہیں آتا تھا۔ میں جب گھر میں ہوتا تو پھپھو اس قسم کی باتیں شروع کر دیتی تھیں جن سے لگتا تھا کہ وہ رومانہ کو اب واپس بھیجنا چاہتی ہیں لیکن جب وہ ایسا کہا کرتی تھیں تو میں گھر سے نکل کر چلا جاتا تھا۔ ابو نے بھی پھپھو یا ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ وہ چالیسویں تک اس امید پر بار بار آتی رہیں کہ شاید میں یا ابو رومانہ کو واپس لانے کی بات کریں۔ ابو تو خیر بالکل ہی بجھ گئے تھے۔ میرا بھی دل جیسے اندر سے مر گیا تھا۔ مجھے رومانہ کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب اگر وہ بالکل تبدیل ہو کر بھی سامنے آ جاتی تو میں اسے قبول نہ کرتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے واپس آنا چاہتی تھی۔ امی تو انتقال کر ہی چکی تھیں' ان کے خیال میں ابو بھی کچھ دن میں گزر ہی جاتے اور رومانہ اس گھر کی مالکن بن جاتی۔

ہمارے ہاں آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی رشتوں کی بنیاد جذباتی فیصلوں پر ہوتی ہے۔ اس سے دو زندگیاں خراب بھی ہو سکتی ہیں۔ اس سے ان فیصلہ کرنے والوں کو کوئی غرض نہیں ہے۔ اگر امی ابو کی باتوں میں آ کر ماموں اور پھپھو کی شادی کا جذباتی فیصلہ نہ کرتیں یا میں امی کی باتوں میں آ کر رومانہ سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کرتا تو شاید ماموں اور امی دونوں ہی زندہ ہوتے۔ ہمارے بڑے فیصلہ کرتے ہوئے اس پر ذرا کم ہی غور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر پہلے سے یہ سوچ لیا جائے تو کئی زندگیاں تباہ ہونے سے بچ جائیں۔

رومانہ نے دو سال بعد ہی پھپھو کی شدید مخالفت کے باوجود مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے بھی اس کا یہ مطالبہ پورا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے جہیز کا سارا سامان وہ کچھ عرصے پہلے ہی لے جا چکی تھی' اس ذمے داری سے چھٹکارا حاصل کر کے میں نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ابو کے بے حد اصرار پر میں نے اپنی ہی ایک کولیگ سے شادی کر لی اور اب میں اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ بے حد خوش اور مطمئن ہوں۔ ایک غلط فیصلے کی راہ سے گزر کر بالآخر میں صحیح سمت میں گامزن تھا۔ دو سال پہلے جب ابو کا انتقال ہوا تو وہ بے حد مطمئن اس دنیا سے گئے تھے۔

تحریک

محترم ایڈیٹر صاحب، آداب عرض۔

آج ایک بار پھر سرگزشت کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے۔ جب تک زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو یہ عجیب بے مزہ سی لگتی ہے۔ میں نے یہ جانا ہے کہ زندگی کو تحریک صرف دو جذبوں سے ملتی ہے۔ محبت سے یا پھر نفرت سے۔ میری زندگی بھی بڑی بے مقصد ہو چکی تھی کیونکہ میرے دل میں اب خواہشات نے جنم لینا چھوڑ دیا تھا۔ مگر پھر اچانک مجھے زندہ رہنے کا ایک معقول جواز مل گیا۔ ممکن ہے میری یہ چھوٹی سی کاوش بہت سی بے مقصد زندگیوں کو کوئی مقصد عطا کر دے۔

فقط آپ کا خیر خواہ

ظفر خان۔ کراچی

ایک دیوار پر لکھا تھا "آپ خودکشی کرنے سے پہلے ایک بار ہم سے ضرور مل لیں"۔ اس کے بعد اس ادارے کا پتا لکھا تھا۔ فون نمبر بھی تھا۔

میں واقعی خودکشی ہی کی سوچ رہا تھا۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ میرے پاس سوائے موت کے اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا اور اس اندھیرے میں اس ادارے کا اشتہار میرے لیے روشنی کی کرن بن کر سامنے آ گیا تھا۔

میں نے وہ پتا ذہن نشین کیا اور اسی وقت اس ادارے

کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ دفتر ایک خوبصورت سی عمارت میں قائم تھا۔ دفتر کی سجاوٹ بھی مرعوب کرنے والی تھی۔

سامنے ایک کاؤنٹر پر ایک خوبصورت لڑکی ایک رجسٹر لیے بیٹھی تھی۔ ''جی فرمائیں'' اس نے میری طرف دیکھا ''کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟''

''میں اس ادارے کے کسی قابلِ اختیار شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں'' میں نے بتایا۔

''آپ فرمائیں تو سہی مسئلہ کیا ہے۔ تاکہ میں آپ کو اس شعبے کے کسی بااختیار کے پاس بھیج دوں۔''

مسئلہ بتاتے ہوئے مجھ کو محسوس ہو رہی تھی لیکن بتانا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں نے بتایا ''میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ'' اس نے ایک گہری سانس لی ''نام بتائیں۔''

''خودکشی کرنے والے سے نام پتا پوچھ کر کیا کریں گی؟''

''رجسٹر میں لکھنا بہت ضروری ہے۔''

میں نے اپنا نام اور پتا بتا دیا ''ٹھیک ہے آپ کل شام کو تشریف لے آئیں'' اس نے کہا۔

''محترمہ! میں خودکشی کرنے جا رہا ہوں اور آپ مجھے کل شام کو بلا رہی ہیں۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ خودکشی کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے میرے پاس'' اس نے بتایا ''ایسا لگتا ہے جیسے اس معاشرے کا ہر فرد خودکشی کرنا چاہتا ہے اسی لیے سب کو وقت دینا پڑتا ہے۔ سب کے مسائل سننے پڑتے ہیں۔ ان کے حل کے راستے تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو کل بلایا گیا ہے۔''

''سمجھ گیا' میں کل آجاؤں گا'' میں نے کہا۔

میں خودکشی کیوں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میں انہیں بتاؤں گا لیکن یہ بات طے ہے کہ میں نے ایسا ارادہ کرلیا تھا۔ اگر وہ اشتہار میری نظروں سے نہیں گزرتا تو شاید اب تک یہ کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔

بہرحال دوسری شام میں پھر اسی دفتر میں موجود تھا۔ مجھے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ادھیڑ عمر کے باوقار افراد تھے۔

ایک نے اپنا تعارف ڈاکٹر رضا کہہ کر کروایا تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا جبکہ دوسرا اس ادارے کا نگراں تھا ''تشریف رکھیں۔'' نگراں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چند لمحوں تک گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتے رہے تھے ''تو آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟'' نگراں نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' میں نے اپنی گردن ہلا دی۔

''خودکشی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں'' اس نے کہا ''شاید محبت میں ناکامی۔''

''جی نہیں'' میں نے انکار کیا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی تھی اور وہی میری بیوی ہے اور ہمارے ازدواجی تعلقات بہت ہی اچھے ہیں۔''

''اوہ! تو پھر کاروبار میں آپ کا نقصان ہو گیا ہوگا''

''جی نہیں۔ ایسا بھی سلسلہ نہیں ہے۔ میرا کاروبار بہت خوش اسلوبی سے چل رہا ہے اور نہ ہی مجھ پر کسی قسم کا کوئی قرض وغیرہ ہے کہ میں جس کے خوف سے خودکشی کر رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا'' اس بار ڈاکٹر بول پڑا تھا ''آپ شاید کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔''

''خدا کے فضل سے میرے ساتھ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے'' میں نے کہا ''میری صحت بہت اچھی ہے۔''

''جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر آپ کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟'' نگراں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ میرے سامنے اب زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا'' میں نے کہا ''پورے وجود میں ایک خالی پن ہے۔ خلا اور کچھ نہیں ہے۔ میں وہ سب کچھ حاصل کر چکا ہوں جس کی خواہش ہوتی ہے اس لیے اب زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ خودکشی کرلیں۔ یہ دنیا بہت خوبصورت ہے' جائیں دنیا کی سیر کریں۔''

''وہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں'' میں نے بتایا ''کئی بار' پوری دنیا کی سیر کر چکا ہوں۔''

''کوئی اور کام۔ کوئی خواہش کوئی آرزو؟''

''نہیں' خدا نے سب پوری کی ہے'' میں نے بتایا ''اب کوئی تمنا کوئی آرزو نہیں رہی۔ یوں سمجھیں کہ زندگی سے اوب چکا ہوں۔ بقول غالب ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔''

''آپ کا کیس دوسروں سے بہت مختلف ہے'' نگراں نے کہا ''یہاں تو زمانے بھر کے ستائے ہوئے آیا کرتے ہیں۔ جن کے سامنے زندگی عذابوں کا پہاڑ بن کر کھڑی ہوتی ہے لیکن آپ کی بات اور ہے۔ آپ کے ساتھ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے'' میں نے کہا

''ایک اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس شخص کا مسئلہ ہے' جس نے یا تو سب کچھ حاصل کرلیا ہے یا اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں بھی اتنا جانتا ہوں لیکن اس کا مداوا کیا ہے؟ کیا میں خودکشی کرلوں؟ اور ہاں' میں یہ لیکچر نہیں سننا چاہتا کہ ہمارے مذہب میں یہ حرام ہے اور خودکشی کرنے والا کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ اس قسم کی باتیں نہیں سنی۔ یا تو آپ مجھے میری حیات کا مقصد بتائیں یا پھر خودکشی کرنے دیں۔''

''عجیب معاملہ ہے'' نگراں نے کہا ''آپ خود عقل مند اور سمجھ دار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ خود ہی کوئی راستہ ڈھونڈ نکالیں گے اور جہاں تک ہمارا سوال ہے تو ہم اسی وقت آپ کی مدد کر سکتے ہیں جب آپ کو کوئی پرابلم ہوتی۔''

''تو پھر میں مایوس ہو جاؤں؟''

''نہیں' ہمیں صرف ایک دن کا موقع دیں'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ ایک دن بھی کیا ہو جائے گا؟''

''کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرلوں گا'' ڈاکٹر نے یقین دلایا ''صرف ایک دن کی بات ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک دن کے لیے اپنے ارادے کو ملتوی کر دیتا ہوں۔''

میں اس ادارے میں تفریح کرنے نہیں گیا تھا۔ بلکہ یہ سچ تھا کہ میں نے اپنے طور پر خودکشی کا ارادہ کرلیا تھا' زندگی بہت تھکی ہوئی اور ویران ہو گئی تھی۔ شاید سب کچھ مل جانا بھی ایک طرح کی موت ہوا کرتا ہے۔

میری ساری خواہشیں پوری ہو چکی تھیں۔ اپنے خدا سے جو کچھ چاہا وہ خوش اسلوبی سے مل گیا تھا اور اب ایک بے لذتی کی کیفیت تھی۔ کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ روز و شب ایک جیسے گزر رہے تھے اور اس وقت مجھے اپنے اندر ایک بڑی تبدیلی' ایک ہیجان کی ضرورت تھی۔ اس خلا کو صرف مقصد سے پُر کیا جا سکتا تھا۔

گھر واپس آیا تو معمول کا سکون تھا۔ سب کچھ اسی طرح در اپنے انداز سے چلتا ہوا۔ جس کو دیکھ دیکھ کر مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے'' میری بیوی نے دریافت کیا۔

علم روحیت پر ایک مستند کتاب
ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی
مصنف: ڈاکٹر الیس صدیقی
اپنا پیغام دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے اور ان کے دل کا حال جاننے کا سائنٹفک طریقہ
قیمت: -/40 روپے ڈاک خرچ: -/23 روپے
کتاب کے چند عنوانات
ٹیلی پیتھی
شعاع بینی کی مشق
تحت الشعور
اور اگنی مخفی قوت
جبلت کی کارفرمائیاں
مابہیت انوکار
متبادل طرز تنفس
اشتعال انگیز
اور اگنی شقیں
مسرت انتقال فکار
مستقبل بینی
انسان
غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک
نفس امارہ
قوتوں کا سرچشمہ
مستقبل بینی
اٹل حقیقت
بغیر چشم دید واقعات
طاقت ور احساسات
مستقبل بینی سیکھئے
مستقبل بینی کے مضمرات
اچھے اور برے پہلو
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون 5802551 فیکس: 5802552-5895313
kitabiat1970@yahoo.com
رابطہ کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے میں روڈ کوریئر سروس کراچی

''مرنے کے لیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب ایسی بھی کیا جلدی ہوگئی ہے؟'' بیوی نے شاید میری بات کو مذاق سمجھا تھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔''

''تو پھر؟''

میں نے اپنی بیوی کو بتادیا کہ میں نے کیا سوچ رکھا ہے۔ میرے دل میں کیا ہے اور میں مشورے کے لیے ایک ادارے تک چلا گیا تھا۔ یہ سب سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''خدا کی پناہ! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ آپ یہ سب کیا سوچنے لگے ہیں؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں یار! اس لیے کہ میرے سامنے کوئی مقصد نہیں رہا۔ زندگی ایک پُرسکون انداز سے چل رہی ہے۔ کاروبار سیٹ ہے۔ بچی کی شادی ہوچکی ہے۔ گھر ہے، گاڑی ہے، میں نے اپنے حصے کی ساری خوشیاں حاصل کرلی ہیں اس لیے اب زندگی کا کوئی جواز نہیں رہا۔''

''یہ تو بہت عجیب بات بتائی آپ نے؟''

''عجیب تو ہے لیکن انوکھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بلا جواز ایک لمحہ بھی سانس لینے کے قائل نہیں ہوتے۔ اس لیے میں نے خودکشی کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

بیوی کو اس پر بھی یقین نہیں آرہا تھا لیکن میں نے نہ جانے کس طرح اسے یقین دلا ہی دیا۔ اس یقین کے بعد اس کی حالت عجیب ہوگئی تھی۔ وہ اس طرح رونے دھونے لگی جیسے واقعی میں نے خودکشی کرلی ہو۔

پھر آہستہ آہستہ یہ کہانی پورے خاندان میں پھیلتی چلی گئی۔ لوگ میرے پاس مجھے سمجھانے کے لیے آنے لگے۔ ان سبھوں کو میری ممکنہ موت کا افسوس ہو رہا تھا۔ (ہاں، اس دوران میں دو تین بار اس ادارے میں جاچکا تھا لیکن وہ لوگ بھی کسی حل تک نہیں پہنچ پائے تھے)۔

کئی دنوں تک گھر میں سوگ کا ماحول رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ حالات نارمل ہوتے چلے گئے۔ بیوی نے اس دوران میں اپنے دو ناکارہ بھائیوں کو بلوالیا تھا تاکہ وہ میرے کاروبار کو سنبھال سکیں۔

شروع شروع میں وہ دونوں سالے بھی بہت اداس اور پریشان ہی رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہیں اس بات کی فکر ہونے لگی کہ میں کب خودکشی کرتا ہوں۔ وہ روزانہ میرے پاس بیٹھ کر اس موضوع پر باتیں کیا کرتے۔ پھر اپنے منصوبے بتانے لگتے کہ میری موت کے بعد وہ میرے کاروبار کو کس طرح وسعت دیں گے۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کیا کریں گے؟

میں ان کی باتیں سن کر حیرت زدہ بھی ہوتا اور افسوس بھی کرتا کہ آخر یہ کس مزاج کے انسان ہیں۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ان کا بہنوئی موت کی آغوش میں جارہا ہے بلکہ وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ میرے کاروبار کو کس طرح سنبھالیں گے۔

ماہر نفسیات نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں کسی طرح اپنی زندگی کا کوئی بڑا مقصد سامنے رکھ لوں۔ پھر خودکشی کا فیصلہ تبدیل ہوجائے گا۔ پھر موت کی خواہش نہیں کروں گا اور اچانک ہی زندگی کا ایک مقصد سمجھ میں آگیا تھا۔

میں نے ایک شام چائے کے دوران میں اپنی بیوی سے کہا ''نزہت۔ شاید میں خودکشی نہ کروں کیونکہ میرے سامنے زندگی کا ایک واضح مقصد آچکا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تمہارے دونوں بھائیوں کو اپنی موت کے انتظار میں رکھنا۔'' میں نے کہا ''میرے لیے زندگی کا اس سے بڑا کوئی مقصد نہیں ہوسکتا۔''

میرے دونوں سالے ابھی تک میری موت کے انتظار میں ہیں اور میں جیے چلا جارہا ہوں۔ اگر آپ بھی اپنے دل میں خودکشی کا فیصلہ کرچکے ہیں تو مشورے کے لیے کسی ادارے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے اردگرد دیکھیں۔ کوئی نہ کوئی مقصد دکھائی دے ہی جائے گا اور اسی کو سامنے رکھ کر جیے چلے جائیں۔

یاد رکھیں کہ زندگی کی تحریک دو ہی جذبوں سے ملتی ہے یا تو محبت سے نفرت سے۔

شمارہ اگست کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا چناؤ

☆اول: جھوٹا انتظار.....زار اعلی، کینیڈا

☆دوم: فٹ پاتھیا.....محمد مشتاق، کراچی

☆سوم: اندر کا آدمی.....نوید، کراچی